www.pkdigest.com

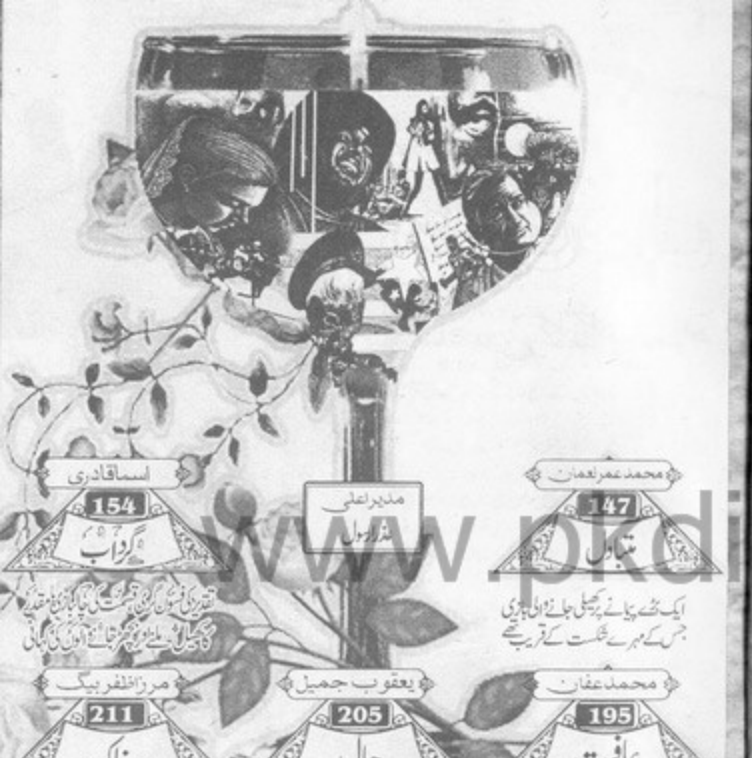

جاسوسی ڈائجسٹ

مدیر اعلیٰ
11
چینی نکتہ چینی
قارئین کی آرا، فرمائشیں، تلخ ادائیاں
محبتیں، شکایتیں اور نکتہ چینی

اثر نعمانی
18
[illegible]
محبت کی ڈگر پر مختلف حلقے لانے کی
فتح یا دولت کے سنسنی خیز کھیل کی جھلکیاں

کاشف زبیر
55
پجاری
تاریخی پس منظر میں جنم لینے والی ایک سنسنی
خیز داستان کے یادگار کرداروں کی کہانی

اصف زبیر
71
موت پسند
زندگی سے فرار اور موت کی خواہش میں
مبتلا فرد کی ایک سنگ دل کہانی

ثمر عباس
79
سزا
ایک بوڑھے آدمی کی عقل مندی جس نے
بچاؤ کے لیے ایک انوکھا طریقہ اختیار کیا تھا

محمد فاروق انجم
87
رازدار
ایک اسرار جس کی سنسنی اور پراسراریت
نے ہر شخص کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا

طاہر جاوید مغل
90
پرواز
ایک پراسرار جستجو میں سحر... اور اسی کے
خیال میں شام کرنے والے پجاری کا احوال

مریم کے خان
131
اسرارِ اہرام
مصر کی سیر کے شوقین افراد کے لیے تحفۂ خاص
اہرام کے پس منظر میں ایک ہنگامہ خیز کہانی

مدیر اعلیٰ
[illegible]

محمد عمر نعمان
147
مقابل
ایک نئے پیمانے پر کھیلی جانے والی بازی
جس کے مہرے شکست کے قریب تھے

اسما قادری
154
گرداب
تقدیر کی ستم ظریفی کہ قسمت کی بازی کا مقدر
کا کھیل ... والوں کی کہانی

محمد عفان
195
عافیت
جاسوسیت اور پراسراریت میں ڈوبی
اعصاب کو جھنجوڑ دینے والے انجام کی روداد

یعقوب جمیل
205
جال
ایک مجرم کی آپ بیتی جو مجرم بننے کے
بعد بھی جرم کرنے سے قاصر رہا

مرزا ظفر بیگ
211
سفاک
اپنے لیے سب کچھ کر گزرنے
والے بے ضمیر مجرم کا قصۂ عبرت

غوثیہ شبیر
221
گم گشتہ لمحے
جھوٹ اور سچ... یقین و گمان کے
درمیان گھومتی کہانی کا آغاز اور انجام

انجم اقبال
248
دشمنِ موسم
آپ کے پسندیدہ مصنف انجم اقبال کی کاوش
بطور خاص آپ کے لیے سرورق کا دوسرا رنگ

ادارہ و قارئین
000
تراش خراش
اقتباسات، گدگدیاں، مسکراہٹیں اور قہقہے
سب کچھ آپ کی تفریحِ طبع اور ذوق کے لیے

www.pkdigest.com

جلد 38 • شمارہ 09 • ستمبر 2009 • زرِ سالانہ 500 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 40 روپے • سعودی عرب 12 ریال یا مساوی

باوجود آپ کی آنکھیں دوشیزہ سے دوچار ہوئیں حالانکہ یہ مردوں کا کام ہے۔ آمنہ پٹھانی جی دوستوں کو یار کہنے میں کوئی قباحت تو نہیں، ویسے اپنے اپنے ذہن کی بات ہے۔ اے بے کسانہ... اس بار تبصرہ کچھ خاص نہیں اور مختصر بھی؟ حسیبہ سدھو اگر ہم آپ کو جن، بھوت کہتے ہیں تو آپ کس کیٹگری میں آتی ہیں؟ چاچا نجومی... اگر آپ نجومی ہیں تو اپنا خط اس وقت بھیجیں جب آپ کے ستارے گردش میں ہوں تاکہ انعام پائیں۔ محمد کبیر عباسی... آپ کے خط کو دیکھ کے دل سے دعا نکلی کہ کاش ہمارا مکمل تبصرہ بھی کبھی شائع ہو کر ہمارا بھلا ہو انکل کی قینچی کا... جو صرف چلتی ہے۔ نوشی چودھری کا تبصرہ پسند آیا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے گرداب کی دوسری قسط پڑھی۔ شہریار اور ماسٹر آفتاب کا کردار بہت پسند آیا جبکہ ماہ نور کی بدقسمتی اسے پھر گاؤں لے آئی۔ اینڈ کافی سنسنی خیز تھا۔ نواب صاحب کی بدست زندہ نے ہمیں اس وقت تک اپنے حصار میں لیے رکھا جب تک ختم نہ کی۔ کافی اچھی اسٹوری تھی۔ رنگوں میں پہلا رنگ شثث عام سا رنگ ثابت ہوا۔ ویسے بشریٰ کے قاتل ہونے پر حیرانی ہوئی۔ دوسرا رنگ، رخ تقدیر دلچسپ تو تھا مگر عامر کو بہت بڑھا چڑھا کے پیش کیا گیا۔ بہرحال، عامر اور فرخندہ نے مل کر وہ ما کا منصوبہ کام بنا دیا۔ انمول، لٹیرے اور ہم پیشہ بھی اچھی تحریریں تھیں۔ کاشف زبیر کی سفید ہاتھی بھی اچھی لگی۔"

مس روز قصبہ گجرات سے لکھتی ہیں "جاسوسی کا جس بے تابی سے انتظار کر رہے تھے، وہ بے تابی الجھن میں بدلی 3 اگست کی رات۔ 14 اگست کو نمایاں کرنے کے لیے خاصا بڑا چاند تارا ٹائٹل پر سب سے اونچا تھا۔ ایک صاحب جو چشمہ لگائے چہرے سے فرعونیت ٹپکائے، بکرا کٹنگ کروائے، ایک اسٹائل کے ساتھ سامنے پڑے پائے۔ حسینہ کی آنکھوں میں ذہانت تھا، ایک چھوٹی اور ایک بڑی تھی۔ پیچھے ایک صاحب نے ڈرتے ہوئے پستول تھام رکھا تھا۔ فہرست کو ایک نظر دیکھ کر محفل تو خاں میں پہنچے۔ انعام کے حق دار عبدالسلام صدیقی صاحب بہت بہت مبارک ہو۔ آپ کے خواب بھی پورے ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ ویسے آپ کا تبصرہ ذاتی زندگی کے تجربات تھا، آمنہ خیال رکھیے گا۔ ایف اے حسنی بہت بہت شکریہ تبصرہ پسند کرنے کا۔ ٹریل ایس جی، لگتا ہے آپ نے تابش صاحب سے علاج کروایا تھا جواب مشکل پاس کر رہے ہیں۔ تابش صاحب ایک بار دوبارہ ان کا علاج کریں وہ بھی فری میں تاکہ ان کی شکایت دور ہو اور ہاں، آپ کے پاس تو وقت کی کمی ہوگی نہیں اس لیے لمبا آ... آمنہ پٹھانی کا تبصرہ لاجواب رہا۔ لکی کنول، انکل گجرات والوں پر مہربان ہوتے تو ہمارا تبصرہ یوں ردی کی نذر نہ کرتے، یہ غلطی بھی دل دیکھیے۔ جاوید صدیقی صاحب ہم تو بہت دن سے حاضری دے رہے ہیں، آپ نے ہی دیکھنے میں دیر کی۔ عباسی جی ہم انگریزی والا روز (گلاب) ہیں، دور ہوگی پریشانی۔ اس بار بلیک لسٹ بڑے بڑے لوگوں سے بھری پڑی تھی، اب ذرا کہانیوں پر تبصرہ ہو جائے۔ بدست زندہ ایک لاجواب تحریر، جواد اکبر، ستارہ دونوں کے نیگیٹو رول زبردست تھے کیونکہ پوزیٹو تو ہوتے ہی اچھے ہیں۔ آخری کچھ صفحات تو جان ہی لے گئے۔ انتقام ہو تو ایسا نسیم صدیقی نے آفریں کا بدلہ بھی لیا اور بچہ بھی بیوی سمیت مل گیا۔ آتی گرمی میں کہانی روح افزا ثابت ہوئی۔ لٹیرے، اچھی اسٹوری تھی۔ گیس اسٹیشن کی چوری نہایت عقل مندی سے چھپائی گئی تھی لیکن ہام نے اسے ڈھونڈ نکالا۔ پرواز میں ثمینہ کے قتل کی تفتیش جاری ہے، کہانی روز بہ روز الجھتی جا رہی ہے۔ گرداب زبردست تھی اور زبردست ہی جاری ہے۔ اسما قادری ویلڈن۔ اب شہریار اور ماہ بانو کی اسٹوری شروع ہوگی۔ اسماجی مزہ ہی آ جائے گا۔ تکمیل میں سرفراز ہام نے اپنے ہی ... مسز فرزانہ ملوست کی آغوش میں پہنچا دیا۔ ہم پیشہ ... جون کا ملن اچھا لگا۔ دوسرا رنگ رخ تقدیر اچھا تھا۔"

محمد وقاص تفصیل تو شروع سے لکھ رہے ہیں۔ "لگتا ہے اس بار انکل نے اے بے کسانہ صاحب کی درخواست پر تھوڑا نوٹس لیا ہے کیونکہ اس دفعہ اپنی صنف کے حضرات کی شکلیں تھوڑی بہت انسانوں سے ملتی تھیں اور حسینہ اس پر ہر کوئی ثواب کا کام سمجھ کر تبصرہ کرتا ہے وہ بھی ذرا تفصیل سے۔ ہم اس دفعہ یہ کام نہیں کرنے والے حالانکہ حسینہ کافی خوبصورت تھی۔ اس کے بعد ہم ڈائریکٹ محفل میں پہنچے تو کرسیٔ صدارت پر عبدالسلام صدیقی صاحب کو پایا۔ فٹا فٹ مبارک دی اور آگے چل دیے۔ اب آتے ہیں ذرا کہانیوں کی طرف۔ شروعات تو ظاہر ہے پرواز سے ہوئی تھی، شاہ خاور بہت مشکلات سے گزر رہا ہے۔ شہوار کے قاتل تو بہرحال بچ گئے ہیں لیکن اینڈ میں پھر خاور کے گرد گھیرا تنگ ہو گیا ہے۔ پہلے بھی ایک گھیرے سے بڑی مشکل سے نکلا ہے۔ اب دیکھتے ہیں کہ کیسے نکلتا ہے۔ اس کے بعد گرداب پر پہنچے تو دیکھا کہ ماہ بانو دوبارہ چودھری افتخار سے بچ گئی ہے لیکن چودھری ڈھیٹ بندہ ہے اس نے اب شادی کے ذریعے ماہ نور کو پانے کی کوشش کی ہے تو ماہ بانو انصاف کے لیے شہریار کے پاس پہنچ چکی ہے۔ اب لگتا ہے اسے ہی شہریار اور چودھری افتخار کے درمیان پھنسا پڑے گا۔ اس لیے اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ اس کے بعد رنگوں پر پہنچے۔ پہلا رنگ حسام بٹ کا اچھی تحریر تھی۔ دوسرا رنگ رخ تقدیر جاسوسی سے بھرپور کہانی تھی۔ مزہ آ گیا پڑھ کر۔ اس کے بعد بدست زندہ پڑھی۔ انسان کو انسان مارتا ہے۔ بدنصیبی بھی کیا نہیں مارتی، کافی حد تک سچ لگا۔ جہاں پر شہباز درانی جیسے لوگ اپنی اولاد کے گناہوں جنہیں وہ گناہ نہیں سمجھتے بلکہ تفریح سمجھتے ہیں پر پردہ ڈالنے کے لیے کیسے گھناؤنے کھیل کھیلتے ہیں۔ یہ ان کی بدنصیبی نہیں، ایسے انسانوں کی ہوس اور کم ظرفی کا نتیجہ ہے جن کو کوئی پوچھنے والا نہیں کیونکہ ان کے پاس دولت ہے لیکن ایک دن ان سے پوچھ گچھ ہوگی۔ اس دن کوئی دولت کام نہیں آئے گی۔ اس دن صرف انصاف ہوگا۔ اس دفعہ جاسوسی مجموعی طور پر اچھا رہا۔"

ایف اے حسنی یوکوی کی یادآوری کراچی سے "سبز قومی رنگ اور چاند تارے سے مزین سرورق دل کو بھا گیا۔ مہینے کی مناسبت سے کافی عمدہ سرورق ترتیب دیا تھا۔ ٹائٹل گرل کو دیکھ کر یہ اندازہ نہیں کر پایا کہ موصوفہ رو رہی ہے یا ہنس رہی ہے۔ ساتھ ہی ہماری صنف کے جو دو نمونے دیے گئے تھے ان کو دیکھ کر یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ ہماری صنف کو صنف کرخت کیوں کہا جاتا ہے۔ محفل ہاؤس میں سب سے پہلے آپ کی پُر مغز باتوں پر نظر ماری کی۔ عبدالسلام صدیقی بھائی کا تبصرہ اگر انعام کا حق دار نہیں ٹھہرتا تو بڑی زیادتی ہوتی۔ اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے ملک میں یہ واحد کرسی ہے جہاں پر صرف اور صرف میرٹ پر رسائی ہوتی ہے۔ تبصرہ دلچسپ اور شاندار تھا۔ ٹریل ایس کے اسما محل اکیا ناؤں جناب اچھا نام ویسا ہی کام۔ ہم آج تک ان کے نام کا مطلب نہیں سمجھ پائے تو ان کا تبصرہ کیسے سمجھ میں آئے گا۔ ان کے تبصرے پڑھ کر ہم سمجھ گئے ہیں کہ پٹھان کیوں اتنے بدنام ہیں۔ ندا مغل جی! آپ کے تبصروں کو پڑھ کر کافی مزہ آتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ جلد ہی کرسی صدارت پر براجمان ہوں گی۔ نوشی چودھری صاحبہ آپ کے بھائی کو ہم دل سے ویلکم کرتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر آپ ان کا نام بھی بتا دیتیں۔ چودھری سرفراز صاحب اپنے تبصروں کے بارے میں کیا رائے ہے۔ ابن مقبول جاوید

احمد صدیقی بھائی، لگتا ہے آپ کو پڑدادا، پڑدادی سے بڑا ہی پیار ہے۔ جبھی تو پڑدادا صاحب کا نام بھی اپنے نام کے ساتھ چپکایا ہوا ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے موسٹ فیورٹ پرواز پڑھی جہاں پر شاہ خاور کی خواریاں عروج پر تھیں۔ اسما قادری صاحبہ کی گرداب وہی چودھریوں اور شہ زوروں کی روایتی سی کہانی لگ رہی ہے۔ میری رائٹر حضرات سے گزارش تھی کہ وہ ان چودھریوں اور نوابوں کے علاوہ کچھ اور موضوع بھی چنا کریں۔ بدلتے ہوئے ملکی اور عالمی حالات پر اگر لکھیں تو ایک اور مداری اور موت کے سوداگر جیسا شاہکار وجود میں آ سکتا ہے۔ امید ہے اس طرف توجہ فرمائیں گے۔ سرورق کے رنگوں میں سلیم فاروقی صاحب کی رخ تقدیر اس ماہ کی جاسوسی کی جان تھی۔ سسپنس، تھرل، ایکشن اور جاسوسی سے بھرپور یہ کہانی بیسٹ آف دی منتھ قرار پائی۔ دوسرا رنگ شثث بھی کچھ کم نہیں ہے۔ ہر قاری کے دل کی دھڑکن اپنے نواب صاحب کی بدست زندہ کی... واہ کیا بات ہے۔ نواب صاحب آپ نے تو دل ہلا کے رکھ دیا۔ اتنی تلخ اور سفاک تحریر ہمارے معاشرے کی بھرپور عکاسی تھی۔ اس بار آپ نے معاشرے کا جراح ہونے کا بھرپور ثبوت دیا۔ شکریہ اس بہترین تحریر پر۔"

حافظ آباد سے شجاع چودھری کا تبصرہ "سرورق تو لگتا ہے کہ جیسے رخ تقدیر کہانی کو ذہن میں رکھ کر تخلیق کیا گیا ہے۔ کہانی پڑھنے کے بعد ہم نے سرورق کے کرداروں کو کہانی کے کرداروں میں ڈھال دیا۔ حسینہ شاید شہلا باجی تھی اور سن گلاسز والے بھائی صاحب شاید عامر تھے اور شارٹ نیک کر دوسرے انڈین بھائی صاحب کو کافی زک پہنچا چکے تھے لہٰذا وہ غصے میں گن تان کے کھڑا تھا۔ محفل میں بہت سے لوگ الفاظ بھی پکڑتے ہیں لہٰذا سوری، گن نہیں پسٹل۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ محی الدین نواب صاحب کی بدست زندہ میں معاشرے کے المناک و شرمناک پہلوؤں کی طرف بڑی باریک بینی سے توجہ مبذول کرائی گئی ہے..... بخبر رہے لوگوں کا انجام آخرکار برا ہی ہوتا ہے جیسا کہ ستارہ اور جواد اکبر کا۔ لٹیرے اور جل پری بس اوکے ہی تھیں۔ انمول کہانی پڑھ کے یہ کہاوت بڑی شدت سے یاد آئی جتنے دیہی کھوتی اوتے آن کھلوتی۔ سنی رانگس پڑھ کر کافی مزہ آیا اور ٹنل اور جول کی جو درگت بنی وہ تو یوں تھی کہ بچہ بغل میں اور ڈھنڈورا پورے شہر میں۔ سفید ہاتھی بھی دلچسپ کہانی تھی۔ گرداب میں اسما قادری بڑا زبردست لکھ رہی ہیں البتہ جب ہمارے ملک میں بااختیار اور بااثر افراد بشمول قانون کے رکھوالے ہی اپنے اختیارات سے تجاوز کریں تو عام آدمی کی تو بات ہی چھوڑیں۔ تکمیل کو دو دفعہ پڑھا تو پتا چلا کہ دراصل تکمیل کیا تھا۔ ہم پیشہ میں مجھے تو شک اس لومڑی نما شخص پر تھا لیکن کہانی میں نے تھوڑی لکھی ہے کہ میرا خیال اور شک درست ثابت ہوتا۔ کہانی تو شر عباس نے لکھی ہے جنہوں نے سیما کو چور بنا دیا اور سرورق کا پہلا رنگ دوسرے نمبر پر اور دوسرا پہلے نمبر پر رہا۔"

محمد امین انجم نے ارزانی پور قصور سے تبصرہ ارسال کیا ہے "یوم آزادی کا شمارہ 5 اگست کو ملا۔ حسینہ نہ جانے یوم آزادی کی خوشی میں موسم کی مناسبت سے جنگلی رنگ کا جوڑا پہنے ہوئے سر کو ڈھانپنے سے بے نیاز ہے۔ جنگلی دار جنگل میں پہنچے عبدالسلام صدیقی کرسی آزادی پر براجمان تھے۔ مبارک ہو بھئی جشن آزادی کی کرسی۔ اے بے کسانہ میں نے پہلی بار سنا ہے کہ مرد بھی ... ہوتا ہے، دل آویز محفل میں خوش آمدید۔ ویسے جاسوسی کی محفل میں، میں بھی پہلی بار لکھ رہا ہوں کیونکہ کئی دفعہ سوچا کہ جاسوسی کی محفل میں لکھوں لیکن نہ لکھ سکا۔ ساتھ یہ بھی بتا دوں کہ 09-09-2009 کو میری سالگرہ ہے (مبارک ہو)۔ سب کو انوائٹ کرتا ہوں۔ سب سے پہلے تو پرواز پڑھتا ہوں لیکن اس دفعہ نہ چاہتے ہوئے بھی گرداب شروع کر بیٹھا۔ ماہ بانو دوسری دفعہ چودھری افتخار سے بچ گئی۔ ... چودھری نے دوسرے ہتھکنڈوں سے ... کے پاس پہنچ گئی ہے۔ اب دیکھتے ہیں اگلی قسط میں اے ہی صاحب کیا ... اس کے بعد پرواز پڑھی۔ ... ثمینہ کا قتل بھی خاور کے سر پر گیا اور چودھری امین کے چوکیدار نے اس کی مخبری کر دی۔ جس سے بے چارہ بال بال بچا اور انور سے حقیقت سن کر بڑا دکھ ہوا۔ اب چودھری عزیز قابو میں ہے اور پولیس بھی پہنچ گئی ہے۔ اب دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ بدست زندہ پڑھی امبارانی کے ساتھ بہت ظلم ہوا۔ جواد اکبر نے ستارہ کو بغیر نکاح کے ماں بنا دیا اور اس کی والدہ نے اس گناہ کو نسیم صدیقی کے گلے تھوپنا چاہا تو ڈاکٹر آفریں نے سب کچھ بتا دیا جس کے بعد دشمنی بڑھتی گئی۔ آخرکار ستارہ جواد اکبر کے ڈھانچے کے سامنے گر پڑی۔ ظلم کرنے والوں کو واقعی ان کے اعمال کی سزا ملتی ہے۔ اس کے بعد پہلا رنگ شثث پڑھا جس میں اسد نے کامران کی قاتلہ کو بڑے اچھے طریقے سے پھنسایا۔ جل پری پڑھی جس میں نادرس نے چال چلی، وہ ناکام ہوگئی۔ انمول میں ایمرین کو پتا ہونے کے باوجود اس نے لاکٹ اپنے پاس رکھا، آخر وہ تین آدمیوں کے پاس سے ہو کر اس کی جیب میں واپس آ گیا۔ لٹیرے میں ہیک نے ڈرامہ کیا لیکن رابرٹس کی عقل مندی سے وہ کامیاب نہ ہو سکا۔"

سندس جبیں، گوجرانوالہ سے پوچھتی ہیں "اس ماہ کا جاسوسی تین کو ملا۔ ٹائٹل گرل خوبصورت تھی اور صنف کرخت اپنا اصل روپ دکھا رہے تھے۔ سب سے پہلے پرواز پڑھی اور پے در پے جھٹکوں سے دوچار ہوئے۔ مغل انکل لگتا ہے خاور مظفر و مجرم بنے گا لیکن بہرحال شاہ خاور کو اپنی بیگم جی سے ضرور ملانا ہے ورنہ بے چارے کی روح بھی تڑپتی رہے گی۔ اس کے بعد بدست زندہ پڑھی اور جواد کے انجام نے تھرا دیا۔ پھر خطوط پر پہنچے۔ زیرو زیرو زیرو ایڈ فیضی پلیز آ جائیں، آپ کی کمی ہے۔ مغل شاہ رخ کہاں ہیں آپ؟ پھر نائی پلیز انٹری دیں۔ اس کے بعد حسام بٹ کو پڑھا واقعی اسد کی عدالت جیسی عدالتوں کی ضرورت ہمارے ملک کو بے حد ہے۔ پھر سلیم فاروقی کو پڑھا مزہ آ گیا۔ باقی ڈائجسٹ ابھی زیر مطالعہ ہے۔ ویسے اے بے کسانہ آپ کس جرم میں قید ہیں؟"

خانیوال سے عابد خان کی خامہ فرسائی "اگست کا جاسوسی 2 تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل پر حسب معمول 2 عدد غنڈے اور ایک خوبرو حسینہ براجمان تھے۔ ہماری محفل عمدہ چٹکلوں اور اعلیٰ قسم کے نکات سے بھری پڑی ہے جہاں مذاق ہی مذاق میں عبدالسلام صدیقی نے میدان فتح کر لیا۔ مبارک باد۔ ٹریل ایس کے آپ کے ایکسیڈنٹ کا سن کر بے حد افسوس ہوا۔ ندا مغل جی یہ صدارت کی کرسی بڑی بے وفا ہوتی ہے۔ کراچی سے دل آویز کو ہم صدق دل سے خوش آمدید کہتے ہیں۔ اس مرتبہ تو بلیک لسٹ بھی دوستوں سے بھری پڑی ہے۔ بدست زندہ ہمارے معاشرے کی تلخ حقیقتیں... جنہیں محی الدین نواب جیسا حساس رائٹر ہی سامنے لا سکتا ہے۔ رابرٹس کی جل پری تو بڑی مکار نکلی۔ انمول میں مسٹر ایمرین کے قتل لٹیرے نے چوراچکوں کو وخت ڈال دیا۔ لٹیرے کے بعد پرواز کی جامع تلاشی لی تو سر پھرا خاور پھر ایک نئی مشکل میں گرفتار نظر آیا۔ سفید ہاتھی میں ہر طرف ٹھگ ہی ٹھگ تھے۔ بالآخر جوزیو ٹھگ کا گروپ ستر لاکھ ڈالر لے کر چلتا بنا۔ گرداب کی گرد کچھ کم ہوتی جا رہی ہے۔ ہم پیشہ میں شر عباس نے ایک چور اور ایک چورنی کا کیا خوب ملاپ کروایا ہے۔ پہلے رنگ میں میاں بیوی کے مقدس رشتے کے درمیان نفرت کی دیوار حائل تھی۔ بشریٰ نے جو بویا وہی کاٹا۔ دوسرا رنگ لمحہ بہ لمحہ رنگ بدلتا رہا۔ ادب پتی طالب علم عامر خان نے ہر جگہ فتح

www.pkdigest.com

مدیر اعلیٰ

چینی نکتہ چینی

پیارے قارئین!
السلام علیکم

ہمارے یہاں ہر شعبے میں تجربات کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ حالیہ دنوں میں دو تجربات کے حوصلہ افزا نتائج سامنے آئے ہیں۔ ضروری نہیں کہ یہ ہم سب یعنی عوام الناس کے لیے حوصلہ افزا ہوں، یہ طے ہے کہ کسی نہ کسی کو فیض ضرور پہنچا ہے۔ بجلی کا بحران مہینوں سے جاری ہے۔ بجلی کی قلت سے عام شہریوں کو ایسی مار ماری گئی کہ وہ بلبلا کر ایک ہی دعا مانگنے پر مجبور ہو گئے کہ جس دام بھی ہو بجلی تو ہو۔ اب نوید ہے کہ کرائے کے بجلی گھروں سے ہر گھر روشن ہو جائے گا۔ دوسرا تجربہ چینی کے بارے میں کیا گیا ہے۔ کبھی سوچا نہیں تھا کہ گنے کی پیداوار کے حوالے سے دنیا کا پانچواں بڑا ملک اور چینی کی تیاری کے لحاظ سے چودھواں سب سے بڑا ملک کہلوانے والے پاکستان میں چینی اب پچاس ساٹھ روپے کلو بکتی رہے گی... میڈیا آزاد ہے... عدلیہ آزاد ہے... دیکھنا یہ ہے کہ قوم کو ان تجرباتی جونکوں کے شکنجے سے آزادی کب نصیب ہوتی ہے۔ باسٹھ سال سے پاکستانی قوم ان گراں فروشوں اور ذخیرہ اندوزوں کے ہاتھوں میں یرغمال بنی ہوئی ہے۔

خیر اب تفصیل سنانے بیٹھیں تو دفتر کے دفتر بھرتے چلے جائیں گے مگر داستان ختم نہیں ہوگی۔ وقت کا کام چلتے جانا ہے مگر خوشیوں، برکتوں اور رحمتوں کے ایام تو جیسے پر لگا کر ہوا میں تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ خدا کی رحمت کہ ہمیں اپنی زندگیوں میں ایک بار پھر رمضان المبارک کا بابرکت مہینا نصیب ہوا۔ ماہِ رمضان المبارک کے اختتام پر عید ہم سب کی منتظر ہے۔ اس دورِ مہنگائی میں عید بھی شاید ایک رسم ہی ٹھہرے۔ خدا سے دعا ہے کہ رمضان کے ماہِ مبارک کے طفیل ہمارے کرتا دھرتاؤں کو عقلِ سلیم عطا فرمائے کہ وطنِ عزیز کے جن لوگوں کی زندگیوں کو گرانی نے مزید گراں بار کر دیا ہے، اسے ہلکا کرنے کی توفیق ملے سچے دل کے ساتھ۔ عید کی خوش رنگ ساعتیں آپ سب کو نصیب ہوں (آمین)۔

آیئے چلتے ہیں بزم نامہ میں جہاں دور دراز سے آنے والے سندیسے منتظرِ گفتار ہیں۔

محمد کامران شہزاد ضلع بھکر سے پہلے انعام کے حق دار قرار پائے ہیں، موصوف لکھتے ہیں ”اگست 2009ء کا تازہ شمارہ میرے ہاتھوں کے گلدستے میں تازہ گلاب کی مانند اپنی خوشبو سے فضائے ذہن و دل کو مہکا رہا ہے۔ سرورق پر ہیرو، ہیروئن اور ولن کی موجودگی احساس دلا رہی تھی کہ اس بار تحریریں رنگ زبردست ہوں گے۔ چینی، نکتہ چینی میں ہمیشہ کی طرح چینی زیادہ اور نکتہ چینی کم تھی۔ اس کی بڑی وجہ آپ کی ان تھک محنت اور کام سے بے پناہ لگن ہے۔ پہلی کہانی ہمارے محبوب رائٹر محی الدین نواب کی بدست زندہ تھی جس میں زمانے کی سفاکی و قسمت کا ہیر پھیر اور خوش بختی میں بہتا لوگوں کے لیے ایک عبرتناک سبق پوشیدہ تھا۔ کہانی میں کردار نگاری لاجواب ... سسپنس اور منظر کشی لاجواب تھی۔ جل پری نے مرزا ظفر بیگ نے تخیلی روپ دیا، جو انسانی دنیا کی عکاسی تحریر جو سبق آموز بھی تھی۔ اصول ظفر سعید ہوتی نے کہانی کی صورت میں بیان کیا تھا۔ اس کہانی میں انسانی جذبات کی بڑے خوبصورت الفاظ میں ترجمانی کی گئی ہے۔ واقعی سچ ہے، تحفہ اہم نہیں ہوتا بلکہ دینے والے کی محبت اہم ہوتی ہے۔ رضوانہ منظر نے تیر سے میں ثابت کر دیا ہے کہ کوئی شخص بھی عقلِ کل نہیں ہو سکتا بلکہ اپنا سمجھنے والا شخص ہمیشہ کہیں نہ کہیں مات کھا جاتا ہے۔ پرواز میں طاہر جاوید مغل نے جس خوبصورتی سے سسپنس اور تجسس کو ایک لڑی میں پرو دیا، اس نے کہانی کو دو آتشہ کر دیا ہے۔ کہانی کا پلس پوائنٹ ہے کہ کردار نگاری اور واقعات نگاری میں مصنف نے قاری کو سحر زدہ کر کے رکھ دیا ہے۔ چودھری خاور نامساعد حالات کا جس مردانگی سے مقابلہ کرتے ہوئے اپنی بے گناہی کے شواہد تلاش کر رہا ہے۔ وہ سبق آموز لمحات ہیں۔ انسان کو اسی دل جمعی اور بہادری سے آنے والی مشکلات و مصائب کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ مریم کے خان کی رائیگاں سبق آموز تحریر تھی جس میں موجود کردار جو سرگرمی دکھا رہے تھے، وہ واقعی رائیگاں جا رہی تھی کیونکہ وقت اور سمت درست نہ تھی۔ کاشف زبیر کی تحریر سفید ہاتھی اہم ہا کی تحریر جس میں کچھ ایسے مجرموں کا ذکر تھا جو ایک دوسرے کو نیچا دکھاتے دکھاتے آخر اپنے منطقی انجام سے دوچار ہو گئے۔ اسما قادری کی سلسلہ وار کہانی گرداب کی ابھی دوسری قسط تھی، کہانی کا پلاٹ پرانا ہے۔ کہانی میں کردار نگاری اور واقعات نگاری کے سلسلے میں مصنف کی گرفت کچھ بہتر ہے۔ سسپنس اور ایکشن کا مناسب انداز میں استعمال کیا گیا ہے، چودھری روایتی انداز میں ظالمانہ کارروائیوں سے گاؤں کے لوگوں پر اپنا رعب جمائے ہوئے ہے۔ ابھی کہانی کی ابتدا ہے جو کہ کافی کمزور انداز سے کی گئی ہے۔ محنت، لگن اور فنِ تحریر سے کہانی کو رنگ دیا جا سکتا ہے۔ احمد صغیر صدیقی کا کھیل دلچسپ انجام کی وجہ سے لائق مطالعہ ثابت ہوا۔ قمر عباس کا ہم پیشہ ایسے شخص کا قصہ جو جرائم سے جان چھڑانا چاہتا تھا مگر کمبل کی طرح وہ اس کی جان سے چمٹے تھے۔ محبت واقعی ایسا جذبہ ہے جو پتھر کو موم بنا سکتا ہے۔ آخری صفحات پر سرورق کے رنگ بکھرے تھے۔ حسام بٹ کی تحریر شاطر جو مصنف کی اعلیٰ تحریر نگاری کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ اس کہانی میں محبت اور نفرت کی ازلی جنگ کو بڑی چابک دستی سے الفاظ کے روپ میں صفحہ قرطاس کی زینت بنایا گیا ہے۔ کہانی میں سسپنس، تجسس اور ایکشن کے درمیان توازن کا پورا پورا اہتمام کیا گیا تھا۔ سلیم فاروقی کا دوسرا رنگ، درخ تقدیر ایسی تحریر جس میں ایسے نوجوان کا قصہ بیان کیا گیا تھا جو خواہشات کے بھنور میں ایسا الجھا کہ پھر سنبھل نہ پایا مگر اس نے حالات کا مردانگی سے مقابلہ کیا۔ واقعی سچ ہے، خدا ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ واقعات نگاری پر مکمل کنٹرول اور کردار نگاری میں توازن کہانی کا حاصل تھا۔ کچھ دیسا تھا مگر کہانی سے مطابقت رکھتا تھا، دونوں رنگ اپنا رنگ جمانے میں کامیاب و کامران رہے۔“

چودھری دل بہار انجم، بستی ملوک سے حاضر ہیں ”اس بار سرورق اگست کی مناسبت سے بہت پیارا تھا۔ بس ہمیں عینک والا مرد ایسے لگا جیسے پہلوئے حور میں لنگور... چینی، نکتہ چینی میں عبدالسلام صدیقی کا خط واقعی اچھا تھا۔ ہماری طرف سے مبارک باد۔ ویسے صدیقی بھائی! آپ وہ باتیں دو ملاقاتیں... کے ساتھ ہمسائی کے بھائی کی لائنیں لکھنا بھول گئے۔ ایف اے مثنی... بیلیوں اور مرغوں کے ساتھ آپ بھی تو کام کیا کرتے ہیں۔ ویسے بھی گرمیوں میں کوے کچھ زیادہ ہی بولتے ہیں۔ عما مغل آپ اپنی باتوں سے اتنی نازک نہیں لگتیں جتنا ظاہر کر رہی ہیں۔ ویسے حیرت کی بات ہے کہ صنفِ نازک ہونے کے

www.pkdigest.com

کے جھنڈے گاڑ دیے۔ زبردست۔"

ضلع گجرات سے مصدق محمود دانش کی باتیں "اگست کے جاسوسی کا سرورق جہاں جشن آزادی کی رنگینیوں میں کھویا ہوا تھا وہاں مس جاسوسی کی مست نظریں اور دل فریب مسکراہٹ کا دور انبر تھا۔ لمبے بالوں، بڑے شیشوں کی عینک لگائے، بڑی مونچھوں والا نفتوا نامی شخص گلے کے بٹن کھولے لاکٹ پہنے، تاش کے پتوں کی بھرمار کر رہا تھا۔ جسم کا اکا یعنی حکم کا بادشاہ بھی اس کے ہاتھ میں نمایاں تھا جو اس بات کی نشان دہی کر رہا تھا کہ اس بار جاسوسی ڈائجسٹ میں بدی کو ڈھیل ملی ہوئی ہے۔ خود پاکستان میں بھی یہی صورتِ حال ہے۔ چٹنی تکہ چٹنی یعنی چٹنی کم نمک مرچ زیادہ والی محفل میں اس بار عبدالسلام صدیقی انعام کے حق دار قرار پائے۔ مبارک ہو۔ خط میں عبدالسلام صدیقی کا انداز بالکل نہیں بھایا۔ انکل عبدالسلام صدیقی اپنی عمر دیکھیں، باتیں دیکھیں اور کام دیکھیں۔ رشید ایس کے کا مختصر تبصرہ اچھا تھا۔ ایف اے حسنی کو کوئی جاسوسی محفل میں خوش آمدید۔ ٹریلی ایس کے اسماعیل کی دہنک گستاخانہ تھی۔ جسے کسی بھی کمین اور مالک مکان کے آرام سے کچھ غرض نہیں تھی۔ اے اے شام کی توصیف و تنقید بھی ٹھیک تھی۔ مردان میں ہمارے ایک وکیل دوست گل جلیل بھی رہتے ہیں۔ انہیں سلام کہیے گا۔ عابد خان بلوچ کی مختصر آمد بہت پسند آئی۔ عدا مثل جی اپنے نازک دل کو خوب بگھوا کریں۔ ہمارے تبصرے کو کرسی وزارت دینے کے لیے شکریہ۔ نوشی چودھری جی محبت ہے میں بھی خلوص ہی شامل ہوتا ہے۔ آپ کے لیے ہمارے دل میں بہت خلوص ہے، کاش آپ سمجھیں تو۔ کراچی سے دل آویز کی آمد خوشگوار ہوا کا جھونکا تھی۔ دل کو سکون آ گیا۔ محمد کبیر عباسی اپنی صفتیں اور انعام (تانکا جھانکی کرنا اور بری طرح پٹنا) اپنے پاس ہی رکھیں۔ ہمیں اپنی طرح آوارہ مت سمجھیں۔ باقی خطوط ٹھیک ہی تھے۔ محی الدین نواب کی بدست زندہ معاشرتی برائیوں کی عکاس تحریر تھی۔ مصنف نے کھوکھلے کرداروں کے چہروں کی نقاب کشائی کی۔ پرواز میں خاور شاہ کے ستارے بدستور گردش میں تھے۔ امید ہے جلد ہی ستاروں کی گردش سے نکل آئے گا۔ پرواز اس بار بہت زیادہ سنسنی لیے ہوئے تھی۔ اسماقادری کی گرداب اچھی تحریر لگی ہے۔ اس بار بھی شہریار کے کردار نے دل موہ لیا۔ سرورق کے دونوں رنگ مثلث اور رخ تقدیر اس بار قدرے پھیکے تھے۔ چھوٹی چھوٹی کہانیوں میں ہم پیشہ، سعی رائگاں اور ٹیپر سے زیادہ پسند آئیں۔"

تصور احسن، ضلع اوکاڑہ سے لکھتی ہیں "ٹائٹل پر حسینہ تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے بہت اچھی لگ رہی تھی۔ ایک نوجوان پستول پکڑے نشانہ تانے نہ جانے کس کو شوٹ کرنے کی کوشش میں تھا، دوسری طرف ایک صاحب تاش کے پتے کو دو انگلیوں میں پکڑے شاید پھینکنے کے چکر میں تھے۔ ساتھ میں چاند اور تارا بنا کر ہمیں اگست کی مبارکباد دی گئی۔ ہم جاسوسی کے بارے میں جامع تبصرہ نہیں کر سکتے کیونکہ یہ بڑی مشکلوں سے ہاتھ آتا ہے۔ جیسے ہی جاسوسی کی گھر میں انٹری ہوئی فوراً بھائی نے ہاتھوں سے چھین لیا۔ جاسوسی تمہارے پڑھنے کی چیز نہیں، لاؤ ادھر دو، بعد میں پڑھ لینا۔ لو جی اب انتظار کرو۔ بہرحال، خدا خدا کر کے بھائی سے مجھ تک پہنچا۔ (ویسے بڑے بھائی نہیں ہونے چاہئیں، رعب بڑا ڈالتے ہیں) سب سے پہلے انکل طاہر جاوید مغل کی پرواز پڑھی۔ ابھی شمینہ کی موت کے جھٹکے سے ہی نہیں سنبھلے تھے کہ چودھری عزیز کا بھی پول کھل گیا۔ اللہ کرے خاور ابھی پولیس کے ہاتھ نہ آئے اور اسے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کا موقع مل جائے۔ اسماقادری نے اپنی گرداب دوسری قسط میں ہی پہلے سے آگے بڑھا دی ہے۔ جاسوسی کا دوسرا رنگ انتہائی زبردست تھا کہ کیا بتاؤں۔ سلیم فاروقی نے رخ تقدیر کو اتنے واضح اور جامع انداز میں بیان کیا، بہت اچھا لگا۔ قمر عباس نے ہم پیشہ میں جس طرح جیک ول کا حال بیان کیا، کاش اسے پڑھ کر بھی کوئی نصیحت پکڑے کہ برائی سے توبہ کرنے والے کا انجام بھی ہمیشہ اچھا ہوتا ہے۔ محی الدین نواب کے بارے میں کیا لکھوں، یہ جب بھی آتے ہیں تو چھا جاتے ہیں۔"

قیصر عباس نانوری، ضلع جھنگ سے فرماتے ہیں "3 اگست کی شام کو بک اسٹال میں جاسوسی ڈائجسٹ کا دیدار کیا تو سرورق پر نظر پڑتے ہی جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ شار پر اور شوٹر کے درمیان مس جاسوسی خاص ہیئر اسٹائل میں، ہونٹوں پر خاص مسکراہٹ سجائے، چالاک آنکھوں میں عیاری لیے، سنجیدہ چہرے کے ساتھ باوقار انداز میں براجمان تھیں۔ بعد ازاں پہنچے بزم تکہ چٹنی میں، جہاں عبدالسلام صدیقی صاحب پیٹ کے مروڑ نکالتے نکالتے لیٹ گئے تختِ شاہی پر اور قبضہ جما لیا پورے ایک ماہ کے لیے۔ خیر بھئی مبارک ہو۔ اپنا تبصرہ نظر نہیں آیا تو بلیک لسٹ میں جھانک کر سرد آہیں بھر لیں۔ گزشتہ ماہ کے ہیرو "بلیک زیرو" کو بھی بلیک لسٹ میں پایا۔ خیر ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ کل کا ہیرو... آج کا زیرو اور وہ بھی بلیک اور بلیک لسٹ میں۔ دونوں رنگ سرورق کے عین مطابق تھے۔ پہلا رنگ حسام بٹ کی مثلث قتل کی گتھی سلجھاتے پولیس انسپکٹر اسعدی کی کاوشوں پر مشتمل تحریر تھی۔ دوسرا رنگ رخِ تقدیر ایک اولوالعزم اور جاسوس طبع نوجوان کے کارناموں کی جاسوسی سے بھرپور سنسنی خیز تحریر، سلیم فاروقی کی عمدہ کاوش پسند آئی۔ انکل طاہر جاوید مغل کی شاہکار پرواز میں شمینہ کو بھی راستے سے ہٹا دیا گیا۔ شاہ خاور، لیزا آصف جاہ سے جان بچا کر تو جیسے جاسوس بن گیا۔ گرداب کی دوسری قسط نے ابتدا میں کافی بور کیا مگر اب کہانی ایک دوسرے رخ پر چل پڑی ہے اور ایکشن کا وقت نزدیک نظر آتا ہے۔ ابتدائی صفحات پر موجود محی الدین نواب کی تحریر بدست زندہ ظالموں کو عبرت پکڑائی، سرکشوں کو کیل ڈالتی، چونکا دینے والے انجام کی حامل عبرت آموز کہانی ثابت ہوئی۔ ٹیپر سے رضوانہ منظر کی اچھی کاوش تھی، کمانڈر رستم نے ذہانت کا خوب استعمال کیا۔ کاشف زبیر کی سفید ہاتھی میں اصل چور رقم سمیت فرار ہو گئے۔ پولیس کے ہتھے چڑھے جان اور مارونٹ کیرز۔ یہ بھی اچھا ہوا۔ قمر عباس کی ہم پیشہ اور مریم کے خان کی سعی رائگاں کے ساتھ ساتھ جل پری، اصول اور کھیل بھی عمدہ اور زبردست کاوشیں تھیں۔"

آمنہ پٹھانی، فتح پور لیہ سے لکھتی ہیں "ماہ رواں کا خوب صورت شمارہ 3 اگست کو ملا۔ کرسیِ صدارت پر عبدالسلام صدیقی براجمان تھے۔ تبصرہ واقعی جاندار اور قابلِ انعام تھا۔ سو صدیقی صاحب مبارک ہو۔ ٹریلی ایس کے اب اس عمر میں جوانوں کی طرح چوکڑیاں مت بھرا کرو۔ اپنی عمر کا لحاظ کیا ہوتا تو یوں چوٹیں نہ لگتیں۔ عدا مثل جی کیا خوب اتفاق ہے کہ سرورق کو دیکھ کر ہم بھی ڈر جایا کرتی تھیں، اب سرورق والے (مصنف کرخت) ہم سے ڈرتے ہیں۔ نوشی جی ایسا حوصلہ جوان رکھیں میں بھاگنے والی نہیں ہوں۔ لکی کنول انجم سے آپ کے نام کے دیوانے بھی پیدا ہو گئے اور تعجب ہے کہ آپ خاموش ہیں...؟ آپ کی جگہ میں ہوتی تو... چودھری سرفراز امیر سے اور نوشی چودھری کے ہم خیال ہونے پر آپ کو مرچیں کیوں لگ رہی ہیں...؟ کبیر عباسی! آپ کا دلچسپ تبصرہ بہت پسند آیا۔ باقاعدگی سے آتے رہیے گا۔ قاری اشرفی...! آپ سے کس نے کہہ دیا کہ میں کاغذی پٹھانی ہوں۔ بھئی ہم خان ہیں، اپنے

علاقے میں پٹھان ہی کہلاتے ہیں۔ پرواز میں ایک بار پھر چودھری عزیز کا منافقانہ اور مکارانہ کردار سامنے آ گیا لیکن اب کی بار لگتا ہے خاور اسے ہرگز معاف نہیں کرے گا۔ دوسری قسط وار کہانی گرداب کافی دلچسپ ہوتی جارہی ہے۔ شہریار کے لیے اصل کیس اب شروع ہوا ہے۔ ابتدائی صفحات پر محی الدین نواب کی بدست زندہ، گو ایسے موضوعات پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے پھر بھی رائٹر انکل نواب ہوں تو کہانی کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ جرم و سزا پر لکھی گئی مثلث عام سی تحریر ثابت ہوئی۔ البتہ حسام بٹ کے مکالمے اور برجستہ جملے لاجواب اور بے مثال ہوتے ہیں۔ دوسرا رنگ سلیم فاروقی کا قدرے بہتر لگا۔ باقی رسالہ زیرِ مطالعہ ہے۔"

ملک عطاءالرحمٰن اسماعیلہ صوابی سے فرمائش کرتے ہیں "اس ماہ کا جاسوسی 7 تاریخ کو ملا۔ سب سے پہلے سرورق کا مطالعہ کیا۔ تو لڑکی، ہیرو اور ولن کے علاوہ جو نئی چیز نظر آئی، وہ تاش تھی۔ خیر سرورق اچھا تھا اور 14 اگست کے پیشِ نظر بنایا گیا تھا، اچھا لگا۔ اس کے بعد چٹنی تکہ چٹنی میں قدم رکھا۔ عبدالسلام صدیقی صاحب کو مبارک باد۔ ویسے ملتان میں گرمی تو ہوگی۔ اس کے بعد سب کے تبصرے پڑھے۔ ہمیشہ کی طرح اچھے لگے پھر ہم پرواز کر کے پرواز میں پہنچے اور شاہ خاور کو مصیبتوں میں پایا تو دکھ ہوا۔ یہ کہانی کسی حد تک دیوی سے ملتی ہے اور دیوی کی کمی پوری کر رہی ہے۔ واقعی مغل صاحب کا کوئی جواب نہیں۔ اس کے بعد سیدھا گرداب پہنچا۔ جہاں ماہ بانو کے ساتھ ظلم ہو رہا تھا۔ چودھری افتخار اپنی طاقت کے نشے میں مست تھا اور وہ ایک شکاری بن کر انسانوں کے جنگل میں انسانوں کا شکار کر رہا تھا لیکن ماسٹر صاحب اور شہریار کی ایمانداری دیکھ کر سکون ہوا کہ ہر فرعون کے لیے موسیٰ ہوتا ہے۔ اب اس نئے کھیل سے ماہ بانو کیسے نکلے گی، آگے پتا چلے گا۔ اس کے بعد بدست زندہ میں پہنچے جس میں زمانے کی وہی باتیں تھیں جو ہمارے معاشرے میں عام تھیں۔ جس میں جواد اور ستارہ کا انجام دیکھ کر اچھا لگا۔ باقی سب کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ رخِ تقدیر پڑھ کر اچھا لگا۔ اگر اس میں ہیرو اپنا نام عامر خان کے بجائے بروس لی یا جیکی رکھتا تو شاید کہانی اور اچھی ہو جاتی۔"

غلام مصطفیٰ کا مظفر گڑھ سے انتصاریہ "جاسوسی میں میری پہلی حاضری ہے۔ جاسوسی بھی اپنا رنگ دکھا رہی تھی جیسے چودہ اگست منا رہی ہو۔ جاسوسی پہلے آٹھ یا دس تاریخ کو ملتا تھا لیکن اس ماہ قدرت کچھ مہربان تھی جو چھ تاریخ کو مل گیا۔ سب سے پہلے سب بہن بھائیوں کو سلام اور آزادی مبارک ہو۔ اب چلتے ہیں اسٹوریوں کی طرف۔ جل پری اچھی کہانی تھی۔ نارس کا اور مین کا جو منصوبہ ہوتا ہے، رابرٹس اس سے بچ جاتا ہے۔ اصول میں بدر لالا اشرفی اصول بنتا ہے۔ گھوم پھر کر واپس آ جاتا ہے۔ ٹیپرے میں میک خود ہی ٹیپر ہوتا ہے...... کمانڈر رستم اس کی نفسیات سے اس کو پکڑ لیتا ہے۔ پرواز میں خاور خود پرواز نہیں کر رہا ہے، اسے پرواز کیا جا رہا ہے۔ اس پرواز سے وہ خوف زدہ ہو گیا۔ اپنی بہن اور بے بے جی کے لیے! گرداب تو گرداب بنتی جارہی ہے۔ بدست زندہ نے بہت ہی متاثر کیا ہے۔ باقی سب کہانیاں اچھی تھیں۔"

بہاولپور سے رخسانہ اسلم کی انٹری "سرورق دیکھتے ہی ہمیں یہ خیال آیا کہ پستول والے بھائی نہ جانے کہاں اندھے فائر کر رہے ہیں حالانکہ تجو بابا تو پیچھے بیٹھا ہے اور لگتا... یار کا طلب گار ہے۔ کوئی بات نہیں تجو جی آپ کے لیے عرض کیا ہے۔

پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

www.pkdigest.com

عبدالسلام صدیقی صاحب مبارک ہو۔ میرا ایک مشورہ ہے پیٹ میں مروڑوں کا ڈاکٹر کوئی اچھی بات نہیں اور یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہر کہانی پر تبصرہ کیا جائے۔ ٹریلی ایس کے صاحب یہ کیا؟ آپ میں زرقا جن کی روح سما گئی ہے کیا؟ آپ کے بابا پر صرف ایک یہ بات کہی جا سکتی ہے "حق ہا۔" اس کے علاوہ سب کے خطوط اچھے تھے۔ محفل سے کوچ کیا جاسوسی کی جان پرواز کی طرف۔ ایمان تو خاصی گرما گرمی ہے۔ سورج میں قید خاور کے لیے شاہ نواز بھی مدد کی طرح ثابت ہوا۔ مجھے پہلے ہی شک تھا، چودھری عزیز کا کردار مشکوک ہے۔ اب دیکھتے ہیں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ گرداب پڑھی بلکہ وہ دو صفحے پھلانگ کر پڑھی۔ اس کہانی میں سب چیزوں کی کمی ہے مثلاً مار دھاڑ، سسپنس، جاسوسیت۔ اس میں بہتری کی ضرورت ہے۔ ہاں لیکن اینڈ میں کہانی نے تھوڑا سا رنگ تبدیل کیا ہے۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ سلسلے وار کہانیوں سے رنگوں میں قدم رنجہ فرمایا تو دوسرا رنگ پڑھ کر طبیعت باغ باغ ہو گئی۔ مزہ آ گیا۔ کافی عرصے بعد کوئی اس طرح کی منفرد تحریر پڑھنے کو ملی۔ شکریہ! پہلا رنگ سسپنس سے بھرپور تھا لیکن ایک طرف تو سلمٰی کو نہایت سخت گیر دکھایا گیا پھر جب اسد شاکر علی کو سلمٰی اور کامران کے عشق سے آگاہ کرتا ہے تو شاکر علی کا رد عمل سلمٰی پر ظاہر نہیں کیا۔ حالانکہ سلمٰی اپنے باپ سے کافی ڈرتی ہے۔ محی الدین نواب صاحب کی بدست زندہ میں جذبات کی کمی تھی اور استار فنس کی طرح سازشوں کی بہتات اور ہماری جیلوں میں قیدیوں کے حال پر ترس آیا۔ مختصر کہانیوں میں ہم پیشہ کا اختتام کمزور کن تھا۔ اس کے علاوہ سب کہانیاں منفرد اور دلچسپ تھیں۔"

ساگر کوکر چشمہ بیراج سے اپنی مختصر بات کے ساتھ "ٹائٹل اس مرتبہ اگست کی مہکار لیے ہوئے تھا۔ ٹائٹل پر جگمگ کرتا چاند تارا بہت پیارا منظر پیش کر رہے تھے۔ ابتدائی کہانی نواب صاحب کی تھی۔ نواب صاحب کی تعریف کرنی سورج کو جگنو دکھانے والی بات ہے۔ پرواز اچھی پرواز کر رہی ہے۔ گرداب اسماقادری کی سوغات ہے۔ اسماقادری صاحبہ جو نام ہے اعتماد کا۔ بہت اچھا لکھتی ہیں۔ "کلرز" بہت ناکس تھے۔ شارٹ کہانیوں پر "نو" تبصرہ کیونکہ ابھی پڑھی نہیں۔ تمام پاکستانیوں کو دل کی گہرائیوں سے 14 اگست کی مبارک باد۔"

اے اے زیڈ انجم، آر ایس حاضر ہوتے ہیں "تین ماہ غیر حاضری کے بعد ایک بار پھر اپنی محفل رولا دوبارہ میں حاضر ہوں۔ تمام اہلِ نظر کو پیار بھرا سلام۔ ماہ اگست کا دل دار جاسوسی 6 تاریخ کی ایک رومینٹک اور خوب صورت شام کو ملا۔ ڈاکٹر انکل نے اس بار کمال کر دیا۔ ٹائٹل زبردست تھا۔ اشتہارات کو پھلانگتے ہوئے سیدھے اپنی کیوٹ سی بزم میں پہنچے۔ سب سے پہلے انکل کی باتیں پڑھیں جسے پڑھ کر انکل کی اپنے وطن سے محبت کا بخوبی اندازہ ہوا۔ کہتے ہیں کہ جب طوفان بہت زور پکڑ لے تو اس کا رخ تبدیل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح رات کتنی ہی سیاہ اور تاریک کیوں نہ ہو، صبح ضرور روشن ہوتی ہے۔ ہمارا ملک بھی ضرور پورے عالم پر آفتاب بن کر چمکے گا۔ انشاءاللہ۔ اس مرتبہ کرسی صدارت پر عبدالسلام صدیقی پوری شان سے براجمان تھے۔ تبصرہ واقعی شان دار تھا۔ مبارکاں جی مبارکاں۔ ٹریلی ایس کے اسماعیل اللہ تعالیٰ آپ کو صحت اور تندرستی عطا فرمائے، آمین۔ مجھے آپ کا نام بہت اچھا لگتا ہے، وہ بھی

ٹریلی ایس تک... چاہے کیوں؟ پلیز اپنا انداز بیان تبدیل کریں۔ اپنے آدھے ہم نام کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ یعنی ہم اے اے زیڈ اور وہ اے اے شام وغیرہ... مغل جی، بہنا آپ کوشش جاری رکھیں، آپ ضرور کرسی صدارت جیت لیں گی۔ اے جے کسانہ نے بھی خوب انٹری دی۔ نوشی چودھری آپ کو اور آپ کے بھائی کو جی آیاں نوں۔ دل آویز جی آپ کو دل کی گہرائیوں سے خوش آمدید۔ تجی کنول آپ کی تیزیاں اچھی تھیں۔ مغل شاہ رخ کو ہماری طرف سے ...ں پی ربھوڑے۔ سمعیہ سندھو آپ کی امریکی طبیعت ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ ہیں... یہ کیا؟ بلیک زیرو بلیک لسٹ میں؟ کوئی بات نہیں، حوصلہ جوان رکھو۔ محمد ...لیر عباسی، چاچا جی، چودھری محمد سرفراز کے تبصرے بھی خوب رہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے پرواز پڑھی جو کہ ایک پرندے کی طرح نشیب و فراز طے کر رہی ہے۔ خاور کے بارے میں اتفاق کہ (پارو ادھی عشق آتش لائی ہے) اسما قادری کی گرداب نے سب کو اپنے گرداب میں لے لیا ہے۔ ماسٹر آفتاب ...ر ماہ بانو کے کردار پسند آئے ہیں۔ کاشف زبیر کی سفید ہاتھی سفید ہی رہا۔ دونوں رنگ بھی بس ٹھیک ہی تھے۔''

محمد مغل جی مرغزار کالونی گجرات سے حاضر ہیں ''سرورق ماہ دولت کو بور کر رہا تھا اگرچہ ایک حسین الپڑ سی حسینہ س مست سے آنکھیں چار نہ ہوئی ہوتیں۔ دونوں بور افراد سے ہمیں کچھ لینا دینا نہ تھا۔ اس کے باوجود بھی دونوں کی ناٹپ ظاہر ہوگی کہ دونوں کس قماش کے ہیں۔ بہرحال، پستول والا آدمی مثبت انداز میں کام کرنے والا لگا۔ یعنی کہ بدی کے خلاف برسرپیکار۔ پھولوں اور کلیوں کی حسین محفل میں عبدالسلام صدیقی کا نام سرفہرست دیکھ کر اپنی شہادت والی انگلی پر ...نگی کاٹ لی۔ حسب معمول ہمارا نام غائب تھا۔ عبدالسلام صدیقی انکل (قرعہ فال آپ کے نام نکلا۔ (سوساڈی طرفوں ڈھیراں مبارکاں)۔ تبصرہ چودہ طبق روشن کیے دے رہا تھا۔ رشید ایس کے مردان کا مختصر لیٹر تبصروں پر تبصرے کے بغیر ادھورا ادھورا تھا۔ لگتا ہے کہ تمام دوستوں سے ناراض ہیں۔ ایف اے حسنی ...کوئی کا ''شکایت نامہ'' عنایت نامے کی شکل میں پڑھا۔ کچھ زیادہ ہی اور ہو گئے موصوف۔ ٹریلی ایس کے اسماعیل کی دھنک کچھ زیادہ لمبی ہوگئی تھی جو ہمیں تو بہت بور کر گئی۔ رضوان تنولی کریزوی اپنا نام اتنا مشکل تو مت رکھیں۔ اے اے شام والے حضرت ذرا اپنا اصل نام تو ظاہر کریں۔ عابد خان بلوچ کی آمد اچھی لگی۔ ڈاکٹر محمد منیر مرزا افسوس آپ کی شعر والی بات پر۔ آمنہ پٹھانی ہمارا خط پسند کرنے کا شکریہ۔ اے جے کسانہ ابھی کتنا قیام ہے جیل میں؟ کیا واقعی کچھ جرم کیا تھا؟ یا ویسے ہی ناانصافی کی چکی میں پس گئے؟ نوشی چودھری صاحبہ، اپنا پورا ایڈریس تو بتائیں۔ کبھی حافظ آباد ساتھ لکھتی ہیں تو کبھی (اب کی بار) سیالکوٹ ساتھ لکھا۔ آپ میرے اول نمبر خط کی دعا کرتی ہیں تو ہمیں بھی جواباً دعا کرنی پڑتی ہے کہ آپ بھی ٹاپ پر آجائیں۔ دل آویز ڈیئر اسی نوں ...جتے ہو۔ جی آیاں نوں۔ قاری عبدالماجد اشرفی اس بار آپ کا مختصر خط اچھا لگا۔ بدست زندہ میں پیچ کم اور مبالغہ آرائی زیادہ تھی۔ معاشرے کی کھوکھلی تصویر کی نمائش تو تھی مگر کسی حد تک۔ پرواز بار درمیانے درجے کی تھی۔ شاہ خاور کے ستارے گردش میں ہیں جبکہ چودھری عزیز کے دن زیادہ برے آ گئے۔ گرداب اس بار بہت بور کی گئی کہ پہلی قسط کا مزہ بھی کرکرا ہو گیا۔ سرورق کا پہلا رنگ مثلث میں بھی ڈرامائی انداز زیادہ تھا۔ حقیقت سے کافی دور۔ دوسرا رنگ رخ تقدیر بہت پسند آئی۔ جابر خان کا کردار نمایاں تھا۔ مختصر طرز کی کہانیوں میں سبھی رانگاں اور کھیل زیادہ پسند آئیں (خطا ور کرکے)۔''

ملتان سے محمد سلیم شبلی کی خرابی طبیعت کے سلسلے میں التماس ''اگست کے شمارے کے لیے تبصرہ حاضر ہے۔ ارے واہ عبدالسلام صدیقی صاحب آپ نے تو آتے ہی کمال کر دیا۔ ہم کرسی صدارت کی مبارک باد نہیں دیں گے۔ ہم بھی آپ کے برابر کے حق دار ہیں۔ ہم واقعی کرسی ... سے انجوائے کر رہے ہیں آپ بھی ہمارے ساتھ شامل ہو جائیں نا۔ پھر حمزہ آئے کا ٹریلی ایس کے اسماعیل صاحب اب آپ کی طبیعت کیسی ہے اور یہ جو آپ کے خطوط پر کافی تنقید کرتے ہیں، آپ ان کی باتوں میں نہ آیا کریں۔ یہ لوگ آپ کی کامیابی سے جلتے ہیں۔ خود سے کچھ ہوتا نہیں، دوسروں پر تنقید کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہیں۔ یہ جمہوریت کا دور ہے، جس میں ہر کسی کو اپنے خیالات، جذبات، احساسات ادا کرنے کی مکمل آزادی ہے۔ بلیک زیرو صاحب، آپ عرش سے فرش پر کیسے پہنچ گئے۔ نوشی چودھری صاحبہ آپ اتنا اچھا تبصرہ کیسے کر لیتی ہیں۔ دل آویز آپ کو دل کی گہرائیوں سے خوش آمدید۔ لگتا ہے آپ دل کی بہت اچھی ہیں۔ اتنا تبصرہ ہی بہت ہے، اب کچھ کہانیوں کی طرف۔ پرواز میں خاور صاحب اتنی زیادہ بھاگ دوڑ سے تھک گئے ہوں گے۔ ...بلقیس اب بیگم بلقیس کی ٹھنڈی چھاؤں میں آ جانا چاہیے۔ گرداب میں شہریار اور ماہ بانو کا تعلق بنتا نظر آ رہا ہے۔ دونوں رنگ درمیانے درجے کے تھے۔ باقی کہانیاں زیر مطالعہ ہیں کیونکہ میری طبیعت ایک ہفتے سے خراب ہے۔ ڈاکٹر تنویر عباس تابش صاحب کوئی اچھا سا نسخہ جلدی سے بھجوا دیں تاکہ اگلے ماہ کے لیے بروقت تبصرہ کر سکیں۔''

ایم افضال ذوالفقار سرگودھا سے گزارش کرتے ہیں ''اس دفعہ جاسوسی ڈائجسٹ حسب معمول 5 اگست کو ملا۔ سب سے پہلے ٹائٹل پر نظر ڈالی تو وہ جاسوسی سے بھرپور لگا۔ اس کے بعد چٹکی، بلکہ چٹھی میں انٹری دی۔ کرسی صدارت پر عبدالسلام صدیقی کو براجمان پایا۔ مبارکاں جی مبارکاں۔ اس کے بعد اس محفل میں اپنا خط نہ پا کر سخت مایوسی ہوئی۔ ٹریلی ایس کے اسماعیل کو اللہ صحت کاملہ عطا فرمائے، آمین۔ محمد مغل جی ہمت نہ ہارنا، انشاء اللہ جلد ہی آپ کرسی صدارت پر چمکتی نظر آئیں گی۔ خیر، باقی دوستوں کے تبصرے بھی شاندار تھے۔ سب سے پہلے اپنے محبوب رائٹر طاہر جاوید مغل کی پرواز پڑھی۔ مغل صاحب کیا کمال کا کر دیا۔ شہوار کے ساتھ بے چاری ثمینہ کو بھی اوپر پہنچا دیا۔ مغل صاحب پلیز کہانی کو اسی رفتار سے آگے بڑھائیے گا۔ اس کے بعد گرداب میں انٹری دی تو اسما قادری کی دل کش کاوش پڑھی۔ اسماجی، پلیز زیادہ لمبا نہ کرنا اس ناول کو، آپ کی مہربانی ہوگی۔ بعد ازاں محی الدین نواب کی بدست زندہ زیر نظر آئی۔ ...صاحب مبارک ہو آپ کی اچھی کہانی لکھنے پر خصوصاً میری طرف سے۔ اس کے بعد جل پری میں مرزا ظفر بیگ سے ملاقات ہوئی۔ رابرٹس بے چارہ آخر ہاتھ ملتا ہی رہ گیا۔ خیر، اچھی کہانی تھی۔ اس کے بعد ظفر سعید یوسفی کی انمول پڑھی۔ یوسفی صاحب میرے تمام دوستوں کی طرف سے مبارک ہو۔ اس کے بعد رضوانہ منظر کی لٹیرے پڑھی۔ نام کا کردار کافی زبردست تھا۔ باقی ڈائجسٹ 23 اگست کے بعد پڑھیں گے کیونکہ 23 تاریخ کو نہم کی ٹیسٹ ہے لہٰذا اس کی تیاری میں مصروف ہیں۔ تمام قارئین سے گزارش ہے کہ دعا فرمائیے گا۔''

سرفراز چودھری، تحصیل جتوئی سے ''مکمل تبصرے کے ساتھ'' اگست کا عکس ٹائٹل سے جھلک رہا تھا۔ ٹائٹل گرل کے چہرے کا اطمینان اور معنی خیز مسکراہٹ قابل فہم تھی۔ ظاہر ہے جب ایک پستول بردار شخص حفاظت کے لیے ہو تو ٹینشن کس چیز کی ہو سکتی ہے۔ معراج انکل آپ نے آزادی کے حوالے سے خوب لکھا ہے۔ آج کل کے خراب حالات کے پس منظر میں چند لوگوں کا یہ کہنا کہ پاکستان نے ہم کو آخر دیا ہی کیا ہے، بالکل بے معنی سا لگتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم نے آخر اتنے سالوں میں پاکستان کو کیا دیا ہے؟ ڈاکٹری اسٹینڈ والے عبدالسلام صدیقی زبردستی حیران کرنے کے چکر میں تھے۔ جناب! حیرانی ہمیں آپ کے پیٹ کا پانی ہونے سے ہے جو کہ خالصتاً زنانہ کام ہے۔ ایلی وے ڈھیروں مبارک باد ہیں قبول فرمائیں۔ محمد مغل صاحبہ ایہہ ذکر انکل کی کرم فرمائیاں ہیں کہ آپ کو صنف وجاہت پر خوفناک قسم کے جملے کسنے کا موقع ملتا ہے۔ ورنہ کہاں ''یہ منہ اور مسور کی دال''۔ آمنہ پٹھانی اتنا پیارا تبصرہ لکھنے کے بعد اتنا سوسو، ساتبصرہ کچھ جچا نہیں ہے۔ نوشی چودھری ہم آپ کی طرح کوئی جن بھوت تھوڑی ہیں جو محفل سے غائب ہو جاتے ہیں، ارے بابا! کچھ گھریلو مصروفیات ہوتی ہیں اور بس... سمعیہ سندھو برا ہو آپ کی امریکی طبیعت کا جس کے زیراثر آپ کو ایلیاں جیلی، بکتہ گیگی جن بھوت اور چڑیلیں نظر آ رہے تھے۔ محفل کی رونق بڑھانے کے خواہاں کبیر عباسی صاحب کا مرچ مسالے دار تبصرہ اچھا لگا۔ ٹریلی ایس کے اسماعیل اپنے بارے میں بھی خیال ہے کہ کوئی ہم سا ہو تو سامنے آئے۔ میرے ڈی سیال صاحب ادویتی کب کی ختم ہو چکی ہے۔ اب محفل پر سیالوں کے بجائے چودھریوں نے جھنڈے گاڑنے ہیں۔ مغل صاحب کی پرواز بڑی ٹاپ ٹاپ جاری ہے۔ شاہ خاور اگرچہ شہوار کے قاتلوں یعنی چودھری عزیز وغیرہ تک جا پہنچا ہے۔ اس سب کے باوجود خاور کے لیے اپنی بے گناہی ثابت کرنا آسان نہیں ہوگا۔ اسما قادری صاحبہ گرداب کو بڑے پروفیشنل انداز میں آگے بڑھا رہی ہیں۔ ہر سطر، جملے اور پیراگراف پر ان کی گرفت مضبوطی سے قائم ہے۔ امید کرتے ہیں جاسوسی کی روایات کے عین مطابق یہ سلسلہ بھی مقبولیت کی بلندیوں کو چھوئے گا۔ محی الدین نواب صاحب ابتدائی صفحات پر بدست زندہ کے ساتھ جلوہ افروز تھے۔ دولت کے بل پر خود کو فرعون سمجھنے والے جب مکافات عمل کی زد پر آتے ہیں تو عبرت کا نشان بن جاتے ہیں۔ پہلا رنگ مثلث قتل کی تفتیش پر مبنی تھا۔ انسپکٹر اسد نے روایتی کے بجائے غیر روایتی طریقۂ تفتیش اپنایا اور اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ دوسرا رنگ رخ تقدیر غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل نوجوان کے گرد گھومتی تحریر تھی۔ سلیم فاروقی صاحب نے عامر کے کردار کو کچھ زیادہ ہی بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ منزل کے قریب پہنچ کر ناکامی کا کڑوا گھونٹ کوئی نہیں پینا چاہتا۔ سبھی رانگاں اسی پس منظر کو لیے ہوئے تھی۔ کاشف زبیر صاحب کی تحریر سفید ہاتھی کے اتار چڑھاؤ سے خاصے محظوظ ہوئے۔ بکری کی سادہ سی تجویز نے آخر کار مسئلے کا حل نکالا۔ احمد صغیر صدیقی کی کھیل مبہم انداز لیے ہوئے تھی۔ اختتام کہیں تین چار مرتبہ پڑھنے کے بعد کچھ سمجھ میں آیا۔ جل پری ناکامیوں پر مبنی تحریر تھی۔ رابرٹس محبت کے حصول میں ناکام رہا تو ناراس دولت کے حصول میں۔ لٹیرے میں نام کی منصوبہ بندی کے آگے میک کی ساری منصوبہ بندی دھری کی دھری رہ گئی۔ ایک چھوٹے سے پوائنٹ نے تحریر کا رخ بدل ڈالا۔ تحفے کی قدر و قیمت پیسے سے نہیں بلکہ دینے والے کی نیت اور خلوص سے ہوتی ہے۔ اسی تاثر کو اجاگر کرتی انمول ایک اچھی تحریر تھی۔ ہم پیشہ بس ٹھیک ہی تھی کیونکہ اس تحریر میں کوئی نئی بات تھی ہی نہیں۔''

عبدالسلام صدیقی، ملتان سے سوال و جواب و تنقید کے ساتھ ''سرورق تو اس بار ایک انار سو بیمار کی تصویر پیش کر رہا تھا۔ ایک بیمار نشانہ بازی کی مشق سے اور دوسرا عقابوں کی سی بیچری سے انار کو مرعوب کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ محمد مغل جی میرا تو مشورہ ہے کہ اب صدارت پر آنے کی دعا کریں ... ہم تو صدارت پر ... جس کے ایڈیٹر صاحب کو ترس آ ہی گیا۔ بدست زندہ، نواب صاحب آپ کی کہانی تو خود ... جل پری ... شروع سے محسوس ہوتی تھی کہ ... رابرٹس نے ... کا انکار کیا۔ انمول، تحفہ دیا جاتا ہے، چاہے کیسا بھی ہو، ... یہ تحفہ قبول کر لینا چاہیے بکرے کے پائے کیوں نہ ہوں (اس زمانے میں پائے سب سے سستے ہیں) لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہم تحفہ دے کر امید رکھتے ہیں کہ ہمیں جواباً اس سے بہتر تحفہ ملے گا۔ پرواز، مغل صاحب خون سرخ کلر کا ہوتا ہے جو اندھیرے میں چمکتا ہے آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اندھیرے کی وجہ سے خون نظر نہیں آیا۔ سبھی رانگاں، ایسے لوگوں کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ سفید ہاتھی، ماہرین تو چیونٹی کا گروپ تھا مارونٹ کیر تو احمقوں کا ٹولہ تھا جن کے ہاتھ آخر تک مرغی نہیں آیا۔ گرداب، ماہ بانو تو نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ کھیل، یہ ہے مغربی خاندان جہاں میاں بیوی کے درمیان اتنی نفرت ہوتی ہے کہ بچے کسی ایک کو قتل کر کے سمجھتے ہیں کہ ہم دوسرے کو سرپرائز دے رہے ہیں۔ مثلث ایک دم بے کار تھی۔ رحمت، جس کے بے وقوفانہ تکیہ کلام سے آدھا صفحہ بھر دیا اور آخر میں سارے تکیہ کلام بھول گیا۔ فریدہ، جس پر پہلا شک جاتا تھا اسے نظر انداز کر دیا گیا۔ بشریٰ جو کسی صورت میں مجرم نہیں ہو سکتی کیونکہ جہاں چوری ہوتی ہے وہاں سینہ زوری بھی ہوتی ہے اور حسام بٹ صاحب آپ تو مرزا اور ملک صاحب کی کہانیاں لکھتے ہیں، آپ سے ایسی امید نہ تھی۔ رخ تقدیر، باقی سب تو ٹھیک تھا لیکن کھلکوں کی وجہ سے کچھ بے سکونی ہوئی۔ کچھ کہانیاں ایسی ہوتی ہیں جس کے انجام کا پہلے سے پتا لگ جاتا ہے جیسے لٹیرے اور ہم پیشہ۔''

ان قارئین کے نام جن کے نامے شامل بزم نہ ہو سکے۔ شعیب شیخ، لطیف آباد حیدرآباد۔ شاہینہ رفیع، کراچی۔ عصمت علی، سوات۔ ذیشان بدر منیر، نیو کشمیر ٹاؤن دینہ۔ مغل شاہ رخ خان، فتح جنگ اٹک۔ محمد عارف، ضلع گجرات۔ ناہید یوسف، کراچی۔ مہتاب خان، حیدرآباد۔ نصیر اختر، گوجرانوالہ۔ صدیق لودھی، جھنگ۔ زرین صبا، سکھر۔ محمد وسیم، ملتان۔ شکیل شاہ، ڈیرہ غازی خان۔ محمد برہان، کوئٹہ۔

انتباہ
جاسوسی ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔
کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے
تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بہ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

www.pkdigest.com

روپ بہروپ

اثر نعمانی

طبیعت میں باغ و بہار اور شخصیت میں ہمہ گیریت بہت کم لوگوں کا خاصہ ہوتی ہے جو افراد ان خوبیوں کے مالک ہوں..... ان کے گرد پرستاروں کا ایک جم غفیر ہوتا ہے..... اثر نعمانی کے کہنہ مشق قلم سے جنم لینے والی ایک ہنستی مسکراتی تحریر..... جس کی ایک ایک سطر میں مزاح اور تجسس کا ملاپ آپ کو کہانی پڑھنے پر مجبور کردے گا۔

محبت کی بازی میں ہر شخص چاہتا ہے کہ اسی کی فتح ہو ہار و جیت کے سنسنی خیز کھیل کی جھلکیاں

خان بہادر ولی محمد خان کی اکلوتی بیٹی نرگس شاپنگ کرنے ان کے پی اے اختر کے ساتھ شہر آئی تھی۔ پکچر دیکھنے کی وجہ سے واپسی میں تاخیر ہوگئی تھی، اختر گھبرا رہا تھا کہ اب ڈانٹ پڑے گی۔ نرگس اسے تسلی دے رہی تھی۔

''آپ سے بھی حد ہے۔'' وہ بولی۔ ''کہہ رہی ہوں کہ میں ابا جان کو جواب دے دوں گی مگر آپ ہیں کہ سہمے جارہے ہیں۔ آپ کو تو لڑکی ہونا چاہیے تھا، اللہ میاں نے پتا نہیں مرد کیوں بنادیا۔''

''سوائے اس کے کیا کہا جاسکتا ہے کہ فرشتوں سے غلطی ہوگئی۔'' اختر نے جواب دیا۔

''اپنی کمزوری کے لیے فرشتوں کو الزام نہ دیجیے۔'' نرگس نے کہا۔ ''کسی فرشتے نے نہیں کہا ہے کہ آپ دوسروں کی ہر ناجائز بات محض اس لیے سر جھکا کر سن لیں کہ اتفاق سے آپ اس کے ملازم ہیں۔ اصولاً تو آپ کو اس پر بھی اعتراض ہونا چاہیے کہ آپ سے دس بارہ گھنٹے کام لیا جاتا ہے اور وہ کام بھی آپ کے ذمے ڈال دیے جاتے ہیں جو ہرگز آپ کے فرائض میں شامل نہیں۔''

''مثلاً آپ کو شاپنگ کے لیے شہر لانا اور لے جانا۔'' اختر نے کچھ مسکراتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں، بالکل۔'' نرگس نے شرمندہ ہوئے بغیر جواب دیا۔ ''مجھے حیرت ہے کہ آپ ابا جان کی ایسی ایسی باتیں برداشت کرلیتے ہیں جنہیں کوئی غیرت مند انسان ایک لمحے کے لیے گوارا نہیں کرسکتا۔ آپ کی جگہ میں ہوتی تو اب تک دس مرتبہ ملازمت چھوڑ کر جاچکی ہوتی۔ مگر آپ تو پلٹ کر جواب بھی نہیں دیتے۔''

''بات تو یہی ہے نرگس صاحبہ کہ آپ میری جگہ نہیں ہیں۔'' اختر کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔ ''اگر ہوتیں تو شاید ایک مجبور انسان میں غیرت و حمیت تلاش نہ کرتیں۔ آج کل آدمی ان اعلیٰ صفات کے لیے نہیں، پیٹ کے لیے لڑتا ہے۔ مجھے بتائیے کتنے لوگ ہیں جن کے کندھوں پر سات افراد کے خاندان کی کفالت کا بوجھ ہو۔ جو مہینے بھر کی محنت شاقہ کا معاوضہ پانچ ہزار پاتے ہوں اور پھر بھی غیرت و حمیت کے بارے میں سوچ لیتے ہوں۔''

کار نرگس ڈرائیو کررہی تھی۔ ایکسلریٹر پر اس کے پیر کا دباؤ بڑھتا ہی جارہا تھا کہ اچانک اس نے دیکھا کہ دو تین فرلانگ آگے ایک نوجوان دونوں ہاتھ اٹھائے گزرتی گاڑیوں کو روکنے کی کوشش کررہا ہے۔ کچھ فاصلے پر ایک کار بھی کھڑی تھی، لگتا تھا کہ اس کی کار خراب ہوگئی ہے۔ نرگس نے رفتار آہستہ کی۔ قریب آنے پر اس نے دیکھا کہ وہ نوجوان صورت شکل سے وجیہہ، مہذب اور تعلیم یافتہ معلوم ہوتا ہے۔ نرگس نے کار روک لی۔

''کیا آپ کی کار خراب ہوگئی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''کار نہیں ہماری قسمت ہی کچھ خراب معلوم ہوتی ہے۔'' نوجوان نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ''آپ کے پاس کوئی فالتو ڈرائیور تو نہیں ہوگا؟''

''ڈرائیور۔'' نرگس نے تعجب سے پوچھا۔ ''آپ کا مطلب اسکرو ڈرائیور سے تو نہیں ہے؟''

''جی نہیں، ہمارا مطلب ڈرائیور سے ہی ہے۔ اگر کوئی

www.pkdigest.com

ہو تو دے دیجیے، شام نگر پہنچ کر واپس کر دیں گے۔"
"آپ کے اپنے ڈرائیور کا کیا ہوا؟" نرگس نے کچھ مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔
"اسے اسٹرائکوفوبیا ہو گیا ہے۔" نوجوان نے منہ بنایا۔ "آج کل محنت کشوں میں یہ چھوت کی بیماری بہت عام ہو گئی ہے۔ ہمارے ایک دوست مل اونر ہیں، بے چاروں نے بڑی کوشش کی۔ مزدوروں کو لائن میں کھڑا کر کے دھمکیوں کے ٹیکے لگوائے۔ اپنی نوازشوں کا مکسچر پلایا کہ آخر آپ لوگوں کو اس بیماری میں مبتلا ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم کم سے کم اتنی تنخواہ ضرور دیتے ہیں جس میں دو میاں بیوی اور چار بچے چنے چبا سکتے ہیں۔ علاج و معالجہ کے لیے سرکاری اسپتال موجود ہیں۔ تعلیم آج کل سیرت و اخلاق بگاڑنے کے سوا کیا کر رہی ہے جو آپ اس کے خواہش مند ہوں۔ رہا مکان کا معاملہ تو یقین کریں کہ ہم خود پانچ کوٹھیاں بنوا کر پچھتا رہے ہیں۔ بلدیہ اور محکمہ ٹیکسیشن والے آپ کی ساری تنخواہ لے جائیں گے۔ سال کے سال ہماری زکوٰۃ سے بونس آپ کو مل ہی جاتا ہے اس لیے ہمارا کہا مانیے اور..."
"معاف کیجیے۔" اختر بات کاٹ کر ترش لہجے میں بولا۔ "ہم ذرا جلدی میں ہیں، اس لیے مختصر طور پر بتائیں کہ آخر ہم آپ کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟"
"وہ ہی تو بتانے کی کوشش کر رہے ہیں۔" نوجوان نے جواب دیا۔ "اگر ہمیں گھر سے نکلتے وقت معلوم ہو جاتا کہ ہمارے ڈرائیور پر اسٹرائکوفوبیا کا دورہ پڑنے والا ہے تو بہ خدا ہم ہرگز باہر قدم نہ نکالتے۔ اب آپ ہی انصاف سے کہیے کہ یہ بھی کوئی معقولیت ہے کہ ٹھیک نصف راستے پر ڈرائیور صاحب فرمانے لگے کہ صاحب! اگر اگلے ماہ سے میری تنخواہ میں پانچ سو کا اضافہ کرنے کا وعدہ کریں تو میں آگے جاؤں گا ورنہ آپ جانیں اور آپ کی کار... میں یہیں اور اسی وقت اسٹرائک کرتا ہوں۔ بہت سمجھایا کہ بھائی ہڑتال کا نوٹس مہینا پندرہ دن پہلے نہیں تو چندرہ منٹ پہلے ضرور دینا چاہیے مگر ڈرائیور صاحب پر تو دورہ پڑ چکا تھا۔ کار کھڑی کر کے یہ جا وہ جا۔ اب بتائیے ہم کیا کریں؟"
"آپ کو کار چلانا نہیں آتی؟" نرگس نے جو اس گفتگو سے بہت محظوظ ہو رہی تھی، پوچھا۔
"پتا نہیں۔" نوجوان نے پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔ "ہم دیر سے یہی یاد کرنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر اعلیٰ حکام اور والیانِ ریاست کو خصوصی طور پر جو ہر بات بھول جانے کی ٹریننگ دی جاتی ہے اس نے ہماری یادداشت کا ستیاناس کر دیا ہے۔ کچھ یاد ہی نہیں آتا۔"

"والیانِ ریاست!" نرگس نے چونک کر نوجوان کی طرف دیکھا۔
"اوہ، ہم نے غالباً اب تک اپنا تعارف نہیں کرایا۔" نوجوان سینہ تان کر بولا۔ "ہم ہیں شہزادہ علی قلی خان آف ریاست ڈھیلا مار۔"
"جی۔" نرگس نے حیرت سے پوچھا۔
"دیکھیے یہ ہے ہمارے ملک میں خالص اردو کی قدر و قیمت۔" شہزادے نے کچھ ناگواری سے کہا۔ "ہم اپنی اسٹیٹ کا نام اسٹون بیٹ بتاتے تو آپ نہ صرف اپنا ڈرائیور بلکہ اپنی کار بھی پیش کر دیتیں۔"
"معاف کیجیے میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" نرگس جلدی سے بولی۔ "آپ شام نگر جا رہے ہیں نا؟"
"فی الحال تو یہاں کھڑے ہوئے ہیں۔" شہزادے نے سادگی سے کہا۔ "جب تک کوئی ڈرائیور یا ٹیکسی نہ مل جائے کیا کہا جا سکتا ہے۔"
"ڈرائیور تو میں پیش نہیں کر سکتی۔ البتہ آپ پسند فرمائیں تو ہمارے ساتھ چل سکتے ہیں۔ ہم بھی شام نگر ہی جا رہے ہیں۔"
"اور ہماری کار... اس کا کیا ہوگا؟"
"ظاہر ہے کار آپ کو یہیں لاک کر کے چھوڑنا پڑے گی۔"
"ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ ہماری کار میں شام نگر چلیں اور اپنی کار لاک کر کے یہاں چھوڑ جائیں۔"
"کیوں... کیا آپ کو خطرہ ہے کہ کوئی آپ کی کار چرا نہ لے؟" نرگس مسکرائی۔
"ہم تو نہیں مگر ہمارے ابا حضور... اس معاملے میں بڑے محتاط ہیں۔ ان کا قول ہے کہ اپنی بیوی اور کار بھی تنہا نہیں چھوڑنا چاہیے۔ مگر..... نئی نسل بزرگوں کی اتنی سی بھی پروا نہیں کرتی اس لیے ہم ضرور آپ کی کار میں ہی جائیں گے۔ فرمائیے، کہاں بیٹھیں؟"
نرگس نے ہاتھ بڑھا کر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔
"شکریہ۔" شہزادہ علی نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔
"اپنی کار لاک نہیں کریں گے؟"
"جی نہیں۔ ہم اس کم بخت کار سے عاجز آ چکے ہیں۔ دل سے چاہتے ہیں کہ کوئی اسے چرا کر لے جائے تاکہ ہم اپنی آئندہ برسی پر ابا حضور سے نئی کار کا مطالبہ کر سکیں۔"
"آپ کا مطلب غالباً سالگرہ سے ہے۔" نرگس نے کار بڑھاتے ہوئے کہا۔
"جی نہیں، سالگرہ ہماری ریاست میں کسی کے مرنے کے بعد منائی جاتی ہے۔" شہزادے نے بتایا۔ "اور یہ بھی

ہمارے ابا حضور کا کارنامہ ہے، وہ جو فاتحہ پر پلاؤ کھانے والا شعر ہے نا۔ وہ کہیں ابا حضور نے سن لیا۔ جوش میں آگئے کہ کوئی شاعر کا بچہ یہ نہیں بتا سکتا کہ اس کے مرنے کے بعد کیا ہو گا۔ اور اگر مرنے کے بعد یہ سچ بھی ہوتا ہے تو ہم اسے غلط ثابت کر دیں گے۔ آئندہ ریاست میں ہر شخص اپنی برسی اپنی زندگی میں منائے گا اور احباب کے ساتھ خود بھی پلاؤ کھایا کرے گا۔"
"اُفوہ۔" نرگس نے بے اختیار ہنستے ہوئے کہا۔ "خدا کے لیے بس کریں، ورنہ مجھ سے کوئی ایکسیڈنٹ ہو جائے گا۔"
"آپ آدمی تو دلچسپ معلوم ہوتے ہیں۔" اتنی دیر میں پہلی مرتبہ اختر کے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔
"ہمارا آپ سے ابھی تک تعارف نہیں ہوا ورنہ ہم آپ کو بتاتے کہ ہم فی الحال صرف شہزادے ہیں۔"
"تعارف میں کرائے دیتی ہوں۔" نرگس نے کہا۔ "یہ اختر صاحب ہیں اور میرا نام نرگس ہے۔ اگر آپ نے شام نگر کے خان بہادر ولی خان صاحب کا نام سنا ہے تو جان لیجیے کہ میں ان کی بیٹی ہوں اور اختر صاحب ان کے پی اے ہیں۔"
"آپ دونوں سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ اگرچہ ہمارے ابا حضور کا کہنا ہے کہ پہلی مرتبہ کسی سے مل کر خوشی کا اظہار نہیں کرنا چاہیے ورنہ لوگوں کو آپ کی مالی حیثیت کے بارے میں شبہ ہو سکتا ہے۔"
"وہ کیسے؟" نرگس نے پوچھا۔
"ابا حضور کا خیال ہے کہ جن کے پاس خوش ہونے کے لیے بینک میں لاکھوں کا بیلنس نہ ہو، وہ ایسی ہی معمولی باتوں پر خوشی کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔"
"ابھی آپ نے کہا کہ آپ فی الحال شہزادے ہیں۔" اختر کی بوریت بھی شہزادہ علی کی دلچسپ باتوں نے دور کر دی تھی۔ "تو کیا شہزادے آدمی نہیں ہوتے؟"
"جی نہیں۔ شہزادوں کی دوسری مصروفیات اتنی زیادہ ہوتی ہیں کہ انہیں آدمی بننے کا وقت بالکل نہیں ملتا۔"
"اچھا یہ تو بتائیے کہ آپ شام نگر کس سلسلے میں جا رہے ہیں؟" نرگس نے پوچھا۔
"عجیب بات ہے، آپ نے وہی سوال کیا جو آپ کی کار میں بیٹھنے کے بعد ہم اپنے آپ سے پوچھ رہے ہیں۔ یہ تو طے ہے کہ اگر ہم شام نگر جا رہے ہیں تو ضرور کسی نہ کسی سلسلے میں ہی جا رہے ہوں گے۔ ذرا ٹھہریے۔ یہ بتائیے آپ نے ہماری کار دیکھی تھی نا... اس کا رخ کراچی کی طرف تھا یا شام نگر کی جانب؟"
"شام نگر کی جانب۔"

"شرمندگی"

"کل فینسی ڈریس پارٹی میں میری آنٹی کو کافی شرمندگی اٹھانا پڑی۔"
"ایک خاتون نے ان سے فرمائش کی کہ وہ اپنا ماسک اتار دیں۔"
"تو اس میں شرمندگی کی کیا بات تھی؟"
"وہ ماسک پہنے ہوئے ہی نہیں تھیں۔"

"بجلی"

ایک صاحب نے گھبراہٹ میں ڈاکٹر کو فون کیا۔ "ڈاکٹر صاحب میرے بچے کو کرنٹ لگ گیا ہے، میں کیا کروں؟"
"سب سے پہلے شکرانے کے دو نفل پڑھیں کہ آپ کے گھر بجلی آ رہی ہے۔ میں گھپ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہوں۔"

"بس تو پھر ہم شام نگر ہی جا رہے تھے۔" شہزادے نے بڑے وثوق سے کہا۔ "مگر کیوں جا رہے تھے۔ آہا... دیکھیے یاد آگیا۔ وہاں کوئی وہی بڑے خان ہیں۔"
"وہی بڑے خان!" اختر کو ہنسی آگئی۔
"کچھ ایسا ہی نام ہے ان کا۔ سنا ہے شام نگر کے مشہور آدمی ہیں اور گھوڑے بھگاتے ہیں۔"
"کہیں آپ اکبر خان صاحب کے بارے میں تو نہیں کہہ رہے ہیں؟" نرگس نے چونک کر پوچھا۔
"لاحول ولاقوۃ... تو ان کا نام اکبر خان ہے۔" شہزادے نے کہا۔
"مگر آپ ان کے پاس کیوں جا رہے ہیں؟"
"ہم نے کب کہا کہ ہم ان کے پاس جا رہے ہیں۔" شہزادہ سادگی سے بولا۔ "ان کے بارے میں تو اس لیے پوچھا تھا کہ ان کے حوالے سے کوئی پیر خان صاحب ہیں، ان کا پتا معلوم کریں۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ یہ پیر صاحب گھوڑوں کے علاوہ خان بہادری کا کاروبار بھی کرتے ہیں۔"
اختر نے چونک کر نرگس کی طرف دیکھا مگر نرگس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔
"آپ ان کا پتا کیوں پوچھ رہے ہیں؟" اس نے دریافت کیا۔
"آج وہاں گھوڑوں کی دعوت ہے جس میں ہمیں بھی مدعو کیا گیا ہے۔" شہزادے نے جواب دیا۔

☆☆☆

خان بہادر ولی محمد خان کے آباؤ اجداد ایک زمانے میں شام نگر کے سب سے بڑے جاگیردار سمجھے جاتے تھے لیکن ان

www.pkdigest.com

کے والد علی محمد خان کو ریس کا ایسا چسکا لگا کہ نصف سے زیادہ جائداد اسی شوق میں ختم کردی۔ ولی محمد خان باپ سے بھی آگے بڑھ گئے۔ انہوں نے خود ریس کے گھوڑے تربیت دے کر دوڑانا شروع کردیے۔ رہی سہی جائداد بھی ختم ہوتی رہی، اب صرف کراچی میں ایک کوٹھی اور شام نگر کے اصطبل کے علاوہ تھوڑی سی زمین باقی تھی۔ آج کل خان بہادر صاحب اپنی تمام امیدیں برق رفتار گھوڑے سے وابستہ کیے ہوئے تھے جس کے بارے میں ریس کے ماہرین بھی بہت اچھی رائے رکھتے تھے۔ اس بارے میں اگر ان کا کوئی حریف تھا تو شام نگر ہی کا ایک دلال اکبر خان تھا جو ریس کی شرطوں کی دلالی کرتے کرتے ایک گھوڑے کا مالک بن بیٹھا تھا۔ گھوڑے کا نام اس نے طوفان رکھا تھا اور اس طوفان نے ایک دو ریسیں جیت کر طوفان بھی مچا دیا تھا۔ آئندہ ہفتے ہونے والی ریس میں برق رفتار اور طوفان دونوں گھوڑے شامل تھے۔ خان بہادر برق رفتار کی تیز رفتاری کا مشاہدہ کرانے کے لیے اکثر دعوتیں کرتے رہتے تھے جس میں ریس کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والوں کو مدعو کیا جاتا تھا۔ برق رفتار اتنی بہترین فارم میں تھا کہ ان دعوتوں میں جیتنے والے تمام گھوڑوں سے زیادہ تیز رفتاری کا مظاہرہ کیا کرتا تھا۔

اصطبل کا پورا عملہ ٹرینر شمشاد، جوکی اکرم، سائیس اللہ دتہ اور چوکیدار عاقل خان پر مشتمل تھا۔ خاص اصطبل کے سامنے ایک وسیع میدان تھا جس میں برق رفتار کو تربیت بھی دی جاتی تھی اور دوڑ کا مظاہرہ بھی کرایا جاتا تھا۔ اس میدان کے دو چکر ایک میل کے برابر رکھے گئے تھے۔ سائیس اللہ دتہ کو چھوڑ کر جس نے پہلی بیوی کے مرنے پر ایک دو ماہ قبل ہی دوسری شادی کی تھی، کسی اور کو عورتیں یا بچے اصطبل میں لانے کی اجازت نہیں تھی اور اللہ دتہ کو بھی یہ رعایت اس لیے دی گئی تھی کہ اس کی بیوی پورے عملے کا کھانا پکاتی تھی۔ اللہ دتہ کی عمر پچاس پچپن سے کم نہیں تھی اور اسی اعتبار سے اس کی مرحوم بیوی بھی چالیس سال سے زیادہ ہی تھی اور سب کے سامنے آتی تھی مگر جب سے یہ نئی نویلی دلہن آئی تھی، کسی نے اسے ایک فٹ لمبے گھونگھٹ کے بغیر نہیں دیکھا تھا اور یہ افواہ سچ ہی معلوم ہوتی تھی کہ اللہ دتہ نے بڑھاپے میں بیس بائیس سالہ نوجوان لڑکی سے شادی کی ہے۔

خان بہادر صاحب کا قیام عموماً کوٹھی میں رہتا تھا جس کا ایک حصہ انہوں نے کرائے پر اٹھا دیا تھا... اور دوسرے حصے میں اپنی اکلوتی بیٹی نرگس، دو ملازماؤں اور اپنے پی اے اختر کے ساتھ رہتے تھے۔ ریس کے زمانے میں وہ شام نگر چلے آتے تھے اور ریس ختم ہونے تک یہیں رہتے تھے۔ بیشتر دعوتیں بھی یہیں دی جاتی تھیں۔ اختر اور نرگس کو واقعی بہت دیر ہوگئی تھی۔ خان بہادر صاحب اپنے درجن بھر مہمانوں کے خیال سے خاموش تھے۔ مگر دل ہی دل میں اس قدر کھول رہے تھے کہ دعوت نہ ہوتی یا انہوں نے کار سے پہلے شہزادہ علی کو اترتے نہ دیکھ لیا ہوتا تو آج دونوں کی خیریت نہیں تھی۔ شہزادہ علی سے ان کی پہلی ملاقات گزشتہ ہفتے ڈپٹی کمشنر صاحب کے عصرانے میں ہوئی تھی اور وہ ریس نیز ریس کے گھوڑوں کے بارے میں اس کی وسیع معلومات سے اتنے متاثر ہوئے تھے کہ وہیں پر آج کی پارٹی کا دعوت نامہ دے دیا تھا۔

اختر اور نرگس خان بہادر صاحب کے غصے سے اتنے سہمے ہوئے تھے کہ دونوں میں سے کسی نے کار سے اترنے میں پہل نہیں کی اس لیے لامحالہ اترنے والوں میں پہلا نمبر شہزادہ علی کا رہا اور خان بہادر اسے دیکھتے ہی چہرے پر چھلکے ہوئے غصے کو سمیٹ کر اتنی تیزی سے شہزادے کی طرف لپکے کہ اختر یہی سمجھا کہ آگئی شہزادہ صاحب کی شامت... اور اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کرلیں مگر اس کے کانوں نے جو کچھ سنا، وہ کچھ اور ہی تھا۔

"ارے بھئی شہزادہ صاحب!" خان بہادر نے کوئلی آواز میں کہا۔ "کمال ہے... آپ چھپے چھپے رہتے ہیں؟"

"ہم تو جھ سے بھی پہلے پہنچ جاتے۔" شہزادے نے جواب دیا۔ "مگر کم بخت ڈرائیور کو عین راستے میں اسٹرانگوفوبیا کا دورہ پڑ گیا۔ اگر یہ شریف لوگ نہ مل جاتے تو ہم شاید اس وقت بھی وہیں بیچ سڑک پر کھڑے انگوٹھا دکھا رہے ہوتے۔"

اختر نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ خان بہادر صاحب شہزادے کا ہاتھ پکڑے بڑا زوردار مصافحہ کررہے تھے۔ اس نے جلدی سے نرگس کی طرف دیکھا۔ وہ شوخ آنکھوں سے مسکرا رہی تھی۔

"چلیے اتریے۔" وہ آہستہ سے بولی۔ "جان بچ گئی۔"

"شریف لوگ۔" خان بہادر نے گھوم کر نرگس اور اختر کی طرف دیکھا۔ "تم دونوں کہاں رہ گئے تھے؟"

"وہ... شہزادے صاحب کے ڈرائیور کو اسٹرانگوفوبیا کا دورہ پڑ گیا تھا نا۔" نرگس نے جلدی سے کہا۔ "تو اسے اسپتال چھوڑنے گئے تھے۔" اس نے شہزادے کی طرف التجا آمیز نظروں سے دیکھا۔

"جی ہاں، بالکل... بالکل۔" شہزادے نے گردن ہلائی۔ "آپ ان لوگوں کو کیسے جانتے ہیں خان بہادر صاحب؟"

"تو کیا نرگس نے آپ کو نہیں بتایا؟"

"کیا نہیں بتایا؟" شہزادے نے تعجب سے پوچھا۔

"بتایا تو تھا اباجان۔" نرگس نے اباجان پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"یہ میری بیٹی ہے نرگس۔" خان بہادر صاحب بولے۔

"مگر انہوں نے تو کہا تھا کہ یہ کسی خان بہادر ولی محمد خان صاحب کی صاحبزادی ہیں۔" شہزادے نے سادگی سے کہا۔ اب حیرت میں آنے کی باری خان بہادر صاحب کی تھی۔

"تو اور میں کون ہوں؟" انہوں نے آہستہ سے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ۔ ہمیں آپ کا نام خان بہادر پیر محمد خان یاد آرہا تھا۔" شہزادے نے ایک شرمندہ مسکراہٹ سے جواب دیا۔ "اس دعوت میں آپ سے پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی تھی اور ڈپٹی کمشنر صاحب اپنے مہمانوں سے اخلاق اور سیاست پر گفتگو فرما رہے تھے چنانچہ ہم آپ کا نام ٹھیک سے سن نہیں سکے تھے۔"

"کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں۔" خان بہادر صاحب نے ایک زلزلہ آمیز قہقہہ لگاتے ہوئے کہا اور شہزادے کا بازو پکڑ کر میدان کی طرف چل دیے۔ "باتیں کرنے کا وقت بالکل نہیں ہے۔ برق رفتار کی دوڑ شروع ہونے ہی والی ہے۔ آپ اسے دیکھ کر بتائیں کہ آئندہ ریس میں اس کے اول آنے کے کیا امکانات ہیں۔"

نرگس بھی ان کے پیچھے چل دی اور اختر کار کو گیراج کی طرف لے گیا۔ جیسے ہی خان بہادر صاحب پہنچے، ٹرینر شمشاد نے اشارہ کیا۔ اصطبل کا دروازہ کھلا۔ ایک سفید براق عربی النسل گھوڑا اس طرح بے تابانہ اچھلتا کودتا باہر نکلا جیسے اس کے ایک ایک عضو میں بجلیاں بھر دی گئی ہیں۔ جوکی اکرم سبز رنگ کی قمیص پر سرخ ٹوپی پہنے زین پر مضبوطی سے جما بیٹھا تھا مگر صاف ظاہر ہورہا تھا کہ گھوڑے کو قابو میں رکھنے کے لیے اسے خاصی کوشش کرنا پڑ رہی ہے۔ اصطبل سے نکل کر برق رفتار میدان میں ایک سفید لکیر تک آیا۔ شمشاد نے گھڑی دیکھی، چند سیکنڈ سکوت کیا پھر اس کا سفید رومال پکڑا... ہوا ہاتھ ایک جھٹکے سے نیچے آیا۔ برق رفتار نے بجلی کی طرح چمک کر ایک جست لگائی اور دوڑنا شروع کردیا۔ مہمانوں میں سب ہی کے ہاتھوں میں دوربینیں نظر آرہی تھیں۔ خان بہادر صاحب نے شہزادے کی طرف دیکھا اور اسے خالی ہاتھ دیکھ کر قریب کھڑے شمشاد سے دوربین لے کر اسے پکڑا دی۔

برق رفتار واقعی برق رفتار معلوم ہورہا تھا۔ اسے دس چکر یعنی پانچ میل پورے کرنا تھے اور یہ اس نے تین منٹ

تصوف

سفیرانِ حرم	(ملک آصف)	(جاری ہے)	250/-
صاحب کرامات	(4 حصے مکمل)		250/- فی حصہ
سوانح انبیاء	(شیلا تسنیم بلگرامی)	2 حصے	250/- فی حصہ
روشنی کے مینار	(شیلا تسنیم بلگرامی)		250/-
عظمت کے مینار	(شیلا تسنیم بلگرامی)		250/-
پراسرار بندے	(شیلا تسنیم بلگرامی)		250/-
نبوت کے جھوٹے دعوے دار	(شیلا تسنیم بلگرامی)		250/- فی حصہ
احوالِ اولیا	(ڈاکٹر ساجد امجد)	(اولیائے کرام کی سوانح حیات)	250/-
خاصانِ خدا	(ڈاکٹر ساجد امجد)	(اولیائے کرام کی سوانح حیات)	250/-
سفرِ آخرت	(محمد فاروق قادری)		50/-
حکایات اولیاء (1)(2)	(شیلا تسنیم بلگرامی)		30/- فی حصہ

سسپنس ڈائجسٹ کے سلسلے

دیوتا	50 حصے (جاری ہے)	75/- فی حصہ
طاغوت	3 حصے (مکمل)	75/- فی حصہ
موت کے سوداگر	18 حصے (جاری ہے)	75/- فی حصہ
فرعون	2 حصے (مکمل)	75/- فی حصہ

جاسوسی ڈائجسٹ کے سلسلے

گمراہ	8 حصے (مکمل)	75/- فی حصہ
مغرور	6 حصے (مکمل)	75/- فی حصہ
صدیوں کا بیٹا	5 حصے (مکمل)	75/- فی حصہ
شکاری	20 حصے (مکمل)	75/- فی حصہ
مجاہد	11 حصے (مکمل)	75/- فی حصہ
آتش فشاں	13 حصے (مکمل)	75/- فی حصہ

سب رنگ ڈائجسٹ کے سلسلے

بازی گر	7 حصے (جاری ہے)	75/- فی حصہ
انکا	2 حصے (مکمل)	75/- فی حصہ
[illegible]	2 حصے (مکمل)	75/- فی حصہ
سورج کہکشاں کا پجاری	(مکمل)	60/- فی حصہ
[illegible]	(مکمل)	60/- فی حصہ

دیگر ڈائجسٹوں کے سلسلے

چھلاوا	صبیحہ بانو	(مکمل)	600/-
جال	صبیحہ بانو	(مکمل)	75/-
ہمزاد	شمیم نوید	(مکمل)	75/-
شاطر (1)(2)	سنڈے میگزین کا سلسلہ (مکمل)		75/- فی حصہ
نک ویلوٹ کی چوریاں	2 حصے (مکمل)		75/- فی حصہ
انعام یافتہ کہانیاں	ڈائجسٹوں کی بہترین کہانیاں		60/-
چارلس سوبھراج کی سرگزشت			60/-
کالی کہانیاں	اے ایس صدیقی		60/-
بہترین کہانیاں	اے ایس صدیقی		75/-
شیطان صفت	مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ		75/-
سبز قدم	مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ		75/-
اسیر ہوس			75/-
دست انتقام			75/-
ماورائی لوگ			75/-
کشتہ سیاست			75/-

کتابیات پبلی کیشنز

پوسٹ بکس 23 کراچی 74200

فون: 021-5804300 tabiat1970@yahoo.com

63-C

چالیس سیکنڈ میں پورے کر لیے۔ مہمانوں کے منہ سے کلمۂ تحسین بلند ہوا اور خان بہادر کا سینہ فخر سے یوں تن گیا جیسے برق رفتار کے بجائے وہ خود ہی دوڑتے رہے ہوں۔

☆☆☆

خان بہادر صاحب ٹریبز شمشاد کے ساتھ شہر گئے ہوئے تھے۔ گورنرز کپ ریس جس میں برق رفتار کو دوڑنا تھا، ایک دن بعد ہونے والی تھی۔ ریس کلب کے کچھ خصوصی انتظامات پر گفتگو کرنے کے لیے گھوڑوں کے مالکان اور کلب کی انتظامیہ کا اجلاس ہو رہا تھا جس میں خان بہادر کی شرکت ضروری تھی۔ ان کی موجودگی میں اصطبل کے عملے کے کسی فرد کو بے راہ روی کی اجازت نہیں تھی۔ اس لیے وہ کچھ دیر کے لیے بھی کہیں جاتے تو جوکی اکرم کو ایک آدھ گھونٹ پینے کا موقع مل جاتا تھا اور آج کے لیے تو طے تھا کہ خان بہادر صاحب رات تک واپس آنے والے نہیں۔ سائیس اللہ دتہ گھوڑے کی مالش کر رہا تھا۔ اکرم اپنے کوارٹر سے شراب کی بوتل بغل میں دبائے باہر نکلا۔ اللہ دتہ کے کوارٹر سے گزرتے ہوئے اس کی نظر کھلی کھڑکی سے اندر گئی۔ اللہ دتہ کی نوجوان بیوی اس وقت گھونگھٹ سے بے نیاز چولھے کے سامنے بیٹھی روٹی پکا رہی تھی۔ آگ کے سرخ شعلوں کی روشنی میں اس کا دمکتا چہرہ دیکھ کر اکرم کے قدموں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ آس پاس کوئی بھی نہیں تھا۔ اکرم دبے پاؤں کوارٹر میں داخل ہو گیا۔ دلہن نے چونک کر اکرم کی طرف دیکھا اور جھپٹ کر برابر کی پیڑھی سے چادر اٹھا کر سر پر ڈال لی۔ اکرم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''میں جانتا ہوں یہ خوب صورت ہاتھ اپنی خوشی سے اللہ دتہ کے گلے کا ہار نہیں بنے ہوں گے۔'' وہ بولا۔ ''مگر جب سماج نے تمہارے دل کی آواز نہیں سنی تو تمہیں اس کے ڈر سے اپنے ارمانوں کا گلا گھونٹنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''چھوڑ دے میرا ہاتھ۔'' دلہن نے غصے سے کہا اور ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا۔

''اچھی طرح سوچ لو ڈارلنگ... مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔'' اکرم نے بانکا قہقہہ لگایا اور کوارٹر سے باہر نکل گیا۔

دوسری طرف اللہ دتہ آ رہا تھا۔ اکرم کو کوارٹر سے باہر نکلتے دیکھ کر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ جھپٹ کر کھڑکی کے پاس پہنچا۔ ریشماں سر پر چادر ڈالے پیڑے توڑ رہی تھی۔ اس طرف سے اطمینان کر کے اللہ دتہ اکرم کی طرف متوجہ ہوا جو اس وقت گیٹ تک پہنچ گیا تھا۔ اس نے اللہ دتہ کو نہیں دیکھا تھا چنانچہ وہ اسی اطمینان سے دل ہی دل میں ریشماں کو حاصل کرنے کا پلان سوچتے ہوئے گیٹ سے باہر چلا گیا۔ چوکیدار عاقل خان نے اسے جاتے دیکھا اور سر ہلا دیا۔ وہ جانتا تھا کہ اکرم شراب کا رسیا ہے مگر جب تک اس کی شراب اور عاقل خان کے فرائض میں کوئی ٹکراؤ نہ ہو، وہ خوامخواہ دخل دینا نہیں چاہتا تھا۔

اصطبل کی چہار دیواری سے باہر چند قدم کے فاصلے پر درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ اکرم ہمیشہ اسی گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر اپنی پیاس بجھاتا تھا۔ آج بھی اس کے قدم اسے وہیں لے جا رہے تھے۔ مگر آج کوئی اور بھی اس طرف آ رہا تھا۔ ملگجی چاندنی میں ایک لمبے تڑنگے سیاہ وجود کو دیکھ کر اکرم کے ذہن میں پہلا شبہ یہی ابھرا کہ شاید ریشماں نے اللہ دتہ سے اس کی شکایت کر دی ہے مگر اللہ دتہ کوٹ پتلون تو نہیں پہنتا تھا۔

''کون ہے؟'' اکرم نے پکارا۔ اتنی دیر میں آنے والا قریب آ چکا تھا اور اکرم نے نیم تاریکی کے باوجود اسے پہچان لیا تھا۔

''اکبر خان، تم؟'' اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

''ہاں اکرم، میں اکبر ہوں۔''

''میں تم سے کہہ چکا ہوں اکبر کہ میں کسی قیمت پر بھی خان بہادر صاحب کی ملازمت چھوڑ کر تمہارے پاس نہیں آ سکتا۔ تم بار بار ایک ہی بات کو دہرانے کیوں آ جاتے ہو؟''

''اطمینان سے بیٹھ جاؤ اکرم۔'' اکبر خان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر گھاس پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ ''میں تم سے ملازمت کے بارے میں نہیں صرف اس ریس کے سلسلے میں ایک معاہدہ کرنے آیا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ آج کل تمہارا ہاتھ تنگ ہے۔ قرض خواہوں کے تقاضے تمہیں پریشان کر رہے ہیں۔ تم نے خان بہادر صاحب سے دو ہزار روپے مانگے تھے مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ تم چاہو تو میں دس پانچ ہزار دے سکتا ہوں۔''

''قرض۔'' اکرم نے جلدی سے پوچھا۔

''نہیں، تحفہ۔'' اکبر نے جواب دیا۔ ''برق رفتار کے بارے میں جو کچھ مجھے معلوم ہوا ہے، اس سے لگتا ہے کہ وہ یہ ریس جیت جائے گا۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ ایک ریس اگلے ہفتے بھی ہونے والی ہے۔ اگر کسی اتفاق سے برق رفتار پرسوں کی ریس ہار جائے، تب بھی خان بہادر اسے اگلی ریس میں ضرور دوڑائیں گے مگر میرے لیے اس ریس کے بعد آئندہ کوئی چانس باقی نہیں رہے گا۔ اب اگر تمہارے تعاون سے مجھے یہ ریس جیتنے کا موقع مل جائے تو میں اس تعاون کے لیے بیس ہزار پیش کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے اس سے

www.paksociety.com

غرض نہیں کہ یہ کام تم کس طرح کرتے ہو۔ برق رفتار کتنے گز کتنے قدم سے پیچھے رہ جاتا ہے۔ تم صرف گردن کی لمبائی سے بھی طوفان کو یہ ریس جیتنے کا موقع دے سکتے ہو۔ برق رفتار اگلی ریس میں ضرور دوڑے گا۔ اس ریس میں طوفان بھی شامل ہوگا۔ تم بے شک اس مرتبہ کی ہار کا بدلہ اگلی بار لے سکتے ہو۔ خان بہادر صاحب کا کوئی خاص نقصان نہیں ہوگا اور تمہاری جیب میں بیس ہزار آجائیں گے۔ بولو، کیا کہتے ہو؟"

☆☆☆

ریس کورس کا وسیع پویلین اور میدان کا وہ حصہ جسے آہنی تاروں سے علیحدہ رکھا گیا تھا، کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ایک دوڑ پندرہ منٹ پہلے ختم ہوئی تھی۔ دوسری شروع ہونے میں کچھ وقت باقی تھا۔ خصوصی مہمانوں کے شامیانے میں شہزادہ علی اور سارجنٹ شریف بھی موجود تھے۔

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ ریس سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔" شریف نے کہا۔

"ہمارے متعلق اکثر لوگ بہت سی باتیں نہیں جانتے۔" شہزادے نے جواب دیا۔ "ویسے جس ریاست کے سربراہ کا خطاب ہی سائیس الملک ہو اسے کسی اور چیز سے دلچسپی ہو نہ ہو گھوڑوں سے ضرور ہونا چاہیے۔ گھوڑا صدیوں سے ہمارے خاندان کی کمزوری چلا آرہا ہے۔ ہماری زندگی کے ہر پہلو میں کسی نہ کسی شکل میں گھوڑا ضرور موجود ہوتا ہے۔ گھوڑا ریاست ڈھیلامار کا شاہی جانور ہے۔ اس کے نعل کی تصویر ریاست کے پرچم کے ساتھ فضاؤں میں لہراتی ہے۔ والیٔ ریاست گھوڑے کے سر کی شکل کا تاج پہن کر، زین نما تخت پر، گھوڑے کی اگلی ٹانگ جیسا عصائے شاہی ہاتھ میں لے کر دربار عام منعقد کرتا ہے اور خدام اس کے سر پر گھوڑے کی دُم کا مورچھل بلکہ گھوڑ چھل ہلاتے ہیں۔ دادا حضور کے زمانے میں جب پہلی مرتبہ ریاست میں مردم شماری کرائی گئی تو گھوڑوں کی تعداد عام آبادی سے تیس فیصد زیادہ تھی۔ الیکشن کا مرحلہ آیا تو ایک بڑے حلقے کی طرف سے مطالبہ کیا گیا کہ گھوڑوں کو بھی ووٹ کا حق دیا جائے۔ دادا حضور اس مطالبے کے دل سے حامی تھے مگر جب ووٹروں کی فہرست دیکھی تو اس میں نوے فیصد گدھوں کے نام نظر آئے۔ دادا حضور نے صاف انکار کر دیا کہ گدھے اور گھوڑے برابر نہیں ہو سکتے۔ جب تک ووٹروں میں گدھے شامل ہیں اور جب تک وہ گدھوں کو ووٹ دے کر اپنا ممبر بناتے رہیں گے، اس وقت تک گھوڑے جیسے شاہی اور شریف جانور کو الیکشن کی چپقلش میں حصہ نہیں لینا چاہیے۔"

"لیکن میں نے آج سے پہلے کبھی آپ کو ریس کورس آتے جاتے نہیں دیکھا۔" شریف نے اعتراض کیا۔

"اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم زیرِ تعلیم تھے۔ ہماری ریاست میں طالب علمی کے زمانے تک ایک عشق بازی کو چھوڑ کر تمام بازیاں قانوناً ممنوع ہوتی ہیں۔"

"مگر مجھے یاد آتا ہے کہ چند ماہ پہلے آپ نے فرمایا تھا کہ اس سال بی اے کے امتحان میں بیٹھ رہے ہیں۔"

"ہم نے بالکل درست فرمایا تھا۔" شہزادے نے جواب دیا۔ "لیکن جب ہم امتحان دینے پہنچے تو یونیورسٹی کے اربابِ حل و عقد ہمارے قدموں سے لپٹ گئے۔ کہنے لگے کہ آپ چوتھی مرتبہ امتحان دے کر ہمیں کیوں شرمندہ کر رہے ہیں۔ یونیورسٹی فیصلہ کر چکی ہے کہ تین مرتبہ فیل ہونے کے اعزاز میں آپ کو بی اے کی ڈگری دے دی جائے۔ آپ کی خواہش ہو تو ایم اے کی ڈگری کے بارے میں بھی غور کیا جا سکتا ہے۔ مگر خدا کے لیے آپ چوتھی مرتبہ امتحان دینے کے خطرناک ارادے سے باز آجائیں۔ گزشتہ تین مرتبہ جن ممتحن حضرات نے آپ کی کاپیاں جانچی تھیں، وہ ابھی تک پاگل خانے سے باہر نہیں آسکے ہیں۔ ہم نے ایم اے کی ڈگری دیے جانے کے وعدے پر بڑی مشکل سے اپنی آمادگی ظاہر کر دی۔ چنانچہ اب صورت یہ ہے کہ ہم تعلیم سے فارغ ہو چکے ہوں یا نہ ہو چکے ہوں، تعلیم بہرحال ہم سے فارغ ہو چکی ہے۔"

ایک شور سا اٹھا، معلوم ہوا کہ دوسری ریس شروع ہو چکی ہے۔ شہزادے نے جلدی سے گردن میں لٹکتی ہوئی ایک عجیب وضع کی دوربین آنکھوں سے لگالی۔ لوگ چیخ چیخ کر اپنے پسندیدہ گھوڑوں اور ان کے جوکیوں کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ پہلا چکر ختم ہونے تک برق رفتار اور طوفان نے باقی تمام گھوڑوں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ دونوں تقریباً پہلو بہ پہلو ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے۔ دوسرے چکر کے نصف تک برق رفتار... طوفان سے دو تین گز آگے نکل گیا تھا۔

"ہمیں کسی ایسی ہی بات کا خطرہ تھا۔" اچانک شہزادے نے کہا۔ شریف نے دوربین آنکھوں سے ہٹا کر حیرت سے اسے دیکھا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ برق رفتار طوفان سے کئی گز آگے جا رہا ہے۔ اس کا جیتنا لازمی ہے۔" وہ بولا۔

گھوڑے میدان کے دوسری جانب ایک چھوٹی سی پہاڑی کے پیچھے نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تھے۔

"نہیں۔" شہزادے نے افسردگی سے سر ہلایا۔ "اس

کے ساتھ حرکت ہی ایسی کی گئی ہے کہ اب اس کا جیتنا قریب قریب ناممکن ہے۔"

پھر ایک شور اٹھا۔ شریف نے جلدی سے دوربین لگائی۔ تیسرے چکر کے شروع میں برق رفتار جو کئی گز آگے تھا، ایک مرتبہ پھر طوفان کے ساتھ دوڑ رہا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے طوفان نے بڑھنا شروع کر دیا۔ لوگوں کی آوازیں جیسے گھٹ کر رہ گئیں، ایک سناٹا چھا گیا۔ برق رفتار نے ایک کوشش اور کی مگر نتیجہ مختلف ثابت نہیں ہوا۔ برق رفتار طوفان سے صرف ایک قدم پیچھے رہ کر ہار گیا۔

☆☆☆

ریس کورس کے اصطبل میں خان بہادر صاحب ایک کرسی پر سر پکڑے بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے ہانپتا ہوا برق رفتار اور پسینے میں شرابور جوکی اکرم سر جھکائے کھڑے تھے۔ نرگس اور اختر بھی موجود تھے۔ شمشاد، خان بہادر کو تسلی دے رہا تھا۔ اکبر خان نے برق رفتار کی تعریف کی اور اس کے ہارنے پر افسوس کا اظہار کیا۔ خان بہادر نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ شہزادہ علی اور شریف بھی پہنچ گئے۔

"خان بہادر صاحب!" شہزادہ علی نے سنجیدگی سے کہا۔ "برق رفتار کو دانستہ ہرایا گیا ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" خان بہادر اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ اکبر خان اور جوکی اکرم نے چونک کر شہزادے کی طرف دیکھا۔

"کیوں اکرم صاحب!" شہزادہ علی، خان بہادر کو جواب دینے کے بجائے اکرم سے مخاطب ہوا۔ "تمہارے خیال میں برق رفتار کے ہارنے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟"

"اگر آپ کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اسے جیتنے سے باز رکھا۔" اکرم نے تیز لہجے میں کہا۔ "تو یہ ایک انتہائی سنگین الزام ہے۔ میں مطالبہ کرتا ہوں کہ آپ یا تو اپنا الزام ثابت کریں یا پھر اپنے الفاظ واپس لیں اور ان سب کے سامنے مجھ سے معافی مانگیں جن کے سامنے آپ نے مجھے ذلیل کرنے کی کوشش کی ہے۔"

"بہت خوب۔ اور آپ کیا کہتے ہیں جناب ٹریژر صاحب؟ کیا آپ کے خیال میں ہمیں اکرم سے معافی مانگ لینی چاہیے؟" شہزادے نے شمشاد کی طرف دیکھا۔

"اگر میں نے صبح خود چیک نہ کیا ہوتا۔" شمشاد نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "تو میں سمجھتا کہ ممکن ہے آپ کا اندازہ درست ہو۔"

"آخر آپ پہیلیوں میں باتیں کیوں کر رہے ہیں

شہزادہ علی؟" خان بہادر تقریباً چیخ پڑے۔

"ہم دیکھنا چاہتے تھے کہ جو شبہ ہمارے دل میں پیدا ہوا ہے، اس کی تائید آپ کے قابل عملے کی جانب سے ہوتی ہے یا نہیں۔" شہزادے نے کہا۔

اور برق رفتار کے قریب جا کر ایک لمحے کے لیے جھک کر اس کی دونوں پچھلی ٹانگیں دیکھنے کے بعد بائیں ٹانگ اٹھا دی۔ اور پھر خان بہادر ہی نہیں دوسرے لوگ بھی چونک اٹھے۔ برق رفتار کی پچھلی بائیں ٹانگ نعل سے محروم تھی۔

شمشاد نے پھر کہا کہ اس نے صبح دس گیارہ بجے چیک کیا تھا، چاروں نعل موجود اور مضبوطی سے جمے ہوئے تھے اور اس کے فوراً بعد برق رفتار کو ریس کورس کے ٹرک میں ٹھہرایا گیا، تب سے اب تک نہ صرف ریس کلب کا حفاظتی عملہ بلکہ پولیس بھی اصطبل کے چاروں طرف موجود رہی ہے۔

"نہیں۔" خان بہادر صاحب نے کہا۔ "یہ شرارت کی گئی ہے تو شام نگر میں یا راستے میں کی گئی ہے۔ یہاں برق رفتار ریس شروع ہونے تک میری نگاہوں میں رہا ہے۔" وہ اکرم کی طرف گھومے۔ "اور ٹرک میں تم اس کے ساتھ آئے تھے۔ سچ بتاؤ، تم نے اپنے ایمان کی کتنی قیمت وصول کی ہے؟"

"میں آپ سے حلفیہ کہتا ہوں خان بہادر صاحب۔" اکرم ولی محمد خان کی سرخ آنکھوں کی تاب نہ لا کر کچھ پیچھے ہٹا۔ "ریس شروع ہونے سے پہلے میں نے خود بھی چاروں نعل دیکھے تھے اور ان میں سے کوئی ایسا نہیں تھا جس کے بارے میں شک ہوتا کہ دوڑ میں نکل جائے گا۔"

مگر خان بہادر صاحب نے اکرم پر تھپڑوں اور گھونسوں کی بارش کر دی۔ لوگوں نے بڑی مشکل سے انہیں الگ کیا۔ اسی وقت انسپکٹر مولا بخش بھی آگیا۔ اس نے بھی برق رفتار پر پانچ سو روپے لگائے تھے۔

"کیا ہے... یہ کیسا ہنگامہ ہو رہا ہے؟" اس نے تیزی سے پوچھا۔ جواب میں خان بہادر نے بتایا کہ اکرم نے برق رفتار کی پچھلی ٹانگ کا نعل ڈھیلا کر دیا تھا۔ یہی اس کے ہارنے کی وجہ تھی۔

"میں اس جھوٹے اور بے بنیاد الزام سے قطعی انکار کرتا ہوں۔" اکرم نے جواب دیا۔ اگرچہ اس کا چہرہ زرد تھا مگر آواز سے کمزوری کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔

"یہ محض آپ کا شبہ ہے یا آپ اسے ثابت بھی کر سکتے ہیں؟" مولا بخش نے خان بہادر صاحب سے پوچھا۔

"مجھے پورا یقین ہے۔" خان بہادر بولے۔ "آپ اسے گرفتار کر لیں۔ میں عدالت میں الزام بھی ثابت کر

دوں گا۔"

"نہ جانے آپ کب کی دشمنی کا بدلہ نکال رہے ہیں خان بہادر صاحب۔" اکرم نے مولا بخش کو متذبذب دیکھ کر حوصلہ پاتے ہوئے کہا۔ "مگر لحاظ اور مروت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اگر اس وقت انسپکٹر صاحب نے مجھے محض آپ کے کہنے سے گرفتار کر لیا تو یاد رکھیے، میں بھی یہ ظلم خاموشی سے برداشت نہیں کروں گا۔ چیونٹی بھی پیر کے نیچے آتی ہے تو کاٹ لیتی ہے، میں تو پھر بھی انسان ہوں۔"

"باتیں خوب بنا لیتے ہو جوکی صاحب۔" شہزادہ علی نے بڑی دیر کے بعد زبان کھولی۔ "یہ ایک علیحدہ بات ہے کہ ایک شیطانی کاروبار میں کوئی چھوٹا شیطان کسی بڑے شیطان کو چوٹ دے جائے تو دونوں کو ایک دوسرے سے شکایت کا کوئی موقع نہیں ہونا چاہیے۔ مگر جب تک اس ملک میں ریس کا کاروبار قانونی حیثیت رکھتا ہے تو اس قانون کے مطابق تم نے واقعی جرم کیا ہے اور تمہیں اس کی سزا ملنی چاہیے۔"

وہ مولا بخش سے مخاطب ہوا۔

"غور سے سنیے، انسپکٹر صاحب۔ پہلے چکر کے اختتام تک برق رفتار اور طوفان دوسرے تمام گھوڑوں سے آگے نکل چکے تھے۔ برق رفتار طوفان سے آگے تھا۔ یہ کیفیت دوسرے چکر کے نصف تک برقرار رہی اور اس لیے برقرار رہی کہ اس وقت تک چاروں نعل اپنی جگہ موجود تھے مگر دوسرا چکر ابھی آدھا ہی ہوا تھا کہ ہم نے دوربین سے واضح طور پر برق رفتار کی چال میں فرق آتے دیکھا۔ اکرم نے بھی ایک ہوشیار جوکی ہونے کی حیثیت سے اس فرق کو فوراً محسوس کر لیا تھا۔ اس نے بالکل غیر شعوری طور پر گردن گھما کر یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ چال کا یہ فرق واقعی نعل گرنے کی وجہ سے ہے۔ ہم یہ بات یونہی نہیں کہہ رہے ہیں۔ اپنے مووی کیمرے سے جو دوربین میں ہی فٹ ہے، ہم نے اس پورے موقع کی تصویریں لے لی ہیں۔ آپ بے شک اکرم کو گرفتار کر سکتے ہیں۔ یہ ثبوت کسی بھی عدالت کی نگاہ میں اسے مجرم قرار دینے کے لیے کافی ہے۔ مزید اگر آپ چاہیں تو اسی جگہ وہ نعل بھی پڑا ہوا مل جائے گا۔"

اکرم آنکھیں پھاڑے شہزادے کو گھور رہا تھا۔ مولا بخش نے آگے بڑھ کر ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر رسید کیا اور جب تک اکرم اس چوٹ سے سنبھلا اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی پڑ چکی تھی۔

☆☆☆

کیفے سکون کی ایک میز کے گرد شہزادہ علی، نرگس اور اختر بیٹھے ہوئے تھے اور شہزادہ بڑے انہماک سے ایک چھوٹی سی نوٹ بک کے صفحات الٹنے میں مصروف تھا۔

"آہا۔ یہ لیجیے۔ برجس صاحبہ تو مل گئیں۔" اس نے جوش سے کہا۔

"برجس نہیں، میرا نام نرگس ہے۔"

"نرگس ہے۔" شہزادہ علی نے منہ بنایا۔ "کمال ہے، ہم اتنی دیر سے برجس تلاش کر رہے ہیں اور آپ بتاتی نہیں کہ آپ کا نام نرگس نہیں برجس ہے۔"

"دیکھیے آپ پھر غلطی کر رہے ہیں، میرا نام نرگس ہے نرگس!"

"جی ہاں، ہمیں یاد ہے۔ نرگس نا۔ دیکھیے یہ رہا۔" شہزادہ علی نے فاتحانہ لہجے میں پڑھنا شروع کیا۔ "نرگس، بھارت کی مشہور و معروف فلم ایکٹریس۔ سب سے پہلے ڈائریکٹر محبوب کی فلم تقدیر میں جلوہ گر ہوئی۔ اس کے بعد... مگر آپ تو شاید فلم ایکٹریس نہیں ہیں۔ لاحول ولاقوۃ... معلوم ہوتا ہے آج ہم غلط عینک لے آئے ہیں۔"

"عینک لے آئے ہیں؟" اختر نے تعجب سے پوچھا۔

"جی ہاں۔" شہزادہ علی نے مایوسانہ انداز میں سر ہلایا۔ "اب ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ابا حضور نے ہمیں سب فراموشی کی تربیت دے کر ہمارے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔ اسی تربیت کی وجہ سے ہم تین سال بی اے میں فیل ہوتے رہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج کسی سے ملنے کے بعد اگر پھر دوبارہ ملاقات ہو جائے تو یہ یاد نہیں رہتا کہ اس سے کب اور کہاں تعارف ہوا تھا۔ اور ہوا بھی تھا یا نہیں۔ اس دشواری سے بچنے کے لیے ہم نے ایک نوٹ بک رکھنا شروع کر دی تھی۔ چونکہ یہ ہمیں لوگوں کو دیکھنے اور پہچاننے میں مدد دیتی ہے اس لیے ہم اسے اپنی عینک ہی کہا کرتے ہیں۔"

"چھوڑیے اسے، میں اپنا تعارف دوبارہ کرائے دیتی ہوں۔" نرگس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ کو یہ تو یاد ہوگا کہ آپ تین چار دن پہلے شام نگر تشریف لے گئے تھے؟"

"افوہ۔ خوب یاد دلایا آپ نے۔" شہزادہ علی ایک دم اچھل پڑا۔ "ہم تو خود آپ کی تلاش میں تھے۔ آپ وہی نرگس ہیں جن سے ہم نے ڈرائیور مانگا تھا؟"

"جی ہاں، بالکل وہی۔ شکر ہے آپ کو یاد تو آ گیا۔"

"شکریہ تو ہم بعد میں ادا کریں گے، پہلے آپ ہماری کار تو واپس کر دیں۔"

"آپ کی کار؟"

"ہم نے آپ سے کہا تھا نا کہ آپ اپنی کار وہیں چھوڑ

دیں اور ہماری کار میں شام نگر چلیں۔"

"آپ نے کہا ضرور تھا مگر آپ گئے میری ہی کار میں تھے۔" نرگس نے جواب دیا۔ "تو کیا واپسی میں اپنی کار نہیں لی تھی؟"

"وہاں ہوتی تب لیتے نا۔"

"ایسا تو نہیں ہے کہ آپ کا ڈرائیور واپس آ کر کار لے گیا ہو۔" اختر نے خیال ظاہر کیا۔

"اگر وہ لے گیا ہے تو کم بخت ضرور راستہ بھٹک گیا ہوگا۔ ابھی تک گھر نہیں پہنچا ہے۔"

"ابھی تک گھر نہیں پہنچا... کہیں کار لے کر نو دو گیارہ تو نہیں ہو گیا؟" نرگس نے کہا۔

"نو دو گیارہ چھوڑ وہ گیارہ چار پندرہ بھی نہیں ہو سکتا۔" شہزادے نے جواب دیا۔ "اسے معلوم ہے کہ ہم نے قسطوں پر کار خریدی تھی اور ابھی اس کی آدھی قسطیں بھی ادا نہیں ہوئی ہیں۔"

"افوہ... آپ سے بھی حد ہے۔" نرگس نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "بہرحال، میں آپ کو کیفے میں بیٹھے دیکھ کر اس لیے آ گئی تھی کہ ابا جان آئندہ اتوار کو ہونے والی ریس میں برق رفتار کو دوڑانے کا مصمم ارادہ کر چکے ہیں۔ ساری جائیداد پہلے ہی فروخت ہو گئی ہے۔ جو تھوڑی سی زمین باقی ہے اب اس کا بھی سودا کیا جا رہا ہے۔ ہم میں سے کوئی ان سے بات کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا، سمجھانے کی ہمت کہاں سے لائے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ وہ آپ کی رائے کو خاص اہمیت دیتے ہیں اگر آپ انہیں اس ارادے سے باز رکھ سکیں تو بہت ممنون ہوں گی۔ انہیں مشورہ دیجیے کہ اب یہ ریس کا چکر ختم کریں اور اصطبل وغیرہ فروخت کر کے اس کی رقم سے کوئی مناسب کاروبار کر لیں۔ ورنہ آج زمین بک رہی ہے تو کل کوٹھی اور مکانات کا نمبر آئے گا اور بہت جلد ہم لوگ دانے دانے کو محتاج ہو جائیں گے۔"

☆☆☆

تین دن حوالات میں گزارنے کے بعد چوتھے دن اکرم کو ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ ضمانت نقد تھی اور کسی ایسے شخص نے جمع کرائی تھی جسے اکرم کم سے کم نام سے بالکل نہیں جانتا تھا۔ یوں اسے کچھ اندازہ ضرور تھا کہ اس نام کے پردے میں کون شخص ہو سکتا ہے۔ وہ دن کے گیارہ بجے رہا کیا گیا۔ رات کو تقریباً نو بجے شام نگر پہنچا۔ دن کا وقت اس نے کہاں گزارا یا کس کس سے ملا، اس بارے میں پولیس اپنی تمام تحقیقات کے بعد بھی کچھ معلوم نہیں کر سکی۔

خان بہادر صاحب بہت پریشان تھے۔ دوسرے جوکی کا انتظام کرنا تھا۔ عملے کی تنخواہیں واجب ہو چکی تھیں اور کم سے کم پچاس ہزار کی زمین کے لیے کوئی گاہک تیس ہزار سے زیادہ دینے پر تیار نہیں تھا۔ عاقل خان چوکیدار نے اکرم کے آنے کی خبر دی تو انہوں نے ملنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ پندرہ منٹ کے اندر کوارٹر خالی کر کے دفع ہو جائے۔ کوارٹر میں اکرم کا کوئی خاص سامان نہیں تھا۔ کپڑے اور کچھ متفرق چیزیں اور الماری سے شراب کی بوتل نکال کر سوٹ کیس میں رکھیں۔ سائیس اللہ دتہ ہینڈ پمپ سے ٹنکی میں پانی بھر رہا تھا۔ اس نے بھی اکرم کو واپس آتے دیکھ لیا تھا مگر منہ پھیر کر اپنے کام میں لگا رہا۔ ریشماں نے اکرم کے کوارٹر میں بجلی جلتے دیکھی تو یونہی جھانک لیا۔ اکرم باہر نکلا۔ اسے جھانکتے دیکھا تو سوٹ کیس وہیں رکھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "میرے پاس بیس ہزار روپے نقد موجود ہیں۔" اس نے سرگوشی کی۔ "اللہ دتہ ساری زندگی کما کر بھی اتنا روپیا جمع نہیں کر سکتا۔ یہ آخری موقع ہے۔ میرے ساتھ چلی چلو۔ سچ کہتا ہوں، عیش کرا دوں گا۔ میں اصطبل کے سامنے والے درختوں میں رات کے گیارہ بجے تک تمہارا انتظار کروں گا۔ اگر زندگی میں کچھ مزے اٹھانا چاہتی ہو تو چلی آنا۔"

سامنے ایک سایہ سا گزرا۔ اکرم نے جلدی سے ریشماں کا ہاتھ چھوڑ دیا اور وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ اکرم چند منٹ بعد تک خاموشی سے کھڑا کچھ آہٹ لیتا رہا پھر سوٹ کیس اٹھا کر مسکراتا ہوا گیٹ کی طرف چل دیا۔ سامنے سے آتی ہوئی ایک کار کی روشنی اس پر پڑی، وہ جلدی سے ایک طرف ہو گیا۔ غور سے دیکھا تو اکبر خان کار میں بیٹھا گیٹ میں داخل ہو رہا تھا۔ "یہ اس وقت یہاں کیوں آیا ہے؟" اکرم نے تعجب سے سوچا۔ "اونہہ! ہوگا کچھ..." اس نے سر کو ایک جھٹکا دیا۔ "یہاں تو راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔" وہ درختوں کے جھنڈ کی طرف بڑھ گیا۔ اسے یقین سا تھا کہ بیس ہزار کا ذکر سن کر ریشماں گھونگھٹ نکالے اپنے کوارٹر میں نہیں بیٹھی رہے گی۔

اکبر خان نے عاقل خان کے ذریعے اپنی آمد کی اطلاع کرائی۔ اس وقت پونے دس بجے تھے۔ عاقل خان نے واپس آ کر بتایا کہ خان بہادر اپنے کمرے میں اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ اکبر خان کمرے کی طرف چل دیا۔ خان بہادر میز کے پیچھے اپنی آرام دہ کرسی پر بیٹھے تھے۔

"حاضر ہو سکتا ہوں؟" اکبر نے دروازے پر رکتے ہوئے پوچھا۔

"آ جاؤ۔" خان بہادر اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔

www.pkdigest.com

وہ قریب آیا تو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ''کیسے آنا ہوا؟''

''ایک تجویز لے کر حاضر ہوا ہوں۔'' اکبر نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''ریس کی لت نے بڑے بڑے دولت مندوں کو فقیر بنا دیا ہے۔ میری طرح آپ بھی اپنی ذات سے تنہا ہوتے تو کبھی نہ آتا مگر آپ کے سامنے ایک بچی کا مستقبل بھی ہے۔ اپنی خاطر نہیں تو نرگس کے خیال سے میری تجویز پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔''

''بڑی ہمدردی جتا رہے ہو۔'' خان بہادر کے لہجے میں طنز تھا۔

''دشمن تو میں آپ کا کبھی بھی نہیں تھا۔'' اکبر خان نے جواب دیا۔ ''کاروباری حریف ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اپنی ذاتی حیثیت میں بھی ایک دوسرے کے لیے اچھا نہیں سوچ سکتے۔ بہر حال، میری تجویز ہے کہ آپ اپنا اصطبل مع برق رفتار میرے ہاتھ فروخت کر دیں۔ میں آپ کو ایک لاکھ روپیا نقد دینے کے لیے تیار ہوں۔''

پیشکش اتنی غیر معمولی اور قیمت کے لحاظ سے چونکا دینے والی تھی کہ خان بہادر ایک لمحے کے لیے اکبر خان کی صورت دیکھتے رہ گئے مگر دوسرے لمحے ان کے چہرے پر غصے کی سرخی نمودار ہوئی۔

''تو تم میری مجبوریوں کا سودا کرنے آئے ہو؟'' وہ گرج کر بولے۔ ''یہ جتانے آئے ہو کہ کل تک میں جسے گھوڑوں کا معمولی دلال کہا کرتا تھا، وہ آج مجھے... خان بہادر ولی محمد خان کو خریدنے کی حیثیت رکھتا ہے مگر میرے اور تمہارے درمیان سب سے بڑا فرق یہی ہے اکبر خان کہ تم خود بکتے رہے ہو اور سمجھتے ہو کہ دوسروں کو بھی خریدا جا سکتا ہے۔ مگر میں صرف خریدنا جانتا ہوں۔ میں تمہاری تجویز کو غور کرنے کے قابل بھی نہیں سمجھتا۔ تم جا سکتے ہو۔''

اکبر خان کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا... مگر وہ اپنے جذبات چھپانے پر بڑی قدرت رکھتا تھا۔

''جیسی آپ کی خوشی۔'' اس نے اٹھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''مگر ممکن ہے آپ نے اس وقت جذبات میں آ کر انکار کر دیا ہو۔ اس خیال سے میں ابھی اس تجویز کو واپس نہیں لے رہا ہوں۔ آپ اس پر ٹھنڈے دل سے غور کیجیے۔ میری پیشکش آئندہ ہفتے تک برقرار رہے گی۔ اس دوران میں میری ضرورت ہو تو آپ جانتے ہی ہیں کہ میں کہاں مل سکتا ہوں۔''

اکبر خان کے جانے کے بعد خان بہادر صاحب سوچ میں غرق اس کھڑکی کے پاس آ کھڑے ہوئے جو اصطبل کے عقبی میدان کی جانب کھلتی تھی۔ درختوں کا جھنڈ سامنے ہی نظر آ رہا تھا۔ اچانک دروازے کی طرف سے آواز آئی۔

''ہم تشریف لا سکتے ہیں؟'' خان بہادر چونک کر گھومے۔ دیکھا شہزادہ علی کھڑا مسکرا رہا تھا۔

''اوہ آپ...'' وہ اس کی طرف بڑھے۔ ''تشریف لائیے۔ اس وقت کیسے زحمت کی؟''

''ہمیں کسی نے بتایا تھا کہ آپ اپنی زمین فروخت کر رہے ہیں...''

''تو یہ بات ہے۔'' خان بہادر نے تیوری پر بل ڈالتے ہوئے بات کاٹی۔ ''وہ آج اس لیے شہر گئی تھی۔''

''کون شہر گئی تھی؟''

''نرگس۔'' خان بہادر نے غور سے شہزادے کی طرف دیکھا۔ ''سچ بتائیے، کیا یہ خبر آپ کو نرگس سے نہیں ملی؟ وہ میرے سر تھی کہ مجھے حیدر آباد والی زمین نہیں بیچنی چاہیے۔ اب اس نے آپ کو سفارشی بنا کر بھیجا ہے مگر آپ اس معاملے میں دخل نہ دیں۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے اور میں اپنے معاملات میں دوسروں سے مشورہ لینا ضروری نہیں سمجھتا۔''

''بہت اچھا کرتے ہیں آپ۔'' شہزادے نے گردن ہلائی۔ ''یہ دوسرے لوگ بیٹھے بٹھائے ہی مشورے دیتے رہتے ہیں۔ یوں بھی ہمارے ابا حضور کا قول ہے کہ دشمن تو دشمن اور دوست کو مشورہ بھی نہیں دینا چاہیے۔ لوگ تمہارے خلوص پر شبہ کرنے لگیں گے۔ ہم آپ کو ہرگز کوئی مشورہ دینے نہیں آئے تھے۔ ہم تو اس نالائق ڈرائیور کی تلاش میں نکلے تھے جو آج چار دن سے ہماری کار لے کر غائب ہے۔ پولیس اسٹیشن رپورٹ کرنے گئے تو انسپکٹر صاحب نے رازداری کا وعدہ لے کر چپکے سے کان میں بتایا کہ رپورٹ تو میں لکھ لوں گا مگر آپ کو اپنی گم شدہ کار کا پتا لگانا ہے تو شام نگر میں ایک مجذوب رہتے ہیں، ان کے پاس جائیے۔ چور کا سراغ، گم شدہ کا پتا، سٹے لاٹری کا نمبر اور ریس کا گھوڑا ان سے بہتر کوئی نہیں بتا سکتا... بلکہ انسپکٹر مولا بخش کا کہنا ہے کہ اس نے قتل کے معاملات میں بھی ان کی رائے کو نہایت صائب پایا ہے۔''

''مگر میں نے تو یہاں کسی ایسے مجذوب کا نام نہیں سنا۔'' خان بہادر نے حیرت سے کہا۔

''آ گئیں۔'' شہزادہ نے پلکیں جھپکائیں۔ ''اس کا مطلب ہے کہ انسپکٹر صاحب ہمیں چوٹ دے گئے۔ مگر خیر، کبھی تو ہمارا بھی...''

الفاظ شہزادہ علی کے منہ میں ہی تھے کہ ایک چیخ سنائی دی۔ پھر دوسری اور تیسری۔ آواز کھلی کھڑکی کی طرف سے آتی معلوم ہوئی تھی۔ شہزادہ علی اور خان بہادر کھڑکی کی طرف لپکے۔ میدان کے اس پار درختوں کے جھنڈ سے تاریکی میں لپٹا ہوا ایک سایہ نمودار ہوا اور تیزی سے مخالف سمت میں بھاگتا چلا گیا۔ کھڑکی میں نہ صرف آہنی سلاخیں بلکہ جالی بھی لگی ہوئی تھی۔ شہزادہ علی دروازے کی طرف جھپٹا۔

''ہمارے پاس ٹارچ ہے۔'' اس نے خان بہادر صاحب سے کہا۔ ''اگر آپ کے اصطبل میں کوئی پیٹرومیکس ہو تو اسے لے کر فوراً درختوں کے پاس پہنچیں۔''

چوکیدار عاقل خان نے بھی چیخیں سن لی تھیں اور گیٹ کے پاس کھڑا ہوا درختوں کی جانب دیکھ رہا تھا۔ شہزادہ علی اس کے پاس سے رکے بغیر نکلتا چلا گیا۔ درختوں کا جھنڈ اصطبل سے تیس چالیس گز کے فاصلے پر تھا۔ شہزادہ علی نے پانچ سیل کی طاقتور ٹارچ کی روشنی درختوں کے درمیان ڈالی۔ سب سے پہلے ایک سوٹ کیس روشنی کی زد میں آیا۔ قریب ہی ایک شراب کی بوتل گری ہوئی تھی۔ اس سے دو قدم کے فاصلے پر جوکی اکرم پیٹھ کے بل اس طرح پڑا ہوا تھا کہ اس کی آنکھیں دہشت سے کھلی ہوئی تھیں اور ٹھیک دل کے مقام پر ایک چاقو دستے تک سینے میں اترا ہوا تھا۔

☆☆☆

تحقیقات کے لیے انسپکٹر مولا بخش کو بھیجا گیا مگر اس سائے کو بھاگتے ہوئے دیکھنے کے سوا کسی نے کوئی خاص بات نہیں دیکھی تھی اور اس کے بارے میں بھی یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ کوئی مرد تھا یا عورت۔ خان بہادر صاحب نے بتایا کہ اکرم اپنا سامان لینے آیا تھا مگر انہوں نے اس سے ملاقات نہیں کی اور نہ یہ بتا سکے کہ وہ کب اصطبل سے رخصت ہوا۔ چاقو پر کسی کے نشانات نہیں تھے۔ باقی شراب کی بوتل سمیت ہر چیز پر صرف اکرم کی انگلیوں کے ہی نشانات پائے گئے۔ پولیس سرجن کی ابتدائی رپورٹ کے مطابق لاش پر چاقو کے دو زخم اور بھی تھے مگر موت کی وجہ وہ کاری وار تھا جو دل کے مقام پر کیا گیا۔ سرسری اندازے کے مطابق مقتول کی موت ساڑھے دس اور ساڑھے گیارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کر دیا گیا۔ اکرم کی جیب سے بینک کی پاس بک اور چیک بک برآمد ہوئی۔ پاس بک کے اندراج کے مطابق اکرم نے اپنے اکاؤنٹ میں بیس ہزار روپے جمع کرائے تھے۔

''آپ کے خیال میں یہ بیس ہزار روپے اسے کس نے دیے ہوں گے؟'' مولا بخش نے خان بہادر سے پوچھا۔

''یہ معلوم کرنا آپ کا کام ہے۔'' خان بہادر نے جواب دیا۔ ''لیکن یہ کوئی پیچیدہ سوال تو نہیں ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ برق رفتار کی ہار سے ایک ہی شخص فائدہ اٹھا سکتا تھا اور اس نے اٹھایا بھی۔''

''آپ کا مطلب ہے اکبر خان؟''

''میں اس کے علاوہ اور کیا سمجھ سکتا ہوں۔ خاص طور سے اس صورت میں کہ وہ شہزادہ علی کے آنے سے قبل میرے پاس آیا تھا اور آپ کو تعجب ہوگا کہ میرے اصطبل اور گھوڑے کے لیے اس نے ایک لاکھ کی آفر دی تھی۔''

''کیا؟'' مولا بخش چونکا۔ ''اکبر خان یہاں آیا تھا۔ خوب! یہ کتنی دیر پہلے کی بات ہوگی؟ میرا مطلب ہے، اکرم کے آنے سے قبل یا اس کے بعد؟''

''میں نے گھڑی تو نہیں دیکھی تھی مگر شاید پونے دس بجے کا وقت تھا۔ اکرم اس سے پہلے آ چکا تھا۔''

''بڑی عجیب بات ہے۔'' مولا بخش نے غور سے خان بہادر کی طرف دیکھا۔ ''اکرم آج ہی ضمانت پر رہا ہوا اور آج ہی کسی نے اسے قتل کر دیا۔ اور وہ آپ کے اصطبل کے قریب قتل کیا گیا ہے۔ ایک عام آدمی کا ذہن سوچ سکتا ہے کہ جب اکبر خان نے آپ کو ایک لاکھ کی آفر دی تو اگرچہ شبہ آپ کو پہلے سے تھا مگر اس وقت آپ کو یقین ہو گیا کہ اکبر خان نے ہی اکرم کو رشوت دے کر آپ سے غداری پر آمادہ کیا تھا۔ آپ اکبر خان کے جاتے ہی اکرم کے کوارٹر میں گئے، وہ اس وقت تک موجود تھا۔ آپ نے زبردستی اس کی جیبوں کی تلاشی لی اور پاس بک میں بیس ہزار کی انٹری دیکھ کر آپ کو مزید ثبوت مل گیا۔ آپ کے غصے اور انتقامی جذبات سے کون واقف نہیں؟! اکرم کے خلاف آپ کے دل میں انتقام کا شعلہ بھڑک سکتا تھا۔ جیسے ہی وہ اصطبل کی حدود سے باہر نکلا، آپ کے کسی وفادار خادم نے اسے درختوں کے جھنڈ میں لے جا کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ شہزادہ علی آپ سے ملنے آ گئے۔ یہ نہ آئے ہوتے تو آپ کے لیے آسان تھا کہ لاش کہیں پھنکوا دیں یا اسی ویرانے میں دفن کرا دیں۔''

''تو آپ مجھے اکرم کا قاتل خیال کرتے ہیں؟'' خان بہادر کا چہرہ غصے سے سرخ ہونے لگا۔

''جی نہیں، میں نے ابھی اپنا خیال ظاہر نہیں کیا ہے۔'' مولا بخش نے جواب دیا۔ ''میں نے کہا تھا کہ ایک عام آدمی کا ذہن یہ سوچ سکتا ہے۔ آپ اس کے جواب میں کچھ کہنا پسند کریں گے؟''

''جی نہیں۔ میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہتا کہ اگر آپ کا بھی یہی خیال ہو تو شوق سے میرے خلاف تحقیقات

www.pkdigest.com

کیجیے۔ مقدمہ قائم کیجیے۔ مجھے جو کچھ کہنا ہوگا، عدالت میں کہوں گا اور یہ بات بھی اچھی طرح ذہن نشین کرلیں کہ اگر آپ اپنا دعویٰ ثابت نہیں کرسکے تو اس کی پاداش میں جو کچھ آپ کو بھگتنا پڑے گا اس کے لیے بھی تیار رہیں۔''

خان بہادر صاحب نے کہا اور تیزی سے گھوم کر لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے اصطبل کی جانب چل دیے۔

☆☆☆

خان بہادر صاحب کسی اچھے جوکی کے لیے بہت پریشان تھے کہ ایک نوجوان... جس نے اپنا نام رشید بتایا، ان کے پاس پہنچا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ حال ہی میں انگلینڈ سے آیا ہے۔ اس کے والد ایک انگریز کے ملازم تھے جس کے پاس گھوڑوں کا بہت بڑا فارم تھا چنانچہ اسے بچپن سے ہی گھوڑوں سے واسطہ رہا ہے۔ انگریز نے اسے خود اپنی نگرانی میں تربیت دے کر ایک بہترین جوکی بنا دیا۔ اس نے بہت سی ریسیں جیتی ہیں۔ یارک شائر کے سب سے پرانے ریس کلب سے بھی وابستہ رہا ہے۔ والد کے انتقال کے بعد اس کی ماں کو اپنے عزیزوں کی یاد ستانے لگی اور اسے مجبوراً واپس آنا پڑا۔ یہاں اسے کئی اچھی ملازمتوں کی پیشکش کی گئی مگر جب اس نے ان کے گھوڑوں کو دیکھا تو کسی کو اپنی سواری کے قابل نہیں پایا۔ یہاں تک کہ اسے پچھلی ریس میں برق رفتار گھوڑا دیکھنے کا موقع ملا اور اس نے سوچا کہ ہاں.... یہ ایک گھوڑا ایسا ہے جس پر کوئی بیٹھنے کی تمنا کرے۔ قدرت کو بھی شاید یہی منظور تھا کہ خان بہادر صاحب کو ایک جوکی کی ضرورت محسوس ہوئی اور وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔

خان بہادر دل ہی دل میں بہت خوش ہوئے کہ انہیں ایک انگلینڈ ریٹرن جوکی مل رہا ہے۔ برق رفتار جیسا گھوڑا اور رشید جیسا جوکی.... پھر بھلا ان کی کامیابی میں کیا شک رہ جاتا ہے۔ انہوں نے تنخواہ کے بارے میں پوچھا۔

''تنخواہ کا مسئلہ تو طے ہو ہی جائے گا۔'' رشید نے جواب دیا۔ ''لیکن ایک بات جو آپ کو لازمی ماننا پڑے گی وہ یہ ہے کہ جب بھی آپ کا گھوڑا ریس جیتے گا، آپ کو جیتی ہوئی رقم کا پانچ فیصد حصہ بہ طور بونس دینا پڑے گا۔''

''کیا؟'' خان بہادر چونک پڑے۔

''مجبوری ہے۔'' رشید نے کندھے اچکائے۔ ''ہر جگہ اور ہمیشہ میری یہی شرط رہی ہے۔''

''اور تنخواہ کیا لوگے؟''

''کم سے کم پانچ سو روپے ماہانہ۔'' رشید نے کہا۔ ''ملازمت ختم کرنے سے پہلے ایک ماہ کا نوٹس یا تنخواہ دونوں جانب سے۔''

خان بہادر سوچ میں پڑ گئے۔ جب ابھی سے اس کے یہ مزاج ہیں تو آگے چل کر پریشانی بھی ہوسکتی ہے۔ خاص طور سے اس صورت میں کہ وہ اپنے غصے پر قابو نہیں رکھ سکتے... اور یوں جیسے رشید ان کے خیالات پڑھ رہا ہو۔ وہ بولا۔

''مجھے معلوم ہے کہ آپ غصے کے بہت تیز ہیں۔ اس معاملے میں، میں بھی آپ سے کچھ کم نہیں ہوں۔ اس لیے باہمی تعلقات کی بہتری کے لیے ضروری ہے کہ میں اور آپ ایک دوسرے کی ذمے داریوں میں دخل نہ دیں۔ اختلاف ہو اور برداشت سے باہر نکلنے لگے تو شرافت سے ایک ماہ کا نوٹس دیں اور بات ختم کردیں۔ ورنہ یہ کچی بات ہے کہ میں آپ کی بے جا اور سخت باتیں خاموشی سے نہیں سن سکوں گا۔''

ضرورت اگر خان بہادر کو مجبور نہ کررہی ہوتی تو وہ اس لاٹ صاحب کے بچے رشید کو کان سے پکڑ کر باہر نکال دیتے مگر موجودہ صورتِ حال میں انہیں ایک جبریہ پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ رشید کی ہر شرط منظور کرنا پڑی مگر وہ اپنی بالادستی سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھے۔

''ایک بات تم بھی کان کھول کر سن لو۔'' وہ بولے۔ ''میں نے اصطبل کے انتظام کے لیے کچھ اصول بنائے ہیں۔ یہاں رہتے ہوئے تمہیں ان کی پابندی لازماً کرنا پڑے گی۔ تمہارے طرزِ عمل سے یہ ہرگز ظاہر ہونا چاہیے کہ اس جگہ کا مالک میں ہوں، تم نہیں ہو۔''

رشید اسی شام اکرم کے خالی کوارٹر میں اپنے مختصر سامان کے ساتھ آباد ہوگیا۔ اکرم کے قتل کا معاملہ پولیس کے لیے ہنوز ایک معما بنا ہوا تھا۔ مولا بخش نے خان بہادر صاحب کے تمام ملازموں سے سوالات کیے تھے مگر یہ ظاہر ہوا اس واردات کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ مولا بخش کے لیے ان میں سے کسی کو مجرم ثابت کرنا انتہائی مشکل تھا۔ اسے شبہ تھا کہ خان بہادر صاحب نے اپنے کسی ملازم کے ذریعے اکرم کو انتقام کا نشانہ بنایا تھا مگر اپنا شک درست ثابت کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ ایک دوسرے خیال کے پیشِ نظر مولا بخش نے اکبر خان سے بھی سوالات کیے۔ اکبر خان نے تسلیم کیا کہ وہ خان بہادر سے ملنے گیا تھا اور واقعی ان کے اصطبل اور گھوڑے کو خریدنے کے ارادے سے گیا تھا مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس نے اکرم کو رشوت دے کر برق رفتار کو ہرانے کی سازش کی تھی۔ نیز اسے یہ بھی علم نہیں کہ اکرم نے جیل سے ضمانت پر رہا ہونے کے بعد بینک میں بیس ہزار روپے جمع کرائے تھے یا

www.pkdigest.com

نہیں... اور اگر کرائے تھے تو یہ رقم اس کے پاس کہاں سے آئی۔ اکبر خان نے یہ اعتراف بھی کیا کہ جب وہ خان بہادر سے مل کر واپس آ رہا تھا، اس نے گیٹ سے کچھ فاصلے پر اکرم کو جاتے دیکھا تھا مگر ظاہر تھا کہ اسے اکرم سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی چنانچہ کوئی بات کیے بغیر وہ آگے بڑھ گیا۔ اس سوال کے جواب میں کہ اکرم بہرحال ایک بہترین جوکی تھا، کیا اس کے دل میں یہ خیال نہیں آیا کہ وہ خود اکرم کو ملازم رکھ لے؟ اکبر خان نے مسکراتے ہوئے کہا کہ کیا وہ اتنا ہی احمق تھا کہ اکرم کو ملازم رکھ کر خواہ مخواہ اپنے اوپر شبہ کرنے کی دعوت دیتا۔ اس کے علاوہ اکرم کو ایک سنگین الزام کے تحت نکالا گیا تھا۔ وہ خواہ کتنا ہی اچھا جوکی کیوں نہ رہا ہو، اس الزام کے بعد اسے کوئی اپنے ہاں ملازم رکھنے کی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔

☆☆☆

نرگس کو توقع تھی کہ شاید خان بہادر صاحب شہزادہ علی کا مشورہ مان لیں لیکن جب انہوں نے اختر کو بلا کر ہدایت کی کہ وہ حیدر آباد والی زمین کا سودا فلاں پارٹی سے طے کر لے تو یہ بات ظاہر ہو گئی کہ خان بہادر ہمیشہ کی طرح اب بھی اپنی من مانی کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ نئے جوکی رشید کو ملازم رکھنے کے بعد یہ بات کھل کر سامنے آ گئی کہ وہ سندھ والوں کی ریس میں برق رفتار کو دوڑانے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ نرگس کو اپنے والد کے فیصلے کے خلاف انتہائی غصہ تھا کہ وہ نہ صبح کے ناشتے میں شریک ہوئی اور نہ دوپہر کے کھانے پر نظر آئی۔ خان بہادر اپنے کمرے میں چلے گئے تو اختر نے نرگس کے کمرے کا رخ کیا۔

"میرا خیال ہے کہ اس دوڑ میں برق رفتار کے جیتنے کے امکانات سو فیصد نہیں تو ننانوے فیصد ضرور ہیں۔" اس نے کہا۔ "اور یہ بات آپ بھی جانتی ہیں کہ برق رفتار یہ ریس جیت گیا تو موجودہ حالات کو بدلتے ہوئے دیر نہیں لگے گی۔"

"میں اس ناجائز ذریعۂ آمدنی کو ہی پسند نہیں کرتی۔" نرگس نے جواب دیا۔ "ابا جان خواہ ریس سے لاکھوں کما لیں مگر میرا دل یہ تمام دولت پا کر بھی مطمئن نہیں ہو گا۔ امی جان... خدا انہیں جنت نصیب کرے... زندگی بھر اسی بات پر کڑھتی رہیں۔"

"پھر آپ چاہتی کیا ہیں؟" اختر نے سنجیدگی سے کہا۔

"اپنی تمام زندگی ریس کورس میں گزار کر آپ کو یہ توقع ہے کہ خان بہادر صاحب کوئی دوسرا کاروبار کر لیں گے تو اسے خوش فہمی ہی کہا جا سکتا ہے۔"

نرگس نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے اختر کی صورت دیکھتی رہی پھر آخرکار جیسے کوئی حتمی فیصلہ کرتے ہوئے بولی۔

"ایک بات پوچھوں... بشرطیکہ آپ صاف صاف جواب دینا پسند کریں؟"

"ایسی کیا بات ہے، جس کے لیے آپ کو اندیشہ ہے کہ میں اسے جھوٹ کے پردے میں چھپانے کی کوشش کروں گا؟"

"یہ بات ممکن ہے آپ کو عجیب محسوس ہو لیکن مستقبل کے بارے میں میری تمام پلاننگ کا جواب آپ کی جانب سے اس بات کے دوٹوک جواب پر منحصر ہے۔ سچ بتائیے، کیا آپ مجھے اس حد تک پسند کرتے ہیں کہ اپنی زندگی کا ساتھی بنانا گوارا کر لیں۔"

سوال اچانک ہونے کے باوجود غیر متوقع نہیں تھا۔ دونوں کے درمیان باقاعدہ اظہارِ محبت نہیں ہوا تھا مگر وہ ایک دوسرے کے لیے پسندیدگی کے جذبات سے آگاہ تھے۔ ساتھ اختر یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے اور خان بہادر کے درمیان جو فاصلہ ہے، وہ شاید کبھی ختم نہ کیا جا سکے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ نرگس کے اس سوال کا کیا جواب دے... اس نے ٹالنا چاہا کہ ابھی اس موضوع پر بات کرنے کے لیے حالات سازگار نہیں ہیں۔ نرگس نے یہ عذر تسلیم نہیں کیا۔ اختر نے پھر اپنے اور خان بہادر صاحب کے مالی، معاشرتی فرق کا ذکر کیا تو نرگس بھڑک اٹھی۔

"پھر وہی کم ہمتی... پھر وہی حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے سے فرار۔" وہ بگڑ کر بولی۔ "اگر آپ نے اپنی اس کمزوری پر قابو نہیں پایا تو مجھے سچ مچ افسوس ہو گا کہ میں نے ایک کمزور سہارے پر اپنا مستقبل تعمیر کرنے کی حماقت کی تھی۔"

"آخر آپ چاہتی کیا ہیں؟" اختر کھڑا ہو گیا۔

"کیا آپ مجھ سے شادی کر سکتے ہیں؟"

"اگر تمام حالات پر غور کرنے کے بعد بھی آپ مجھ سے اس سوال کا جواب چاہتی ہیں تو لعنت ہے مجھ پر کہ میں پھر بھی آگے بڑھ کر اس ذمے داری کو اٹھانے سے گھبراتا ہوں۔ خان بہادر کی خفگی کا خیال مجھے آپ کی وجہ سے تھا۔ جب آپ ان سے ٹکرانے کے لیے تیار ہیں تو میرے قدم ہرگز پیچھے نہیں رہیں گے۔"

"اختر!" دروازے سے ایک گرج دار آواز ابھری اور کمرے میں زلزلہ آ گیا۔ "نمک حرام... ذلیل، کمینے... میرے ٹکڑوں پر پل کر میرے ہی گھر میں نقب لگانے کی سازش کر رہا ہے۔"

نرگس اور اختر دونوں نے گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ خان بہادر صاحب خوں خوار نظروں سے اختر کو گھورتے ہوئے آگے بڑھے۔ ان کا سیدھا ہاتھ تیزی سے اٹھا، سر سے بلند ہوا اور پوری طاقت سے اختر کے منہ پر پڑا۔ چٹاخ... اختر کا منہ دوسری طرف گھوم گیا۔ خان بہادر صاحب نے پھر ہاتھ چلایا مگر اس مرتبہ اختر نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔

"خان بہادر صاحب!" اختر نے ایک جھٹکا دے کر ان کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ "میں آپ کو اپنا بزرگ سمجھتا ہوں۔ بہتر ہو گا کہ اپنی بزرگی کا بھرم رکھیں، زبان بے قابو نہ ہونے دیں ورنہ جواب دینا مجھے بھی آتا ہے۔"

"گستاخ... حرام زادے تو مجھے جواب دے گا۔" خان بہادر نے پھر ہاتھ اٹھایا مگر اس مرتبہ بجلی کی سی تیزی سے نرگس ان کے اور اختر کے درمیان آ گئی۔

"ابا جان!" وہ چیخی۔ "بس... ہاتھ روک لیں۔ برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔"

"بے حیا لڑکی... تو اپنے باپ کے مقابلے میں اپنے یار کی طرف داری کر رہی ہے۔" خان بہادر گرجے۔

"جو شخص مجھ میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکے، اس سے کسی معقولیت کی توقع بے کار ہے۔" نرگس نے سرخ ہوتے ہوئے جواب دیا۔ "میں آپ سے الجھنا نہیں چاہتی تھی مگر جب بات یہاں تک آ گئی ہے تو سن لیجیے کہ میں نے اپنے ساتھی کا انتخاب کر لیا ہے اور یہ میرا اٹل فیصلہ ہے۔"

"نکل جا یہاں سے بدکردار لڑکی۔ تیرے لیے میرے گھر میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ آج سے تو میرے لیے مر چکی ہے۔"

"میں آپ کی زبان سے یہی الفاظ سننا چاہتی تھی۔" نرگس، اختر کی طرف گھومی۔ "چلیے اختر صاحب۔"

"میں تجھے اپنی جائداد سے عاق کرتا ہوں۔"

"کون سی جائداد ابا جان!" نرگس کے لہجے میں طنز کی تیز کاٹ تھی۔ "کیا وہ جسے ہمارے بزرگوں نے خون پسینا بہا کر حاصل کیا تھا اور جسے آپ اپنا لایعنی شوق پورا کرنے کے لیے فروخت کر چکے ہیں؟"

"نکل جاؤ۔" خان بہادر حلق پھاڑ کر چیخے۔ "تم دونوں اسی وقت میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔"

نرگس دروازے کی طرف بڑھی۔ اختر پہلے ہی سے وہاں اس کا منتظر تھا۔ اچانک خان بہادر کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔

"کوٹھی میں قدم رکھنے کی کوشش مت کرنا۔" وہ گرجے۔

"وہ کوٹھی میری امی کی ہے اور انہوں نے اسے میرے نام چھوڑا ہے۔" نرگس نے پلٹ کر جواب دیا۔ "آپ یا دنیا کی کوئی طاقت مجھے وہاں جانے سے باز نہیں رکھ سکتی۔"

دروازے کے باہر اصطبل کا سارا ہی عملہ خان بہادر کے چیخنے کی آوازیں سن کر جمع ہو گیا تھا۔ اختر اور نرگس خاموشی سے قدم اٹھاتے ہوئے ان کے درمیان سے نکل گئے۔

☆☆☆

نرگس نے کوٹھی پہنچ کر شہزادہ علی سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی مگر شام کے چھ بجے سے پہلے کسی نے ریسیور نہیں اٹھایا۔

"ہیلو۔" نرگس نے کہا۔

"آپ کو بھی ہیلو۔" جواب ملا۔

"شہزادہ علی بات کر رہے ہیں؟"

"جی نہیں، یہاں کوئی شاہد علی نہیں رہتے۔ ہم ریاست ڈھیلا مار کے شہزادے علی قلی خان گفتگو فرما رہے ہیں۔"

"میں نرگس ہوں۔ کیا آپ اسی وقت کوٹھی آ سکتے ہیں؟"

"جی نہیں۔" شہزادے نے جواب دیا۔ "شام کے وقت آنے والے لڑکیوں کے اسی فیصد فون رانگ نمبر ہوتے ہیں اور باقی بیس فیصد بھی ان کے گھر پہنچنے پر رانگ نمبر ہی نکلتے ہیں۔"

"مگر مجھے آپ سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔" نرگس بولی۔ "آپ نہیں آ سکتے تو پھر میں آپ کے گھر آتی ہوں۔"

"آ جائیے۔ ہم انتظار کر رہے ہیں۔"

"مگر سنیے... آپ کے گھر کا پتا کیا ہے، میں کہاں آؤں؟"

"تھری ناٹ تھری۔ پرنس اسٹریٹ۔" شہزادے نے جواب دیا۔ "اب آپ مطلب پوچھیں گی تو اس کا مطلب ہے فلیٹ نمبر 30 اور بلڈنگ نمبر 3۔"

بلڈنگ نمبر تین پرنس اسٹریٹ ایک شان دار پانچ منزلہ عمارت تھی۔ فلیٹ نمبر 30 اس کی تیسری منزل پر تھا۔ اختر نے برقی گھنٹی کا بٹن دبایا تو ایک لمبی سی ڈاڑھی والے شخص نے دروازہ کھول کر جھانکا اور رعب دار لہجے میں بولے۔

"ہمیں کس نے پکارا ہے۔ پھر پکارو فریادی ہم آ گئے۔"

"ہم شہزادہ علی کی خدمت میں باریاب ہونا چاہتے ہیں۔" نرگس نے کہا۔ "کیا وہ اندر تشریف رکھتے ہیں۔"

www.pkdigest.com

''شہزادوں کا کام ہی تشریف رکھنا ہے، خواہ وہ اندر رکھیں یا باہر۔ مگر گھبراؤ نہیں لڑکی ہمارے ساتھ چلی آؤ۔ انصاف ضرور ہوگا۔''

بڑے میاں نرگس اور اختر کو ساتھ لیے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔

''بیٹھ جاؤ فریادی۔ ہم ابھی شہزادے کو تمہارے آنے کی اطلاع کرتے ہیں۔'' انہوں نے کہا اور دوسرے دروازے سے غائب ہو گئے۔ ایک منٹ بعد ہی شہزادہ علی کمرے میں داخل ہوا۔

''اوہ، آپ لوگ ہیں۔'' اس نے دیکھتے ہی کہا۔ ''ہم سمجھے کہ وہ صاحب زادی ہیں جنہوں نے کچھ دیر پہلے فون کیا تھا۔''

''فون تو میں نے کیا تھا۔''

''ہمارا بھی یہی خیال تھا۔'' شہزادے نے سر ہلایا۔ ''خیر، فرمایئے ہم آپ کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟''

''مجھے اپنے ذاتی معاملات کے لیے آپ کو پریشان کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔'' نرگس نے کہا۔ ''مگر نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس معاملے میں آپ ہی ہماری صحیح راہنمائی کر سکیں گے۔'' اور اس کے بعد نرگس نے دوپہر پیش آنے والا واقعہ تفصیل سے شہزادے کے سامنے دہرا دیا۔

''مجھے احساس ہے کہ ابا جان کے سامنے اس گستاخی سے پیش نہیں آنا چاہیے تھا۔'' اس نے آخر میں کہا۔ ''مگر آپ کو اندازہ نہیں ہو سکتا کہ بچپن سے اب تک ابا جان نے کس طرح معمولی سے معمولی بات میں بھی اپنی مرضی مسلط کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے ان کی شفقت سے انکار نہیں مگر اس شفقت کو انہوں نے اپنے جبر کے دبیز پردوں میں اس طرح چھپا رکھا ہے کہ وہ ظلم اور زبردستی نظر آتی ہے۔ اب تک انہوں نے میرے معاملات میں جس طرح چاہا فیصلہ کیا مگر میں زندگی کے سب سے اہم مسئلے پر ان کے غلط فیصلے کو قبول نہیں کر سکتی۔''

''آپ کی گفتگو نے ہمیں اس وقت ابا حضور کے دو قول یاد دلا دیے۔'' شہزادے نے گہری سانس لی۔ ''ایک قول ان سے اس وقت سرزد ہوا تھا جب وہ تختِ حکومت پر جلوہ افروز نہیں ہوئے تھے اور ہماری طرح محض شہزادہ کہلاتے تھے، تب انہوں نے فرمایا تھا کہ بہترین والدین وہ ہوتے ہیں جو اپنے بچوں کی تربیت کا فرض خود بچوں کے نظریات کے مطابق انجام دیں۔ مگر پندرہ سال بعد جب وہ خود والدین کی برادری میں شامل ہو چکے تھے، انہوں نے فرمایا کہ بہترین والدین انہیں سمجھنا چاہیے جو اپنے نظریات کے مطابق بچوں کی تربیت کا فرض انجام دینے پر قادر ہوں۔ آپ کا مسئلہ بھی والدین اور اولاد کے درمیان اس ہزاروں سال پرانی کشمکش سے کچھ مختلف نوعیت نہیں رکھتا۔ البتہ آپ نے اس کا فیصلہ جس انداز سے کرنے کی کوشش کی ہے، ہم اس سے اتفاق نہیں کریں گے۔ مگر اب تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ اس لیے ہمارا مشورہ ہے کہ آپ اس وقت نہیں تو کل شام مگر واپس چلی جائیں۔ مزید کوئی گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اول تو خان بہادر خود بھی آپ کو دیکھ کر یہی ظاہر کریں گے جیسے کچھ نہیں دیکھا۔ لیکن صورت اس کے برعکس ہو، تب بھی آپ صرف اتنی بات کریں کہ غلطی میری تھی۔ اس وقت جبکہ آپ کے ذہن پر پہلے ہی کافی بوجھ ہے، مجھے ایک نیا مسئلہ چھیڑ کر آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اب میں نے اپنی غلطی محسوس کر لی ہے۔ یہ کوئی ایسا معاملہ نہیں جسے کچھ دن ملتوی نہ کیا جا سکے۔''

اختر نے اس مشورے کی تائید کی اور نرگس نے وعدہ کیا کہ وہ کل ضرور واپس چلی جائے گی۔ شہزادے نے اختر کو منع کیا کہ وہ اس وقت بھی نرگس کے ساتھ گئی نہ جائے۔

''تو پھر میں کیا کروں؟'' اختر نے پوچھا۔

''آپ۔'' شہزادے نے منہ بنا کر جواب دیا۔ ''جب تک اس معاملے کا کوئی فیصلہ نہیں ہو جاتا، آپ ہمارے دولت خانے پر قیام فرمائیں اور مفت کی روٹیاں توڑیں۔ اس کے علاوہ آپ کر بھی کیا سکتے ہیں۔''

پریشانی کے باوجود نرگس اور اختر اس فقرے پر مسکرانے لگے۔

☆☆☆

نرگس نیچے اتری تو اس کی گھڑی میں شام کے آٹھ بج رہے تھے۔ اس نے ٹیکسی کے لیے سڑک پر ادھر اُدھر دیکھا۔ چند منٹ بعد ایک ٹیکسی بلڈنگ کے سامنے آ کر رکی۔ ایک صاحب اترے، ڈرائیور کو کرایہ ادا کیا اور عمارت میں چلے گئے۔ نرگس نے آگے بڑھ کر ڈرائیور سے سمن آباد چلنے کے بارے میں پوچھا۔ ڈرائیور نے اثبات میں سر ہلایا۔ نرگس پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ ٹیکسی کچھ ہی دور چلی تھی کہ نرگس نے سیٹ کے نیچے سے دھواں نکلتے دیکھا۔ اس نے ڈرائیور سے کہا۔

''میرے خیال سے جو صاحب ابھی اترے ہیں، وہ کوئی جلتا سگریٹ پھینک گئے ہیں۔'' ڈرائیور نے جواب دیا۔ ''ایک منٹ ٹھہریں، میں دیکھتا ہوں۔''

اس نے ٹیکسی ایک سائڈ پر روک دی۔ اپنی جگہ سے اتر کر نرگس کی طرف پہنچا۔

''یہ لیجیے منہ پر رومال رکھ لیں۔'' اس نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

نرگس نے ہاتھ بڑھا کر رومال لینا چاہا۔ ڈرائیور نے رومال اس کے ہاتھ میں دینے کے بجائے پھرتی سے رومال اس کی ناک سے لگا دیا۔ نرگس گھبرا کر پیچھے ہٹی مگر اتنی دیر میں ڈرائیور کے مضبوط ہاتھ اس کے چہرے کو اپنی گرفت میں لے چکے تھے۔ ایک منٹ سے بھی کم وقفے میں نرگس بے ہوش ہو چکی تھی۔ ڈرائیور نے اسے سیٹ پر لٹا دیا اور دروازہ بند کر کے اپنی جگہ آ بیٹھا۔ ٹیکسی پھر آگے بڑھی مگر اس کا رخ سمن آباد کی طرف نہیں تھا۔

☆☆☆

دوسرے دن صبح ابھی شہزادہ علی اور اختر ناشتا کر رہے تھے کہ انسپکٹر مولا بخش آ گیا۔ اس کے چہرے سے تھکن اور شب بیداری کے اثرات ظاہر تھے۔

''شکر ہے۔'' اس نے اختر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کہ آپ یہاں مل گئے۔''

''بات کیا ہے؟'' شہزادے نے پوچھا۔

''کل رات خان بہادر صاحب کا فون ملا کہ کسی نے ان پر گولی چلائی ہے۔'' مولا بخش نے اختر کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''چنانچہ شام نگر بھاگنا پڑا۔''

''کیا کہہ رہے ہیں انسپکٹر صاحب!'' اختر چونکا۔

''آپ کا مطلب ہے کہ کسی نے خان بہادر ولی محمد خان پر گولی چلائی ہے... وہ خیریت سے تو ہیں؟ خدانخواستہ کوئی خطرناک زخم تو نہیں آیا۔ گولی کس نے چلائی تھی؟''

''آپ نے تو ایک ہی سانس میں اتنے بہت سے سوالات کر ڈالے۔'' مولا بخش عجیب انداز سے مسکرایا۔

''ہم سمجھتے ہیں کہ آپ محض یہ خبر سنانے تو یہاں نہیں آئے ہوں گے۔'' شہزادے نے غور سے مولا بخش کی طرف دیکھا۔

''آپ کا خیال درست ہے۔'' مولا بخش نے کہا۔ ''میں خان بہادر صاحب کا فون پاتے ہی شام نگر پہنچا۔ خان بہادر صاحب بہ خیریت تھے۔ گولی بالکل ان کے قریب سے نکل گئی تھی۔ ان سے معلوم ہوا کہ کل دوپہر کو ان کا اپنی بیٹی نرگس سے زبردست جھگڑا ہو گیا تھا۔ نرگس اختر صاحب سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ خان بہادر صاحب اس کے خلاف تھے۔ جھگڑے کے نتیجے میں انہوں نے بیٹی کو گھر سے نکال دیا اور وہ یہاں اپنی ماں کی طرف سے ملنے والی کوٹھی میں آ گئی۔ اختر صاحب بھی اس کے ساتھ چلے گئے۔ خان بہادر صاحب کے دل پر اس صدمے کا بہت گہرا اثر تھا۔ اس پریشانی میں وہ رات کے گیارہ بجے بھی جاگ رہے تھے۔ کمرے کی کھڑکی جو کہ باہر میدان میں کھلتی ہے، اس وقت بھی کھلی ہوئی تھی۔ اچانک انہوں نے دھماکے کی آواز سنی اور فوراً کوئی جلتی ہوئی چیز سن سے ان کے چہرے کے برابر سے نکل گئی۔ وہ لپک کر کھڑکی کے پاس پہنچے اور انہوں نے دور میدان میں کسی شخص کو بھاگتے دیکھا۔ وہ اسے یقینی طور پر تو شناخت نہیں کر سکے مگر انہیں شبہ ہے کہ وہ اختر صاحب تھے۔ گولی خان بہادر کے پیچھے دیوار میں پیوست ہو گئی تھی میں نے اسے نکالا۔ وہ اعشاریہ 32 بور کے ریوالور کی گولی ہے۔ باہر میدان میں ایک فونٹین پین بھی پڑا ملا جس پر اختر صاحب کا نام کھدا ہوا ہے۔ فونٹین پین دیکھتے ہی خان بہادر نے واضح طور پر اختر کے خلاف قاتلانہ حملے کا الزام عائد کیا اور مجھ پر زور دیا کہ میں فوراً انہیں حراست میں لے لوں۔ میں پہلے کوٹھی گیا مگر ملازموں سے معلوم ہوا کہ نرگس اور اختر دونوں کل شام آپ سے ملنے گئے تھے اور اب تک واپس نہیں آئے ہیں۔''

اختر یہ سن کر چونکا کہ نرگس کوٹھی واپس نہیں پہنچی مگر اس نے سوچا شاید وہ شام نگر چلی گئی ہو۔ لیکن مولا بخش نے بتایا کہ نرگس وہاں بھی نہیں تھی۔ اختر فطری طور پر گھبرا گیا۔

''بیٹھ جایئے۔'' مولا بخش نے سخت لہجے میں کہا۔ ''وہ بچی نہیں ہیں کہ کہیں گم ہو جائیں۔ آپ میرے سوال کا جواب دیں۔''

''خان بہادر صاحب کو غلط فہمی ہوئی ہے۔'' اختر بولا۔ ''میں کل شام سے شہزادہ علی کا مہمان ہوں اور ابھی تک قدم باہر نہیں نکالا۔''

''پھر وہ فونٹین پین میدان میں کیسے پہنچ گیا؟''

''میں کیا بتا سکتا ہوں۔ وہ میرے کمرے میں تھا۔ جھگڑے کے بعد مجھے اپنے کمرے میں واپس جانے کا موقع نہیں ملا اور میں نرگس کے ساتھ یہاں آ گیا۔''

''آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں۔'' مولا بخش نے شہزادہ علی کی طرف دیکھا۔ ''کیا اختر صاحب کل شام سے کسی بھی وقت باہر نہیں گئے؟''

''ہم اس بیان کی تائید کرتے ہیں۔''

''آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟ ظاہر ہے آپ ان کی چوکیداری تو نہیں کرتے رہے ہوں گے۔''

www.pkdigest.com

''ابھی دروازے پر تمہاری ملاقات آغا صاحب سے تو ہوئی ہوگی؟''

''آپ کا مطلب ہے وہ نکی سا ملازم جو شعروں میں بات کرتا ہے۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ چھ بجے ہیں صبح کا ہنگام ہے، ناشتا کرتا ہے یا کچھ کام ہے...''

''بالکل وہی۔'' شہزاد نے بات کاٹی۔ ''کل شام وہ شہنشاہ جہانگیر بنے ہوئے تھے اور رات بھر اختر صاحب کے کمرے کے سامنے پنگ ڈالے بیٹھے رہے کہ کوئی کنیز ملکہ عالم نور جہاں کو اس کھانے کے بجائے جو قیدیوں کو دیا جاتا ہے، شاہی کھانے نہ پہنچا دے۔''

''بہت خوب۔'' مولا بخش نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''سردست میں اختر صاحب کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر رہا ہوں مگر یہ اطلاع دیے بغیر شہر چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔''

''آپ نے نرگس کے بارے میں مجھے پریشانی میں ڈال دیا ہے۔'' اختر نے کہا۔ ''میری درخواست ہے کہ آپ فوری طور پر ان کا پتا لگانے کی کوشش کریں۔''

''آپ پریشان نہ ہوں۔'' مولا بخش نے جواب دیا۔ ''میرے خیال میں ان کی یہ گمشدگی بھی معنی خیز ہو سکتی ہے۔ کھڑکی کے باہر میدان میں اندھیرا تھا۔ ممکن ہے خان بہادر نے جس فرد کو بھاگتے دیکھا وہ کوئی مرد نہ ہو، عورت ہو۔''

☆☆☆

مولا بخش کے رخصت ہونے کے بعد اختر، نرگس کی دو تین سہیلیوں کے گھر اسے تلاش کرنے چلا گیا۔ مگر نرگس کہیں بھی نہیں تھی۔ وہ اسے دن بھر تلاش کرتا رہا پھر تھکن اور پریشانی سے مایوس و دل شکستہ وہ ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں جا کر بیٹھ گیا۔ بدمزہ چائے کو حلق سے اتارتے ہوئے اس نے چونک کر اس شخص کو دیکھا جو اچانک اس کے سامنے بیٹھ گیا تھا۔ اس کے کوٹ کے کالر کھڑے ہوئے تھے۔ گھنی مونچھوں نے پورا دہانہ چھپا لیا تھا۔ آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ تھا اور سر پر ٹیکسی ڈرائیوروں جیسی کیپ تھی۔

''میرا نام دلاور ہے۔'' وہ بولا۔ ''میں خان بہادر صاحب کا پرانا زخم خوردہ ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ ان کی بیٹی نرگس اور تم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو۔ جب خان بہادر نے دیکھا کہ ایک معمولی حیثیت کا آدمی ان کی بیٹی اور بیٹی کے ساتھ اس کی جائداد بھی لیے جا رہا ہے... اور وہ کسی شریفانہ طریقے سے اس شکست کا انتقام نہیں لے سکتے تو انہوں نے خود اپنی بیٹی کو اغوا کرا لیا۔''

اختر کے ہاتھ سے چائے کی پیالی چھوٹتے چھوٹتے بچی۔

''نرگس کو خان بہادر نے اغوا کرایا ہے؟'' بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

''اگر ایسا نہیں ہے تو پھر بتاؤ وہ کہاں ہے؟ خان بہادر کی شاطرانہ چال بھی قابل داد ہے۔ ایک جانب انہوں نے بیٹی کو اغوا کیا، دوسری طرف خود کھڑکی سے باہر کھڑے ہو کر گولی چلائی۔ تمہارا قلم میدان میں ڈال دیا۔ پولیس تحقیقات کے لیے پہنچی تو واضح طور پر تم پر شبہ ظاہر کیا تاکہ پولیس تمہیں گرفتار کر لے۔ سزا نہ بھی ہو تو بیٹی سے یہ کہنے کی گنجائش نکل آئے کہ جس شخص نے باپ پر گولی چلائی کیا بیٹی اسی سے شادی کرے گی۔ تمہارے جیل جاتے ہی نرگس بھی واپس پہنچا دی جائے گی اور غالباً اسے یہ تاثر دینے کی کوشش کی جائے گی کہ اس کے اغوا میں بھی تمہارا ہاتھ تھا۔''

''مجھے خان بہادر سے اس ذلالت کی امید نہیں تھی۔'' اختر کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔

''کیا ان حالات میں تمہارا ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہنا مناسب ہوگا... کیا شریف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی ظلم کے خلاف احتجاج بھی نہ کرے؟''

''میں خان بہادر کو اس مکاری کا مزہ چکھا دوں گا۔'' اختر نے غصے سے کہا۔ ''میں اس ظلم کا ایسا انتقام لوں گا کہ وہ زندگی بھر یاد رکھیں گے۔''

''شاباش میرے دوست... یہ ہے وہ جذبہ جس سے سرمایہ دار کی نانی مرتی ہے۔'' دلاور نے پُرجوش لہجے میں داد دی۔ ''میں اب تک اس ظالم کے خلاف اکیلا تھا۔ تم ساتھ دینے کا وعدہ کرو تو ہم خان بہادر کی ہر چال کا جواب دے سکتے ہیں۔''

''میں تیار ہوں۔ بتاؤ مجھے کیا کرنا ہوگا؟'' اختر نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

دلاور کے ہونٹوں پر ایک پُراسرار تبسم ظاہر ہوا اور وہ اختر کی جانب جھک کر سرگوشیوں میں کچھ کہنے لگا۔

☆☆☆

ڈی ایس پی مولا بخش پر بگڑ رہے تھے کہ جو کی اکرم کے قاتل کو پکڑنا تو درکنار وہ قاتل کے بارے میں کوئی اندازہ بھی نہیں لگا سکا۔ خان بہادر صاحب پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ انہوں نے صاف الفاظ میں اختر کے خلاف شبہے کا اظہار کیا مگر ابھی تک اسے بھی گرفتار نہیں کیا گیا۔ کیپٹن شہزاد بھی اس موقع پر موجود تھا۔ اس نے مولا بخش کی حمایت کی کہ یہ معاملہ ہی بہت الجھا ہوا ہے۔ مولا بخش کو بھی جواب دینے کا حوصلہ ہوا۔ اس نے بتایا کہ شہزادہ علی کے بیان کے مطابق اختر اس رات ان کے گھر تھا اور ایک منٹ کے لیے بھی باہر نہیں نکلا۔ بغیر کوئی ٹھوس ثبوت اسے کیسے گرفتار کیا جا سکتا ہے۔

''نرگس کا کچھ پتا چلا؟'' ڈی ایس پی نے سوال کیا۔

''جی نہیں، سب جگہ تلاش کر چکا ہوں مگر کچھ معلوم نہیں ہوا۔''

''آپ کا ان معاملات کے بارے میں کیا خیال ہے کیپٹن؟'' ڈی ایس پی نے شہزاد کی طرف دیکھا۔

''حقیقت یہ ہے کہ میں بھی ابھی تک کوئی واضح نظریہ قائم نہیں کر سکا ہوں۔'' کیپٹن شہزاد نے جواب دیا۔

''ان دنوں شہزادہ علی کے بارے میں بہت کچھ سننے میں آ رہا ہے۔ آخر یہ ہیں کون؟''

''کہا جاتا ہے کہ ریاست ڈھیلا مار کے شہزادے ہیں اور یہاں تعلیم حاصل کرنے آئے ہیں۔''

''اسی بات سے مجھے شبہ ہوتا ہے کہ ان کی حقیقت وہ نہیں جو ظاہر کرتے ہیں۔'' ڈی ایس پی نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''کسی دشمن ملک کے جاسوس تو نہیں ہیں؟''

''ایسی کوئی بات نہیں۔'' کیپٹن شہزاد نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ''میں انہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ واقعی ایک ریاست کے شہزادے ہیں مگر اس کا نام انہوں نے نظریہ طور پر ڈھیلا مار رکھا ہوا ہے۔ اکثر ریاستوں میں جس قسم کے حالات ہیں، وہ آپ بھی جانتے ہیں۔ یہ حضرت انسانی مساوات کے قائل ہیں۔ آئے دن والد بزرگوار سے الجھتے رہتے تھے کہ یہ ہونا چاہیے اور یہ نہیں ہونا چاہیے۔ نواب صاحب نے تنگ آ کر انہیں تعلیم حاصل کرنے کے بہانے یہاں بھیج دیا۔ اب یہ خود بھی جانے سے کتراتے ہیں کہ خوامخواہ جھگڑے پیدا ہوں گے۔''

''معلوم ہوتا ہے آپ انہیں بہت قریب سے جانتے ہیں؟''

''کچھ ایسی ہی بات ہے۔'' کیپٹن نے ٹالنے کے انداز میں کہا۔ ''آپ ان کی فکر چھوڑیں۔ امید ہے وہ بھی آپ کے لیے دردسر ثابت نہیں ہوں گے۔ جہاں تک موجودہ واقعات کا تعلق ہے تو میرا مشورہ ہے کہ آج ریس کورس میں انسپکٹر صاحب اور دو چار کانسٹیبلوں کی ڈیوٹی خاص طور پر لگوا دیں۔''

''کیا آپ کو خطرہ ہے کہ کوئی ناخوش گوار واقعہ نہ پیش آ جائے؟''

''کچھ ایسی ہی بات ہے۔'' کیپٹن شہزاد نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یہ تمام متفرق واقعات... اکرم کے قتل کے علاوہ... ایک ہی سلسلے کی کڑی محسوس ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ سلسلہ ابھی کسی کلائمکس پر نہیں پہنچا اس لیے پس پردہ جس کا بھی ہاتھ ہے، وہ ممکن ہے آج کوئی ہنگامہ کھڑا کرنے کی کوشش کرے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ برق رفتار آج کی ریس میں دوڑ رہا ہے۔ پچھلی ریس میں وہ جس طرح طوفان سے پیچھے رہ گیا تھا یا دانستہ رکھا گیا تھا، اس کے پیش نظر احتیاط کر لینا بہتر ہے۔''

☆☆☆

ریس کورس میں آج گزشتہ اتوار سے کہیں زیادہ رش تھا۔ اخبارات کے ذریعے یہ داستان پبلک تک پہنچ گئی تھی کہ برق رفتار جو کی اکرم کی سازش کی وجہ سے ہارا تھا۔ دبے الفاظ میں اکبر خان پر بھی شبہ ظاہر کیا جا رہا تھا۔ کلب کی انتظامی کمیٹی کا ایک اجلاس بھی ہو چکا تھا کہ کیوں نہ گزشتہ ریس کے نتیجے کو کالعدم قرار دے دیا جائے۔ فیصلہ یہ کیا گیا کہ آج کی ریس میں ایک بار پھر برق رفتار اور طوفان کی دوڑ دیکھ کر حتمی رائے قائم کرنا مناسب ہوگا۔ ان خبروں کی وجہ سے برق رفتار پر لگنے والی شرطوں کی شرح اور رقم کی تعداد میں زبردست اضافہ ہوا تھا۔ مولا بخش چار سادہ لباس کانسٹیبلوں کے ساتھ خان بہادر کے ساتھ ہی لگا ہوا تھا۔ ریس شروع ہونے میں کچھ وقت باقی تھا۔ اچانک لاؤڈ اسپیکر پر یہ اعلان ہوا کہ گھوڑا طوفان مشق کے دوران اگلے پیر میں چوٹ آ جانے کی وجہ سے ریس میں شامل نہیں ہوگا۔ اعلان سن کر خان بہادر اچھل پڑے۔ مولا بخش نے مبارک باد دی کہ اب برق رفتار کی جیت میں کوئی شبہ باقی نہیں رہا تھا۔

''شبہ پہلے بھی نہیں تھا۔'' خان بہادر صاحب پھولے نہیں سما رہے تھے۔ ''اکرم غداری نہ کرتا تو یہ بات پچھلی ریس میں ہی ثابت ہو جاتی۔ اکبر یہ بات جانتا ہے، مجھے شک ہے کہ اس اعلان میں کوئی حقیقت ہو۔ اس نے محض اپنے گھوڑے کو شکست کی ذلت سے بچانے کے لیے یہ بہانہ تراشا ہے۔''

ضروری چیکنگ کے بعد گھوڑے ان خانوں میں جانے لگے جہاں سے انہیں ریس شروع کرنا تھی۔ رشید بھی برق رفتار کی لگام پکڑے آگے بڑھا۔ خان بہادر اور مولا بخش گھوڑے کے ساتھ ساتھ تھے۔ برق رفتار گھاس کی روش کا نصف فاصلہ ہی طے کر پایا تھا کہ کنارے کھڑے لوگوں میں کچھ حرکت ہوئی۔ دوسرے لمحے دھوپ کا چشمہ لگائے ایک

www.pkdigest.com

نوجوان بھیڑ سے باہر نکلا۔ جیسے ہی برق رفتار اس کے قریب سے گزرا نوجوان کا سیدھا ہاتھ بلند ہوا۔ تب پاس کھڑے لوگوں نے دیکھا کہ اس میں ایک چھوٹا سا ریوالور دبا ہوا ہے۔ جوکی رشید برق رفتار کے دوسری جانب تھا۔ اچانک نوجوان نے ہاتھ کو حرکت دی۔ دھماکا ہوا۔ ریوالور کی نال سے ایک شعلہ خان بہادر کی طرف لپکا۔ برق رفتار اچھل کر پچھلی دونوں ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ آس پاس کھڑے لوگ کائی کی طرح پھٹ گئے۔ نوجوان نے ایک فائر پر بس نہیں کیا، وہ مسلسل ٹریگر دباتا چلا گیا۔ برق رفتار اور خان بہادر ایک ساتھ گرے۔

''اختر۔'' خان بہادر گرتے گرتے چلائے۔ ''بزدل، کمینے، نمک حرام!''

''حیدر خان۔'' مولا بخش چیخا۔ ''پکڑنا... بچ کے نہ نکلنے پائے۔''

مگر مسلح اختر کے قریب آنے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔ وہ فائر بھی لگاتار کر رہا تھا۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ۔ ایک دم اختر پلٹا اور تماشائیوں کے پویلین کی طرف بھاگنے لگا۔ مولا بخش اور چاروں کانسٹیبل جو زمین پر لیٹ گئے تھے، اٹھ کر اختر کی طرف لپکے۔ اختر نے ریوالور جیب میں رکھ لیا تھا اور خود بھی پکڑنا جانے نہ پائے کی آوازیں لگاتے ہوئے بھاگ رہا تھا۔ لوگ اسے دیکھتے اور پھر کسی اور شخص کی تلاش میں ان کی نگاہیں آگے بڑھ جاتیں۔ اختر جلد ہی ریس کورس کے ہجوم میں نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اس بھرے مجمع میں اسے تلاش کرنا انتہائی مشکل تھا۔ مولا بخش نے کانسٹیبلوں کو گیٹ پر بھیج دیا اور خود واپس لوٹ گیا۔

ریس کلب کا ڈاکٹر اور فرسٹ ایڈ کا عملہ پہنچ گیا تھا۔ مولا بخش نے دیکھا کہ برق رفتار دو گولیاں کھا کر ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ جوکی رشید اس کی لاش کے پاس سر جھکائے بیٹھا تھا۔ خان بہادر صاحب کے بھی ایک گولی لگی تھی، بائیں شانے سے کچھ نیچے۔ وہ بے ہوش ہو گئے تھے۔ برق رفتار کو گولی مار دی گئی۔ جنگل کی آگ کی طرح یہ خبر پورے ریس کورس میں پھیل گئی۔ لوگ اصطبل کی طرف دوڑ پڑے۔ کلب کا عملہ اور چند کانسٹیبل اس ہجوم کو روکنے کے لیے ناکافی تھے۔ مولا بخش نے فون کر کے ایمبولینس اور پولیس کی بھاری نفری طلب کر لی۔ ایک دستے کو آس پاس کے تمام راستوں اور علاقوں میں پھیلا دیا گیا مگر اختر کو فرار ہونے کے لیے اتنا وقت مل گیا تھا کہ اب اس کا پکڑا جانا ناممکن ہی تھا۔

موقع واردات کی تصاویر وغیرہ لے کر خان بہادر صاحب کو اسپتال بھیج دیا گیا۔ کلب کی انتظامیہ نے ریس ملتوی کیے جانے کا اعلان کر دیا۔ برق رفتار کی لاش اٹھوا دی گئی۔ فارغ ہوتے ہی مولا بخش شہزادہ علی کی قیام گاہ بھاگا۔ مگر نہ شہزادے کا پتا تھا نہ اختر کا... البتہ آغا قیامت موجود تھے۔ ان کے گرج دار مکالموں کے دوران مولا بخش جو کچھ سمجھ سکا، وہ یہ تھا کہ اختر کل صبح ناشتے کے بعد گھر سے نکلا تھا اور پھر واپس نہیں لوٹا اور شہزادے کے معمولات بھی لگے بندھے انداز میں نہیں چلتے تھے، وہ کئی کئی دن تک بھی گھر نہیں آتا تھا۔

پولیس ہیڈ کوارٹر میں کیپٹن شہزاد بھی موجود تھا۔ مولا بخش کی تمام رپورٹ سننے کے بعد اس نے صرف ایک سوال پوچھا۔ ''تمہارے بیان کے مطابق اختر نے پانچ گولیاں چلائیں۔ ایک خان بہادر صاحب کے شانے میں لگی اور دو برق رفتار گھوڑے کے۔ باقی دو گولیاں کہاں گئیں... تم نے انہیں تلاش کیا؟''

مولا بخش کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ اس کا تو اسے خیال ہی نہیں آیا تھا۔ اس نے سر جھکا کر نفی میں جواب دیا۔

''تو جاؤ اور اسی وقت انہیں تلاش کرو۔ غالباً اصطبل پر پولیس کا پہرا تو ابھی قائم ہوگا۔''

''جی... جی ہاں۔'' مولا بخش نے جواب دیا۔ حالانکہ اس میں بھی اس کی عقل مندی کا دخل نہیں تھا۔ بس وہ پہرا ختم کرنے کے بارے میں ہدایت دینا بھول گیا تھا۔

وہ فوراً ریس کورس بھاگا۔ شام ہو گئی تھی۔ سرچ لائٹس کی روشنی میں پورے دو گھنٹے تک اس روش کے آس پاس جہاں فائرنگ ہوئی تھی میدان کا ایک ایک انچ چھان مارا۔ مگر باقی دو گولیاں یوں معلوم ہوتا تھا جیسے چلائی ہی نہ گئی ہوں۔

☆☆☆

اسپتال میں خان بہادر صاحب کو ہوش آیا۔ انہوں نے اپنی تباہی کی سازش کا ذمے دار اکبر خان کو ٹھہرایا کہ جوکی اکرم اور اختر اس کے آلۂ کار تھے۔ نرگس کا اغوا بھی ان کے خیال میں اکبر خان نے کرایا تھا۔ وہ کسی بھی طرح برق رفتار کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ثبوت میں خان بہادر نے ایک فون کال کے بارے میں بتایا جو انہیں صبح کی گئی تھی۔ کسی شخص نے اکبر خان کی جانب سے انہیں دھمکی دی تھی کہ انہوں نے برق رفتار کا سودا اکبر خان سے نہیں کیا تو نرگس کو جان سے مار دیا جائے گا۔ یہ بھی کہا گیا تھا کہ اس کی اطلاع پولیس کو دی گئی تو شام تک نرگس کی لاش ان کے پاس پہنچا دی جائے گی۔

اسی وقت نرگس آکر باپ کے سینے سے لپٹ کر آنسو

بہانے لگی۔ بیٹی کو دیکھ کر خان بہادر صاحب کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔

''تمہیں تو خوش ہونا چاہیے بیٹی۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔ ''تم جو کچھ چاہتی تھیں وہی تو ہوا ہے۔ آج تمہارا باپ کوڑی کوڑی کا محتاج ہے۔ ایک پل میں اس سے سب کچھ چھین لیا گیا۔ اور یہ کارنامہ اس شخص نے انجام دیا ہے جسے تم نے اپنی زندگی کا ساتھی بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔''

''نہیں ابا جان! اختر ایسا کبھی نہیں کر سکتے۔'' نرگس نے جواب دیا۔

''کیا اس لیے کہ تم کہہ رہی ہو... اسے ہزاروں آنکھوں نے مجھ پر اور برق رفتار پر گولی چلاتے دیکھا ہے۔ میں تو سمجھا تھا کہ تم اپنی غلطی پر نادم ہو گی مگر تم تو اب بھی زخموں پر نمک پاشی کر رہی ہو۔''

''آپ اب تک کہاں تھیں؟'' مولا بخش نے پوچھا۔

''مجھے اکبر خان کے آدمیوں نے اغوا کیا تھا۔'' نرگس نے جواب دیا۔ ''شہزادہ علی کے فلیٹ سے اتر کر ایک ٹیکسی میں بیٹھی تو پچھلی سیٹ سے دھواں نکلتے دیکھا۔ ڈرائیور کو بتایا تو اس نے بہانہ پیش کیا کہ کوئی مسافر جلتا ہوا سگریٹ چھوڑ گیا ہے۔ پھر ٹیکسی روک کر مجھے رومال دینے کے بہانے کی آڑ میں زبردستی کلوروفام سے بھیگے ہوئے رومال سے بے ہوش کر دیا۔ آنکھ کھلی تو میں کسی مکان کے ایک کمرے میں بند تھی۔ ایک نوجوان جس کی گھنی مونچھوں نے بیشتر منہ چھپا رکھا تھا اور جو رات ہونے کے باوجود دھوپ کا چشمہ لگائے ہوئے تھا اندر آیا اور بتایا کہ مجھے اکبر خان کی ہدایت پر اغوا کیا گیا ہے۔ اگر میں بھاگنے کی کوشش نہ کروں تو وہ میرے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کریں گے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ مجھے اس وقت تک یہاں رہنا ہوگا جب تک اکبر خان، خان بہادر سے اصطبل کا سودا نہیں کر لیتا۔ دو دن اور دو راتیں میں وہاں قید رہی۔ آج وہ نوجوان پھر آیا اور بولا کہ چونکہ برق رفتار کو گولی مار دی گئی ہے، اس لیے مجھے مزید قید میں رکھنے سے کوئی فائدہ نہیں اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر سوسائٹی کے علاقے میں چھوڑ دیا گیا۔ پہلے میں کوٹھی گئی تو وہاں سے معلوم ہوا کہ اختر نے ابا جان پر گولی چلائی ہے اور ابا جان اسپتال میں ہیں۔ چنانچہ میں یہاں بھاگی چلی آئی۔ اختر صاحب نے اگر گولی چلائی ہے تو اکبر خان نے انہیں ضرور کوئی فریب دے کر یا بہکا کر یہ کام کرایا ہوگا۔''

''اس نوجوان کا نام کیا تھا؟'' مولا بخش نے پوچھا۔

''مجھے معلوم نہیں۔''

''آپ نے کسی اور کو اس گھر میں نہیں دیکھا؟''

''جی نہیں۔ دوسرے کمرے سے کبھی کبھی دو یا دو سے زیادہ آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز ضرور آتی تھی۔''

''ان آوازوں میں اختر کی آواز تو شامل نہیں تھی؟''

''جی نہیں۔ یہ سوال آپ نے اس خیال سے پوچھا ہے کہ میرے اغوا میں اختر صاحب کا ہاتھ تھا یا نہیں... تو میں پرزور الفاظ میں اس کی تردید کروں گی۔''

''آپ اس نوجوان کو دوبارہ دیکھیں تو پہچان لیں گی؟''

''بہت مشکل ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ میک اپ زدہ شکل میں میرے سامنے آتا تھا۔''

مولا بخش اسپتال سے سیدھا ڈی ایس پی کے پاس گیا۔ وہ اکبر خان کو گرفتار کرنا چاہتا تھا۔ کیپٹن شہزاد بھی وہاں موجود تھا اور مولا بخش نے اطمینان کی سانس لی کہ اس نے بھی اکبر خان کو حراست میں لینے کی مخالفت نہیں کی۔ اسی رات تقریباً ساڑھے بارہ بجے اکبر خان کو اس کے مکان سے گرفتار کر لیا گیا۔

☆☆☆

اکبر خان نے بیرسٹر قریشی کو اپنا وکیل مقرر کیا جو مانے ہوئے فوجداری وکیل تھے۔ پولیس کے پاس اکبر خان کے خلاف جرم ثابت کرنے کے لیے کوئی ٹھوس براہ راست ثبوت نہیں تھا۔ ڈی ایس پی بھی فکرمند تھا۔ مگر کیپٹن شہزاد کے مشورے پر اکبر خان کے خلاف ایک ہفتے کا ریمانڈ حاصل کر لیا گیا اور اخبارات میں ایسی خبریں دی گئیں جیسے پولیس کے پاس اکبر خان کے خلاف یقینی ثبوت موجود ہے۔ اختر کو اور اس نوجوان کو جس نے نرگس کو اغوا کیا تھا، بڑی سرگرمی سے تلاش کیا جا رہا تھا۔ نرگس کو اب بھی اصرار تھا کہ اختر اس تمام معاملے میں بے قصور ہے۔

کیفے سکون میں شہزادہ علی اور نرگس بیٹھے ہوئے تھے کہ شریف بھی آگیا۔

''آئیے تشریف لائیے۔'' شہزادے نے کہا۔ ''ہم نے محترمہ نرگس سے شرط لگائی تھی کہ اگر تم چائے آنے سے پہلے آگئے تو وہ ہمیں ایک دعوت کھلائیں گی اور بعد میں آئے تو ہم ان سے دعوت کھائیں گے۔''

''جی۔'' نرگس چونکی۔ ''شرط تو کوئی طے نہیں ہوئی تھی... اور پھر ایسی شرط۔''

''شہزادہ علی کی شرطیں عموماً اسی طرح کی ہوتی ہیں۔'' شریف نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''ایک دن ملے تو فرمانے لگے،

www.pkdigest.com

بھئی وہ شرط کے سو روپے کب دے رہے ہو۔ میں نے حیرت سے پوچھا کیسی شرط۔ تو بولے تم نے شرط لگائی تھی نا کہ اگر محکمۂ موسمیات کی پیش گوئی کے مطابق 31 جون کو بارش نہ ہوئی تو ہم تم سے سو روپے لیں گے اور بارش ہوگئی تو محکمۂ موسمیات کے بھی پیش گوئی کرنے کی پاداش میں تم ہمیں سو روپے ادا کرو گے۔''

''اکتیس جون کو۔'' نرگس ہنسنے لگی۔

''جی ہاں۔ اسی بات پر تو جاں بخشی ہوئی۔ میں نے توجہ دلائی کہ جون میں اکتیس تاریخ کہاں ہوتی ہے۔ شہزادے صاحب پہلے تو سر کھجاتے رہے پھر چونک کر فرمایا کہ اس سال چونکہ لیپ ایئر ہے اس لیے جون میں ایک دن بڑھا دیا گیا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ وہ دن جون میں نہیں فروری میں بڑھایا جاتا ہے۔ کہنے لگے پہلے یہی قاعدہ تھا مگر اس سال سے تبدیل کر دیا گیا ہے۔ تم روپے دینا نہیں چاہتے تو مت دو مگر جون میں اکتیس تاریخ ضرور ہوتی تھی۔''

نرگس نے ہنستے ہوئے شہزادے کی طرف دیکھا۔

''ہمیں یوں نہ دیکھیے۔'' شہزادہ علی نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''جون نہیں تو جولائی کا مہینا ہوگا۔ ہم کوئی منجم یا جوتشی نہیں ہیں کہ ہر مہینے کے دنوں کی صحیح تعداد یاد رکھیں۔''

''اچھا چلیے، اسے جانے دیں۔ مگر اس وقت بھلا کون سی شرط طے ہوئی تھی؟''

''ضرور ہوئی تھی۔'' شہزادے نے جواب دیا۔ ''ہم نے اپنے دل میں طے کر لیا تھا کہ یا تو آپ ہمیں دعوت کھلائیں گی یا ہم آپ سے دعوت کھائیں گے... اور اگر ہمارے دل کی بات آپ کے لیے قابل قبول نہیں ہے تو پھر ہم آپ کے دل کی بات کیوں مانیں کہ اتنے ثبوت اور گواہ موجود ہونے کے باوجود اختر صاحب بے گناہ ہیں۔''

''آپ اختر صاحب کو اس مصیبت سے نجات دلا دیں۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ پورے مہینے بھر تک ہر روز آپ کی دعوت کرتی رہوں گی۔'' نرگس نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا۔

''بس تو پھر ہم آج ہی اپنی ریاست سے سیکرٹ سروس کے آدمیوں کا ایک دستہ طلب کرتے ہیں۔'' شہزادے نے کہا۔ ''وہ اختر صاحب کو کہیں سے بھی برآمد کر کے اپنے ساتھ لے جائیں گے اور پھر کسی کی مجال نہ ہوگی کہ انہیں ہاتھ لگا سکے۔''

''لیکن قانون کی نگاہ میں تو وہ بہ دستور مجرم رہیں گے۔'' نرگس نے انکار میں سر ہلایا۔ ''اس طرح نہیں۔ میں تو چاہتی ہوں کہ کوئی اصل حالات کا سراغ لگا کر اختر صاحب کو بے قصور ثابت کر دے۔''

''سارجنٹ صاحب!'' شہزادے نے شریف کی طرف دیکھا۔ ''ہماری طرف سے اپنے کیپٹن صاحب سے کہہ دینا کہ وہ اس معاملے میں کچھ کر سکتے ہوں تو ضرور کریں۔ ہم ذاتی طور پر ان کے ممنون ہوں گے۔''

''تب پھر خوش ہو جایئے۔'' شریف مسکرایا۔ ''کہ وہ اپنی عادت کے مطابق اس معاملے میں غیر سرکاری طور پر دلچسپی لے رہے ہیں اور شام تک مل گئے ہیں کہ خان بہادر اور ان کے ملازمین سے کچھ سوالات کر سکیں۔''

''واقعی!'' نرگس خوش ہوگئی۔

''اسے کہتے ہیں دل سے دل کو راستہ ہونا۔'' شہزادہ بولا۔ ''ادھر ہم نے دل میں سوچا ادھر کیپٹن صاحب نے کام شروع کر دیا۔''

''دل سے دل کو راستہ ہونا۔'' شریف ہنسنے لگا۔ ''یہ محاورہ آج ہی سنا ہے۔''

''ہم کہہ چکے ہیں کہ ہم سے محاورات کے بارے میں بحث کرنے سے کوئی فائدہ نہیں کہ ہم غیر ملکی شمار ہوتے ہیں۔'' شہزادے نے کچھ برا مانتے ہوئے کہا۔ ''راستہ نہیں تو پھر سڑک یا گلی ہوگی... روڈ بھی ہو سکتا ہے۔ آج کل انگریزی کے الفاظ اردو میں استعمال کرنا ترقی پسندی سمجھا جاتا ہے۔''

''جی نہیں۔ اصل محاورہ ہے دل کو دل سے راہ ہونا۔'' نرگس بولی۔

''چلو یہی ہوگا مقصد تو مینس آف ٹرانسپورٹیشن... یعنی ہمارا مطلب ذرائع آمدورفت سے ہے۔'' شہزادے نے جواب دیا۔

☆☆☆

کیپٹن شہزاد کے سوالات کے جواب میں چوکیدار عاقل خان نے بتایا کہ جب اکرم کی چیخیں سنائی دیں تو وہ گیٹ پر تھا۔ خان بہادر صاحب پر گولی چلائی گئی تو اصطبل کے عملے کا کوئی آدمی باہر نہیں تھا۔ البتہ ٹرینر شمشاد کچھ دیر پہلے ایک ہفتے کی چھٹی لے کر اپنے گھر روانہ ہوا تھا۔ نیز اصطبل کے اندر آنے کا، گیٹ کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے مگر جو کی اکرم شراب کا عادی تھا اور کبھی کبھی شہر سے شراب پی کر لوٹتا تھا تو اس نے اندر آنے کے لیے اصطبل کی عقبی دیوار میں اپنے گزرنے کے قابل ایک راستہ بنا رکھا تھا جسے وہ جھاڑیوں اور پودوں سے چھپا دیتا تھا۔ چونکہ اس میں شراب کے سوا کوئی بری لت نہیں تھی اور یہ کہ وہ ایک اچھا جوکی تھا اس لیے عاقل

خان نے اپنے طور پر سوچا تھا کہ جب تک اکرم اپنے فرائض سے غفلت نہیں کرتا، وہ خان بہادر سے اس کی شکایت نہیں کرے گا۔ عاقل خان کے بعد سائیس اللہ دتہ کی باری آئی۔ اس نے پوچھنے پر بتایا کہ اکرم سے اس کے کوئی خاص تعلقات نہیں تھے۔ اسے اکرم کے شراب پینے کا علم تھا اور وہ اکرم کو سمجھاتا بھی رہتا تھا۔ جس وقت خان بہادر پر گولی چلائی گئی وہ اپنے کوارٹر میں تھا۔

اس کے بعد کیپٹن نے جوکی رشید کو بلایا۔

''تمہارے بہ قول تمہاری پرورش انگلینڈ میں ہوئی اور تم یارک شائر میں کسی کلب کے جوکی رہ چکے ہو؟''

''مجھے معلوم تھا جناب کہ ایک نہ ایک دن مجھ سے یہ سوال ضرور کیا جائے گا۔'' رشید نے ہچکچاتے ہوئے بتایا۔ ''مگر اب جبکہ برق رفتار مر چکا ہے اور یہاں میری ملازمت ختم ہونے والی ہے، میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ نہیں جناب نہ میں کبھی انگلینڈ گیا اور نہ وہاں کسی ریس کلب سے میرا واسطہ رہا۔ میں نے ملازمت حاصل کرنے کے لیے جھوٹ بولا تھا۔''

''یہ جھوٹ تم نے خان بہادر سے ہی کیوں بولا، کہیں اور بھی تو جا سکتے تھے؟''

''اتفاق سے صرف خان بہادر کے پاس ہی ایک جوکی کی جگہ خالی تھی۔''

''جس وقت خان بہادر پر حملہ کیا گیا، تم کہاں تھے؟''

''اپنے کمرے میں جناب۔''

''میرا مطلب اس رات کے حملے سے نہیں، ریس کورس میں جو حملہ کیا گیا اس سے تھا۔''

''میں اس وقت برق رفتار کی لگام پکڑے دوسری جانب تھا۔''

''گھوڑے نے گولی کی آواز سن کر بھاگنے کی کوشش نہیں کی؟''

''جی نہیں اسے معلوم تھا کہ میں اس کی پشت پر نہیں ہوں اور یہ آواز ریس شروع ہونے کا اشارہ نہیں ہو سکتی۔''

کیپٹن نے وہ جگہ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی جہاں برق رفتار کو رکھا جاتا تھا۔ رشید اسے اصطبل لے گیا۔ ایک طرف گھاس پڑی تھی، ساتھ ہی دانے کی بالٹی رکھی تھی۔ دیوار پر چار زینیں آویزاں تھیں۔ ایک گوشے میں لکڑی کے باکس میں گھوڑے کا دوسرا ساز و سامان اور کچھ مختلف اوزار رکھے تھے۔

''جس وقت برق رفتار کو گولی لگی اس کی پشت پر کون سی زین تھی؟'' کیپٹن شہزاد نے پوچھا۔

''یہ زین تھی جناب۔'' رشید نے دیوار سے ایک زین اتار کر دکھائی۔

''بہت خوب۔'' کیپٹن نے زین کو چاروں طرف سے دیکھا۔ ''میں اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔''

''ضرور لے جائیں۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔'' رشید نے جواب دیا۔

کیپٹن شہزاد نے گیٹ سے نکلتے ہوئے چوکیدار عاقل خان کو تاکید کی کہ جب تک خان بہادر صاحب کی طرف سے کسی ملازم کو رکھنے یا نکالنے کا حکم نہ ملے، وہ کسی کو اصطبل سے رخصت ہونے کی اجازت نہ دے۔ شام نگر سے کیپٹن سیدھا ریس کورس پہنچا اور منیجر سے ملا۔ منیجر نے بتایا کہ کلب کی انتظامیہ نے گزشتہ اتوار کی ریس کے نتیجے کو مسترد کرتے ہوئے جیت کی رقم طوفان کے بجائے برق رفتار کو دینے کا فیصلہ کیا ہے اور مزید یہ کہ آئندہ طوفان کو کسی ریس میں شامل ہونے کی اجازت نہیں دی جائے گی، جب تک اکبر خان تحریری معافی نامہ نہ داخل کریں۔ شہزاد کے پوچھنے پر منیجر نے بتایا۔ ریس شروع ہونے سے پہلے گھوڑے، زین اور جوکی کو الگ الگ وزن کر کے اس کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔ کیپٹن نے برق رفتار کے جوکی اور زین کا وزن پوچھا۔ منیجر نے ایک کلرک سے وزن کا رجسٹر منگوایا اور اسے دیکھ کر بتایا کہ جوکی رشید کا وزن ایک سو دس پاؤنڈ اور زین کا وزن تیرہ پاؤنڈ تھا۔

اپنے آفس پہنچ کر کیپٹن شہزاد نے اصطبل سے لائی ہوئی زین کا وزن کیا۔ وہ صرف دس پاؤنڈ تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ وہ زین نہیں تھی جو ریس کے وقت برق رفتار کی پیٹھ پر تھی۔ پھر رشید نے جھوٹ کیوں بولا؟ کیا یہ ایک غیر ارادی حرکت تھی یا اس کی تہ میں کوئی راز پوشیدہ تھا؟ مزید سوال یہ بھی پیدا ہوتا تھا کہ آخر وہ زین کہاں تھی جو واقعی برق رفتار کی پشت پر تھی...؟

☆☆☆

یہ اسی رات کے ایک بج کر پندرہ منٹ کا واقعہ ہے کہ شام نگر کی اندھیری اور سنسان گلیوں میں دو سائے آگے پیچھے چھپتے چھپاتے چلے جا رہے تھے۔ آگے جانے والا شخص کوئی بے ہنگم سا بنڈل اپنے کندھے پر اٹھائے جا رہا تھا۔ پیچھے آنے والا اس ہوشیاری سے تعاقب کر رہا تھا کہ اگلے شخص کو بالکل پتا نہیں تھا کہ کوئی اس کے تعاقب میں لگا ہوا ہے۔ آخر وہ ایک مکان کے سامنے رک گیا۔ اپنا بوجھ اتار کر زمین پر رکھا۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر چابی نکالی۔ مکان کا قفل کھولا اور

اندر داخل ہو گیا۔ دوسرے لمحے تعاقب میں آنے والا مکان کے پاس آیا۔ جیبی ٹارچ کی مدد سے مکان کے دروازے پر لکھا ہوا پتا نوٹ کیا اور جس طرح دبے پاؤں آیا تھا، اسی طرح گلی سے نکل کر نگاہوں سے غائب ہو گیا۔

پہلا آدمی مکان کے اندر تاریکی میں آگے بڑھا۔ کمرے میں روشنی کے لیے سوئچ بورڈ موجود تھا مگر اس نے اسی اندھیرے میں اپنا کام کرنا مناسب سمجھا۔ ایک گوشے میں رکھے ہوئے لکڑی کے بھاری صندوق کا تالا کھولا۔ بنڈل اٹھا کر صندوق میں رکھا اور دوبارہ قفل لگا دیا۔ چابی جیب میں رکھ رہا تھا کہ پیچھے کھلے دروازے میں کسی کے قدموں کی آہٹ ابھری اور ساتھ ہی کمرا روشنی سے منور ہو گیا۔ پہلے شخص نے تیزی سے پلٹ کر آنے والے کو دیکھا۔

''تم... دلاور۔'' آنے والے نے کہا۔

''ہاں اختر، میں ہی ہوں۔'' دلاور نے جواب دیا اور وہیں صندوق پر بیٹھ گیا۔

''لیکن تمہیں چوروں کی طرح اندر آنے کی کیا ضرورت تھی؟'' اختر نے کہا۔ ''اور تم یہاں کیا کر رہے تھے؟''

''آہستہ بولو اور یہ بجلی بھی بجھا دو۔'' دلاور نے کہا۔ ''پولیس ابھی تک تمہیں تلاش کر رہی ہے۔ میں آ رہا تھا تو ایک سادہ لباس والا میرے پیچھے لگ گیا۔ بڑی مشکل سے اسے دھوکا دے کر یہاں پہنچا ہوں۔ اپنے کمرے میں چلو، وہیں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔''

لیکن یہ بات کہتے ہوئے دلاور کو شاید معلوم نہیں تھا کہ اس نے آج تک اختر سے یہ پہلی سچی بات کہی تھی۔

☆☆☆

کیپٹن شہزاد کو اپنے کوارٹر کی طرف آتے دیکھ کر جوکی رشید خود ہی آگے بڑھ گیا۔

''اصطبل میں چلو۔'' کیپٹن نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ رشید نے چونک کر کیپٹن کی طرف دیکھا اور اصطبل کی طرف بڑھ گیا۔

رشید دروازے کے قریب پہنچ کر رک گیا مگر کیپٹن رکے بغیر دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

''جو زین میں کل لے گیا تھا اس کے بارے میں تم نے بتایا تھا کہ ریس کورس میں گولی چلنے کی واردات کے وقت وہ برق رفتار کی پشت پر تھی؟''

''جی ہاں۔''

''مگر یہ جھوٹ ہے۔ میں نے کلب کے رجسٹر سے معلوم کر لیا ہے کہ جو زین اس برق رفتار کی پیٹھ پر تھی، اس کا وزن تیرہ پاؤنڈ تھا جبکہ اس زین کا وزن صرف دس پاؤنڈ ہے۔''

''اوہ!'' رشید نے سرسری لہجے میں کہا۔ ''میں نے آپ سے جان بوجھ کر جھوٹ نہیں بولا تھا۔ آپ نے زین کے بارے میں پوچھا اور میں نے یونہی نگاہ اٹھا کر دیکھا اور کہہ دیا کہ ہاں وہی زین ہے۔ اب آپ کے توجہ دلانے پر میرا خیال ہے کہ غالباً یہ سامنے والی زین تھی۔''

''تم ہر سوال کا جواب... ایسی غیر ذمے داری سے دینے کے عادی ہو یا اس معاملے میں غلطی ہو گئی تھی؟''

''آپ خود سوچیے نا کہ مجھے یہاں آئے ایک ہی ہفتہ ہوا ہے، بہت سی چیزوں سے واقف نہیں ہوں۔'' رشید نے رسمی انداز میں جواب دیا۔ ''اور پھر اس سے فرق بھی کیا پڑتا ہے کہ یہ زین ہے یا وہ زین تھی جو آپ لے گئے تھے۔ گھوڑا تو مر ہی گیا نا۔''

''اب تو تمہیں یقین ہے کہ یہی زین تھی؟''

''جی ہاں۔''

''اچھی بات ہے۔ میں یہ زین بھی لیے جا رہا ہوں۔'' کیپٹن نے زین اٹھائی۔ ''اس مرتبہ بھی تم نے غلط بیانی سے کام لیا ہے تو پھر مجھے تمہارے خلاف کوئی قدم اٹھانا پڑے گا۔''

''ذرا ٹھہریے۔'' رشید گھبرا کر بولا۔ ''میں پھر اسے غور سے دیکھ لوں۔''

وہ زین کے پاس آیا۔ ادھر ادھر سے اچھی طرح دیکھا اور اثبات میں سر ہلایا۔

''جی ہاں، یہی تھی... لائیے میں پہنچا دوں۔''

رشید نے زین کار میں رکھ دی۔ کیپٹن شہزاد پولیس ہیڈ کوارٹر جانے کے بجائے اسپتال کی طرف مڑ گیا۔ اندر جاتے ہوئے بھی زین اس کے ہاتھ میں لٹک رہی تھی۔

''آیئے کیپٹن صاحب!'' خان بہادر کی طبیعت آج بہت بہتر تھی۔ ''جب نرس نے مجھے بتایا کہ اس نے آپ سے ذاتی طور پر اس کیس میں دلچسپی لینے کی درخواست کی ہے اور آپ نے اسے مان بھی لیا ہے تو مجھے واقعی تعجب ہوا۔ جب آپ جیسی شخصیت اتنے واضح حالات کے باوجود جو کچھ عام طور پر سمجھا جا رہا ہے، اس سے مطمئن نہ ہو تو اس کا مطلب یہی لیا جا سکتا ہے کہ ضرور کوئی نہ کوئی پہلو ایسا ہے جو ہم سب کی نگاہوں سے اوجھل ہے۔''

''اس حسنِ ظن کے لیے شکریہ۔'' کیپٹن نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں بھی آپ ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ آپ ہی جیسا ایک ذہن میرے پاس بھی ہے۔ فرق

www.pkdigest.com

صرف اتنا ہے کہ تجربے نے مجھے بتایا ہے کہ جرم و قانون کی کشمکش میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہماری آنکھ جو کچھ دیکھ رہی ہوتی ہے، وہی اس کا اصل مطلب نہیں ہوتا۔“

”سچ کہا آپ نے۔“ خان بہادر نے سر ہلایا۔ ”چنانچہ ہم باپ بیٹی نے اس شرط پر مصالحت کرلی ہے کہ آپ کی کوشش کے نتیجے میں اختر بے گناہ ثابت ہوا تو مجھے اسے اپنا بیٹا بنانے میں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ خیر، آپ فرمایئے کیسے زحمت کی؟ یہ زین تو میرے اصطبل کی معلوم ہوتی ہے۔“

”آپ نے ٹھیک پہچانا۔ میں یہ معلوم کرنے آیا تھا کہ آپ اپنے گھوڑوں کے لیے زینیں یونہی مارکیٹ سے خرید لیتے تھے یا پھر کسی سے خاص طور پر آرڈر دے کر بنواتے تھے؟“

”شام نگر میں ایک بہترین ملا نامی زین ساز رہتا ہے۔ سائیں اللہ دتہ آپ کو اس کا پتا بتا دے گا۔ میں نے تمام زینیں اسی سے بنوائی ہیں۔“

”آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ وہی زین ہے جو ریس کے دن برق رفتار کی پشت پر تھی؟“ شہزادے نے سوال کیا۔

”اس معاملے میں مجھ سے زیادہ صحیح بیان رشید کا ہوسکتا ہے۔ اگر وہ کہتا ہے کہ یہ وہی زین ہے تو پھر وہی ہوگی۔ یا پھر آپ سائیں اللہ دتہ سے پوچھیں۔ مگر ایک بات میں ضرور کہہ سکتا ہوں، وہ یہ کہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، میری کسی زین میں اتنی موٹی رکابیں نہیں تھیں جتنی اس میں ہیں۔“

اور پولیس ہیڈکوارٹر پہنچ کر کیپٹن شہزادے نے تصدیق بھی کرلی۔ اس دوسری زین کا وزن بالکل صحیح تیرہ پاؤنڈ تھا۔ لیکن جب کیپٹن نے پہلی زین کی رکابیں نکال کر دوسری زین میں ڈالیں اور وزن کیا تو اس زین کا وزن بارہ پاؤنڈ رہ گیا۔ اگر خان بہادر کی تمام زینوں میں ایک ہی وزن کی رکابیں پڑی ہوئی تھیں تو پھر اس دوسری زین کی رکابیں ضرور تبدیل کردی گئی تھیں۔

☆☆☆

گزشتہ رات دلاور کا پُراسرار رویہ اختر کے لیے مزید الجھن کا سبب بن گیا تھا۔ اسے اس چھوٹے سے مکان میں چار دن گزر گئے تھے۔ اس دن ریسٹورنٹ میں خدا جانے وہ کس ذہنی کیفیت میں تھا کہ دلاور کی باتیں اس پر بالکل کسی جادو کی طرح اثر کر گئی تھیں۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ آخر اسے کیا ہوگیا تھا کہ اس نے اس ذلیل سازش میں دلاور کا ساتھ دینا منظور کرلیا۔ اخلاقی اعتبار سے اس نے اپنے آپ کو بھی اتنا گرا ہوا محسوس نہیں کیا تھا جتنا ان چار دنوں کے اندر وہ خود کو سمجھنے لگا تھا۔ ضمیر کی یہ ملامت اس کی برداشت سے باہر ہوتی جارہی تھی۔ یہاں تک کہ وہ سوچ رہا تھا کہ کیوں نہ خود ہی تھانے میں حاضر ہوکر اپنے آپ کو قانون کے سپرد کردے۔

کسی نے مکان کے دروازے پر دستک دی اور اپنی الجھن میں اختر بھول گیا کہ گزشتہ چار دن سے وہ مکان کے بیرونی دروازے کو مقفل کیے محلے والوں کو یہ تاثر دے رہا ہے کہ مکان میں کوئی نہیں ہے۔ وہ بے خیالی میں اٹھا اور جب دستک کی آواز دوبارہ آئی تو پوچھ بیٹھا۔

”کون ہے؟“ یہ کہتے ہی اسے ہوش آگیا مگر اب تو تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

”تار ہے صاحب!“

اختر نے جھک کر دروازے کے بھنسی قفل سے آنکھ لگا دی۔ باہر کھڑا ہوا آدمی تار گھر کا ڈاکیا معلوم ہو رہا تھا۔

”کس کے نام کا تار ہے؟“

”دلاور صاحب کے نام کا۔“

اختر کو دلاور کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا تجسس تھا۔ اس نے سوچا معلوم تو کرنا چاہیے کہ دلاور کو کس نے کیا تار بھیجا ہے۔ ”کہاں سے آیا ہے؟“ یہ کہتے ہوئے اختر نے جیب سے چابی نکال کر قفل کھول دیا۔

مگر ڈاکیا نے بازو میں پکڑا ہوا لفافہ اختر کو دینے کے بجائے دھکا دے کر اسے پیچھے ہٹا دیا اور پھرتی سے اندر داخل ہوکر چابی قفل میں گھما دی جو اختر نے اسی میں لگی چھوڑ دی تھی۔

”عجیب آدمی ہیں آپ۔“ ڈاکیا نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں مصیبت میں پھنسا کر ایسے غائب ہوئے جیسے دوستوں کی آنکھوں سے مروت۔ اب آپ کہیں گے کہ محاورہ غلط ہے مگر ہم کہتے ہیں کہ کیا آپ کا وہ سلوک درست تھا جو آپ نے ہم سے روا رکھا۔ مولا بخش روز ہمارے فلیٹ کے چکر لگاتا ہے کہ یا تو اپنے مہمان کا پتا بتائیں یا پھر اس کی جگہ خود حوالات میں چل کر رہیں۔“

اختر نے آنکھیں مل کر ڈاکیا کی طرف دیکھا اور اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

”شہزادہ علی۔“ اس نے کہا اور بے اختیار لپٹ گیا۔

”او بھائی! ہم یونہی دھان پان آدمی ہیں۔“ شہزادہ علی خود کو الگ کرتے ہوئے بولا۔ ”اگر لوگ اسی طرح گرم جوشی دکھاتے رہے تو ضرور اللہ کو پیارے ہوجائیں گے۔“

”یہ آپ نے حلیہ کیا بنا رکھا ہے؟“ اختر نے پوچھا۔

”اب ہمیں پتا چلا کہ وہ جو ایک محاورہ ہے طاقت ہماں برداشت اس کا مطلب کیا ہے۔“ شہزادے نے ایک گہری سانس لی۔ ”اور بھائی آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ ہم سے نرگس کی حالتِ زار نہ دیکھی گئی۔ تسلی دی کہ بی بی غم نہ کر... پرانے زمانے میں ہمارے ایک بھائی بند حاتم طائی کے نام سے... گزرا ہے۔ اس مردِ معقول کو بھی یہی مرض لاحق تھا کہ اپنے سارے کام چھوڑ کر بس بچھڑے دلوں کو ملایا کرتا تھا۔ اگر وہ ذرا بھی جینئس ہوتا تو ایک ایجنسی کھول کر یہی کام کمیشن پر کرنے لگتا...“

”بس بس۔“ اختر نے مسکراتے ہوئے بات کاٹی۔ ”یہ تو بتایئے آپ کو میرا پتا کیسے معلوم ہوا؟“

”اگر ہم کہیں کہ ہم ماہرِ عملیات ہیں اور ایک جن نے آپ کا پتا بتایا تھا تو آپ ہرگز یقین نہیں کریں گے۔ اس لیے یہ باتیں چھوڑیئے اور یہ بتایئے کہ آخر آپ کو سوجھی کیا تھی کہ اپنے ہونے والے خسر پر ریوالور تان کر کھڑے ہوگئے۔“

”کیا بتاؤں، بس حماقت ہی تھی۔ اب خود پچھتا رہا ہوں کہ میں نے یہ کیا کیا۔“

اور پھر اختر نے پوری تفصیل سے اپنی دلاور کے ساتھ ملاقات کا واقعہ دہرایا۔

”اس وقت مجھے اس سے زیادہ کوئی اپنا ہمدرد محسوس نہیں ہو رہا تھا۔“ اس نے آخر میں کہا۔ ”میں نے بلا سوچے سمجھے اس کی تجویز پر عمل کرنے کی ہامی بھرلی۔ دلاور مجھے اپنے ساتھ ایک ہوٹل لے گیا۔ دوسرے دن شام کو نہ جانے کہاں سے ایک ریوالور لا کر دیا۔ اس کے بعد جیسا کہ آپ جانتے ہیں، میں نے خان بہادر پر گولی چلائی۔ میرے لیے ریوالور استعمال کرنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ شاید میں صحیح نشانہ نہیں لگا سکوں گا اس لیے میں نے ایک دو فائر پر ہی اکتفا نہیں کیا۔ اس وقت تک فائر کرتا چلا گیا جب تک میں نے انہیں گرتے نہیں دیکھ لیا۔ غالباً میں نے پانچ فائر کیے تھے۔ بعد میں مجھے یہ معلوم کرکے حیرت ہوئی کہ پتا نہیں کیسے دو گولیاں برق رفتار کو بھی لگیں اور وہ مر گیا۔ ریس کورس سے بھاگ کر جب میں ہوٹل پہنچا تو دلاور رات کے اندھیرے میں مجھے اس مکان میں لے آیا۔ اس وقت تک مجھ پر اس حرکت کا ردِعمل شروع ہوچکا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ جو شخص مجھے آلۂ کار بنا کر ایک انسان کی جان لے سکتا ہے، وہ میرا دوست اور ہمدرد نہیں ہوسکتا۔ اس پر میرا اندھا اعتماد جس طرح شروع ہوا تھا اسی طرح ختم بھی ہوگیا۔ میں نے وہ ریوالور ایک جگہ زمین کھود کر دبا دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ریوالور دلاور کو واپس کرکے اپنے آپ کو بالکل ہی اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دوں۔ شام کو دلاور واپس آیا اور اس کی زبانی یہ سن کر مجھے اطمینان ہوا کہ خان بہادر مرے نہیں زندہ ہیں۔ دلاور نے ریوالور واپس مانگا۔ میں نے اسے بتایا کہ ریس کورس سے واپس آتے ہوئے میں نے ریوالور پھینک دیا ہے۔ اسے یقین نہیں آیا۔ کسی نامعلوم وجہ سے وہ ریوالور حاصل کرنے کے لیے بہت بے تاب نظر آرہا تھا۔ اس دن کے بعد سے میں نے محسوس کیا کہ وہ میرے خلاف اپنے دل میں شدید نفرت رکھتا ہے۔ مجھے خطرہ ہے کہ دلاور مجھے ختم کرنے کی کوشش نہ کرے۔ کل رات وہ بڑے پُراسرار انداز میں مکان میں داخل ہوا تھا... شاید مجھے قتل کرنے کے لیے۔ مگر مجھے ہوشیار پاکر ارادہ ملتوی کردیا۔ میں عاجز آچکا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ خود کو پولیس کے حوالے کردوں۔“

”وہ ریوالور آپ نے کہاں دفن کیا ہے؟“ شہزادے نے پوچھا۔

اختر، شہزادہ علی کو مکان کے صحن میں لے گیا۔ ایک گوشے میں تین چار اینٹیں اکھیڑیں۔ کاغذ میں لپٹا ہوا ایک پارسل برآمد کیا۔ کاغذ نمی پاکر گل گیا تھا مگر اندر کی شے خشک تھی۔ شہزادے نے ریوالور دیکھا۔ اس کا چیمبر کھولا۔ پانچ گولیاں چلی ہوئی اور ایک بغیر چلی موجود تھی۔ شہزادے نے گولیوں کو دیکھا اور چونک گیا۔

”کیا یہ وہی ریوالور ہے جس سے آپ نے خان بہادر پر گولیاں چلائی تھیں؟“ اس نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ اختر نے جواب دیا۔

”ریس کورس سے واپس آکر آپ نے اسے بالکل اسی طرح کاغذ میں لپیٹ کر زمین میں دبا دیا تھا؟“

”جی ہاں۔ مگر بات کیا ہے؟“

”آپ نے اس کا چیمبر کھول کر کچھ رد و بدل تو نہیں کیا؟“

”مجھے تو چیمبر کھولنا بھی نہیں آتا تھا۔“ اختر نے بتایا۔

”آپ نے کھولا ہے تو دیکھا ہے۔“

”بہت خوب!“ شہزادے کے ہونٹوں پر ایک پُراسرار مسکراہٹ ابھری۔ ”اب آپ کے لیے ہمارا بہترین مشورہ یہ ہے کہ آپ یہاں سے سیدھے ہمارے فلیٹ جائیں اور آغا صاحب کو بتائیں کہ ہم نے آپ کو بھیجا ہے۔“

”مگر آپ کچھ مجھے بھی تو بتائیں۔“ اختر نے پوچھا۔

”ریوالور کو دیکھ کر آپ چونکے کیوں... اور یہ کہ میں یہاں سے چلا گیا تو آپ دلاور سے کیسے نمٹیں گے؟“

www.pkdigest.com

"یہ سب باتیں آپ ہم پر چھوڑیں اور فوراً نو دو گیارہ ہو جائیں... نہ نہ یہ کوٹ نہ اتاریں... ہمیں اس کی ضرورت پڑے گی۔"

اختر کھونٹی سے اپنا کوٹ اتارنے لگا تھا مگر شہزادے کی بات سن کر رک گیا۔ پلٹ کر دیکھا مگر کچھ بولا نہیں اور دوسری چیزیں سمیٹنے لگا۔ اس نے روانگی سے پہلے ایک بار پھر ریوالور کے بارے میں پوچھنے کی کوشش کی مگر شہزادے نے اسے ایک حرف بھی نہ بتایا۔ بات ہی کچھ ایسی انقلاب انگیز تھی کہ سارا کیس ہی بدلتا نظر آ رہا تھا۔ اگرچہ ابھی یہ محض اس کی رائے تھی اور کسی اسلحے کے ماہر کو دکھا کر تصدیق کرنا ضروری تھی مگر شہزادہ علی کو یقین تھا کہ اس کی رائے غلط نہیں ہو سکتی۔ جو ریوالور دلاور نے اختر کو لا کر دیا تھا اور جس سے اس نے خان بہادر پر گولیاں چلائی تھیں اور جو اس وقت شہزادے کی جیب میں تھا... اس کے چیمبر میں موجود گولیاں سب کی سب اصلی نہیں نقلی تھیں... جن سے آدمی تو کیا مکھی بھی نہیں ماری جا سکتی تھی۔

☆☆☆

اختر کافی دیر سے کمرے میں رکھے ہوئے لکڑی کے صندوق پر جھکا ہوا، اس کے مضبوط قفل سے زور آزمائی کر رہا تھا مگر ابھی تک کوئی ترکیب کارگر نہیں ہوئی تھی۔ اچانک اس کے کانوں نے کوئی آہٹ سنی۔ یقیناً کوئی باہر کے دروازے پر موجود تھا۔ اس نے پھرتی سے اپنے عجیب اوزار سمیٹ کر جیب میں ڈالے۔ دبے پاؤں باہر نکلا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ یہ سب کچھ عین وقت پر ہی ہوا تھا۔ اور وہ کرسی پر بیٹھا، ادھر دلاور کمرے میں داخل ہوا۔

"کیا ہو رہا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"کتاب پڑھ رہا ہوں۔"

"خوب! گویا اب طبیعت سکون پر آتی جا رہی ہے؟"

"آہی جانا چاہیے۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب اس کے بارے میں سوچ کر ذہن کو پریشان کرنے سے کیا فائدہ۔"

"اور وہ ضمیر کی خلش؟"

"نیا نیا مجرم بنا تھا نا۔ ناتجربہ کاری کی گھبراہٹ تھی جسے میں نے ضمیر کی خلش سمجھ لیا۔ بلکہ مجھے تو افسوس ہو رہا ہے کہ خان بہادر بچ کیوں گئے؟ کوئی اور ترکیب سوچو دوست... انتقام تو ابھی ادھورا ہی ہے۔"

"گویا اب تمہیں کوئی خوف نہیں کہ پولیس ابھی تمہیں یہاں آ کر گرفتار کر لے، تم پر مقدمہ چلائے اور قانون تمہیں موت کی سزا دے دے۔"

"بالکل نہیں۔" اختر نے کہا۔ "اگر میری موت پھانسی کے تختے پر لکھی ہوئی ہے تو میں کہیں بھی جا کر چھپوں، ضرور پکڑ کر وہیں لے جایا جاؤں گا۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ تم آؤ تو میں کہوں کہ اب میں یہاں بند رہنا نہیں چاہتا۔ ذرا باہر نکل کر گھومنا پھرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا اپنے ساتھ مجھے بھی مروانے کا خیال ہے؟" دلاور گھبرایا۔ "یہاں سے نکلے اور گرفتار ہوئے پھر تم لاکھ اپنی زبان بند رکھنے کی کوشش کرو، پولیس سب کچھ اگلوا ہی لیتی ہے۔"

"میری جگہ پولیس تمہیں پکڑ لے تو کیا تم اپنی گردن بچانے کے لیے مجھے پھنسانے کی کوشش نہیں کرو گے؟" اختر نے جواب دیا۔ "انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ اپنی جان کی سلامتی کے لیے دوسروں کی زندگی خطرے میں ڈال دیتا ہے۔ اپنی ہی مثال لو۔ مجھے نہیں معلوم کہ تمہیں خان بہادر کے خلاف کیا کدورت تھی کہ تم ان کی جان کے گاہک بن گئے تھے۔ لیکن تمہیں معلوم تھا کہ تم نے انہیں قتل کیا تو قانون تمہارے پیچھے پڑ جائے گا۔ چنانچہ تمہیں ایک احمق کی تلاش ہوئی جس کے کندھے پر رکھ کر بندوق چلا سکو۔ اتفاق سے میں مل گیا اور تم نے میرے ساتھ ملے کو آڑ بنا کر میرے ہاتھوں اپنا کام کرنا چاہا۔"

"تم آج کیسی باتیں کر رہے ہو اختر؟" دلاور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"جیسی بھی ہوں مگر غلط نہیں ہیں۔ بہرحال، جو کچھ ہونا تھا ہو چکا لیکن آئندہ کے لیے میری تم پر یا تمہاری مجھ پر کوئی ذمے داری نہیں ہے۔ خود سے معصیت میں پھنسنے کا شوق کسی کو نہیں ہوتا۔ اطمینان رکھو، میں اس وقت تک اپنی زبان بند رکھوں گا جب تک مجھ پر کوئی آفت نہیں آتی۔"

"تم مجھے دھمکی دے رہے ہو۔ کیا یہی اس سلوک کا بدلہ ہے جو میں تمہارے ساتھ کر رہا ہوں؟ میں نہ ہوتا تو تم اس وقت جیل کی کوٹھری میں پھانسی پانے کا انتظار کر رہے ہوتے۔"

"اور اگر تم نہ ہوتے تو آج مجھے پولیس سے چھپنے کی بھی کوئی ضرورت نہ ہوتی۔" اختر نے جواب دیا۔

"گویا میں نے تمہیں خان بہادر کے قتل پر اکسایا تھا... تم ان سے انتقام لینے کی کوئی خواہش نہیں رکھتے تھے؟"

"ریوالور میرے ہاتھ میں دینے والے تم ہی تھے۔" اختر نے کہا۔

"ریوالور!" دلاور کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔ "میں نے تمہاری بتائی ہوئی جگہ پر کئی گھنٹے اسے تلاش کیا مگر نہیں ملا۔ تم نے مجھ سے قصداً جھوٹ بولا ہے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں اس ریوالور کی اتنی فکر کیوں ہے؟" اختر نے غور سے دلاور کی طرف دیکھا۔ "گولی اس سے میں نے چلائی ہے، وہ پولیس کو مل بھی جائے تو تم پر کیا اثر پڑتا ہے؟"

"اسے میں نے خریدا تھا۔ اسلحہ فروش کے رجسٹر میں میرا نام لکھا ہے۔"

"گویا تمہارے پاس اس کا باقاعدہ لائسنس ہے۔" اختر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "یار ایسی باتیں مت کرو جس سے خوامخواہ ہنسی آنے لگے۔"

"سیدھی طرح وہ ریوالور واپس کر دو ورنہ مجھے دوسرے طریقے بھی آتے ہیں۔" دلاور کھڑا ہو گیا۔

"وہ ریوالور تو اب تمہیں نہیں ملے گا۔"

"تو تم قبول کرتے ہو کہ تم نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا؟"

"تو کون سی قیامت آ گئی۔ تم بھی تو مجھ سے جھوٹ بولتے رہے ہو۔" اختر نے جواب دیا۔ "دوسری باتوں کو جانے دو، وہ داستان جو تم نے اپنے بارے میں سنائی، کیا سچ تھی؟"

دلاور نے اختر کو خونخوار نظروں سے گھورا اور کھونٹی پر لٹکے ہوئے اس کے کوٹ کی جیبیں دیکھنے لگا۔

"بے کار محنت کر رہے ہو۔" اختر نے کہا۔ "چابی تو میرے پاس ہے۔ مگر تمہیں ملے گی نہیں۔"

"سیدھی طرح چابی دے دو ورنہ میں بہت بری طرح پیش آؤں گا۔"

"ذرا تمہاری بری طرح کو بھی دیکھ لیا جائے۔" اختر بھی کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ "ہمت ہو تو چابی لے لو۔"

دلاور نے جھنجلا کر گھونسا چلایا مگر اس سے پہلے اختر کی لات دلاور کے پیٹ پر لگی۔ دلاور تکلیف سے دہرا ہو گیا۔ اسی لمحے اختر کا ہاتھ دلاور کی گدی پر پڑا۔ دوسرے لمحے دلاور فرش چاٹ رہا تھا۔ کچھ دیر تک وہ یونہی پڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور خوف کے تاثرات تھے۔

"تم جانو۔" وہ بولا۔ "میں تو تمہارے فائدے کے لیے کہہ رہا تھا۔ باہر نکلتے ہی پولیس تمہیں گرفتار کر لے گی۔"

"ایک چشمہ اور ایک نقلی مونچھ میں بھی لگا لوں گا دلاور بھائی۔" اختر نے بڑے مزے سے کہا۔ "آخر تم اتنے دنوں سے باہر نکل ہی رہے ہو، تمہارا کسی نے کیا بگاڑ لیا۔"

دلاور یوں ٹھہر کر پیچھے ہٹا جیسے کسی نے اسے بڑے زور سے دھکا دیا ہو۔ وہ آنکھیں پھاڑے اختر کو دیکھ رہا تھا۔

"کیوں، یقین نہیں آتا کہ میں وہی اختر ہو سکتا ہوں جسے کل رات تم سہما ہوا چھوڑ کر گئے تھے؟" اختر نے عجیب مسکراہٹ سے کہا۔ "سارا کھیل ذہن کی سوچ کا ہوتا ہے۔ خوف انسان کو بزدل بنا دیتا ہے۔ میں نے ڈرنا چھوڑ دیا اور اب میں تم سے آنکھیں ملا کر بات کر رہا ہوں۔"

"میں نہیں چاہتا تھا کہ ہمارے درمیان کوئی جھگڑا ہو۔" دلاور نے ایک گہری سانس لی۔ "مگر تم اسی پر تلے ہوئے ہو تو اب یہی سہی۔ لیکن سنبھل کر رہنا۔ آئندہ ملاقات اس سے بہت مختلف ہو گی۔"

اتنا کہہ کر دلاور تیزی سے گھوما اور مکان سے باہر نکل گیا۔ اختر اس کے جانے کے بعد ایک بار پھر اسی کمرے میں گھس گیا جہاں لکڑی کا صندوق رکھا تھا۔ اوزار پھر اس کی جیب سے باہر نکل آئے۔ اس مرتبہ اس کی کوشش کامیاب ہو گئی۔ صندوق کا بھاری قفل کھل گیا۔ چند لمحے بعد ایک چادر میں لپٹی ہوئی ایک زین اس کے سامنے رکھی تھی۔ پہلی نگاہ میں کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوئی مگر جب اس نے اوپر کا چمڑا اٹھا کر نیچے کی کاٹھ دیکھی تو وہ چیز مل گئی جس کی اسے تلاش تھی۔

☆☆☆

"یہ پارسل آیا ہے۔" شریف نے کیپٹن سے کہا۔ "اور اس پر ریٹرن ایڈریس شہزادہ علی کا لکھا ہوا ہے۔"

"ذرا دیکھو تو کیا ہے۔"

"غالباً کوئی تحفہ ہو گا۔"

"ریاست ڈھیلا مار میں پولیس والوں کو تحفہ دینے کا رواج نہیں ہے۔" کیپٹن نے جواب دیا۔

شریف نے چاقو کی مدد سے پارسل کا کپڑا ادھیڑا۔ اندر سے پلائی وڈ کا ایک باکس برآمد ہوا۔ شریف نے چاقو سے ڈھکنا بھی کھول دیا۔ اندر جھانکتے ہی اس نے حیرت سے سیٹی بجائی۔

"دو ریوالور اور ایک گلاس۔" اس نے کہا۔ "ایک خط بھی ہے۔" کیپٹن نے خط پڑھا۔

"ڈیئر کیپٹن!

ہم اس پارسل میں دو عدد ریوالور اور ایک عدد گلاس روانہ کر رہے ہیں۔ ان تینوں اشیا کو پولیس لیبارٹری بھجوا دیں اور پھر خدا کی قدرت کا تماشا دیکھیں۔ زیادہ تفصیل غیر

www.pkdigest.com

ضروری ہے کہ آپ ماشاء اللہ خود عاقل و بالغ ہیں۔ ہمارا ارادہ اس خط کو اس شعر سے شروع کرنے کا تھا کہ آنکھ والا تیرے جوبن کا تماشا دیکھے۔ دیدہ کور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے۔ مگر اس کے مصرع اولیٰ میں ایک بڑا واہیات لفظ آتا ہے اس لیے ہم نے لکھنا مناسب نہیں سمجھا۔ ویسے ہم جانتے ہیں کہ عقل مند را ریو الور کافی است۔ لیکن یہ محاورہ شاید یوں نہیں کسی اور طرح سے ہے۔ خیر، زیادہ حد ادب۔ مخلص۔ شہزادہ علی قلی خان۔

''ضروری نوٹ: القاب میں اگر کچھ الفاظ کا مطلب سمجھ میں نہ آئے تو لغت میں دیکھ لیں۔ ہم نے بزرگوں کو یونہی استعمال کرتے دیکھا تھا اس لیے لکھ دیے ہیں۔ ورنہ مطلب ہم خود بھی نہیں جانتے۔ امید تو ہے کہ ہم نے ان کا املا درست لکھا ہوگا۔''

شریف جو کیپٹن کے قریب ہی کھڑا خط پڑھ رہا تھا، ہنسنے لگا۔ مگر کیپٹن کے چہرے پر کوئی مسکراہٹ نہیں تھی۔ اس نے خط جیب میں رکھا اور پارسل کو اسی طرح بند کر دیا۔

''میں پہلے شہزادہ علی کو محض ایک لاابالی سا نوجوان خیال کرتا تھا۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ''مگر اب اندازہ ہوتا ہے کہ میری رائے کس قدر غلط تھی۔ کئی مرتبہ ایسا ہوتا رہا ہے کہ مجھے اپنے کیسوں میں کسی نامعلوم ذریعے سے وقت پر کوئی ایسی مدد مل گئی جس سے فائدہ اٹھا کر میں نے مجرموں کو پکڑ کر قانون کے حوالے کر دیا۔ مجھے تعجب تھا کہ قانون کا یہ نادیدہ بہی خواہ کون ہے۔ لیکن گزشتہ دو چار معاملات میں کچھ ایسی واضح باتیں سامنے آئی ہیں کہ مجھے یقین ہو گیا کہ شہزادہ علی جہاں کہیں انہیں موقع ملتا ہے، قانون اور پولیس سے ضرور تعاون کرتے ہیں... یہ بات کسی لاابالی اور غیر سنجیدہ مزاج انسان میں نہیں ہو سکتیں۔ ان کا ظاہر آج بھی ایسا ہے کہ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ آدمی اتنی متضاد خصوصیات کا مالک بھی ہو سکتا ہے۔ جہاں تک دو ریوالوروں اور گلاس کا تعلق ہے تو میرا اندازہ ہے کہ ان میں سے ایک ریوالور وہ ہوگا جس سے اختر نے خان بہادر پر گولیاں چلائی تھیں اور دوسرا شاید وہ جس کی گولیاں برق رفتار کی موت اور خان بہادر کو زخمی کرنے کا سبب بنیں۔ گلاس پر مجھے یقین ہے کہ کسی مجرم کی انگلیوں کے نشانات ہوں گے۔''

☆☆☆

پولیس لیبارٹری کی رپورٹ کے مطابق ریوالور ''الف'' پر اختر کی انگلیوں کے واضح نشانات موجود تھے مگر اس میں پائے جانے والے گولیوں کے خول نقلی تھے اور جو بغیر چلی ہوئی گولی چیمبر میں تھی، وہ بھی نقلی تھی... یہ گولیاں کسی کو ہلاک یا زخمی نہیں کر سکتی تھیں۔ ریوالور ''ب'' پر انگلیوں کے نشانات بالکل نہیں تھے۔ یا تو نشانات کو مٹا دیا گیا تھا یا پھر استعمال کرنے والے نے دستانے پہن رکھے تھے۔ مگر اندر ریوالور کے چیمبر اور گولیوں سے چند ایک واضح نشانات حاصل کر لیے گئے تھے۔ پولیس ریکارڈ چیک کرنے سے معلوم ہوا کہ وہ ایک مفرور اشتہاری مجرم اسلم کی انگلیوں کے نشانات ہیں جو پولیس کو ایک قتل کے کیس میں مطلوب تھا۔ جو گولیاں برق رفتار کے جسم اور خان بہادر کے شانے سے نکالی گئی تھیں، وہ یقینی طور پر اسی ریوالور سے چلائی گئی تھیں۔ اتنا ہی نہیں شام نگر میں خان بہادر پر چلائی گئی گولی بھی اسی ریوالور سے فائر کی گئی تھی۔ گلاس کے متعلق رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ اس پر اسلم کے سیدھے ہاتھ کی انگلیوں کے نشانات موجود ہیں۔ نتیجے میں کیپٹن شہزاد ڈی ایس پی سے گفتگو کرنے کے بعد سولا بخش اور چار کانسٹیبلوں کو ساتھ لے کر شام نگر روانہ ہو گیا۔

خان بہادر اسپتال سے چھٹی پا کر جا چکے تھے۔ نرگس بھی ان کے ساتھ تھی۔ چوکیدار عاقل خان نے کیپٹن کے آنے کی اطلاع کی تو خان بہادر صاحب نے اسے اپنے کمرے میں ہی بلا لیا۔ اس وقت وہ جوکی رشید سے بات کر رہے تھے۔ انہوں نے کیپٹن کو بتایا کہ ریس کلب نے پہلی ریس میں برق رفتار کو جیتا ہوا تسلیم کر کے انعام کی رقم دے دی ہے اور وہ اس رقم سے پھر ایک گھوڑا خرید کر قسمت آزمائی کرنا چاہتے ہیں مگر نرگس ان کی ہم خیال نہیں۔ خان بہادر کا خیال تھا کہ انگلینڈ ریٹرن جوکی رشید سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ رشید مصر تھا کہ اس کی ملازمت کے بارے میں آج ہی جواب دیا جائے کہ جاری رہے گی یا نہیں۔

''میں آپ کو یہی مشورہ دے سکتا ہوں۔'' کیپٹن شہزاد نے کہا۔ ''کہ آپ ملنے والی رقم سے کوئی بزنس شروع کر دیں۔''

''اچھا جناب... تو پھر میں چلتا ہوں۔'' رشید بولا۔ ''آپ کا فیصلہ جو کچھ بھی ہو، کل تک مجھے بتا دیں۔''

''ذرا ٹھہرو رشید۔'' کیپٹن نے کہا اور خان بہادر کو مخاطب کیا۔ ''آپ نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میں اس وقت کیوں آیا ہوں؟''

''تو آپ ہی بتا دیں نا؟'' نرگس بول اٹھی۔

''آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ پولیس کو نا قابل تردید ثبوت مل گیا ہے کہ اختر صاحب بے گناہ ہیں۔''

''کیا؟'' خان بہادر چونکے۔ ''آپ یہ کہنا چاہتے ہیں

کہ خود میں نے اور دوسرے بے شمار لوگوں نے اپنی آنکھوں سے جو اختر کو گولی چلاتے دیکھا تھا، وہ محض فریب نظر تھا۔''

''جی نہیں، آپ نے جو کچھ دیکھا وہ بھی درست تھا اور جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ بھی سچ ہے۔''

''مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''اس طرح کہ اختر صاحب کے ہاتھ میں جو ریوالور دے دیا گیا تھا اس میں جو گولیاں تھیں وہ نقلی تھیں۔ دھماکا تو کر سکتی تھیں مگر کسی کو مارنا یا زخمی کرنا ان کے لیے ناممکن تھا۔''

''مگر... مگر پھر وہ گولیاں کس کی تھیں جنہوں نے برق رفتار کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور میری جان لینے میں بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔''

''اس کا جواب آپ کا جوکی رشید دے سکتا ہے۔'' کیپٹن نے رشید کی طرف اشارہ کیا۔

''کیا مطلب؟'' خان بہادر کے لیے آج کا دن بڑی حیرتوں کا دن تھا۔

''تعجب ہے۔'' رشید کے چہرے پر پھیکی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''اتنے واضح اشارے کے باوجود آپ کیپٹن صاحب کا مطلب نہیں سمجھے۔ وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ گولیاں میں نے چلائی تھیں۔'' وہ کیپٹن شہزاد کی طرف گھوما۔

''آپ نے اختر کی گردن سے پھانسی کا پھندا نکالنے کی کوشش تو خوب کی ہے مگر یہ بات کہہ دینا جتنا آسان ہے، قانون کی نگاہ میں اسے درست ثابت کرنا اتنا ہی مشکل ہے۔ میں پوچھ سکتا ہوں کہ میرے خلاف آپ کے پاس ثبوت کیا ہے؟''

''میں بغیر ثبوت کوئی بات منہ سے نہیں نکالتا مسٹر رشید عرف اسلم۔'' کیپٹن نے کہا اور پھر خان بہادر سے مخاطب ہوا۔ ''یہ شخص جسے آپ رشید کے نام سے جانتے ہیں، حقیقت میں اس کا نام اسلم ہے اور یہ جو کی اکرم کا چھوٹا بھائی ہے۔ اس نے اخبار میں اکرم کے قتل اور اس سلسلے میں آپ کا نام زیر بحث آنے کی خبریں سنیں تو کسی تحقیقات کی ضرورت نہیں سمجھی اور آپ کو اکرم کا قاتل گردانتے ہوئے آپ سے اپنے بھائی کا انتقام لینے کا ارادہ کر لیا اور انگلینڈ ریٹرن جوکی رشید کے نام سے آپ کے اصطبل میں ملازم ہو گیا۔ آپ کے اور اختر کے جھگڑے سے اس کے ذہن میں ایک لاجواب ترکیب آئی۔ اس نے اختر اور نرگس کے رخصت ہوتے ہی اسی رات آپ پر گولی چلائی، تب اس کا مقصد آپ کو قتل کرنا نہیں بلکہ اختر کے خلاف شبہے کا پہلا جواز پیدا کرنا تھا۔ اختر کا واقعہ اتنا تازہ تھا کہ فطری طور پر آپ کا ذہن اسی طرف گیا۔

اس نے اختر کا قلم میدان میں ڈال کر شبہے کو یقین کی حد تک پہنچانے کی کوشش کی۔ اس کے بعد اس نے ملازمین ساز سے ایک ایسی زین بنوائی جس میں ریوالور رکھنے کا خانہ بھی بنا تھا۔ ایک طرف یہ تیاریاں تھیں، دوسری طرف اس نے نرگس کو اغوا کیا اور ایسے حالات پیدا کیے کہ اختر کے علاوہ اکبر خان کو بھی لپیٹ میں لیا جا سکے۔ مزید یہ کہ اس نے آپ کو فون کر کے نرگس کے اغوا میں واضح طور پر اکبر خان کو ملوث کیا۔ ایک طرف آپ اختر پر شبہ کر رہے تھے، دوسری جانب اس نے اختر کو یقین دلایا کہ نرگس کی گمشدگی میں آپ کا ہاتھ ہے تاکہ وہ اس کے خلاف سازش کی مخالفت نہ کر سکے۔ اس الزام کو سن کر اختر کو غصہ آنا ہی چاہیے تھا۔ رشید نے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ سے انتقام لینے پر اکسایا۔ اس کے سازشی ذہن کی چالاکی دیکھیے، یہ آپ پر اختر سے حملہ ضرور کرانا چاہتا تھا مگر جو ریوالور اسے دیا، اس میں اصلی نہیں نقلی گولیاں تھیں۔ اس کے پیش نظر دو مقصد تھے۔ اول تو اپنے بھائی کے انتقام کی تسکین کے لیے یہ خود اپنے ہاتھ سے آپ کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ دوسری جانب اسے معلوم تھا کہ اختر ریوالور استعمال کرنے میں بالکل اناڑی ہے۔ یہ خود بھی موقع واردات پر موجود ہوگا اس لیے اختر کے ہاتھ میں اصلی گولیوں کا ریوالور دینا اس کے لیے بھی خطرناک تھا، عین ممکن تھا کہ کوئی گولی خود اسے لگ جاتی۔ بعد میں جو کچھ ہوا، وہ آپ بھی جانتے ہیں۔ اختر نے گولی چلائی تو رشید گھوڑے کے دوسری جانب تھا۔ آواز سنتے ہی برق رفتار الف کھڑا ہو گیا۔ سب کی نظریں اختر پر لگی تھیں۔ گھوڑے کے پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہوتے ہی رشید نے زین کے خانے سے ریوالور نکالا، ایک گولی آپ پر اور دو برق رفتار پر چلائیں۔ اختر برابر فائر کر رہا تھا۔ رشید کو ریوالور زین کے خانے میں واپس رکھنے کے لیے کافی مہلت حاصل تھی۔ برق رفتار تو ختم ہو گیا مگر آپ اس کی مایوسی کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ جب اسے معلوم ہوا کہ آپ مرے نہیں زندہ ہیں مگر اسے یہ اطمینان ضرور تھا کہ کوئی اسے آپ پر حملہ کرنے کا مجرم خیال نہیں کر سکتا۔ جس ریوالور سے آپ پر گولی چلائی گئی تھی وہ زین کے خانے میں محفوظ تھا۔ زین کے بارے میں میرے سوالات نے اسے پریشان ضرور کر دیا مگر وہ ان کا مقصد نہیں جان سکا لیکن جانتا تھا کہ میں نے اصل زین دیکھ لی تو بھید کھل جائے گا۔ اس نے جھوٹ بول کر ایک دوسری زین مجھے دے دی۔ میں نے اس کا جھوٹ پکڑ لیا تو دوسری مرتبہ اس نے بھاری رکابیں ڈال کر زین کا وہ وزن پورا کرنے کی کوشش کی جو ریوالور کی وجہ سے

www.pkdigest.com

بڑھا تھا مگر میں نے دوسری مرتبہ بھی اس کی چالاکی پکڑ لی۔ دو مرتبہ مجھ سے جھوٹ بولنے کا مقصد صاف ظاہر تھا۔ جو زین والتھی برق رفتار کی پشت پر تھی، اس میں میرے نظریے کے مطابق ریوالور رکھنے کا خفیہ خانہ موجود تھا اور ریوالور بھی۔ اور رشید نہیں چاہتا تھا کہ وہ میرے ہاتھ آجائے اور میں اس کی پوری سازش بے نقاب کرنے میں کامیاب ہوجاؤں۔"

رشید بڑے سکون کا مظاہرہ کررہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک طنزیہ ہنسی کے سوا کوئی تاثر نہیں تھا۔

"میں آپ کے ذہن کی بلند پروازی کی داد دیتا ہوں۔" وہ بولا۔ "آپ نے اختر کو بچانے اور مجھے اندھے قانون کا شکار کرنے کی اپنے نزدیک بڑی کامیاب کوشش کی ہے مگر اس کی حقیقت ایک نظریے سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ آپ ابھی تک کوئی ٹھوس ثبوت پیش نہیں کرسکے۔"

"اچھا، چلو تم ہی بتادو کہ ثبوت میں مجھے کیا پیش کرنا چاہیے؟" کیپٹن نے بڑے عجیب لہجے میں پوچھا۔

"زیادہ نہ سہی تو آپ کم سے کم وہ دونوں ریوالور ہی پیش کردیں جن میں سے ایک میں نقلی گولیاں تھیں اور جو آپ کے بہ قول میں نے اختر کو دیا تھا۔ اور دوسرا ریوالور وہ جس میں اصلی گولیاں تھیں اور جسے آپ کے نظریے کے مطابق میں نے خان بہادر اور برق رفتار پر استعمال کیا۔"

"صرف اتنی سی بات۔" کیپٹن نے جواب دیا۔

اور اپنے کوٹ کی دونوں جیبوں سے دو ریوالور یکے بعد دیگرے نکال کر خان بہادر صاحب کے پیچنگ پر ڈال دیے۔ ایک لمحے کے لیے رشید کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ اس کی آنکھوں میں پہلی مرتبہ حیرت اور خوف کے تاثرات ابھرے مگر دوسرے ہی لمحے بجلی کی طرح چمک کر اس نے ایک جست لگائی اور کمرے کے کھلے دروازے سے باہر نکل گیا۔

"قاتل خان۔" خان بہادر نے پوری طاقت سے پکارا۔ "پکڑنا اس مردود رشید کو... یہ قاتل ہے۔"

مگر جس شخص کو رشید کے فرار کی سب سے زیادہ فکر ہونا چاہیے تھی وہ اپنی جگہ کھڑا مسکراتا رہا۔

"آپ اطمینان رکھیں، وہ بھاگ نہیں سکتا۔" کیپٹن نے دونوں ریوالور اٹھاتے ہوئے کہا۔ "پولیس کا گھیرا اس کے گرد بڑی مضبوطی سے قائم کیا گیا ہے۔"

"مگر اختر صاحب کہاں ہیں؟" نرگس نے بے تابی سے پوچھا۔ "آپ نے ان کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔"

"وہ جہاں بھی ہیں خیریت سے ہیں۔" کیپٹن نے جواب دیا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

انسپکٹر مولا بخش اور چاروں کانسٹیبل باہر موجود تھے۔ انہوں نے کیپٹن کی تاکید کے مطابق بھاگتے ہوئے رشید سے کوئی تعرض نہیں کیا تھا۔

"یہ لو۔" کیپٹن نے مولا بخش کو ایک کاغذ دیا۔ "دس منٹ بعد اپنے کانسٹیبلوں کے ساتھ اس پتے پر پہنچ جانا۔"

"آپ کہیں جارہے ہیں؟" مولا بخش نے اسے اپنی کار کی طرف بڑھتے دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں۔" جواب ملا۔ اس کی انگلی میں پڑی ہوئی دو نگ والی انگوٹھی ظاہر کررہی تھی کہ وہ کیپٹن کے میک اپ میں ڈبل اوتھا۔

☆☆☆

دروازہ ایک دھماکے سے کھلا۔ اختر نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔

"او... ہیلو دلاور۔" وہ بولا۔ "خیریت تو ہے، بڑے پریشان نظر آرہے ہو۔"

"دوسرے کمرے میں رکھے ہوئے صندوق کا قفل تم نے کھولا تھا؟"

"اگر کھولا بھی تھا تو تم کیا کرلوگے؟"

"تو تم میرے ساتھ غداری کررہے تھے جس ریوالور کے بارے میں تم نے کہا تھا کہ بھاگتے ہوئے کہیں پھینک دیا تھا، وہ کیپٹن شہزاد کے پاس کیسے پہنچا؟ یقیناً اسے پولیس تک پہنچانے والے تم ہو۔"

"صرف وہ ریوالور ہی نہیں۔" اختر کھڑا ہوگیا۔ "وہ زین جسے تم بڑی حفاظت سے صندوق میں بند کرگئے تھے اور اس میں رکھا ہوا ریوالور جس سے تم نے خان بہادر کو زخمی کیا، وہ بھی میں نے پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچا دیا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے وہ گلاس بھی بھیجنا پڑا جس سے تم نے برسوں رات پانی پیا تھا اور جس پر تمہاری انگلیوں کے بڑے واضح نشانات موجود تھے۔ اور یہ سب کچھ مجھے اس لیے کرنا پڑا مسٹر اسلم عرف رشید عرف دلاور کہ اس کے بغیر تمہیں مجرم ثابت نہیں کیا جاسکتا تھا۔"

یوں لگا جیسے دلاور کے قدم لڑکھڑا گئے ہوں۔ اس کی حیرت سے پھٹی آنکھیں اختر کو گھور رہی تھیں۔

"تو میری بربادی کی وجہ تم ہو۔" وہ دانت پیس کر بولا۔ "میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

اس نے ایک جھٹکے سے جیب سے ہاتھ نکالا تو اس میں ایک لمبے پھل والا چاقو چمک رہا تھا۔ چاقو بلند کرتے ہوئے اس نے جست لگائی۔ اختر تیار تھا وہ پھرتی سے ایک طرف کو کرگیا۔ دلاور گالیاں بکتے ہوئے دوبارہ حملہ آور ہوا۔ اس مرتبہ اختر نے سیدھا ہاتھ بڑھا کر دلاور کا چاقو والا ہاتھ پکڑتے ہوئے ایک زبردست جھٹکا دیا۔ دلاور گھٹنوں کے بل فرش پر گر گیا۔ سیاہ چشمہ اس کی ناک سے پھسل گیا مگر چاقو ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ایک بار پھر اٹھ کر اختر کی طرف لپکا۔ سرخ آنکھیں جیسے حلقوں سے باہر نکلی پڑ رہی تھیں۔ اختر نے لات چلائی جو دلاور کے پیٹ میں لگی۔ اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔ اختر نے اس کا چاقو والا ہاتھ پکڑ کر زور سے میز پر دے مارا۔ دلاور دوسری بار چیخا اور چاقو اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اختر نے الٹے ہاتھ سے ایک زبردست تھپڑ اس کی کنپٹی پر رسید کیا۔ دلاور لڑکھڑاتے ہوئے دیوار سے ٹکرایا۔ وہ پھر پلٹا مگر اختر نے اسے اپنے گھٹنوں پر رکھ لیا۔ وہ چار گھونسے کھا کر ہی دلاور کا حال ابتر ہوگیا مگر اس کے غصے اور جوش کا یہ عالم تھا جیسے بالکل ہی دیوانہ ہوگیا ہو۔ بار بار گرتا اور اٹھ کر اختر سے لپٹ جاتا مگر کب تک... آخری مرتبہ اختر نے ایک زبردست ہاتھ اس کی گدی پر رسید کیا اور اس مرتبہ دلاور گرا تو اس میں اٹھنے کی سکت باقی نہیں رہ گئی۔

اسی وقت مولا بخش کانسٹیبلوں کے ساتھ پہنچ گیا۔

"ہینڈز اپ۔" اس نے ریوالور سے دلاور اور اختر کو زیر لیتے ہوئے کہا۔

"ارے چھوڑیں انسپکٹر صاحب۔" اختر کرسی پر بیٹھ گیا۔ "میرے ہاتھ پہلے ہی اس کم بخت کی مرمت کرتے کرتے تھک گئے ہیں۔"

"رشید کہاں ہے؟" مولا بخش نے کمرے میں ادھر ادھر دیکھا۔

"کمال ہے، یعنی تم ابھی تک نہیں پہچان سکے... مگر ٹھہرو، شاید اس طرح تمہاری سمجھ میں نہ آئے۔" اختر نے کہا۔

وہ اٹھ کر دلاور کے پاس آیا اور ایک جھٹکے سے اس کی گھنی مونچھیں اکھاڑ پھینکیں۔

"رشید..." حیرت سے مولا بخش نے کہا۔ "گرفتار کرلو اسے۔" اس نے گھوم کر کانسٹیبلوں کو حکم دیا اور اختر سے مخاطب ہوا۔ "آپ کو بھی ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔"

☆☆☆

"ہیلو... کیپٹن شہزاد پلیز!" نرگس نے بڑی بے تابی سے کہا۔ "میں نرگس بول رہی ہوں۔"

"کیپٹن تو آفس میں موجود نہیں ہیں۔" شریف نے جواب دیا۔ "میں کوئی خدمت کرسکتا ہوں؟"

"میں اختر صاحب کے بارے میں معلوم کرنا چاہتی تھی۔"

"اوہ، تو کیا آپ ابھی تک ان سے نہیں ملیں؟"

"جی نہیں۔ آپ کو معلوم ہے وہ کہاں ہیں؟"

"میری معلومات کے مطابق وہ وہیں ہیں جہاں آپ نے انہیں چھوڑا تھا یعنی شہزادہ علی..."

مگر نرگس اس کا باقی فقرہ سننے کے لیے نہیں ٹھہری۔ ہلکی سی کلک کی آواز سن کر شریف سمجھ گیا کہ نرگس ریسیور رکھ چکی ہے۔

نرگس نے کال بیل بجائی۔ آغا قیامت نے دروازہ کھولا۔

"یہ کون آج آیا سویرے سویرے۔" وہ گنگنائے مگر نرگس اس وقت کچھ سننے کے موڈ میں نہیں تھی۔ ایک ہاتھ سے آغا صاحب کو ہٹاتے ہوئے وہ تقریباً بھاگتی ہوئی اندر چلی گئی۔ سامنے ہی کرسی پر اختر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔

"اوہ اختر!" نرگس نے ایک گہری سانس لی اور کرسی کے پیچھے آکر اپنی بانہیں اس کی گردن میں ڈال دیں۔

"ارے ارے۔" اختر اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ "آخر یہ بے تکلفی کیا معنی رکھتی ہے محترمہ!"

"اختر!" نرگس چونکی۔ "میں اب تمہارے لیے اتنی غیر ہوگئی ہوں۔"

"ہوں... کیا مطلب؟ آپ پہلے بھی زیادہ سے زیادہ ایک دوست ہی تو تھیں۔"

"یہ تم کہہ رہے ہو؟" نرگس کے ہونٹ کپکپائے۔ "اور میں تمہارے لیے دن کا چین اور راتوں کی نیند حرام کرتی رہی۔"

"تو آپ کو پہلی فرصت میں جا کر سو جانا چاہیے۔"

"میں نے تمہارے لیے ابا جان سے جھگڑا کیا۔ بے غیرتی اور بے حیائی کے طعنے سنے۔ دنیا کے سامنے خود کو رسوا کرلیا۔ ایک ایک لمحہ کانٹوں کی نوک پر گزارا۔"

"چچ چچ... یقیناً آپ کو کافی خراشیں آئی ہوں گی؟"

"بس خاموش رہو۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ مرد کی ذات اتنی بے وفا ہوتی ہے۔" نرگس جیسے رونے ہی والی تھی۔ "لیکن شاید قصور میرا ہی تھا مگر اب میری آنکھیں کھل چکی ہیں..."

"ابھی نہیں کھلی ہیں محترمہ!" اختر نے سر ہلاتے ہوئے جیسے بڑی مایوسی سے کہا۔

اچانک دوسرے کمرے کا دروازہ کھلا۔ نرگس نے چونک کر دیکھا۔ ایک اور اختر کمرے میں داخل ہورہا تھا۔

"ارے نرگس!" وہ خوش ہو کر بولا۔ "تم کب آئیں؟" نرگس نے تیزی سے پہلے والے اختر کی طرف غور سے دیکھا۔

"اب آنکھیں مت دکھایئے محترمہ! کسی کے گھر آکر اسے باتیں سنانا اور آنکھیں دکھانا ہماری ریاست میں قابل

www.pkdigest.com

دست اندازی پولیس سمجھا جاتا ہے۔‘‘
’’اوہ تو یہ آپ ہیں۔‘‘ نرگس نے ایک گہری سانس لی اور دھم سے کرسی پر بیٹھ گئی۔
’’شاید تم انہیں اختر سمجھ رہی تھیں۔‘‘ اختر نے ہنستے ہوئے کہا۔
’’مگر سوال تو یہ ہے کہ انہوں نے ایسا کیا کیوں؟‘‘ شہزادہ علی بولا۔ ’’ہمارا مشورہ ہے کہ شادی کے بعد کسی اچھے ڈاکٹر سے نرگس صاحبہ کی آنکھیں ٹیسٹ کرائیں۔‘‘
’’اس میں نرگس کا قصور نہیں۔‘‘ اختر نے جواب دیا۔
’’آخر آپ نے اب تک اپنا میک اپ ختم کیوں نہیں کیا؟‘‘
’’لاحول ولا قوۃ۔‘‘ شہزادے نے منہ پر ہاتھ پھیرا۔ ’’رات پولیس ہیڈکوارٹر سے واپس آئے تو اس قدر تھک چکے تھے کہ یونہی چادر تان کر سو گئے۔ میک اپ اتارنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ پھر تو ہمیں آپ دونوں سے معذرت خواہ ہونا چاہیے۔ مگر بہ خدا زندگی میں پہلی مرتبہ ہمارا دل نرگس صاحبہ کی باتیں سن کر یہ چاہ رہا تھا کہ کاش ہم سچ مچ ان باتوں کے مخاطب ہوتے۔‘‘

☆☆☆

’’میری سمجھ میں یہ بات ابھی تک نہیں آئی کہ آپ کو رشید پر شبہ کیسے ہوا؟‘‘ ڈی ایس پی نے پوچھا۔
’’بہت معمولی بات تھی۔‘‘ کیپٹن شہزادے نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ’’اختر نے خان بہادر پر پانچ گولیاں چلائی تھیں۔ ایک ان کے شانے میں لگی دو برق رفتار کے جسم میں پیوست ہو گئیں۔ یہ بھی ایک حیرت انگیز بات تھی کہ تمام گولیاں خان بہادر پر چلائی جائیں اور ان میں سے دو برق رفتار کو لگ جائیں۔ سوال یہ تھا کہ باقی دو گولیاں کہاں گئیں۔ رشید اپنی ساری اسکیم میں بس یہیں غلطی کر گیا۔ اگر اس نے بھی تین کے بجائے پانچ فائر کر دیے ہوتے (واضح رہے کہ اس کے ریوالور پر سائلنسر لگا تھا) تو مجھے یہ کیس سلجھانے میں بڑی مشکل پیش آتی۔ مگر وہ بھی مجبور تھا، اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا۔ اگر کوئی اس کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ لیتا تو سارا کھیل وہیں ختم ہو جاتا۔ بہرحال، جب مجھے معلوم ہوا کہ موقع واردات پر کوئی اور گولی نہیں پائی گئی تو اس کا مطلب صرف یہ نکلتا تھا کہ حقیقت میں صرف تین ہی گولیاں چلائی گئی تھیں۔ مگر اختر نے پانچ فائر کیے تھے اور اگر گولیاں صرف تین چلی تھیں تو وہ لازمی طور پر اس کے ریوالور سے نہیں چلیں۔ چنانچہ یقینی طور پر کوئی دوسرا ریوالور بھی اس موقع پر اور اسی وقت استعمال کیا گیا تھا۔ اس نکتے پر غور کیا تو رشید سے زیادہ کوئی موزوں معلوم نہیں ہوا۔ اور جب اسے مشتبہ قرار دے کر تحقیقات کی تو تمام گتھیاں خود بہ خود سلجھتی چلی گئیں۔‘‘
’’واقعی اس وضاحت کے بعد تو رشید کے سوا کوئی اور مجرم ہو ہی نہیں سکتا تھا۔‘‘ ڈی ایس پی نے تائید کی۔ ’’مگر ایک سوال پھر بھی باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ اکرم کو کس نے قتل کیا؟‘‘
’’کیا آپ کو یہ معلوم نہیں ہوا کہ سائیس اللہ دتہ اچانک خان بہادر کی ملازمت چھوڑ کر مع اپنی نوجوان بیوی کے روپوش ہو گیا ہے۔‘‘
’’آپ کا مطلب ہے کہ وہ اکرم کا قاتل تھا؟‘‘ ڈی ایس پی نے حیرت سے پوچھا۔
’’اس کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔‘‘ کیپٹن نے جواب دیا۔ ’’اکرم ریشماں پر نگاہ رکھتا تھا۔ یہ بات مجھے عاقل خان سے بعد میں معلوم ہوئی۔ جہاں تک میرا خیال ہے اکرم نے ملازمت چھوڑ کر جاتے ہوئے اپنے ساتھ ریشماں کو بھی چلنے پر اکسایا ہوگا۔ اللہ دتہ نے ان دونوں کی باتیں سن لیں اور جب اکرم درختوں کے جھنڈ میں ریشماں کا انتظار کر رہا تھا، اللہ دتہ نے اس خفیہ راستے سے باہر جا کر جسے اکرم نے اپنی آمد و رفت کے لیے بنایا تھا، اس کا کام تمام کر دیا۔‘‘

☆☆☆

ایک ہفتے بعد اللہ دتہ کو اس کے آبائی گاؤں سے گرفتار کیا گیا تو کیپٹن شہزادہ کا یہ اندازہ بھی درست نکلا۔ اکبر خان پر کوئی الزام ثابت نہیں ہو سکا تھا اس لیے اسے رہا کر دیا گیا۔ ریس کلب سے ملنے والی رقم سے خان بہادر نے اپنی زمین واپس خرید کر کھیتی باڑی شروع کرا دی۔ نرگس اور اختر کی شادی ہو گئی مگر شریف کے ذہن میں پھر بھی ایک سوال چبھ رہا تھا کہ اکبر خان نے خان بہادر کا گھوڑا مع اصطبل ایک لاکھ کی خطیر رقم سے کیوں خریدنا چاہا؟ آخر کیپٹن نے بتایا کہ اکبر خان شرطوں کی دلالی بھی کرتا تھا۔ آخری ریس میں برق رفتار کو اتنی پبلسٹی مل گئی تھی کہ اس پر لگائی ہوئی شرطوں کی رقم لاکھوں تک پہنچ گئی تھی۔ اگر وہ جیت جاتا تو اکبر خان کو کم سے کم تین لاکھ روپیا ادا کرنا پڑتا اور وہ بھی اپنی جیب سے۔ اس لیے اس نے ایک لاکھ کی آفر دے کر برق رفتار کو خریدنے کی کوشش کی۔ اگر وہ اس گھوڑے کا مالک بن جاتا تو اسے دانستہ ہرا دیتا۔ اس طرح اسے ایک لاکھ خرچ کر کے بھی دو لاکھ کی بچت ہو جاتی۔

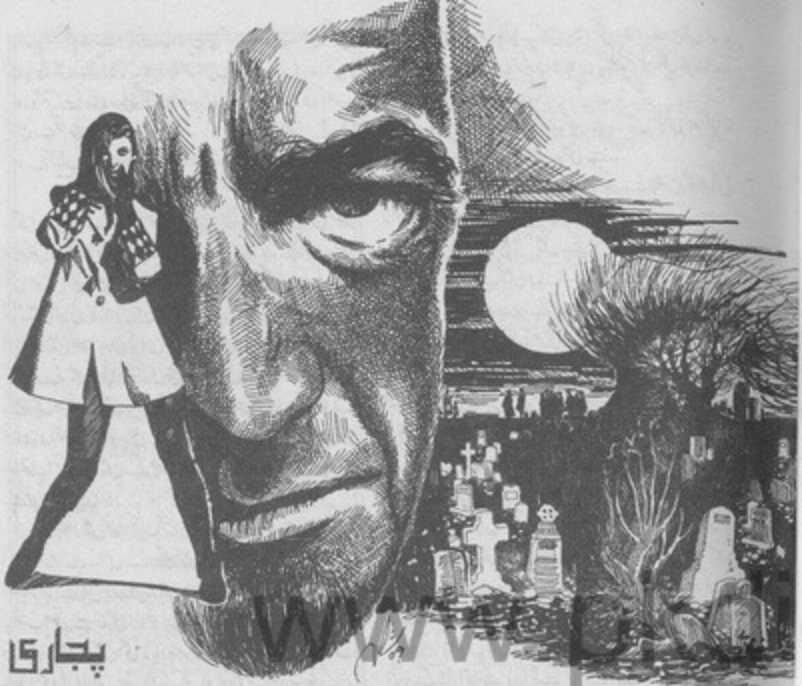

پجاری

کاشف زبیر

حسن ایک نعمت ہے مگر لوگ جنسِ مخالف کی اس دولت بے بہا کو اپنے لیے مخصوص سمجھ لیتے ہیں ... اور اس کے بل بوتے پر اپنی ناآسودہ خواہشات کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے انہیں بری طرح روند ڈالتے ہیں ... جذبات انہیں اس قدر مغلوب کر دیتے ہیں ... کہ انہیں اپنے مقام و مرتبے کا بھی خیال نہیں رہتا.

مغرب سے درآمد مارنی ولسکی اسٹرانگ کی ایک تازہ بہ تازہ سوغات

تاریخی پس منظر میں جنم لینے والی ایک سنسنی خیز داستان کے یادگار کرداروں کی عکاس تحریر

’’اس کہانی کے پانچ کردار ہیں۔‘‘ گائیڈ روسٹر نے کہا۔
میں نے زیر زمین مقبرے میں پتھر کی سلوں پر پڑی ان پانچ صدی پرانی لاشوں کو دیکھا۔ ’’مگر ان کی تعداد تو تین ہے؟‘‘ میں نے اعتراض کیا۔
’’ہاں، یہ ان میں سے تین کرداروں کی لاشیں ہیں۔‘‘
’’اور باقی دو؟‘‘
’’ان کی بھی لاشیں اس دنیا میں کہیں نہ کہیں ہوں گی۔‘‘ روسٹر نے کسی قدر ڈرامائی انداز میں کہا۔ وہ گائیڈز کے مخصوص ڈرامائی انداز میں بات کرنے کا عادی تھا۔
’’کہیں نہ کہیں سے کیا مراد ہے؟‘‘
’’مطلب یہ کہ ان کرداروں کا کچھ نہیں پتا کہ وہ کہاں گئے۔‘‘ اس نے جواب دیا۔ ’’بہرحال، کوئی پانچ صدی زندہ نہیں رہ سکتا۔‘‘

''ٹھیک ہے، میں نے مان لیا کہ وہ غائب ہیں لیکن ان پانچ میں سے کون سے دو غائب ہیں؟''

''اس کے لیے تمھیں ایک کہانی سننا پڑے گی، تب ممکن ہے تم جان جاؤ۔''

''میں کہانی سننا چاہوں گا۔'' میں نے تحمل سے کہا۔

دو دن پہلے میں لندن سے مارسلز آیا تھا۔ یہاں میں نے ایک ساحلی ولا لیا تھا اور اب میرا ارادہ مستقل طور پر یہاں رہنے کا تھا کیونکہ لندن کی سردی میرے لیے جان لیوا بھی ہو سکتی تھی۔ میرا کام ایسا تھا کہ میں کہیں بھی رہ کر کر سکتا تھا۔ میں کہانی کار ہوں اور انگلینڈ کے رسالوں کے لیے کہانی اور مضامین لکھتا ہوں۔ اس لیے میں جہاں بھی رہوں، مجھے کام کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی ہے۔ دو سال پہلے مجھے ایک مرض لاحق ہوا تھا جس میں جسم میں سردی کے خلاف قوتِ مدافعت کم ہو جاتی ہے۔ میں گزشتہ برس مرتے مرتے بچا تھا۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے لندن سے کہیں دور چلے جانا چاہیے۔

مارسلز میں میرا ایک کزن بھی رہتا ہے اور اس کا یہاں ایک فارم ہے۔ اس نے مجھے مارسلز آنے اور یہاں رہائش اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ میں یہاں آیا اور کزن کی مدد سے یہ خوب صورت ساحلی ولا خرید لیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ یہاں دسمبر اور جنوری میں بھی زیادہ سردی نہیں پڑتی ہے اور برف باری بھی کم ہوتی ہے۔ اس کے باوجود اگر مجھے سردی سے تکلیف ہو تو میں افریقا جا سکتا ہوں جہاں موسم ان دنوں نہایت خوش گوار ہوتا ہے۔ اکتوبر میں ہی میں مارسلز چلا آیا تھا۔ میں نے پہلے ہی کزن سے کہہ دیا تھا کہ میرے لیے ایک گائیڈ کا انتظام کر کے رکھے جو مجھے مارسلز کی اور اس کے تاریخی مقامات کی سیر کرائے۔ اس نے مجھے روسٹر سے متعارف کرایا۔ اس کا کہنا تھا کہ مارسلز میں روسٹر سے زیادہ بہتر گائیڈ ملنا دشوار ہے اور وہ اس شہر اور اس کے تاریخی مقامات کو اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح جانتا ہے۔

''مسٹر جارج اینگلش! تم پہلے کیا دیکھنا پسند کرو گے؟''

''موت کے مناظر!'' میں نے جواب دیا۔

وہ چونک گیا۔ ''کیا تم مصنف ہو؟''

''ہاں تمھیں کیسے پتا چلا؟''

''تمہارے اس جملے سے۔ ایسی بات کوئی مصنف ہی کہہ سکتا ہے۔''

''تب تم سمجھ گئے ہو گے کہ موت کے مناظر سے کیا مراد ہے؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''ایسے تاریخی مقامات جہاں اب صرف موت ہو، وہاں زندگی برسوں پہلے ختم ہو چکی ہو۔ اب وہاں صرف کہانیاں ہوں۔''

''تم نے درست تجزیہ کیا ہے۔'' میں خوش ہو گیا۔ ''مجھے تاریخی کہانیوں کی تلاش رہتی ہے۔''

''میں کل ہی تمھیں ایک ایسی جگہ لے چلوں گا جہاں لاتعداد کہانیاں بکھری ہوئی ہیں۔''

''کسی قبرستان؟'' میں نے پوچھا تو وہ مسکرانے لگا۔

مگر اس نے جواب نہیں دیا۔ البتہ اگلے روز جب ہم نکلے تو اس نے کار ایک بہت پرانے قبرستان کے سامنے روک دی۔ یہاں شاید صدیوں پہلے آخری مردہ دفنایا گیا تھا اور اب اس کی چار دیواری میں صرف خاموشی اور ویرانی کا راج تھا۔ یہ قدیم قبرستان تھا اس لیے ہمیں کار دروازے کے باہر چھوڑنا پڑی تھی۔ اندر بے شمار قبریں تھیں۔ اونچی نیچی، پتھر سے لے کر اعلیٰ ترین سنگِ مرمر سے بنی قبریں بھی تھیں۔ ایسی بھی تھیں جن میں مردہ کھڑا کر کے دفنایا گیا تھا اور موصوف یا موصوفہ آج تک اسی طرح کھڑے تھے۔ بعض جگہ قبروں کی جگہ تہ خانے تھے، ان میں پتھر کی سلوں پر لاشیں رکھ دی جاتی تھیں اور وہ آہستہ آہستہ وقت کے ہاتھوں محض ہڈیاں بن کر رہ جاتے تھے۔ یہاں پر ایسے تہ خانوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی کیونکہ قبرستانوں میں تہ خانے صرف امرا بنواتے تھے۔ وہی اس کے اخراجات برداشت کر سکتے تھے اور غریب بے چارے قبرستان میں جگہ ہی پالیں تو ان کی خوش نصیبی ہوتی تھی۔ میں نے روسٹر سے کہا۔

''کیا میں کوئی تہ خانہ دیکھ سکتا ہوں؟''

''اگرچہ ایسا کرنا غیر قانونی ہو گا کیونکہ یہاں کے قانون کے مطابق مقبرے بھی رہائش کی طرح شمار ہوتے ہیں اور ان میں بلا اجازت گھسنا ٹریس پاس کے برابر سمجھا جاتا ہے مگر میں تمھیں ایک خاص مقبرہ دکھاؤں گا۔ اصل میں، میں تمھیں اسی لیے یہاں لایا ہوں۔''

''اس مقبرے سے کوئی کہانی بھی منسلک ہے؟''

''بالکل، ورنہ میں تمھیں صرف مقبرہ دکھانے کے لیے نہیں لایا ہوں۔'' اس نے سر ہلایا اور ایک مقبرے کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہ دیکھ رہے ہو۔ ہمیں اس میں جانا ہے۔''

''یہاں کوئی نگران نہیں ہوتا؟'' مجھے کسی قدر گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ دیارِ غیر میں کوئی غیر قانونی کام کرتے ہوئے پکڑے جانا میرے شایانِ شان نہیں تھا۔ روسٹر نے میری پریشانی بھانپ لی تھی، اس نے مجھے تسلی دی۔

''فکر مت کرو، یہاں کوئی نگران نہیں ہے۔''

''کیا تمھیں یقین ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں یہ قبرستان میرے لیے نیا نہیں ہے۔'' اس نے کسی قدر ناگواری سے کہا۔ ''میں اکثر لوگوں کو یہاں لاتا رہتا ہوں۔''

میں نے سر ہلایا۔ ''اوکے! پھر یہ تمہاری ذمے داری ہے کہ معاملہ خراب ہوا تو تم ہی سنبھالو گے۔''

''یہ میری ذمے داری ہے اور تم بے فکر رہو، کچھ نہیں ہوگا مسٹر جارج!''

مقبرہ ایک چوکور عمارت تھی جس کے چاروں طرف چھت کے ساتھ کنگرے لگے تھے اور عمارت پر سنگِ مرمر لگایا گیا تھا جو زمانے کے ہاتھوں جگہ جگہ سے اکھڑ رہا تھا۔ اس کے نیچے سے سرخ رنگ کے پتھر جھانک رہے تھے۔ مقبرہ یقینی طور پر کسی دولت مند کا تھا لیکن جلد روسٹر نے میری غلط فہمی دور کر دی۔ اس نے بتایا۔

''یہ کسی ایک شخص کا مقبرہ نہیں ہے بلکہ اس میں تین لاشیں ہیں۔''

''ایک ہی خاندان کی؟''

''یہی تو مزے کی بات ہے کہ یہاں دفن ہونے والوں کا آپس میں کوئی خونی یا قانونی رشتہ نہیں تھا۔'' روسٹر نے کہا۔ ہم مقبرے کے پاس تھے، اس نے ایک طرف کا آہنی دروازہ دھکیلا۔ میرا خیال تھا کہ دروازہ آسانی سے نہیں کھلے گا مگر وہ بہت آرام سے اور کسی قدر آواز کے ساتھ کھل گیا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ ''اب اندر چلنا ہے مگر احتیاط سے... سیڑھیاں اچھی حالت میں نہیں ہیں۔''

اس نے جیب سے ایک ٹارچ نکالی اور پہلے خود اندر گیا۔ اس کے پیچھے میں تھا۔ اندر جانے کا راستہ بہت تنگ تھا اور سیڑھیاں گھومتی ہوئی نیچے تک جا رہی تھیں۔ قدمچے بہت خراب حالت میں تھے اور بیشتر ٹوٹ چکے تھے، اس لیے واقعی احتیاط کی ضرورت تھی۔ ٹارچ کی روشنی میں راستہ مشکل سے نظر آ رہا تھا کیونکہ روسٹر آگے تھا اور مجھے واقعی بہت سنبھل کر اترنا پڑ رہا تھا۔ تہ خانہ خاصی گہرائی میں تھا اور جب ہم اس کے دروازے کے سامنے پہنچے تو بدبو کا شدید احساس ہوا۔ آخر میں روسٹر نے ایک دروازہ اور کھولا اور ہم اندر داخل ہوئے۔ مجھے وہاں روشنی پا کر تعجب ہوا تھا۔ اوپر روشن دان اس طرح لگائے گئے تھے کہ ان سے روشنی نیچے تک آ رہی تھی۔ روسٹر نے ٹارچ بجھا دی تھی۔

تہ خانہ ایک ہی ہال پر مشتمل تھا اور اس کے وسط میں

خوب صورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

ماہ ستمبر 2009 کے شمارے کا احوال

زخمی مسکراہٹ

دلفریب محبتوں اور زندگی کے تلخ حقائق پر مبنی دلخراش تحریر...... آخری صفحات پر نشور ہادی کا تحفۂ خاص

خانزادہ

ہمایوں بلگرامی کے قلم سے ابتدائی صفحات کی نمایاں شان...... ورق ورق بکھرتی تاریخی داستان

حضرت ایوبؑ

اس بندۂ خاص کے صبر کی ایسی انتہا کہ شیطان ملعون خود پر ناکامی کی خاک ڈالتا رہا

مقتول مسیحا

مرزا امجد بیگ کے یادگار کارناموں کا سلسلہ...... لالچ آدمی کو مسیحا سے شیطان بھی بنا سکتا ہے

مستقل سلسلے

دیوتا، انا ڑی، محفلِ شعر و سخن، آپ کے خط

مزید

ش صغیر ادیب، منظر امام، کاشف زبیر، شگفتہ ہو یمن اور سریر خان کی دلچسپ تحریریں

اور وہ سب جو آپ سسپنس میں دیکھنا چاہتے ہیں!

تازہ شمارہ فوری حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 5895313 فیکس: 5802551

سنگِ مرمر سے بنی ہوئی پہلو بہ پہلو سلوں پر تین سال خوردہ لاشیں پڑی تھیں بلکہ لاشیں بھی کیا تھیں صرف ہڈیوں کے ڈھیر تھے۔ البتہ لباس سے... جو اتنا بوسیدہ ہو چکا تھا کہ ہڈیوں کی وجہ سے پھٹ گیا تھا، یہ پتا چل رہا تھا کہ لاشیں مرد یا عورت کی ہیں۔ ان میں دو لاشیں مردوں کی تھیں اور ایک عورت کی۔ میں کوئی پرانی لاشوں کا ماہر تو نہیں ہوں مگر انہیں دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ یہ سب پختہ عمر کے لوگ تھے۔ کم سے کم جوان ضرور تھے۔ کوئی لاش کسی کم عمر کی نہیں تھی۔ میں نے سلوں کے سرہانوں کا جائزہ لیا جہاں کتبے لگے تھے اور ان پر مرنے والوں کے نام اور سن وتاریخ وفات لکھی ہوئی چاہیے تھی مگر وہاں کچھ نہیں تھا۔ سارے کتبے صاف تھے۔

''ان پر تو کچھ نہیں لکھا ہے۔'' میں نے روسٹر کی طرف دیکھا۔

''ہاں، ان پر کچھ نہیں لکھا گیا تھا۔'' اس نے تصدیق کی۔

''نہیں، لکھا تھا یا بعد میں کسی نے مٹا دیا؟'' میں نے شک آمیز انداز میں کہا۔

''اگر تمہارا اشارہ میری طرف ہے تو میں اس معاملے میں لاعلم ہوں۔ میں نے جب پہلی بار یہ جگہ دیکھی تھی تو یہ سلیں اسی طرح صاف تھیں اور اس وقت سے اب تک یہاں نہ تو کوئی تبدیلی آئی ہے اور نہ ہی کوئی کمی یا اضافہ ہوا ہے۔''

''یہ لاشیں کن افراد کی ہیں؟'' میں نے لاشوں کا قریب سے معائنہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ دو مرد اور ایک عورت کی لاشیں ہیں۔''

''تم نے درست کہا۔'' اس نے میری تائید کی اور ساتھ ہی بتایا کہ اس کہانی کے کرداروں کی تعداد پانچ تھی۔ میں نے لاشوں کی طرف دیکھا جو تین تھیں۔ باقی دو کے بارے میں روسٹر کو بھی علم نہیں تھا کہ وہ کہاں گئے اور ان کا کیا ہوا۔ البتہ اسے اس کہانی کا علم تھا جو ان لاشوں سے وابستہ تھی۔

''اب تم وہ کہانی سنا دو۔'' میں نے کہا۔ ''اس سے پہلے کہ میرا دم گھٹ جائے۔''

''کہانی بہت عام سی ہے مگر اس زمانے کے معاشرے کے لحاظ سے بہت خاص تھی۔''

''کہانی کبھی عام نہیں ہوتی۔'' میں نے تصحیح کی۔ ''ہر کہانی خاص ہوتی ہے۔''

''اس کے پانچ کردار تھے۔ ایک دولت مند نواب کاؤنٹ ڈی ووستو، دوسرا ایک پادری اینتھنی، تیسرا کردار ایک عورت کا تھا جو کاؤنٹ ڈی ووستو کی ملازمہ تھی۔''

''باقی دو کردار کن لوگوں کے تھے؟''

''ان میں ایک نوجوان لڑکی اوشیا تھی اور ایک جوان لڑکا چارلس تھا۔''

میں نے غور کیا۔ ''کیا یہ محبت کرتے تھے؟''

''ہاں۔'' اس نے کسی قدر بے دلی سے کہا تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں نے اسے ٹوک کر اس کا سارا جوش و خروش ختم کر دیا تھا۔ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی میں نے دم سادھ لیا۔ روسٹر کا موڈ بحال ہونے میں کچھ وقت لگا۔ اس نے آہستہ آہستہ کہانی سنانا شروع کی۔

☆☆☆

کاؤنٹ ڈی ووستو کا شمار مارسلز کے دولت مند اور بارسوخ افراد میں ہوتا تھا۔ اس کا باپ رشتے میں شاہِ فرانس کا دور کا چچا لگتا تھا اس وجہ سے بھی اسے خاص اہمیت حاصل تھی۔ اپنے باپ کے بعد ووستو اس کی جاگیر اور خطاب کا وارث بنا تھا۔ دولت کی کمی نہیں تھی اور وہ تھا بھی بہت شوقین مزاج آدمی... اس لیے اس نے چن چن کر اپنے اردگرد حسین ترین عورتیں جمع کر لی تھیں اور اپنا بیشتر وقت ان کی صحبت میں گزارتا تھا۔ ان عورتوں میں ایک ماریا بھی تھی۔ ماریا بہت زیادہ حسین عورت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ کاؤنٹ ڈی ووستو کے حرم میں آئی تو باقی عورتیں حسد کرنے لگیں۔ انہیں خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ اب کاؤنٹ ان کی طرف زیادہ توجہ نہیں دے گا اور یہ خدشہ غلط بھی نہیں تھا۔ جیسے ہی ماریا حرم میں آئی کاؤنٹ ڈی ووستو اس کے علاوہ سب کو بھول گیا۔

کاؤنٹ ڈی ووستو بلا کا عیاش تھا۔ اس کی راتیں عام طور سے تین چار عورتوں کے ساتھ گزرتی تھیں مگر جب سے ماریا آئی تھی، وہ اس کی راتوں پر قابض ہو گئی تھی۔ ماریا کا تعلق پیرس کے ایک خاندان سے تھا اور وہ خود کاؤنٹ ڈی ووستو کی ملازمت میں آئی تھی۔ ووستو اس کے لیے اتنا پاگل ہو گیا تھا کہ دن رات اس کے ساتھ رہنے لگا تھا جب وہ اپنی جاگیر کے معاملات دیکھتا... تب بھی ماریا اس کے ساتھ ہی ہوتی تھی۔

حرم کے معاملات حرم تک رہا کرتے تھے مگر ماریا پہلی عورت تھی جو حرم سے باہر اس کے محل کے دوسرے حصوں میں بھی نظر آتی تھی۔ حد یہ کہ وہ اس کے اہلِ خانہ کے ساتھ ایک ہی میز پر کھانا کھاتی تھی۔ کاؤنٹ کی بیوی نے اس پر احتجاج کیا تھا کہ وہ ایک داشتہ کو محل میں لا رہا ہے مگر کاؤنٹ نے اس کے احتجاج پر کوئی توجہ نہیں دی۔ یہی نہیں بلکہ ماریا اس کے ساتھ تقریبات میں بھی شرکت کرنے لگی تھی۔ پہلے ان

تقریبات میں کاؤنٹ ڈی ووستو کی بیوی جاتی تھی اور اب ماریا نے اس کی جگہ لے لی تھی۔ دوسری عورتوں کی طرح کاؤنٹ کی بیوی بھی ماریا سے خطرہ محسوس کرنے لگی تھی کہ کہیں وہ اس کی جگہ نہ لے لے۔

فرانس اس زمانے میں ایک کٹر کیتھولک ملک تھا جہاں پادریوں کی حکومت تھی اور مذہب کے معاملے میں ان کا فیصلہ آخری ہوتا تھا جس میں شاہِ فرانس بھی مداخلت نہیں کر سکتا تھا۔ کیتھولک فرقے میں طلاق کا تصور نہیں ہے، اسی طرح دوسری شادی بھی ممنوع ہے۔ مگر یہ ساری پابندیاں عام لوگوں کے لیے تھیں۔ طبقۂ امرا اور شاہی خاندان کو ہر قسم کی آزادی تھی۔ وہ دوسری شادی بھی کر سکتے تھے اور اپنی بیوی کو طلاق بھی دے سکتے تھے۔ اسی وجہ سے کاؤنٹ کی بیوی خوف زدہ تھی۔ حالانکہ وہ خود بہت حسین عورت تھی اور کاؤنٹ کے چار بچوں کی ماں بھی تھی جن میں جاگیر کا ولی عہد بھی تھا... مگر ساتھ ہی وہ کاؤنٹ ڈی ووستو کی عیاش فطرت سے بھی واقف تھی جو کسی بھی عورت کو زیادہ دن اپنے دل اور خواب گاہ میں جگہ نہیں دیتا تھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا تھا کہ اس کے حرم میں کوئی بھی عورت دو تین سال سے زیادہ نہیں ٹکی تھی۔ البتہ ماریا کے لیے اس کا انداز بالکل ہی بدلا ہوا تھا جس سے سب خطرہ محسوس کر رہے تھے۔

ان وجوہات کی بنا پر ماریا کے خلاف سازشوں کا آغاز ہوا۔ اسے کاؤنٹ ڈی ووستو کے دل سے اتارنے کے لیے مختلف حربے استعمال کیے جانے لگے۔ ان حربوں کی تفصیل تو دستیاب نہیں ہے مگر کہا جاتا ہے کہ ماریا کو موت کے گھاٹ اتارنے تک کی کوشش کی گئی تھی۔ اسے شاید زہر دیا گیا تھا اور وہ مرنے کے قریب ہو گئی تھی۔ ایک صبح ناشتے کی میز پر ماریا نے بھنا ہوا گوشت کھایا تھا۔ اس کے بعد اس کی طبیعت بگڑ گئی اور اسے الٹیاں آنے لگیں۔ فوری طور پر محل کے طبیب نے اس کا علاج شروع کیا مگر اس سے ماریا کی حالت نہیں سنبھلی تو اس کے علاج کے لیے کاؤنٹ ڈی ووستو نے فرانس بھر سے طبیب بلوا لیے تھے جو محل کے ایک گوشے میں ماریا کی جان بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس گوشے میں کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ سوائے ان لوگوں کے جن کو خود کاؤنٹ ڈی ووستو نے اجازت دی تھی۔ طبیبوں کی کوشش سے ماریا کی جان بچ گئی تھی۔ مگر جب چند ہفتے بعد محل کے لوگوں نے دیکھا تو وہ حیران رہ گئے۔ اتنے سے دنوں میں ماریا سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچا ہو گئی تھی۔ وہ اتنی نحیف و نزار ہو گئی کہ اس سے چلا پھرا بھی نہیں جاتا تھا۔

کاؤنٹ اس کے لیے بہت فکر مند تھا۔ اس نے ماریا کو صحت کی بحالی کے لیے اپنی پہاڑ والی حویلی میں بھیج دیا تھا۔

حیرت انگیز بات تھی کہ کاؤنٹ نے نہ تو کسی سے باز پرس کی اور نہ ہی یہ الزام لگایا کہ حویلی میں کسی نے ماریا کو زہر دینے کی کوشش کی ہے۔ حتیٰ کہ اس باورچی سے بھی کوئی پوچھ گچھ نہیں ہوئی جس نے وہ کھانا تیار کیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کاؤنٹ ووستو اس معاملے کو فراموش کر بیٹھا ہے۔ ماریا کو پہاڑ والی حویلی بھیج کر وہ اسے جیسے فراموش کر چکا تھا۔ اس کی راتیں پھر ان عورتوں سے سجنے لگیں جنہیں وہ ماریا کے آنے کے بعد بھول چکا تھا۔ کبھی کبھی وہ بیوی کی خواب گاہ میں بھی چلا جاتا تھا۔ حرم کی عورتوں کا خیال تھا کہ یہ رونق اور پذیرائی صرف ماریا کے آنے تک تھی اور ماریا کچھ عرصے میں آ ہی جاتی۔ اس کے بعد وہ پہلے کی طرح فراموش کر دی جائیں گی۔

مگر ماریا واپس نہیں آئی تھی۔ ہفتے مہینے بن گئے اور پھر پورا ایک سال گزر گیا۔ کاؤنٹ ڈی ووستو ماریا کا ذکر تک نہیں کرتا تھا۔ اس سے بعض لوگوں کو شبہ ہونے لگا کہ کاؤنٹ نے اسے فراموش کر دیا ہے اور اسے اپنے دل اور حویلی دونوں سے نکال دیا ہے۔ ویسے بھی کاؤنٹ ڈی ووستو حسن پرست شخص تھا۔ اس کے معیار سے ذرا کم تر عورت اسے بالکل نہیں بھاتی تھی اور زہر خورانی کے واقعے کے بعد ماریا کی حالت بدل گئی تھی۔ اس کا سارا حسن و جمال نچڑ کر رہ گیا تھا۔ اس لیے اس کا کاؤنٹ کے دل سے اتر جانا قرین قیاس تھا۔ جب ایک سال گزر گیا اور ماریا کی واپسی کے کوئی آثار نظر نہیں آئے تو بہت سارے لوگوں اور خاص طور سے کاؤنٹ ڈی ووستو کی بیوی نے سکون کا سانس لیا۔

مگر جس طرح ماریا پہلی بار اچانک آئی تھی، اسی طرح ایک بار پھر اس کی واپسی ہوئی تھی۔ ایک صبح جب محل کے مکین بیدار ہوئے تو انہوں نے ماریا کو کاؤنٹ ڈی ووستو کی خواب گاہ سے برآمد ہوتے دیکھا اور یہ خبر آگ کی طرح پورے محل میں پھیل گئی۔ سب ماریا کو دیکھنے کے لیے بھاگے آ رہے تھے۔ ماریا پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ اس کا حسن اور جوانی کسی قدر ڈھل سی گئی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ اس حالت میں بھی محل کی تمام عورتوں پر بھاری تھی مگر یہ بھی سچ تھا کہ اس میں وہ پہلے جیسی بات نہیں رہی تھی جب اس نے آتے ہی کاؤنٹ ڈی ووستو کو فتح کر لیا تھا۔

ماریا اپنی فتح کھو چکی تھی، اس کا اندازہ کاؤنٹ ڈی ووستو کے رویے سے ہو چلا تھا جو اب پہلے کی طرح صرف

www.pkdigest.com

مارینا کا نہیں رہا تھا بلکہ اس کی توجہ کا مرکز حرم میں آنے والی چند شوخ و چنچل تتلیوں جیسی نوجوان لڑکیاں تھیں۔ ہاں، یہ تھا کہ مارینا کو سب سے زیادہ شرف باریابی ملتی تھی اور وہ حرم کی واحد عورت تھی جو بغیر بلاوے کے بھی کاؤنٹ ڈی دوستو کے پاس جا سکتی تھی۔ شاید یہ اس کا سابق نشہ تھا جو اب تک کاؤنٹ کے سر پر چڑھا ہوا تھا مگر کب تک... آخر اسے اپنی جگہ خالی کرنا ہی تھی۔ دو تین سال بعد مارینا کی حیثیت حرم کی عام عورت کی سی ہو گئی تھی۔ البتہ یہ سب کے لیے حیرت انگیز تھا کہ کاؤنٹ ڈی دوستو نے اسے حرم سے نہیں نکالا تھا اور وہ اب تک موجود تھی۔ ورنہ حسین ترین عورت بھی زیادہ عرصے کاؤنٹ ڈی دوستو کی نظروں میں نہیں جچتی تھی۔ اس کے حرم میں تین سال گزارنے والی عورت بہت خوش قسمت سمجھی جاتی تھی۔

وقت گزرتا رہا اور مارینا اپنی حیثیت کھوتی رہی۔ یہ نہیں تھا کہ اس کے حسن و شباب میں کوئی کمی آئی تھی مگر اب وہ زیادہ عمر والی ہو گئی تھی۔ اس کے دلکش وجود میں کاؤنٹ کے لیے کوئی نئی چیز باقی نہیں رہی تھی اور اس کی مثال اس اعلیٰ ترین ڈش کی سی ہو گئی تھی جسے انسان روز کھا کھا کر بیزار ہو جاتا ہے۔ اب دوسری حسینائیں کاؤنٹ کی توجہ کا مرکز بن گئی تھیں اور وہ مارینا کو بہت کم اپنی خواب گاہ میں بلاتا تھا۔ مگر یہ کم حیرت انگیز نہیں تھا کہ پانچ سال بعد بھی وہ کاؤنٹ کی خواب گاہ تک رسائی رکھتی تھی۔ شاید وہ اسے ماضی کی یادیں تازہ کرنے کے لیے بلا لیتا تھا۔

پھر وقت نے مارینا کو بالکل پیچھے دھکیل دیا اور وہ محض ایک ملازمہ بن کر رہ گئی۔ جس وقت وہ یہاں آئی تھی تو اس کی عمر صرف اٹھارہ برس تھی اور اسے آئے ہوئے اتنا ہی عرصہ ہو چکا تھا۔ یعنی وہ صرف چھتیس برس کی تھی۔ عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے کی وجہ سے اس کی جوانی برقرار تھی بلکہ اس کے شباب میں تازگی تھی۔ عمر نے اس کے جمال میں اضافہ کیا تھا، کمی نہیں کی تھی۔ بس وہ کاؤنٹ ڈی دوستو کے معیارِ حسن سے گر چکی تھی اسی وجہ سے دوستو نے عرصے سے مارینا پر توجہ کی نگاہ نہیں کی تھی۔ مارینا خود بھی یہ بات سمجھتی تھی اس لیے اس نے صبر کر لیا تھا اور خود کو چھوٹے موٹے کاموں میں مصروف رکھتی تھی۔ حالانکہ وہ محل کی خادمہ نہیں تھی۔

یہ تو دو کرداروں کی کہانی ہے۔ اب اس کہانی میں باقی تین کردار داخل ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے پادری اینکس کا کردار سامنے آتا ہے۔ وہ اس علاقے کا بڑا پادری تھا۔ اس کی کاؤنٹ ڈی دوستو سے دوستی تھی کیونکہ کاؤنٹ اکثر چرچ کو گراں قدر عطیات دیتا رہتا تھا اور اس کی مدد سے چرچ میں کئی حسین نئوں کا اضافہ بھی ہوا تھا۔ اس سے دنیا بیزار راہبوں کی زندگی میں کچھ رنگینیاں آئی تھیں۔ مہینے میں ایک دو بار پادری اینکس کاؤنٹ کا مہمان بن کر اس کے محل میں آتا تھا۔

کاؤنٹ پادری کی میزبانی میں تمام لوازمات کا خیال رکھتا تھا اور اس کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ اس سے خوش رہے تاکہ چرچ کی جانب سے اس کے طرزِ زندگی پر کوئی اعتراض نہ ہونے پائے۔ ایسا بھی ہوتا تھا جو دنیادار اور گناہ گار چرچ کا خیال نہیں رکھتے تھے، ان پر کسی مذہبی قانون کی خلاف ورزی کا مقدمہ چل جاتا تھا اور وہ چرچ کی عدالت کے سامنے پیش ہوتے تھے... جس کے فیصلے کی نہ کہیں اپیل ہوتی تھی اور جن کی لغت میں معافی کا لفظ نہیں ہوتا تھا۔ اینکس کی خدمت میں کچھ خواتین بھی پیش کی جاتی تھیں۔ یہ وہ عورتیں ہوتی تھیں جن سے کاؤنٹ ڈی دوستو کا دل بھر چکا ہوتا تھا اور وہ ان کو مہمانوں کے لیے مخصوص کر دیتا تھا۔ اینکس کے لیے یہ ریٹائرڈ مائیں بھی کم نہیں ہوتی تھیں۔

ان خادماؤں میں سے صرف مارینا کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ اس پر آج تک سوائے کاؤنٹ ڈی دوستو کے کسی نے تصرف نہیں کیا تھا۔ اسے نہ تو کبھی کسی مہمان کے پاس جانے پر مجبور کیا گیا تھا اور نہ ہی وہ اینکس کی خدمت میں پیش ہوئی تھی۔ شاید اس لیے بھی کہ وہ کاؤنٹ کی پسندیدہ ترین عورت بھی رہی تھی لیکن ایک دن جب اینکس شراب کے نشے میں دھت کچے اور کچے گوشت سے شغل کر رہا تھا تو اتفاق سے اس کی نظر مارینا پر پڑ گئی۔ وہ اصل میں اپنا خمار کم کرنے کے لیے ذرا ٹھنڈا پانی سر پر ڈالنے کے لیے باغ میں بنے تالاب تک آیا تھا اور وہاں مارینا تیراکی کر رہی تھی۔ رات کا وقت تھا، کوئی دیکھنے والا نہیں تھا اور پھر کاؤنٹ ڈی دوستو کا محل تھا۔ کس کی مجال تھی کہ اس طرح بلا اجازت تیراکی کے دوران وہاں آتا اس لیے وہ لباس فطرت میں بے فکری سے تیر رہی تھی۔ مگر اینکس کو اچانک وہاں دیکھ کر وہ جتنی حیران ہوئی تھی وہ اسے دیکھ کر اتنا ہی آشفتہ ہو گیا۔

''تم کون ہو پیاری سی خاتون؟'' اینکس نے مارینا کے چاندنی میں چمکتے بدن کی چاندنی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔

''آپ...'' مارینا اتنی بدحواس ہوئی کہ تالاب سے نکل آئی اور اب اس کے وجود کی چاندنی بالکل ہی نمایاں ہو گئی تھی۔ اینکس جو پہلے ہی نشے میں تھا' اس کا بازو پکڑ کر اسے کشاں کشاں اپنے کمرے کی طرف لے چلا۔ راستے میں مارینا اس کی منت سماجت کرتی رہی اور شاید اس کو کاؤنٹ کے عتاب سے دھمکاتی بھی رہی مگر اینکس پر جو نشہ سوار ہوا تھا وہ اتنی آسانی سے اترنے والا نہیں تھا۔ اس کا نشہ اترتے اترتے مارینا پر وہ گزر گئی جس کا اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اینکس کے کمرے میں پہلے سے موجود عورتوں نے اس قلعے کو فتح کرنے میں ان کا پورا ساتھ دیا کیونکہ وہ اکیلا اس قابل نہیں تھا کہ مارینا کے ساتھ اپنی مرضی کا سلوک کر سکے۔ عورتوں نے مارینا کو باندھ کر اس کے سامنے ڈال دیا تھا جیسے کسی بھیڑ کو قصائی کے سامنے ڈالا جاتا ہے۔ یہی نہیں کہ عورتوں نے مارینا کو باندھ دیا تھا بلکہ انہوں نے اس کا منہ بھی بند کر دیا تاکہ محل میں کسی کو علم نہ ہو سکے کہ وہ اذیت کے کن مراحل سے گزر رہی ہے۔

مارینا دوسری عورتوں کی مشترکہ سوکن اور حریف رہی تھی اور اس رات انہیں موقع مل گیا تھا کہ وہ اس سے بدلہ لے سکیں۔ یہ ساری عورتیں وہ تھیں جو اینکس اور ان کی طرح کے دوسرے مہمانوں کی دل بستگی کے لیے مخصوص تھیں اور اب کاؤنٹ کی ان میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی۔ سوائے مارینا کے ایسی تمام عورتیں اس محل میں آنے والے مہمانوں کی دل بستگی پر مامور تھیں اور یہی بات ان کو سب سے زیادہ کھٹکتی تھی۔ اب ان کو موقع ملا تو انہوں نے مارینا سے پورا بدلہ لیا۔ انہوں نے اینکس کو پوری طرح اکسا کر رکھا اور ایسا اکسایا کہ وہ باقی رات اسی قلعے کی فتح میں مگن رہا۔ صبح سویرے چپکے سے ان عورتوں نے مارینا کو بے ہوشی کی حالت میں اس کے کمرے میں پہنچا دیا تھا۔ اس کی حالت اتنی خراب تھی کہ وہ شام تک کمرے سے نکل ہی نہیں سکی تھی۔ اس وقت تک اینکس واپس جا چکا تھا اور رات کی فتوحات اس کے نشہ زدہ ذہن میں ثبت ہو چکی تھیں مگر فی الحال وہ کاؤنٹ ڈی دوستو سے اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اتنی آسانی سے نہیں مانے گا اس لیے وہ مناسب وقت کا انتظار کر رہا تھا جب کاؤنٹ آسانی سے اس کی بات ماننے پر مجبور ہو جائے۔ اتنی عقل اس کے پاس تھی کہ اس نے کاؤنٹ کی پسندیدہ کنیز کو اس سے پوچھے بغیر اپنے تصرف میں لا کر ایک تنازعہ کھڑا کر دیا ہے اور اب وہ پہلے کاؤنٹ کا ردِعمل دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر کاؤنٹ کا ردِعمل اینکس کے بجائے ان عورتوں کو دیکھنا پڑا تھا جنہوں نے مارینا کو کسی بھیڑ کی طرح باندھ کر اینکس کے سامنے ڈال دیا تھا۔ اس رات حویلی کا ایک خاص گوشہ ان عورتوں کی چیخوں سے گونج رہا تھا۔ کئی جلاد ان کی برہنہ پشتوں پر تازیانے برسا رہے تھے اور کاؤنٹ خود اس عمل کی نگرانی کر رہا تھا۔ عورتیں جب رحم کی بھیک مانگیں تو اس کا غیظ و غضب اور بھی بڑھ جاتا تھا۔ وہ جلادوں کو تازیانے مزید تیز کرنے اور سخت کرنے کا حکم دیتا تھا۔ حتیٰ کہ وہ عورتیں ہوش سے بے گانہ ہو گئیں۔ اس وقت مارینا اپنے کمرے میں زیرِ علاج تھی۔ اینکس نے اس کے ساتھ کچھ ایسی درندگی کا ثبوت دیا کہ وہ زخمی ہو گئی تھی اور ابھی تک اس کی حالت خراب تھی۔ جب کاؤنٹ ڈی دوستو اس کے کمرے میں آیا تو وہ زبردستی مسکرانے لگی۔

''تم نے سنیں ان کی چیخیں؟'' اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

''اصل مجرم تو اینکس ہے۔'' مارینا نے ہمت کر کے کہا۔

''اسے بھی اس کے کیے کی پوری سزا ملے گی۔'' کاؤنٹ نے اسی انداز میں کہا۔ ''لیکن ابھی نہیں، تمہیں کچھ انتظار کرنا ہوگا۔''

''میں قیامت تک انتظار کروں گی۔''

جس وقت مارینا اور کاؤنٹ انتقام کی قسمیں کھا رہے تھے، عین اسی وقت مارسلز آنے والے ایک بحری جہاز سے ایک نوجوان جوڑا اتر کر شہر میں داخل ہوا تھا۔ یہ دونوں چارلس اور اوفیلیا تھے۔ بحری جہاز فرانس کی ایک اور بندرگاہ سے آیا تھا۔ جوڑا شہر کے ایک معمولی درجے کے سرائے میں رکا تھا جس کا مالک کاؤنٹ ڈی دوستو کا احسان مند تھا۔ اس وجہ سے وہ اسے شہر میں ہونے والی ہر اہم بات کی خبر پہنچانا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ جب اس نے لڑکی کو دیکھا تو اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ ایسی حسین لڑکی اس نے شاید کئی سال بعد دیکھی تھی۔ اور وہ جس حلیے میں تھی، اس حلیے میں اس نے کسی لڑکی کو اتنا خوب صورت نہیں دیکھا تھا۔ اس نے نہایت معمولی سا لباس پہن رکھا تھا اور اس کے پاؤں میں گھٹیا درجے کے جوتے تھے۔ لڑکا عام صورت کا تھا اور اس کا لباس بھی لڑکی سے مختلف نہیں تھا۔ اس نے سرائے کے مالک سے کسی سستے ترین کمرے کی فرمائش کی تھی۔

''یہ لڑکی تمہاری بیوی ہے یا بہن ہے؟''

''بیوی۔'' لڑکے نے اس طرح ہچکچا کر جواب دیا تو سرائے کے مالک کو یقین ہو گیا کہ وہ غلط کہہ رہا ہے۔ اس نے ان دونوں کو ایک عقبی کمرا دے دیا۔ اس کے فوراً بعد اس نے اپنا گھوڑا نکالا اور کاؤنٹ ڈی دوستو کی حویلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ کاؤنٹ مارینا کی تیمارداری میں مصروف تھا اس لیے اس نے یہ اہم اطلاع اس کے دست راست ڈی کورک کو دے دی کہ اس کے سرائے میں ایک گوہرِ نایاب رکا ہے اور وہ

اس قابل ہے کہ کاؤنٹ اسے اپنے حرم کی زینت بنا سکے۔ کورک نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا۔ ”ایسا کوئی گوہر نایاب تمہاری سرائے میں رکا ہے۔“

”جناب! یقین تو مجھے بھی نہیں آیا تھا مگر میں خود اسے وہاں چھوڑ کے آرہا ہوں۔“ سرائے کے مالک نے یقین سے کہا۔ ”آپ چاہیں تو میرے ساتھ چل کر تصدیق کر سکتے ہیں۔“

ڈی کورک کو معلوم تھا کہ اس کا آقا کس قدر شوقین مزاج ہے۔ اگر اس نے ابھی جا کر اس لڑکی کو نہ دیکھا تو ممکن ہے اس تک کسی اور ذریعے سے یہ خبر پہنچے اور وہ اس کے صلے سے محروم رہ جائے۔ اس لیے اس نے سرائے کے مالک کے ساتھ جا کر اس لڑکی کو دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ سرائے کے مالک نے اسے راستے میں بتایا کہ لڑکی کے ساتھ ایک لڑکا بھی ہے اور وہ خود کو اس کا شوہر بتاتا ہے۔ یہ سن کر کورک رک گیا۔

”یہ بات تم اب بتا رہے ہو... کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ کاؤنٹ ڈی ودستو کو شادی شدہ عورتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

”پہلی بات تو یہ ہے، مجھے اس لڑکے کی بات جھوٹ لگ رہی ہے۔ وہ اس لڑکی کا شوہر نہیں ہے۔ دوسرے لڑکی بہت کمسن ہے اور کہیں سے بھی شادی شدہ نظر نہیں آتی ہے۔ تیسرے اگر وہ شادی شدہ بھی ہے، تب بھی اس قابل ہے کہ اسے اس کے معمولی سے شوہر سے حاصل کر کے کاؤنٹ کے محل کی زینت بنایا جائے۔“

کورک نے اسے گھورا۔ ”اس کا فیصلہ اسے دیکھنے کے بعد کیا جائے گا۔“

وہ سرائے پہنچے اور سرائے کے مالک نے کورک کو لے جا کر براہِ راست ان کے کمرے کے دروازے پر کھڑا کر دیا۔ دستک کے جواب میں چارلس نے دروازہ کھولا۔ سرائے کے مالک نے کورک کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ مارسلز کے عزت مآب کاؤنٹ ڈی ودستو کے نائب ہیں اور ان کا کام مارسلز میں آنے والوں نئے لوگوں سے تفتیش کرنا ہے۔“

”کیسی تفتیش؟“ چارلس نے کھردرے لہجے میں پوچھا۔ ”ہم فرانس کے شہری ہیں اور فرانس کے ہی ایک حصے میں ہیں اس لیے کس بات کی تفتیش کی جا رہی ہے؟“

”تم دونوں سے کچھ سوالات کرنے ہیں۔“ کورک نے نرمی سے کہا۔ ”تم سے اور تمہاری بیوی سے۔“

”جو پوچھنا ہے مجھ سے پوچھ لو۔“ چارلس نے کہا۔

”نہیں، پوچھ گچھ دونوں سے ہو گی۔“ کورک نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”اپنی بیوی کو بلا لو۔“ سرائے کے مالک نے چارلس کو سمجھایا۔ ”یہ عزت مآب کا احسان ہے کہ تمہیں اپنے دفتر نہیں بلایا۔“

مجبوراً چارلس نے اوشینا کو بھی بلا لیا اور اسے دیکھتے ہی کورک، سرائے کے مالک کی بات سے متفق ہو گیا تھا کہ یہ لڑکی کاؤنٹ کے حرم کے لائق تھی۔ اس نے ان سے سوالات کیے۔ چارلس اور اوشینا نے اسے بتایا کہ وہ بہتر روزگار کی تلاش میں مغربی فرانس کی ایک چھوٹی سی بندرگاہ سے بحری جہاز کے ذریعے مارسلز آئے تھے۔ وہ ایک چھوٹے سے گاؤں کے رہائشی تھے۔ انہوں نے چند مہینے پہلے ہی شادی کی تھی۔ کورک نے ان کی بات سن کر کہا۔

”اگر تمہیں نوکری کی تلاش ہے تو کاؤنٹ کے محل میں مالی کی ایک اسامی خالی ہے۔“ کورک نے اسے فوری پیش کش کی۔

چارلس خوش ہو گیا۔ اس نے کہا۔ ”میں مالی کا کام جانتا ہوں۔“

کورک نے لڑکی کو غور سے دیکھا تو اسے لگا جیسے اسے لڑکے کا اتنی جلدی یہ پیش کش قبول کرنا پسند نہیں آیا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”ہم آپس میں بات کر کے آپ کو بعد میں بتاتے ہیں۔“

کورک نے سر ہلایا۔ ”تم لوگ بے شک مشورہ کر لو کیونکہ یہاں کاؤنٹ سے ابھی ملازمت کوئی نہیں دے سکتا۔ اگر تمہیں بھی ملازمت کرنی ہو تو کاؤنٹ کے محل میں اس کی گنجائش ہو گی۔ اس میں تم لوگوں کو کھانا پینا اور رہائش مفت ملے گی اور اچھا کام کرنے پر انعام و اکرام الگ سے ملے گا۔“ کورک ان دونوں کو پوری طرح پرچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس لیے اس نے لڑکی کو بھی ملازمت کا لالچ دیا تھا مگر لڑکی کے جواب کے بعد لڑکا بھی محتاط ہو گیا تھا۔ اس نے کورک سے کہا۔

”آپ کی پیش کش کا شکریہ جناب... ہم آپس میں مشورہ کر کے ہی کوئی فیصلہ کریں گے۔“

کورک نے ان پر زور دیا کہ وہ مشورے کے بجائے اس پیش کش کو قبول کر لیں۔ وہ سرائے کے مالک کے ساتھ باہر آیا اور اسے ہدایت کی۔ ”لڑکی بہت تیز لگ رہی ہے۔ ان لوگوں کو نظر میں رکھنا۔ اگر یہ کہیں جانے لگیں تو ان کے پیچھے اپنا آدمی لگا دینا۔“

”میں سمجھ گیا جناب!“ سرائے کے مالک نے کہا۔ ”آپ بے فکر رہیں۔ یہ کہیں نہیں جائیں گے۔“

کورک فوری طور پر محل واپس آیا اور اس نے کاؤنٹ سے شرفِ باریابی چاہی۔ وہ اس وقت مارینا کے پاس تھا۔ اس نے اسے بھی وہیں بلا لیا۔ جب کورک نے مارینا کو دیکھا تو اسے اچانک خیال آیا کہ اسے لڑکی کی شکل اتنی شناسا کیوں لگ رہی تھی۔ وہ ہو بہو مارینا کی جوانی کی تصویر تھی بلکہ وہ مارینا سے کہیں زیادہ حسین تھی۔ کورک نے کاؤنٹ ڈی ودستو کے کان میں کہا۔

”جناب! بہت اہم اطلاع ہے۔“

کاؤنٹ سمجھ گیا کہ کورک، مارینا کے سامنے اسے یہ بات بتانا نہیں چاہتا۔ اس نے کورک کو جانے کا اشارہ کیا اور کچھ دیر بعد خود اٹھ کر باہر آ گیا۔ کورک راہداری میں اس کا منتظر تھا۔ اسے دیکھتے ہی اس نے فوری طور پر اسے لڑکی کے بارے میں بتایا۔ حسن پرست کاؤنٹ یہ سنتے ہی بے تاب ہو گیا تھا کہ اس کے علاقے میں ایک ایسی لڑکی آئی ہے جو صورت میں مارینا سے مشابہ ہے اور اس سے کہیں زیادہ حسین ہے۔ یہی نہیں، وہ بہت کم سن بھی ہے اور کم سنی کاؤنٹ کی کمزوری تھی۔ عورت ذرا سی عمر سے آگے نکلتی تھی تو وہ اس کے دل سے اتر جاتی تھی چاہے وہ مارینا جیسی حسینا ہی کیوں نہ ہو جس کے لیے وہ ایک زمانے میں دیوانہ تھا۔ مگر جہاں اس کے شباب میں پختگی آئی، وہ کاؤنٹ کے دل سے اترتی گئی۔

”کیا تم یہ بات یقین سے کہہ سکتے ہو؟“ کاؤنٹ نے اسے گھورا۔ ”کیا تم نے جوانی میں مارینا کو نہیں دیکھا؟“

”دیکھا ہے جناب... اسی لیے تو یہ دعویٰ کر رہا ہوں۔“

”ٹھیک ہے اسے ہمارے سامنے پیش کرو۔“

اب کورک نے ہمت کر کے اسے بتایا کہ لڑکی نہ صرف شادی شدہ ہے بلکہ بہت ہوشیار بھی ہے اور اس نے کاؤنٹ کی ملازمت تک ٹھکرا دی۔ کاؤنٹ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

”کیا اس جگہ کوئی میری ملازمت بھی ٹھکرا سکتا ہے؟“

”وہ باہر سے آئے ہیں اور ان کو عزت مآب کے بارے میں زیادہ علم نہیں ہے۔ لڑکا بہت سادہ ہے۔ وہ فوراً ملازمت کے لیے مان گیا تھا مگر لڑکی نے اسے منع کر دیا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ وہ آسانی سے قابو میں نہیں آئے گی۔“ کاؤنٹ نے سوچتے ہوئے کہا۔

”میرا بھی یہی خیال ہے۔ لیکن ایک بار وہ کسی طرح محل میں آ جائیں تو لڑکی کو بھی قابو کیا جا سکتا ہے۔“

کاؤنٹ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”تم جانتے ہو، میں زبردستی کا قائل نہیں ہوں۔“

”زبردستی کون کرے گا۔“ کورک نے عیاری سے کہا۔ ”اگر لڑکی کا شوہر کسی وجہ سے اسے چھوڑ دے اور آپ اسے سہارا دینا چاہیں تو وہ انکار کر سکتی ہے؟“

کاؤنٹ مسکرانے لگا۔ ”اگر اس کے شوہر نے اسے چھوڑنے سے انکار کر دیا؟“

”تب وہ کسی حادثے میں مر بھی سکتا ہے۔“ کورک نے متبادل حل پیش کیا۔

”کل بلکہ بھیج کر لڑکی اور اس کے شوہر کو حویلی بلاؤ۔“

”مجھے خدشہ ہے جناب کہ لڑکی انکار کر دے گی۔“

”نہیں، انہیں دعوت دو کہ وہ کاؤنٹ کے مہمان ہیں۔ وہ انکار نہیں کریں گے۔ ان کو محل تک لانا تمہاری ذمے داری ہے۔“

یہ سن کر کورک کی جان پر بن گئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اسے کسی طرح بھی ان دونوں کو محل میں لانا ہے ورنہ اس کی شامت آ جائے گی۔

☆☆☆

پادری اینگس کئی دن تک کاؤنٹ کی طرف سے کسی کارروائی کا منتظر رہا مگر جب اس نے کوئی ردِعمل نہیں دکھایا تو وہ کسی قدر مطمئن ہو گیا کہ شاید مارینا کی اتنی اہمیت نہیں تھی جتنی کہ وہ سمجھ رہا تھا اور اس کے ساتھ جو ہوا، وہ کاؤنٹ کے نزدیک اتنا اہم نہیں تھا کہ وہ اینگس سے اس بارے میں کوئی باز پرس کرتا۔ اب اینگس سوچ رہا تھا کہ کس طرح اس سے مارینا کا مطالبہ کرے؟ وہ اس کے دل و دماغ پر چھا گئی تھی اور اس کے بغیر اس کو کسی کل چین نہیں آ رہا تھا۔ صرف اس کی خاطر وہ ایک بار پھر کاؤنٹ کے محل جانے کا سوچ رہا تھا مگر بعض خدشات اس کے قدم روک رہے تھے۔ اگرچہ وہ اس علاقے کا دوسرا بارسوخ آدمی تھا اور کاؤنٹ کے بعد اس کا نمبر آتا تھا... بلکہ جہاں تک مذہبی معاملات کا تعلق تھا، وہ کاؤنٹ پر برتری رکھتا تھا۔ اس کے باوجود بادشاہ سے کاؤنٹ کی رشتے داری اس کے لیے ایک ایسی ڈھال تھی جس پر مذہب کی تلوار بھی بے کار تھی۔ اگر کاؤنٹ چاہتا تو اس کو اس کے عہدے سے برطرف بھی کرا سکتا تھا اس لیے وہ اس سے کھلی محاذ آرائی مول نہیں لے سکتا تھا۔

اپنی پوزیشن کو مضبوط رکھنے کے لیے اینگس نے شہر میں اپنے مخبروں کا ایک جال بچھا رکھا تھا۔ عام طور سے یہ مخبر چرچ کے ان افراد کے بارے میں اطلاع دیتے تھے جو کسی طرح بھی الحاد کا شکار پائے جاتے تھے اور چرچ ان افراد کے خلاف فوری کارروائی کرتا تھا۔ ساتھ ہی یہ مخبر اینگس کو شہر میں

www.pkdigest.com

ہونے والی اہم باتوں سے باخبر رکھتے تھے۔ ایسے ہی ایک مخبر نے اینگس کو اطلاع دی کہ شہر کی ایک سرائے میں باہر سے آیا ایک جوڑا مقیم ہے اور اس جوڑے میں کاؤنٹ ڈی دوستو دلچسپی لے رہا ہے کیونکہ اس کا نائب ڈی کورک سرائے میں آیا تھا اور اس جوڑے سے ملاقات کر کے گیا تھا۔ مخبر کا کہنا تھا کہ کورک نے جوڑے کو محل میں ملازمت کی پیش کش کی تھی اور جوڑے نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ لڑکی بے پناہ حسین اور نوعمر تھی۔

اس خبر سے اینگس کو صرف اس وجہ سے دلچسپی پیدا ہوئی تھی کہ جوڑے میں کاؤنٹ ڈی دوستو بھی دلچسپی لے رہا تھا۔ اس نے اپنے مخبر سے کہا۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ کاؤنٹ اس جوڑے میں دلچسپی لے رہا ہے؟"

"جی ہاں جناب!" اس نے ادب سے کہا۔ "کورک کاؤنٹ کا نائب ہے اور وہ ہر جگہ خود نہیں جاتا۔"

"یہ تو ہے۔" اینگس نے قائل ہو کر کہا۔ "تم ان دونوں پر کڑی نظر رکھو اور دیکھو ان سے ملنے کون کون آتا ہے۔"

"میں اپنا ایک آدمی لگا آیا ہوں جو مستقل ان کی نگرانی کر رہا ہے۔"

"شاباش۔" اینگس نے اسے سکوں کی ایک تھیلی دی تو وہ خوش ہوا اور جھک کر سلام کرتا ہوا رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

ڈی کورک پھر اس سرائے میں تھا۔ ابھی صبح کا وقت تھا اور بیشتر لوگ ناشتے سے فارغ ہو کر اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے تھے۔ لڑکا اور لڑکی اپنے کمرے میں تھے۔ اس کی دستک کے جواب میں لڑکی نے دروازہ کھولا اور اسے دیکھ کر ناگواری سے منہ بنایا۔ "جناب! ہمارے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں؟"

"میں تم دونوں کے لیے کاؤنٹ کا پیغام لے کر آیا ہوں۔" کورک نے برداشت کرتے ہوئے کہا۔ "وہ تم دونوں کو اپنا مہمان بنانا چاہتے ہیں۔"

"لیکن ہم ان کا مہمان بننا نہیں چاہتے۔" لڑکی نے درشت لہجے میں انکار کر دیا اور دروازہ بند کرنے لگی تھی کہ کورک نے اس میں جوتا اڑا دیا۔

"میری بات سنو... کاؤنٹ کو انکار کر کے تم بہت بُرا کر رہی ہو۔"

"اب تو میں نے بُرا کر دیا ہے۔ تمہیں جو کرنا ہے کر لو۔" لڑکی نے کہا اور دروازہ بند کر دیا۔ کورک پریشان ہو گیا۔ کاؤنٹ نے زبردستی سے منع کیا تھا ورنہ وہ سپاہیوں کا ایک دستہ لے کر آتا اور اس کے بعد ان لوگوں کی مجال نہ ہوتی کہ اسے یوں انکار کرتے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اس نے سرائے کے مالک سے رجوع کیا اور اسے صورتِ حال بتائی۔ "یہ کاؤنٹ کا مہمان بننے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں۔"

"میرے ایک ملازم نے کل رات ان دونوں کی باتیں چھپ کر سنی تھیں۔ وہ لوگ کاؤنٹ کی نیت پر شک کر رہے تھے۔ لڑکی کا کہنا ہے کہ کاؤنٹ اسے زبردستی لڑکے سے چھین سکتا ہے کیونکہ وہ عورتوں کا رسیا ہے۔" سرائے کے مالک کو کہتے ہوئے خیال آیا تو اس نے جلدی سے کہا۔ "یہ اس لڑکی کا کہنا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے، ان لوگوں کے لیے کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنا ہو گا۔" کورک نے بدمزگی سے کہا۔ "یہ شرافت سے ماننے والے نہیں ہیں۔"

"یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں۔ میرا تو مشورہ ہے کہ آپ سپاہی بھیج کر انہیں اٹھوا لیں۔"

"ایسا کرنا ہوتا تو تمہارے مشورے کی ضرورت نہیں تھی۔"

"ایک بات اور ہے جناب!"

"وہ کیا؟"

"چرچ کا ایک مخبر بھی ان دونوں کے بارے میں معلومات حاصل کرتا پھر رہا تھا۔"

"چرچ کا مخبر!" کورک نے تشویش سے کہا۔ "وہ ان دونوں سے ملا تو نہیں تھا؟"

"نہیں جناب! وہ ابھی تک ان سے ملا نہیں ہے۔"

"اگر وہ ملنا چاہے تو انکار کر دینا۔" کورک نے کہا۔

"میں ایسا کیسے کر سکتا ہوں جناب۔" سرائے کے مالک نے مسکین سی صورت بنا کر کہا۔ "وہ چرچ کا آدمی ہے۔ میں انکار کر کے مشکل میں پڑ جاؤں گا۔"

"کچھ نہیں ہو گا، تم کاؤنٹ کو جانتے ہو۔" کورک کا لہجہ دھمکی آمیز ہو گیا۔ "اس لیے جیسا کہا جا رہا ہے ویسا ہی کرو۔"

"بہتر جناب!" سرائے کا مالک مردہ لہجے میں بولا۔

کورک نے اسے حکم دیا کہ وہ کسی بہانے لڑکے کو باہر لے کر آئے، وہ اس سے بات کرنا چاہتا ہے۔ بے چارہ کسی نہ کسی طرح چارلس کو باہر لے آیا۔ جب اس نے کورک کو دیکھا تو بدک گیا۔ "تو مجھے اس نے بلایا ہے۔"

"میری بات سنو۔" کورک نے سخت لہجے میں کہا۔ "اب تک میں تم دونوں کے ساتھ بہت نرمی برت رہا ہوں۔ اگر میں سختی پر اتر آیا تو تم ایک لمحے میں سیدھے ہو جاؤ گے۔"

چارلس کسی قدر ڈر گیا۔ "جناب! آپ کیا چاہتے ہیں؟ ہمیں کاؤنٹ کی ملازمت نہیں کرنی ہے۔"

"کاؤنٹ تم لوگوں کو ملازمت کے لیے مجبور نہیں کر رہا ہے۔ وہ صرف تم لوگوں کو ایک دن کے لیے اپنے محل میں مہمان بنانا چاہتا ہے۔"

"مگر کیوں؟ ہم بہت معمولی سے لوگ ہیں۔"

"یہ کاؤنٹ کی مرضی ہے اور وہ اس علاقے کا حاکم ہے، اس کی بات کوئی نہیں ٹال سکتا۔" کورک کا انداز جابرانہ ہو گیا۔ "اور جو ایسا کرتا ہے اس کا مقدر جیل کی کوٹھری ہوتی ہے۔"

چارلس ڈر گیا۔ "جناب! ہمیں سوچنے کی مہلت تو دیں۔"

"تمہارے پاس کل تک کی مہلت ہے۔" کورک نے اپنی دھمکی کامیاب ہوتے دیکھ کر لہجہ مزید سخت کر لیا۔ "ورنہ تم جس طرح لے جائے جاؤ گے، وہ ساری دنیا دیکھے گی۔"

چارلس خاموشی سے وہاں سے چلا گیا اور کورک بھی روانہ ہو گیا۔ اسے اور چارلس کو دونوں کو پتا نہیں تھا کہ چرچ کے مخبر کا آدمی وہاں موجود تھا اور اس نے ساری بات سنی تھی۔ وہ فوری طور پر اپنے آقا کو بتانے کے لیے روانہ ہو گیا۔

سرائے کا مالک بھی وہاں سے چلا گیا۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ ایک سفید پوش اس وقت اوشینا کے کمرے میں تھا جس وقت اس کا شوہر سرائے کے مالک کے کہنے پر باہر آیا تھا۔ اوشینا چارلس کو اس کے بارے میں بتانے لگی۔

"وہ بہت باوقار اور شان دار آدمی تھا۔ عمر والا تھا مگر میں نے اتنا وجیہہ آدمی آج تک نہیں دیکھا۔"

"اسی وجہ سے تم نے اسے اندر بلا لیا تھا؟" چارلس نے حسد سے کہا۔

"نہیں، دروازے پر دستک ہوئی تو میں سمجھی کہ تم ہو اور میں نے پوچھے بغیر کھول دیا۔ وہ تیزی سے اندر آیا تھا۔ میں اسے باہر جانے کو نہیں کہہ سکی تھی۔"

"اس نے تمہیں چھوا تو نہیں تھا؟"

"بالکل بھی نہیں... اس کا رویہ بہت شریفانہ تھا۔ نہ اس نے مجھے بری نظر سے دیکھا۔" اوشینا نے یقین سے کہا۔

"کہیں وہ کاؤنٹ تو نہیں تھا۔" چارلس کا خدشہ اس کی زبان پر آ گیا۔ "وہ ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑ گیا ہے اور ابھی اس کا آدمی مجھے دھمکی دے کر گیا ہے کہ کل تک اگر ہم کاؤنٹ کے مہمان بننے پر تیار نہ ہوئے تو ہمیں دوسرے طریقے سے لے جایا جائے گا۔"

"تب ہم کیا کریں؟" اوشینا نے پریشان ہو کر کہا۔

"میرے ذہن میں ایک خیال آیا ہے آج رات ہم یہاں سے نکل جاتے ہیں اور کہیں اور رہائش اختیار کر لیتے ہیں۔"

"یہاں سے نکل کر کہاں جائیں گے... جبکہ ہمارے پاس رقم بھی نہیں ہے۔"

"یہاں رہے تو کل کاؤنٹ کے محل جانا پڑے گا۔" اس نے اوشینا کو خبردار کیا۔ دونوں پریشان تھے اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ اسی وجہ سے وہ جاگ رہے تھے۔ رات کے کسی وقت دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور دونوں سہم گئے۔ چارلس نے دروازے کے پاس جا کر آہستہ سے پوچھا۔ "کون ہے؟"

"دروازہ کھولو، میں تمہارا ہمدرد ہوں۔" کوئی آہستہ سے بولا۔

"مت کھولنا۔" اوشینا نے مشورہ دیا۔ "ممکن ہے وہی ہو۔"

لیکن چارلس سوچ رہا تھا کہ وہ ہوتے تو اس طرح دستک نہ دیتے بلکہ دروازہ توڑ کر اندر گھس آتے۔ اس نے ہمت کر کے دروازہ کھول دیا۔ سامنے ایک چھوٹے قد کا آدمی کھڑا تھا، وہ جلدی سے اندر گھس آیا۔ اس نے دروازہ بند کر دیا اور ہانپتے ہوئے بولا۔

"تم دونوں خطرے میں ہو۔ کاؤنٹ کے آدمی باہر صبح ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔ جیسے ہی روشنی ہو گی، تم دونوں کو پکڑ کر لے جائیں گے۔"

"مگر کیوں... اور تم کون ہو؟" چارلس نے فکرمندی سے کہا۔

اس آدمی نے ایک نظر اوشینا کو دیکھا اور چارلس سے کہا۔ "احمق آدمی! تمہیں اپنی اتنی حسین بیوی کو لے کر یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی، تمہیں معلوم نہیں ہے کہ کاؤنٹ ڈی دوستو کس قدر عیاش آدمی ہے۔ اب وہ تمہاری بیوی کو ہتھیانے کے چکر میں ہے۔"

"میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔" چارلس نے غصے اور خوف کے ساتھ کہا۔ اس کی حالت یہ سن کر ہی غیر ہونا شروع ہو گئی تھی۔

"تم کون ہو اور تمہیں یہ بات کس طرح معلوم ہوئی ہے؟" اس بار اوشینا نے پوچھا۔

"میں اس شہر کے بڑے پادری جناب اینگس کا ایک ادنیٰ خادم ہوں اور انہوں نے مجھے بھیجا ہے کہ تم دونوں کو یہاں سے نکال کر چرچ کی پناہ میں لے جاؤں جہاں تمہیں کسی کا ڈر نہیں ہو گا۔"

www.pkdigest.com

چارلس نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ''اینگس کو ہماری کیا پروا ؟''

''وہ بہت خدا ترس آدمی ہیں اور جہاں انہیں کوئی مظلوم نظر آتا ہے، وہ اس کی مدد ضرور کرتے ہیں۔'' اس آدمی نے کہا۔ ''اب تم لوگ جلد فیصلہ کرلو کہ میرے ساتھ چلنا ہے یا صبح ہوتے ہی تم دونوں کو کاؤنٹ کے سپاہی لے جائیں... اور اس کے بعد شاید وہ بھی تم دونوں کی کوئی مدد نہ کرسکیں۔''

چارلس اور اوشینا نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اوشینا نے اشارہ کیا اور چارلس کو ایک طرف لے گئی۔ وہ کچھ دیر بحث کے بعد اس شخص کی طرف واپس آئے۔ چارلس نے کہا۔ ''ہم تیار ہیں لیکن اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تم جناب اینگس کے آدمی ہو اور ہمیں چرچ کی پناہ میں لے جاؤ گے؟''

''اس کا ثبوت تمہیں چرچ تک چل کر ہی مل سکتا ہے۔ میں اگر کاؤنٹ کا آدمی ہوتا تو مجھے یہ سب کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ میرے ساتھ خوں خوار سپاہیوں کا ایک دستہ ہوتا اور تم دونوں اس وقت زنجیروں میں جکڑے میرے ساتھ جا رہے ہوتے۔''

''ہم تیار ہیں۔'' چارلس جلدی سے بولا۔ ''مگر تم نے کہا کہ باہر کاؤنٹ کے سپاہی نگرانی کر رہے ہیں تو ہم یہاں سے کیسے نکلیں گے؟''

''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔'' اس شخص نے اعتماد سے کہا۔ ''جیسا میں کہوں، ویسا کرتے جاؤ۔''

اس شخص کے کہنے پر انہوں نے اپنا سامان سمیٹا اور چادروں سے اپنا چہرہ چھپاتے ہوئے خاموشی سے وہاں سے نکل گئے۔ دو گلیوں سے گزار کر وہ شخص ان کو ایک بگھی تک لایا اور اس میں سوار ہو کر وہ چرچ کی طرف روانہ ہو گئے۔ خاصی دیر کے بعد جب انہیں چرچ کی عمارت دکھائی دی تو انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ان کے ساتھ دھوکا نہیں ہوا تھا اور یہ شخص سچ مچ اینگس کا نمائندہ تھا۔ وہ چرچ کے سامنے رکے اور ان کو اندر لے جایا گیا جہاں اینگس ایک کمرے میں بے چینی سے ان کا منتظر تھا۔ جیسے ہی اینگس نے انہیں دیکھا تو کہا۔

''خوش آمدید میرے بچو... تم لوگ یہاں بالکل محفوظ ہو اب بے فکر ہو جاؤ۔ کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔''

جب اوشینا نے پادری اینگس کا چہرہ دیکھا تو نہ جانے کیوں وہ لرز اٹھی۔ اسے لگا کہ وہ پناہ میں نہیں خطرے میں گھر گئی ہے۔

☆☆☆

ڈی کورک جب صبح سویرے سرائے پہنچا تو اسے وہاں سرائے کا مالک بدحواس دکھائی دیا۔ اس کو دیکھتے ہی سرائے کے مالک کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور اس نے گڑگڑا کر کہا۔ ''جناب! میں بے قصور ہوں... مجھے نہیں معلوم وہ رات کس وقت یہاں سے نکل گئے۔''

''کیا... وہ نکل گئے؟'' کورک نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔ ''اور تم سوتے رہ گئے۔ میں تمہاری کھال اتار دوں گا۔''

''میں بے قصور ہوں جناب... میں نے ایک آدمی ان کی نگرانی پر لگایا تھا مگر اسے بھی پتا نہیں چلا کہ وہ کب اور کہاں چلے گئے۔''

اس آدمی کو بلایا گیا اور کورک نے جلد جان لیا کہ وہ نگرانی کرنے کے بجائے سو رہا تھا۔ خود اس کے ہوش اڑ گئے تھے کیونکہ کاؤنٹ نے اسے کل رات ہی بلا کر ہدایت کی تھی کہ وہ ہر قیمت پر اگلے دن لڑکی اور لڑکے کو محل میں لے کر آئے اور یہاں وہ دونوں غائب تھے۔ ان کا سامان بھی نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ جہاں گئے تھے، اپنی مرضی سے گئے تھے اور یہی کورک کے لیے واحد اچھی بات تھی۔ اب وہ ان کو شہر کی دوسری سراؤں میں تلاش کر سکتا تھا۔ اس نے سرائے کے مالک سے کہا۔

''تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ ان کو تلاش کرنے میں میری مدد کرو۔ یاد رکھو اگر وہ نہ ملے تو میرے ساتھ تم بھی عتاب کی لپیٹ میں آؤ گے۔ کاؤنٹ کو وہ دونوں ہر قیمت پر درکار ہیں۔''

خود سرائے کے مالک کی جان پر بنی ہوئی تھی اور اس نے اپنے تمام آدمی ہی چارلس اور اوشینا کی تلاش میں دوڑا دیے تھے۔ کورک فوری طور پر محل روانہ ہو گیا تھا اور اس نے جا کر کاؤنٹ کو یہ اطلاع دی تو اس کا غصے سے برا حال ہو گیا۔ اس نے گرج کر کہا۔ ''جب میں نے تمہیں ان کی نگرانی کا حکم دیا تھا تو تم نے سستی کیوں کی؟''

''جناب! مجھ سے غلطی ہوئی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس طرح رات کو چپکے سے کہیں جا سکتے ہیں۔ کل تو وہ ہنسی خوشی آپ کا مہمان بننے پر راضی ہو گئے تھے۔'' کورک نے صاف جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

''کورک! ان کو تلاش کرو۔'' کاؤنٹ ڈی دوستو نے بے تابی سے ٹہلتے ہوئے کہا۔ ''اگر وہ نہ ملے تو بہت سارے لوگوں کے ساتھ بہت برا ہو گا اور ان میں تم سب سے پہلے ہو گے۔''

کورک کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ اس نے جلدی سے جھک کر کہا۔ ''جناب عالی! میں جان لڑا دوں گا۔ میں ابھی سپاہی لے کے نکلتا ہوں اور شہری انتظامیہ کی مدد بھی حاصل کرتا ہوں۔''

''تم کچھ بھی کرو، مجھے وہ یہاں پر چاہئیں۔''

''ایسا ہی ہو گا۔'' کورک وہاں سے نکل گیا۔ اسی لمحے مارینا کمرے میں آئی۔ اس کی حالت خاصی سنبھل گئی تھی۔ اس نے آتے ہی کاؤنٹ سے پوچھا۔

''وہ آرہے ہیں؟''

''نہیں۔'' کاؤنٹ نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''وہ سرائے سے کہیں چلے گئے ہیں۔''

''کیا؟'' مارینا کے منہ سے اضطراری طور پر نکلا۔ ''وہ کہاں جا سکتے ہیں؟ نہیں، انہیں کوئی لے گیا ہے۔''

کاؤنٹ چونک گیا۔ اس نے کہا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہی ہو، ان کو کوئی لے گیا ہے۔ میں ابھی کورک سے کہتا ہوں کہ وہ اس بارے میں معلوم کرے۔''

مارینا گہری سوچ میں تھی، اس نے کاؤنٹ سے کہا۔ ''آپ چرچ سے بھی معلوم کریں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ دونوں چرچ چلے گئے ہوں۔''

''چرچ کیوں جائیں گے؟'' کاؤنٹ نے تعجب سے کہا۔

''آپ سے ڈر کر۔'' مارینا نے جواب دیا۔ ''کیا آپ نہیں جانتے کہ عورتوں کے معاملے میں آپ کی شہرت کیسی ہے۔''

کاؤنٹ کھسیا گیا۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ''شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' اچانک اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ''اگر یہ اینگس کی شرارت ہے تو اسے جلد اپنی اوقات کا پتا چل جائے گا۔''

اینگس کا نام سن کر مارینا کی رنگت زرد ہو گئی تھی۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ ''وہ بہت بڑا درندہ ہے اگر اوشینا اس کے پاس ہے تو...''

''نہیں... نہیں۔'' کاؤنٹ نے اضطراب سے کہا۔ ''وہ ایسا نہیں کر سکتا۔''

''جب وہ آپ کی ناک تلے آپ کی عزت روند کر جا سکتا ہے تو چرچ تو اس کی جاگیر ہے۔ وہاں اسے من مانی کرنے سے کون روک سکتا ہے۔''

کاؤنٹ کا چہرہ مزید سرخ ہو گیا تھا۔ اس نے مارینا سے کہا۔ ''اگر اس نے اوشینا کو ہاتھ لگایا تو میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔''

''جب وہ کچھ کر گزرے گا، تب کچھ کرنے کا فائدہ۔ آپ اپنی ساری توجہ چرچ پر لگا دیں اور سب سے پہلے ان دونوں کو وہاں تلاش کریں۔''

''تم نے ٹھیک کہا ہے، میں خود جاتا ہوں۔''

''ابھی یہ معاملہ اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسے آپ آرام سے بعد میں بھی نمٹا سکتے ہیں۔ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟''

کاؤنٹ ڈی دوستو نے سر ہلایا اور کمرے سے نکل گیا۔

☆☆☆

چارلس اور اوشینا چرچ کے اندر ایک حصے میں ٹھہرائے گئے تھے مگر ان کے کمرے الگ الگ تھے۔ اینگس نے ان سے کہا تھا کہ چرچ کے تقدس کے پیش نظر ان کو الگ کمروں میں ٹھہرایا گیا ہے کیونکہ میاں بیوی کے تعلقات اس مقدس جگہ مناسب نہیں تھے۔ ویسے دونوں کمرے ساتھ ساتھ تھے اس لیے وہ مطمئن تھے۔ اوشینا شروع میں بہت ڈری ہوئی تھی مگر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، اس کا خوف بھی کم ہو گیا۔ اب وہ پُرسکون تھی۔ البتہ اس نے تنہائی میسر آتے ہی چارلس سے کہا تھا۔

''ہم زیادہ دن یہاں نہیں رکیں گے۔ جیسے ہی اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے، یہاں سے چلے جائیں گے۔''

''میں نے بھی یہی سوچا ہے۔'' چارلس بولا۔ ''ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمیں بیٹھے بٹھائے چرچ کی پناہ مل گئی ورنہ ابھی ہم کاؤنٹ ڈی دوستو کی قید میں ہوتے۔''

''مجھے تو اس سے بھی ڈر لگ رہا ہے۔'' اوشینا نے آہستہ سے کہا۔

''ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ یسوع کا گھر ہے۔ یہاں ہمارے ساتھ برا نہیں ہو گا۔''

''بس مجھے پادری اینگس سے ڈر لگ رہا تھا۔''

اتنے میں ایک نن نے آکر ان دونوں سے کہا۔ ''تم الگ الگ کمروں میں رہو۔ یہاں میاں بیوی ایک کمرے میں نہیں رہ سکتے۔''

''کیوں، میاں بیوی ایک کمرے میں کیوں نہیں رہ سکتے؟'' اوشینا نے تعجب سے پوچھا۔

''کیونکہ یہاں میاں بیوی کے تعلقات قائم کرنا اس گھر کی توہین ہو گی۔ اس لیے تمہیں الگ الگ کمروں میں رہنا ہو گا اور تم دونوں ایک دوسرے کے کمروں میں نہیں جا سکو گے۔''

مجبوراً وہ الگ کمروں میں چلے گئے تھے۔ اوشینا کو جو کمرا ملا تھا، اس کے ایک طرف دیوار کے ساتھ بڑا سا پردہ لٹکا

www.pkdigest.com

ہوا تھا اور وسط میں بڑا سا بستر بچھا تھا۔ رات بھر جاگنے اور پھر پریشانی کی وجہ سے اس کا جسم ٹوٹ رہا تھا اس لیے وہ بستر پر دراز ہوتے ہی سو گئی۔ کچھ دیر بعد اچانک ہی دیوار کے ساتھ لگا پردہ ہلا اور اس کے عقب سے اینگس نکل کر باہر آیا۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ وہ بستر کی طرف جھکا اور آہستہ سے کہا۔

''یہ تو بالکل مارینا جیسی ہے۔''

اوشینا بچی نیند سو رہی تھی، اس کے لاشعور میں خوف تھا۔ اس کی آنکھ کھل گئی۔ اینگس کو سامنے دیکھ کر اس نے بے ساختہ چیخ ماری۔ اینگس مسکرایا اور نرم لہجے میں بولا۔ ''ڈرو مت میری بچی... میں تمہیں برکت دینے آیا ہوں۔''

اینگس اس کی طرف بڑھا تو وہ خوف سے ایک طرف سمٹتی چلی گئی اور لرزتی آواز میں بولی۔ ''میرے پاس مت آنا۔''

''ڈرو مت... میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ تم خوش قسمت ہو کہ چرچ کی خدمت کرو گی۔'' اینگس نے اسے پکڑنا چاہا تو وہ چھلانگ مار کر بستر سے اتر آئی۔ اس نے دروازے کی طرف جانا چاہا مگر اس بار اینگس اس کی راہ میں حائل ہو چکا تھا اور اس کے عزائم کھل کر اس کی صورت پر لکھے ہوئے تھے۔ ''تم بلاوجہ بھاگ دوڑ کرو گی۔ تمہیں وہی کرنا ہوگا جو میں چاہوں گا... اس لیے آرام سے مان جاؤ۔''

''بچاؤ... مجھے بچاؤ۔'' اوشینا چلائی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی آواز برابر والے کمرے میں موجود چارلس تک جائے گی۔

''اس کمرے سے آواز باہر نہیں جاتی۔'' اینگس نے اسے مطلع کیا۔ ''تم اپنا چیخنے چلانے کا شوق پورا کر سکتی ہو مگر تمہیں کرنا وہی ہوگا جو میں چاہوں گا۔''

''تم شیطان ہو۔'' اوشینا نے غصے سے کہا۔

''ابھی میں شیطان ہوں لیکن جب تم میری خواہش پوری کر دو گی تو میں پھر سے انسان بن جاؤں گا۔''

''میرے قریب مت آنا... میں تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگانے دوں گی۔''

مگر اینگس کسی ہاتھی کی طرح جھومتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔

☆☆☆

کورک نے جلد پتا چلا لیا تھا کہ اوشینا اور چارلس چرچ میں تھے اور انہیں اینگس کا آدمی کسی طرح سرائے سے نکال کر لے گیا تھا۔ معاملہ چرچ کا تھا اس لیے وہ خود کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے جا کر فوری طور پر کاؤنٹ کو اطلاع دی۔ وہ یہ سنتے ہی غضب ناک ہو گیا تھا۔ اس نے کورک سے سپاہیوں کا دستہ تیار کرنے کو کہا۔ مارینا نے کہا۔

''میں بھی چلوں گی۔''

کورک یہ سن کر پریشان ہو گیا تھا۔ اس نے کاؤنٹ سے کہا۔ ''جناب! کیا یہ مناسب ہوگا؟''

''کیا مطلب؟'' کاؤنٹ ڈی ودستو نے اسے گھورا۔

''یہی... سپاہیوں کے ساتھ چرچ جانا۔''

''تم سے جو کہا جا رہا ہے وہ کرو۔'' کاؤنٹ گرجا تو کورک دم دبا کر وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد مارینا نے لرزتی آواز میں کہا۔

''کاؤنٹ! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ کہیں... اوشینا بھی...''

''نہیں، ایسا نہیں ہوگا۔'' کاؤنٹ نے جلدی سے کہا۔

''اور اگر ایسا ہو گیا تو؟''

کاؤنٹ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ''اس صورت میں بہت برا ہوگا... بہت ہی برا ہوگا۔''

کورک نے آ کر سپاہیوں کا دستہ تیار ہونے کی خبر سنائی۔ مارینا نے کاؤنٹ سے کہا۔ ''میں بھی چلوں گی۔''

''چلو۔'' کاؤنٹ نے سر ہلایا۔ ''مگر تم شاید اندر نہ جا سکو۔''

وہ کل سے نکلے اور گھڑ سواروں کا دستہ طوفانی رفتار سے چرچ کی طرف بڑھا اور کچھ دیر میں وہ چرچ کے سامنے تھے۔ چرچ کے محافظوں نے کاؤنٹ کے سپاہیوں کو روکنے کی کوشش کی مگر ان کی تعداد کے سامنے بے بس ہو گئے۔ اسی اثنا میں اینگس کا نائب فادر ہنری باہر آیا اور اس نے کاؤنٹ سے لاؤ لشکر کی وجہ پوچھی۔

''چرچ میں کل رات ایک نوجوان جوڑا آیا ہے؟''

''مجھے اس کے بارے میں نہیں معلوم۔'' فادر ہنری نے بے نیازی سے جواب دیا۔ ''اس قسم کی باتیں جناب اینگس جانتے ہیں۔''

''اینگس کہاں ہے؟''

''وہ اندر آرام کر رہے ہیں۔''

''مجھے اس کے پاس لے چلو۔'' کاؤنٹ نے فادر ہنری کا بازو پکڑا اور جب وہ ہچکچایا تو اپنا خنجر اس کی گردن پر رکھ دیا۔

''یہ آپ اچھا نہیں کر رہے ہیں۔'' فادر ہنری لرزتی آواز میں بولا۔

''مجھے اندر لے چلو ورنہ...'' کاؤنٹ نے دانت پیس کر کہا۔

ہنری کے پاس اب کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ اسے اور مارینا کو اندر لے گیا۔ مارے خوف کے اس نے کوئی ہیر پھیر نہیں کیا اور انہیں سیدھا اس کمرے کی طرف لے گیا جہاں اینگس اوشینا کے ساتھ موجود تھا۔ کاؤنٹ نے دروازے کو دھکا دیا اور اندر داخل ہو گیا۔ اس کے فوراً بعد فادر ہنری نے ایک چیخ سنی اور وہ اندر داخل ہوا تو اس نے اینگس کی برہنہ لاش دیکھی جس کے سینے میں خنجر پیوست تھا۔

☆☆☆

روسٹر نے میری طرف دیکھا۔ ''تمہیں یہ تو پتا چل گیا ہوگا کہ ایک لاش کس کی ہے؟''

میں نے سر ہلایا۔ ''ہاں... ان میں سے ایک لاش اینگس کی ہے۔ مگر باقی دو لاشیں کن کی ہیں؟''

روسٹر مسکرایا۔ ''یہ میں نہیں بتاؤں گا، تم اندازہ لگاؤ۔''

میں نے غور کیا۔ کہانی بہت دلچسپ لیکن نامکمل تھی۔ روسٹر نے بہت ذہانت سے مجھے کہانی سنائی تھی کہ میں اس کی تکمیل آسانی سے نہ کر سکوں۔ اس کے باوجود اس میں بہت سارے اشارے تھے۔ میں نے روسٹر سے کہا۔ ''تم میرے کچھ سوالوں کے جواب دے سکتے ہو؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''اگر تم کوئی براہ راست سوال نہ کرو تو میں جواب دینے کے لیے تیار ہوں۔''

''جب کاؤنٹ اور مارینا کمرے میں داخل ہوئے تو اوشینا کس حالت میں تھی؟''

''وہ بھی عریاں تھی اور اینگس اس کی عزت برباد کر چکا تھا۔''

''فادر ہنری نے اندر داخل ہونے کے بعد اینگس کے سب سے زیادہ قریب کسے پایا تھا؟''

''اوشینا کو مگر وہ بے ہوش تھی۔ اس کے بعد کاؤنٹ تھا۔''

''اینگس کے قتل کا مقدمہ کس کے خلاف چلا تھا؟''

''یہ میں نہیں بتا سکتا ورنہ تم جان جاؤ گے کہ باقی لاشیں کن افراد کی ہیں اور کون سے دو افراد بچنے میں کامیاب رہے تھے۔''

میں نے گہری سانس لی اور روسٹر سے کہا۔ ''میں سمجھ گیا کہ اصل کہانی کیا ہے۔ اگرچہ تم نے مجھے بہت مہارت سے گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے۔''

''کیا ہے اصل کہانی؟''

''اس کہانی کا آغاز وہاں سے ہوتا ہے جب مارینا کو زہر دیا گیا تھا اور اس کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی اور وہ صحت کی بحالی کے لیے پہاڑ پر چلی گئی تھی۔ اصل میں اس نے کوئی زہر نہیں کھایا تھا اور نہ کسی نے اسے زہر دیا تھا۔ بات یہ تھی کہ وہ ماں بننے والی تھی اور کاؤنٹ کو یہ بات قبول نہیں تھی مگر اس کا علم ذرا تاخیر سے ہوا تھا اس لیے بچہ ضائع کرنے کی کوشش کی گئی تو مارینا کی حالت خراب ہو گئی اور بڑی مشکل سے اس کی جان بچی تھی۔ مگر بچہ پھر بھی ضائع نہیں ہوا تھا اور اس بات کو چھپانے کے لیے کاؤنٹ نے اسے کہیں اور بھیج دیا... جب تک وہ فارغ نہیں ہو گئی اور اس نے دوبارہ اپنی صحت حاصل نہیں کر لی۔ بچی کو کسی گھرانے کے سپرد کر کے وہ لوٹ آئی تھی۔''

روسٹر نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ ''تم واقعی ذہین مصنف ہو۔ تم نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا ہے۔ مگر اس سے آگے کیا ہوا، یہ بتاؤ تو میں جانوں۔''

''یہ اندازہ لگانے کے لیے ذہین مصنف ہونا بالکل بھی ضروری نہیں ہے۔ کوئی بھی ذہانت رکھنے والا شخص اسی نتیجے پر پہنچے گا۔ بہرحال، یہ بات صرف دو افراد کے علم میں تھی۔ یعنی کاؤنٹ ڈی ودستو اور مارینا کے علم میں۔ یہ پھر وقت گزرتا گیا اور مارینا کے ساتھ یہ سانحہ پیش آیا کہ اینگس نے اسے بے آبرو کر دیا۔ کاؤنٹ نے اس سے بدلہ لینے کا سوچ لیا تھا مگر وہ مناسب موقعے کے انتظار میں تھا کیونکہ اینگس بھی کافی اثر والا تھا اور اس پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں تھا۔ وہ اپنی اس بے بسی پر تلملا کر رہ گیا تھا اور اسے پہلی بار احساس ہوا تھا کہ وہ جو دوسروں کے ساتھ کرتا آیا تھا، وہی اس کے ساتھ بھی ہوا تھا۔

''پھر مارسلز میں اوشینا اور چارلس کی آمد ہوئی۔'' میں نے کہتے ہوئے مسکرا کر روسٹر کی طرف دیکھا تو وہ جھینپ گیا۔

''تم جان گئے ہو۔'' اس نے کھسیا کر کہا۔

''ہاں، اوشینا مارینا اور کاؤنٹ کی بیٹی تھی اور اپنی ماں کی تلاش میں مارسلز آئی تھی۔ اسے نہ تو اپنی ماں کا پتا تھا اور نہ یہ معلوم تھا کہ وہ کاؤنٹ کی بیٹی ہے۔ اسے بس اتنا معلوم تھا کہ اس کی ماں مارسلز سے آئی تھی اور اسے جنم دے کر اور کسی کے حوالے کر کے واپس چلی گئی تھی۔ اس لیے اس نے ماں کی تلاش میں مارسلز کا رخ کیا تھا۔ یہاں وہ کاؤنٹ کے ملازم کی نظر میں آ گئی اور اس نے اسے کاؤنٹ کے لیے منتخب کر لیا۔ اس نے یہ بات کاؤنٹ کو بتائی اور جب اس کے علم میں آیا کہ لڑکی ہو بہو مارینا کی جوانی ہے تو وہ بے چین ہو گیا کیونکہ اسے قدرتی طور پر یہی خیال آیا تھا کہ لڑکی اصل میں اس کی اور مارینا کی بیٹی ہے۔ اس نے خود جا کر اسے سرائے میں

www.pkdigest.com

دیکھا۔ سرائے میں اوشینا کے کمرے میں گھسنے والا نقاب پوش کاؤنٹ ہی تھا اس نے قریب سے دیکھ کر تصدیق کر لی کہ وہ اس کی بیٹی تھی۔ اس کی شفقت پدری نے جوش مارا اور اس نے اسے اور چارلس کو اپنے پاس بلانے کا فیصلہ کیا مگر وہ یہ بات کورک یا کسی اور کو نہیں بتا سکتا تھا۔ اس لیے انہوں نے کاؤنٹ کے حکم کی تعمیل کے لیے زور اور جبر سے کام لینے کا سوچا، اس وجہ سے اوشینا اور چارلس گھبرا کر چرچ کی طرف چلے گئے۔

''جب اینکس نے اوشینا کو دیکھا اور مارینا سے اس کی مشابہت دیکھی تو اس کے اندر کا درندہ بیدار ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ مارینا نہ سہی، اوشینا ہی سہی بلکہ وہ اس کے مقابلے میں کمسن اور زیادہ حسین تھی۔ اس نے پہلی فرصت میں اوشینا کے کمرے میں جا کر اسے پامال کر دیا۔ اور جیسے ہی وہ اس کام سے فارغ ہوا اسی لمحے مارینا اور کاؤنٹ کمرے میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک نے اینکس کو خنجر مار کر قتل کر دیا۔ اوشینا یہ کام نہیں کر سکتی تھی کیونکہ وہ بے ہوش تھی۔''

''تمہارا کیا خیال ہے، یہ کام کس نے کیا؟'' روسٹر نے پوچھا۔

''یہ کام مارینا نے کیا تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ جس درندے نے اسے بے آبرو کیا تھا، اسی نے اس کی بیٹی کی آبرو بھی چھین لی تھی۔ وہ یہ دیکھ کر بے قابو ہو گئی اور اس نے کاؤنٹ کے ہاتھ سے خنجر لے کر اسے اینکس کے سینے میں اتار دیا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ یہ لاشیں مارینا اور کاؤنٹ کی ہیں؟'' روسٹر نے لاشوں کی طرف دیکھا۔

''نہیں، یہ ان کی لاشیں نہیں ہیں۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ لاشیں اوشینا اور چارلس کی ہیں۔''

روسٹر حیران رہ گیا۔ ''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''مجھے اس طرح سے پتا چلا کہ عورت کی لاش میں دو چیزیں قابل توجہ ہیں۔ ایک تو اس کی پسلیاں عین دل کے مقام سے کٹی ہیں اور دوسرے اس کی زیر ناف ہڈی ابھی نامکمل پذیر تھی۔ یہ بیس بائیس برس کی عمر تک بڑھتی ہے اور اس کی ادھوری حالت بتا رہی ہے کہ عورت کو صرف سترہ یا اٹھارہ برس کی عمر میں موت نے آدبوچا تھا۔ مرد کی ہڈیاں چوڑی اور مضبوط ہیں یعنی وہ بھی جوان تھا۔ اس لیے دونوں لاشیں مارینا اور کاؤنٹ کی نہیں ہو سکتی ہیں۔ مارینا بھرپور عورت تھی اور وہ تکمیل کے تمام مراحل سے گزر چکی تھی جبکہ کاؤنٹ پچاس برس سے زیادہ کا تھا۔ اس لیے اس کی ہڈیوں میں وہ مضبوطی اور چوڑائی نہیں ہو سکتی ہے جو ایک جوان آدمی کی ہڈیوں میں ہوتی ہے۔ دوسرے تم نے غور نہیں کیا۔ مرد کی گردن کی ہڈی ٹوٹی ہوئی ہے، اس لیے کہ اسے پھانسی دی گئی تھی اور کاؤنٹ کو کسی صورت پھانسی نہیں دی جا سکتی تھی۔''

''تم نے بالکل درست تجزیہ کیا ہے۔'' روسٹر نے اعتراف کیا۔ ''مگر اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟''

''وجوہات بہت ساری ہو سکتی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کاؤنٹ نے اس بات کو چھپانے کے لیے اوشینا کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا ہو۔ یا کسی اور وجہ سے اسے مار دیا ہو اور پھر اس کا الزام چارلس پر لگا کر اسے بھی سزائے موت سنا دی ہو۔ زیادہ امکان یہ ہے کہ کاؤنٹ نے اینکس کے مارے جانے کے بعد ہنری سے ساز باز کی اور اوشینا کو بھی مار کر اس کا الزام چارلس پر لگا دیا کہ اس نے اپنی بیوی کو اینکس کے ساتھ ناگفتہ بہ حالت میں دیکھ کر ان دونوں کو قتل کر دیا۔ عدالت میں کاؤنٹ اور ہنری کی گواہی کے سامنے اس بے چارے کی چیخ و پکار پر کسی نے توجہ نہیں دی ہو گی اور اسے سزائے موت سنا کر فوری طور پر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہو گا۔ شروع میں تم نے مجھے دو کرداروں کے غائب ہونے کا کہہ کر کنفیوز کر دیا تھا مگر جب میں نے سوچا تو معاملہ صاف ہو گیا۔''

''اب آخری بات... کہ ان تینوں کو اس مقبرے میں کیوں دفن کیا گیا ہے جو کاؤنٹ کے خاندان کے لیے مخصوص تھا؟''

''یہ مقبرہ کاؤنٹ کے خاندان کے لیے مخصوص تھا مگر اس میں اوشینا اور اس کے شوہر کے ساتھ اینکس کو بھی دفن کر دیا گیا۔ اور ایسا شاید مارینا کی خواہش پر کیا گیا تھا تاکہ وہ اس کی لاش دیکھ کر اپنے جذبۂ انتقام کی تسکین کر سکے۔ میں نے آتے ہوئے ایک عمارت دیکھی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہی کاؤنٹ خاندان کا اصل مقبرہ ہے اور اسی میں کاؤنٹ کی لاش ہو گی اور شاید مارینا کی بھی۔''

''تم واقعی ذہین آدمی ہو۔ تم نے کتنی ہوشیاری سے اس کہانی کا تانا بانا بُنا... اور سچ تلاش کر لیا۔'' اس نے اعتراف کیا اور کھڑا ہو گیا۔ ''میرا خیال ہے کہ اب ہمیں یہاں سے چلنا چاہیے۔''

میں نے اس سے اتفاق کیا کیونکہ ابھی مجھے جا کر اس کہانی کو لکھنا بھی تھا۔ ہم مقبرے سے باہر نکل آئے۔

موت پسند

آصف زبیر

زندگی امید، ترنگ اور امکانات کا نام ہے ...زندگی کتنی حسین اور انمول شے ہے۔ اس کا ادراک بہت کم لوگوں کو ہوتا ہے ...اکثر لوگ معمولی سی ناکامی سے دل برداشتہ ہو جاتے ہیں اور منفی خیالات ان پر اس قدر غالب ہو جاتے ہیں کہ انہیں موت سے بہتر اور کوئی حل نظر نہیں آتا۔

زندگی سے فرار اور موت کی خواہش میں مبتلا افراد کی ایک سنگ دل کہانی

جے پی کینٹر اپنے بے سجائے دفتر کی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ نیچے منزل نیچے زندگی پوری سرگرمی سے رواں دواں تھی اور نیچے منزل اوپر اتنا سناٹا تھا کہ سوئی گرنے کی آواز بھی سنی جا سکتی تھی۔ اگرچہ یہاں ہوا بہت تیز تھی مگر عجیب بات تھی کہ اس کی تیزی میں شور نہیں تھا بلکہ یہ بے آواز تھی۔ ہاں جب کمرے میں آ کر چیزیں اڑاتی تھی تو اس کا شور ہوتا تھا۔ یہ عمارت کوئی پچاس منزلہ تھی۔ مگر جیسن یہاں پر بھی خود کو دنیا سے الگ محسوس کرتا تھا۔ اسے لگتا تھا جیسے اسے سب سے الگ کر دیا گیا ہو۔ حالانکہ اسی منزل پر کوئی پچاس دفاتر تھے اور ان میں کام کرنے والے بیشتر افراد سے جیسن کی جان پہچان تھی۔ لفٹ کے سفر میں آشنائی ہو ہی جاتی ہے۔ تیسویں منزل تک آنے جانے میں لفٹ کو پورے سات منٹ لگتے تھے۔

جیسن کا دفتر کوئی خاص بڑا نہیں تھا۔ یہ بارہ بائی سترہ فٹ کا ایک کمرا تھا جسے اس نے دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ایک حصے میں اس کا دفتر تھا۔ یہ بارہ بائی دس کا تھا اور دوسرے حصے میں سات بائی بارہ فٹ کا ویٹنگ روم تھا۔ اگر اس کے پاس ایک وقت میں ایک سے زیادہ کلائنٹ آ جاتے تھے تو وہ یہاں بیٹھ سکتے تھے۔ دفتر والے حصے میں ایک چھوٹی سے میز تھی جس پر رکھی واحد چیز جیسن کا کمپیوٹر تھا۔ وہ سارا کام اسی پر کرتا تھا۔ میز کے نیچے کمپیوٹر کے دوسرے لوازمات رکھے تھے... جیسے ایک چھوٹا سا پرنٹر اور ایک اسکینر۔ اس کے علاوہ ایک طرف صوفہ سیٹ رکھا تھا۔ اس فائیو سیٹر کے ساتھ گلاس

www.pkdigest.com

ٹاپ میز تھی۔ ایک کونے میں کافی میکر اور اس کے ساتھ واٹر کولر رکھا تھا۔ میز کی دونوں جانب ایک ایک کرسی رکھی تھی اور وہ کلائنٹ کو بس اتنی دیر یہاں بٹھاتا تھا جتنی دیر میں اس کا بائیو ڈیٹا اپنے کمپیوٹر میں ڈالتا تھا۔ اس کے بعد وہ اسے صوفے پر لے آتا تھا۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ اس کا کلائنٹ خود کو کسی دفتر میں نہ محسوس کرے۔ اس کی یہ کوشش اکثر کامیاب رہتی تھی۔ ایک خاص قسم کے ماہر نفسیات کی حیثیت سے اس کے لیے اپنے کلائنٹس سے بے تکلف ہونا بہت ضروری تھا۔

دفتر کی عقبی دیوار پر ایک بڑی سی کھڑکی تھی جس میں شیشے کے سرکنے والے پٹ تھے۔ اس نے پٹ سرکا کر نیچے دیکھا اور سوچا کہ اگر کوئی یہاں سے گر جائے تو اسے نیچے جانے میں شاید دس پندرہ سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگیں گے۔ یعنی گرنے والے کے لیے اذیت کا دورانیہ بس اتنا ہی ہوگا۔ اس کے بعد اسے ابدی سکون مل جائے گا۔ اتنی بلندی پر ہوا بہت تیز تھی اور ذرا سا شیشہ کھولتے ہی ہوا کے جھکڑ اندر آنے لگتے تھے اس لیے وہ کھڑکی بہت کم کھولتا تھا۔ وہ نیچے دیکھ رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے پہلے تو توجہ نہیں دی مگر جب گھنٹی مستقل بجتی رہی تو وہ با دل نا خواستہ میز کی طرف آیا اور ریسیور اٹھایا۔

''ہیلو۔'' اس نے محتاط انداز میں کہا۔

''ڈاکٹر جیسن پی کینز؟'' دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز نے پوچھا۔

''ہاں، بات کر رہا ہوں۔'' اس کا لہجہ مزید محتاط ہو گیا تھا۔

''مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔'' عورت بولی۔

''سوری! اس وقت میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔'' اس نے صاف انکار کر دیا۔

''پلیز... مجھے مایوس مت کرو۔'' عورت نے ملتجی لہجے میں کہا۔ ''اگر تم نے میری مدد نہ کی تو میرا شوہر...''

''تمہارے شوہر کو کیا ہوا ہے؟'' جیسن نے اس کی بات کاٹی۔

''وہ خودکشی کرنا چاہتا ہے۔''

''کیوں؟'' اس نے غیر ارادی طور پر پوچھا۔

''یہ بات تم سے زیادہ بہتر کون جان سکتا ہے کہ آدمی کیوں خودکشی کرنا چاہتا ہے۔'' عورت نے کسی قدر تعجب سے کہا۔

''مسز...''

''مسز مائیکل سمن۔'' عورت جلدی سے بولی۔ ''میرا نام رون ہے۔''

''مسز مائیکل! آدمی کے خودکشی کرنے کی کوئی ایک درجن وجوہات ہوتی ہیں۔ مائیکل ان میں سے کس وجہ سے خودکشی کرنا چاہتا ہے؟'' اس نے ملائمت سے کہا۔

''وہ زندگی سے مایوس ہے۔ اس کے خیال میں اب زندگی میں اس کے لیے کچھ باقی نہیں رہ گیا ہے اس لیے وہ خودکشی کرنا چاہ رہا ہے۔''

جیسن نے سوچا اور احتیاط سے بولنے لگا۔ ''بات یہ ہے کہ میں فی الحال تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔''

''کیا تم چھٹی پر ہو؟''

''نہیں۔''

''تب تم میری مدد کر سکتے ہو۔ میں تمہیں پوری فیس دوں گی۔''

''بات فیس کی نہیں ہے۔''

''پھر تم انسانی ہمدردی کے تحت یہ کام کر دو۔'' عورت کا لہجہ مزید ملتجیانہ ہو گیا تھا۔ ''اگر مائیکل نے خودکشی کر لی تو یہ میرے ضمیر پر ہمیشہ کے لیے بوجھ بن جائے گا۔''

''تمہارے ضمیر پر بوجھ؟''

''ہاں کیونکہ میں اس سے الگ ہونے والی ہوں۔''

''الگ... تمہارا مطلب ہے تم اس سے طلاق لے رہی ہو؟''

''بالکل یہی بات ہے سب طے ہو چکا ہے۔ ہمارے وکیل طلاق کے کاغذات تیار کر چکے ہیں۔ صرف ان پر دستخط ہونا باقی ہیں۔''

''تمہارے خیال میں مائیکل اس طلاق کی وجہ سے... خودکشی کرنا چاہ رہا ہے؟'' جیسن نے پوچھا۔ اسے پہلی بار اس کیس سے دلچسپی ہوئی تھی۔

''کچھ ایسی بات بھی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں اس کے خودکشی کے رجحان سے تنگ آکر طلاق لے رہی ہوں اور وہ مجھے بار بار دھمکی دے رہا ہے کہ وہ خودکشی کر لے گا۔''

''کیا اس نے خودکشی کی کوئی کوشش کی ہے؟''

''کل رات اس نے نیند کی سو سے زائد گولیاں کھانے کی کوشش کی تھی مگر میں اس کی سخت نگرانی کر رہی تھی اس لیے وہ ناکام رہا۔''

''اس کے علاوہ؟'' جیسن نے پوچھا۔ ''کہیں یہ اس کا ڈراما تو نہیں ہے۔ ممکن ہے اس طرح وہ تمہیں طلاق سے باز رکھنے کی کوشش کر رہا ہو۔''

''نہیں، وہ سچ مچ خودکشی کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اس کے کمرے میں ایک خفیہ کیمرا لگا رکھا ہے اس لیے مجھے بروقت پتا چل گیا۔''

جیسن نے سوچتے ہوئے پوچھا۔ ''خودکشی کے حوالے سے اس کا رویہ کیسا ہے... نارمل یا انتہا پسند یا پھر تشدد آمیز؟''

''نارمل ہے۔ وہ بہت نرم آدمی ہے۔ نہ جانے کیوں اس طرح اپنی جان کے پیچھے پڑ گیا ہے۔''

''اس وقت وہ کہاں ہے؟''

''گھر میں۔ میں یہیں سے بات کر رہی ہوں۔''

''کیا تم اسے میرے دفتر لا سکتی ہو؟''

''نہیں، میں نے ہر ممکن کوشش کر کے دیکھ لی ہے۔ وہ کسی صورت گھر سے نکلنے کے لیے تیار نہیں ہے اور میں اسے اکیلا چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی۔ مجھے یقین ہے اس صورت میں وہ فوراً خودکشی کر لے گا۔''

''تب میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔''

''کیا تم میرے گھر نہیں آسکتے؟'' رون نے التجا کی۔

''میں کسی کے گھر نہیں جاتا۔''

''ڈاکٹر مریض کے گھر جاتے ہیں...''

''وہ ڈاکٹر ہوتے ہیں۔ میں صرف ایک طرح کا نفسیات کا ماہر ہوں۔'' جیسن نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

''پھر بھی تم لوگوں کا علاج تو کرتے ہو اور اس میں گھر یا دفتر کی شرط نہیں ہونی چاہیے۔''

''اصل میں، میں بھی کہیں گیا نہیں ہوں۔'' اس کا لہجہ کمزور ہو گیا تھا۔ اس عورت..... کے لہجے میں مردوں کو قائل کرنے والی کوئی بات تھی۔ وہ اس سے بات کرتے ہوئے خود کو اپنے موقف سے ہٹتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

''اگر تم ایک بار کہیں چلے جاؤ گے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا جبکہ تمہارے آنے سے ایک انسانی جان بچنے کا پورا امکان ہے۔''

''آخر میں ہی کیوں؟''

''اس شہر میں، اس شعبے میں تم سے اچھا آدمی کوئی نہیں ہے بلکہ میں نے تمہارے بارے میں جو سنا ہے، تم ملک میں چند ماہر ترین افراد میں سے ایک ہو۔''

''کسی نے میرے بارے میں تمہیں بہت بڑھا چڑھا کر بتایا ہے۔''

''نہیں، میں نے خود تمہارے بارے میں پڑھا ہے۔ میں نے انٹرنیٹ پر تمہارے اس موضوع پر مقالے دیکھے تھے۔ جب سے مائیکل کو خودکشی کا جنون ہوا ہے، تب سے میں نے اس موضوع پر بہت پڑھا ہے۔ میرا یہ یقین ہے کہ تم اس شعبے میں ماہر ترین شخص ہو۔ اسی وجہ سے میں نے تم سے رابطہ کیا ہے۔''

''اس سے پہلے تم نے کسی اور سے مائیکل کا علاج کرانے کی کوشش کی ہے؟''

''نہیں، میں نے اس بارے میں پڑھا تھا کہ خودکشی کا مریض صرف ایک بار علاج کرانے پر آمادہ ہوتا ہے، چاہے اس میں کامیابی ہو یا ناکامی۔'' رون نے کہا۔

''تم نے واقعی اس بارے میں بہت پڑھا ہے۔'' جیسن قائل ہو گیا۔ ''او کے! میں آنے کے لیے تیار ہوں لیکن پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ مائیکل علاج کرانے پر آمادہ ہے یا نہیں؟''

''یہ تو میں نہیں کہہ سکتی لیکن وہ تم سے ملنے پر آمادہ ہو گیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ کسی حد تک علاج پر راضی ہو گیا ہے۔''

''یہ تمہارا خیال بھی ہو سکتا ہے۔''

''ممکن ہے۔'' اس نے تسلیم کیا۔ ''لیکن اس صورت

آپ بھی بھرپور طاقت کے مالک بنیئے طبی دنیا میں کامیاب اور لاجواب نسخہ

مرد حضرات ہی پڑھیں۔

[illegible]

حکیم اینڈ سنز
پوسٹ بکس نمبر 2159 کراچی 74600 پاکستان

میں بھی تمہیں نقصان نہیں ہوگا۔ میں تمہارے وقت کی مکمل ادائیگی کروں گی۔"

"میں نے کہا نا مسئلہ فیس کا نہیں..." وہ کہتے کہتے رک گیا۔ "مجھے اپنا پتا لکھواؤ۔"

رون نے اسے اپنا پتا سمجھا دیا۔ اسے ریسیور رکھنے کے بعد خیال آیا کہ اس نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ وہ کس کے گھر میں تھی۔ اپنے یا مائیکل کے گھر میں؟

☆☆☆

حسین کار سے اترا تو اس کے سامنے ایک شان دار سا مکان تھا۔ یہ علاقہ ویسے بھی پوش تھا اور یہاں زیادہ تر بڑے گھر تھے۔ وہاں پوش عمارتوں جیسی ویرانی سی تھی۔ دور دور تک کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے فولادی گیٹ کے پلر پر لگی کال بیل بجائی تو فوراً ہی رون نے اسپیکر سے پوچھا۔

"کون ہے؟"

"حسین کینز۔" اس نے جواب دیا۔ فوراً ہی فولادی گیٹ از خود کھلنے لگا اور اسپیکر سے آواز آئی۔

"اندر چلے آؤ۔"

عمارت ولا اشائل کی تھی اور اس کے سامنے والے حصے میں گول سفید ستون لگے تھے۔ ایک دل کش عورت نے مرکزی دروازہ کھولا اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے پھر تعارف کرایا۔

"حسین پی کینز۔"

وہ مسکرائی تھی۔ "مجھے مسز مائیکل کہتے ہیں مگر تم مجھے رون کہو تو مجھے زیادہ اچھا لگے گا۔ آؤ، اندر آؤ۔"

وہ اسے ایک نشست گاہ میں لے آئی۔ اس نے بہ غور حسین کا جائزہ لیا اور بولی۔ "میرا تو خیال تھا، تم کوئی عمر رسیدہ شخص ہوگے مگر تم تو جوان ہو۔"

"شکریہ!" اس نے آہستہ سے کہا۔ "مائیکل کہاں ہے؟"

"وہ اندر ہے، تیار ہو کر آرہا ہے۔" رون نے بتایا۔ "تم کچھ پینا پسند کرو گے؟"

"مائیکل کو کیا پسند ہے؟" اس نے سوال کیا۔

"اسے لائم جوس پسند ہے۔"

"بس تو میرے لیے بھی لائم جوس لے آنا۔"

رون نے تعریفی انداز میں سر ہلایا۔ "تم واقعی اچھے ماہر نفسیات ہو۔"

حسین نے اردگرد دیکھا۔ نشست گاہ بہت پُرتعیش انداز میں سجی ہوئی تھی۔ عمارت اور اس کی آرائش سے لگ رہا تھا کہ مکین دولت مند تھے۔ حسین کو یاد آیا اور اس نے رون کی طرف دیکھا۔ "یہ گھر کس کا ہے؟"

"ظاہر ہے، مائیکل کا۔"

"اس کا مطلب ہے مائیکل دولت مند آدمی ہے؟"

"ہاں، لیکن بہت زیادہ نہیں۔ اس کی ایک چھوٹی سی ریالٹر فرم ہے۔"

"تم نے کہا تھا کہ تم اس سے الگ ہو رہی ہو۔ کیا تم اس کی وجہ بتا سکتی ہو؟ میرا مطلب ہے ذرا تفصیل سے۔"

اس نے سر ہلایا۔ "میں نے تین سال پہلے مائیکل سے شادی کی تھی۔ اس وقت وہ ایک جگہ ملازم تھا۔ پھر میں نے اسے سرمایہ فراہم کیا اور اس نے اپنی فرم کھول لی۔ اس میں صلاحیت تھی اس لیے کامیاب رہا اور میرا سرمایہ مجھے واپس کر دیا۔ مگر اسے کاروبار کرا کے دینے کا نقصان مجھے ہوا تھا۔ اس کا سارا ہی وقت بزنس کے لیے وقف ہو گیا تھا اور میرے لیے اس کے پاس وقت نہیں رہا تھا۔ پھر اس سے اختلافات شروع ہوئے۔ پھر کاروبار میں زوال آیا تو وہ بھی گھر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد اس میں خودکشی کا رجحان سر اٹھانے لگا۔ وہ اکثر خودکشی کی دھمکیاں دے کر مجھے بور کرتا تھا۔ میں سمجھتی تھی کہ وہ صرف ڈراما کرتا ہے۔"

"پہلی بار تمہیں کب احساس ہوا کہ وہ اس معاملے میں سنجیدہ ہے؟"

"وہ مہینے پہلے اس نے کار کا ہوسٹ پائپ اندر کر کے انجن چلا دیا تھا اور خود اندر بیٹھ کر کھڑکیوں کے شیشے بند کر لیے۔ وہ تو اتفاق سے برابر والوں کے کتے نے بھونک بھونک کر سب کو جمع کر لیا اور اس کی جان بچ گئی تھی۔ ہم بڑی مصیبت میں پڑ گئے تھے۔ بڑی مشکل سے پولیس انکوائری ختم ہوئی تھی۔"

"اس کے بعد اس نے پھر کوئی کوشش کی تھی؟"

"نہیں، بس یہ نیند کی گولیاں کھانے کی کوشش کی تھی۔"

"اس کا کیا کہنا ہے، وہ کیوں خودکشی کرنا چاہتا ہے؟"

"اس کا کہنا ہے کہ وہ زندگی سے اکتا چکا ہے۔ اس کے پاس کرنے کے لیے کچھ نہیں رہا ہے اس لیے اب وہ مر جانا چاہتا ہے۔"

حسین نے سر ہلایا۔ "میں کسی حد تک اس کا کیس سمجھ رہا ہوں۔ وہ نفسیاتی مریض نہیں ہے، بس بور ہو گیا ہے۔ پھر تم نے بھی اسے چھوڑنے کی بات کی تو اس نے خودکشی کی عملی کوشش کر ڈالی۔"

رون نے سر ہلایا۔ "اس نے پہلی کوشش اس وقت کی تھی جب میں نے اس سے طلاق کی بات کی تھی۔"

"تم خاص طور سے خودکشی کا رجحان رکھنے والوں کا علاج کرتے ہو۔"

"ہاں، کچھ ایسا ہی ہے۔" حسین نے محتاط انداز میں کہا۔ "تم کہہ سکتے ہو کہ میں لوگوں کو زندگی کی افادیت سے متعلق سمجھاتا ہوں اور انہیں قائل کرتا ہوں۔"

"ہاں... شاید تم ایسا ہی کرتے ہو۔ مگر میرے معاملے میں اب بہت دیر ہو چکی ہے۔" اس نے مایوسی سے کہا۔ "میں زندگی کو ترک کر چکا ہوں۔"

"ایسا نہیں ہے..."

مائیکل نے اس کی بات کاٹی۔ "شاید مجھے چلتا پھرتا اور باتیں کرتا دیکھ کر تم سمجھ رہے ہو کہ میں زندہ ہوں۔" اس کا لہجہ استہزائیہ ہو گیا۔ "نہیں ڈاکٹر... میں مر چکا ہوں۔ ہاں، میں ذہنی طور پر مر چکا ہوں۔ اور جب آدمی ذہنی طور پر مر جائے تو اس بات کی خاص اہمیت نہیں رہتی کہ وہ جسمانی طور پر کب مرتا ہے۔"

"ذہنی موت طب کی ایک اصطلاح ہے جس کے مطابق کسی کا دماغ کام کرنا ترک کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ میرے علم میں اور کوئی دماغی موت نہیں ہے۔"

"میں اپنی سوچوں میں مر چکا ہوں۔" مائیکل نے دہرایا۔

"یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ آدمی کی سوچ کبھی نہیں مرتی اور نہ ہی وہ اپنے اندر مرتا ہے۔ خیر، یہ ایک لمبی بحث ہے۔ ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔" حسین نے لائم جوس کا ایک گلاس خود اٹھا لیا اور دوسرا مائیکل کو تھما دیا۔ "بات یہ ہے کہ تم زندہ رہنا نہیں چاہتے... کیوں؟"

"کیونکہ اب میرے پاس زندہ رہنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"مثلاً؟"

"میرا کاروبار ختم ہو گیا ہے۔ میری بیوی مجھے چھوڑ چکی ہے۔ اگرچہ وہ ابھی بھی میری بیوی ہے مگر عملاً ہمارے درمیان علیحدگی ہو چکی ہے۔ وہ شاید آج کل میں اس گھر سے ہمیشہ کے لیے چلی جائے گی۔"

حسین نے اسے بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ وہ اس گھر سے جا چکی تھی۔ اس نے جوس کا ایک گھونٹ لیا اور بات جاری رکھی۔ "یہ تو کوئی وجہ نہیں ہے۔ کاروبار تو میرا بھی ٹھپ ہو چکا ہے۔ اس مہینے مجھے اتنی آمدنی بھی نہیں ہوئی ہے کہ میں اپنے دفتر کا کرایہ دے سکوں۔ اور جہاں تک بیوی کے جانے کا تعلق ہے تو مجھے گزشتہ تین سال میں دو

www.pkdigest.com

بیویاں چھوڑ چکی ہیں۔"

"مگر تمہاری حالت میری طرح خراب نہیں ہوگی۔ میں تباہ ہو چکا ہوں اور اس کی ذمے دار میری بیوی ہے۔ میں دیوالیا ہونے والا ہوں۔ اس سے پہلے کہ قرض خواہ مجھے عدالتوں میں گھسیٹیں، میں اس دنیا سے جان چھڑا لینا چاہتا ہوں۔ میں فٹ پاتھ پر زندگی نہیں گزار سکتا۔"

"کچھ ایسی ہی حالت میری بھی ہے دوست۔" جیسن نے سرد آہ بھری۔ "میرے پاس جو تھا، وہ میں نے ایک نام نہاد کمپنی میں لگا دیا اور جب کاروباری حالات خراب ہوئے تو سب سے پہلے وہ کمپنی فرار ہوئی۔ اب میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ جو ہے اسے بھی جلد بینک والے لے جائیں گے کیونکہ میں نے سرمایہ کاری کے لیے بینک سے بھی کچھ قرض لیا تھا۔"

"اچھا۔" مائیکل کے چہرے پر ہمدردی کے تاثرات نمودار ہوئے۔ "تمہارے ساتھ تو واقعی برا ہوا۔"

"برے سے بھی برا... جب میرا معاملہ عدالت میں آئے گا اور مجھے دیوالیا قرار دیا جائے گا تو کون میرے پاس علاج کے لیے آنا پسند کرے گا۔"

"کوئی بھی نہیں۔" مائیکل نے تسلیم کیا۔ "تمہاری حالت اس لحاظ سے واقعی بُری ہے۔ لیکن جہاں تک بیوی کا تعلق ہے تو مجھے یقین ہے مجھ سے زیادہ بدنصیب اور کوئی نہیں ہوگا۔"

"مجھے تمہاری بیوی ہی نے بلایا ہے، اس کا مطلب ہے اسے تمہاری پروا ہے۔"

"پروا۔" مائیکل نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "اسے صرف اتنی پروا ہے کہ میں طلاق نامے پر دستخط تک زندہ رہوں تاکہ میرے مرنے کے بعد اس پر کوئی ذمے داری نہ آئے۔"

جیسن نے غور کیا۔ "کیا شادی کے معاہدے کے تحت تم دونوں ایک دوسرے کے مالی معاملات کے ذمے دار بھی تھے؟"

"وہ نہیں، میں ہوں۔" مائیکل نے تلخی سے کہا۔ "اس کے باوجود اسے خطرہ ہے کہ میرے بعد میرے قرض خواہ اسے عدالت میں نہ گھسیٹ لیں۔"

"اگر وہ اتنی ہی بری بیوی ہے تو اس کے لیے جان دینا سمجھ سے باہر ہے۔"

"یہ بات بھی تمہیں اس نے بتائی ہوگی کہ میں اس کی خاطر خودکشی کرنے کی کوشش کر رہا ہوں؟" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"ہاں، اس کا کہنا تو یہی ہے۔"

"اس سے جان چھوٹنے پر میں خدا کا شکر ادا تو کر سکتا ہوں لیکن خودکشی نہیں۔"

"پھر کیا وجہ ہے؟"

"مجھے جو رقم ادا کرنی ہے، اس کا بڑا حصہ رون کو جائے گا۔ اس لیے میں مرنا چاہتا ہوں۔"

جیسن نے تعجب سے اسے دیکھا۔ "اگر تمہاری کچھ رقم بیوی کو چلی جائے تو اس میں خودکشی کرنے کی کیا بات ہے؟"

"میں نے کچھ سودے کیے تھے۔ ان کے پیچھے رون کا مشورہ اور سرمایہ تھا۔ مگر جب بدقسمتی سے ان میں نقصان ہوا تو وہ سارے کا سارا میرے سر آگیا۔ رون کا سارا سرمایہ محفوظ رہا۔ اس کے باوجود اس کا دعویٰ ہے کہ ابھی اسے ساری رقم نہیں ملی ہے۔ اب مجھے دیوالیا قرار دیا جاتا ہے تو میرے سارے اثاثے عدالت کی تحویل میں چلے جائیں گے اور اس سے سب سے پہلے رون کو رقم ملے گی۔"

"یہ تو سمجھ میں آتا ہے مگر خودکشی کی وجہ اب بھی سمجھ میں نہیں آئی ہے۔"

"شادی کے معاہدے کے مطابق اگر ہم میں سے کوئی دوسرے کی موجودگی میں مر جائے تو اس کے اثاثے دوسرے کو نہیں ملیں گے۔ اب اگر میں مر جاتا ہوں تو رون کو کچھ نہیں ملے گا۔ اور ممکن ہے، میرے قرض خواہ اسے عدالت میں گھسیٹ لے جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو کم سے کم میری روح ہی خوش ہو جائے گی۔"

جیسن نے پھر نفی میں سر ہلایا۔ "میرے خیال میں تو یہ وجہ بھی درست نہیں ہے۔ دیکھو اگر تم صرف اس لیے مر رہے ہو کہ تمہاری بیوی کو تم سے کچھ نہ ملے تو اس سے بڑی حماقت کیا ہوگی۔ مرنے والے کو بھلا اس سے کیا کہ اس کے اثاثے کس کے پاس جا رہے ہیں... اور جہاں تک دیوالیا ہونے کی بات ہے تو آج کل کسی کو اتنی آسانی سے دیوالیا قرار نہیں دیا جا رہا ہے کیونکہ کاروباری حالات بہت خراب ہیں اور عدالتیں بھی چھوٹ دے رہی ہیں... کیونکہ حالات صرف تمہارے خراب نہیں ہیں بلکہ سب کے خراب ہیں۔ اس لیے دل چھوٹا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"اچھا۔" اس نے بے یقینی سے کہا۔

"بالکل!" جیسن زور دے کر بولا۔ "اپنے اردگرد دیکھو، ہزاروں لوگ اپنی جمع پونجی سے محروم ہو چکے ہیں مگر کسی نے خودکشی نہیں کی۔"

"ہاں۔" اس بار اس کے لہجے میں امید تھی۔

"اور اگر میری بیوی ایسی ہوتی تو میں اس سے جان

چھوٹنے پر خدا کا شکر ادا کرتا نہ کہ خودکشی کی کوشش کرتا۔"

"تمہاری بھی دو بیویاں تمہیں چھوڑ چکی ہیں۔" مائیکل نے اسے یاد دلایا۔ "کیا تمہیں اس کا دکھ نہیں ہوا؟"

"ہاں، دکھ تو ہوا تھا مگر اتنا نہیں کہ میں خودکشی کر لیتا۔"

"مگر میں فٹ پاتھ پر زندگی نہیں گزار سکتا۔ اگر میں زندہ رہا تو جلد یا بہ دیر فٹ پاتھ پر پہنچ جاؤں گا۔"

"زمین کے نیچے ہونے کے مقابلے میں زمین کے اوپر ہونا بہرحال بہتر ہوتا ہے۔" جیسن نے آہستہ سے کہا۔ "ویسے تم اپنی بیوی سے کچھ کیوں نہیں وصول کر لیتے؟"

"بیوی سے... وہ کیسے اور کیوں؟" اس کے لہجے میں سوال تھا۔

"دیکھو نا، تم اتنی آسانی سے اس کی جان چھوڑ رہے ہو۔ اب اگر تم طلاق کے کاغذات پر دستخط کرنے سے انکار کر دیتے ہو تو وہ تمہیں اس کے لیے مجبور نہیں کر سکتی ہے۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔" مائیکل کے چہرے پر رونق آگئی۔ "وہ دولت مند ہے... تو کیا وہ تم سے جان چھڑانے کے لیے تمہاری مالی مدد نہیں کرے گی؟"

"یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔" وہ پُرجوش لہجے میں بولا۔ "میں اس چڑیل کو اتنی آسانی سے نہیں چھوڑوں گا۔ وہ میرا قرض بھی ادا کرے گی اور مجھے اتنا دے گی جس سے میں اس بحران سے نکل سکوں۔ اس کے پاس بہت مال و دولت ہے۔"

جیسن نے اطمینان کا سانس لیا۔ "یعنی تم نے اب خودکشی کا ارادہ ترک کر دیا ہے؟"

"بالکل... پہلے مجھے کوئی راستہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا، اب تم نے راستہ دکھا دیا ہے۔ میں کیوں خودکشی کروں؟ میں اس چڑیل کو خودکشی کرنے پر مجبور کر دوں گا۔ اس نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے۔"

اسی لمحے رون شعلہ جوالا بنی اندر آئی۔ اس نے پہلے کھا جانے والی نظروں سے جیسن کی طرف دیکھا۔ "ذلیل شخص... میں نے تجھے اس لیے بلایا تھا کہ تو میری ہی جڑیں کاٹے؟"

"خاتون! کسی کی بات چھپ کر سننا جرم ہے۔" جیسن نے سنجیدگی سے کہا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ رون نے کسی طریقے سے ان کی باتیں سن لی تھیں۔ "اور کسی کے ساتھ اس طرح بات کرنا بھی ہتک عزت کے تحت آتا ہے۔ اس لیے میری درخواست ہے کہ محتاط ہو کر بات کریں۔"

اس پر رون نے ان دونوں اور جیسن کے مشورے کو ایک ایسی گالی دی جو اس سے پہلے جیسن نے کسی عورت کے منہ سے نہیں سنی تھی۔ وہ دم بہ خود رہ گیا تھا۔ جبکہ مائیکل ہنس رہا تھا۔ اس نے جیسن کی طرف دیکھا۔

"ڈاکٹر! تم نے سنا، یہ اس عورت کی اصلیت ہے۔"

"میرا خیال ہے مجھے تو اجازت دو۔" جیسن جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ "اور مسز مائیکل! تم نے مجھے جس کام کے لیے بلایا تھا وہ میں نے کر دیا ہے۔"

"لیکن تم یہ مت سمجھنا کہ مجھ سے ایک سینٹ بھی وصول کر سکو گے۔ تمہیں بھی اس کے لیے عدالت جانا ہو گا۔" رون غرا کر بولی۔ وہ اس وقت ذرا بھی خوب صورت نہیں لگ رہی تھی۔

"مجھے فیس کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔ اسے عقب سے میاں بیوی کے زور و شور سے جھگڑنے کی آواز آرہی تھی۔ اس نے باہر آکر افسوس سے سر ہلایا اور سوچا کہ یہ عورت کسی کو بھی خودکشی کرنے پر مجبور کر سکتی ہے۔ اچھا تھا کہ مائیکل جلد از جلد اسے طلاق دے کر چھٹکارا پا لے۔ ویسے جیسن نے اسے صحیح راستہ دکھا دیا تھا اور اسے امید تھی کہ وہ اس سے خاصی رقم وصول کر کے ہی اس کی جان چھوڑے گا۔

وہ واپس دفتر آیا تو رات ہونے والی تھی۔ اوپری منزلوں کے اکثر دفاتر خالی ہو چکے تھے اور اس کے آس پاس چند ایک دفتروں میں روشنیاں ہو رہی تھیں۔ اس نے اندر آکر روشنی نہیں کی۔ وہ جاتے ہوئے کھڑکی کھلی چھوڑ گیا تھا۔ اس سے بہت تیز ہوا اندر آرہی تھی اور کمرے میں کاغذات بکھرے ہوئے تھے مگر اس نے انہیں سمیٹنے کی کوشش نہیں کی اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ مائیکل اور اس کی بیوی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے مائیکل کی سوچ پلٹ دی تھی۔ وہ اس کام کا ماہر تھا۔ اس نے اپنے دس سالہ کیریئر میں بے شمار لوگوں کو اسی طرح خودکشی سے باز رکھا تھا اور اس نے جن لوگوں کو باز رکھا تھا ان میں سے شاذ ہی کسی نے بعد میں خودکشی کی۔

ایک ماہر کی حیثیت سے وہ ان تمام وجوہات سے واقف تھا جو انسان کو خودکشی کی منزل کی طرف لے جاتی ہیں۔ ان میں سرفہرست وجہ ناکامی تھی۔ چاہے وہ مالی ناکامی ہو، یا صنفِ مخالف کے معاملے میں ناکامی... یا پھر صحت کی ناکامی۔ جیسن کے تجربے کے مطابق آج کل خودکشی کی سب سے بڑی وجہ مالی ناکامی تھی کیونکہ اس مادہ پرست دور میں ہر چیز کا انحصار دولت پر ہو گیا تھا۔ اگر کسی کے پاس دولت تھی تو وہ اپنی من پسند عورت بھی حاصل کر سکتا تھا اور صحت بھی حاصل

www.pkdigest.com

کر سکتا تھا۔ اور جو لوگ دولت کی پروا کرتے ہیں، وہ کسی اور چیز کی اتنی پروا نہیں کرتے۔ اس لیے ان میں خودکشی کی سب سے بڑی وجہ مالی تنگ دستی ہوتی ہے۔ جیسن کا تجزیہ تھا کہ ایسے لوگوں کو خودکشی سے روکنا سب سے مشکل کام ہوتا ہے کیونکہ وہ دولت کے اتنے عادی ہو چکے ہوتے ہیں کہ اس کے بغیر رہ نہیں سکتے۔

جب جیسن کی پہلی شادی ناکام ہوئی تھی تو اس نے خاص اثر نہیں لیا تھا۔ ایک ماہر نفسیات کے طور پر اس نے خود کو سمجھا لیا تھا کہ شادی ناکام ہونا کوئی اتنی اہم بات نہیں ہے جبکہ دوسری عورت ہر وقت دستیاب ہوتی ہے۔ اس کے لیے دوسری شادی کرنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ خوش شکل تھا۔ دولت مند تھا۔ اسے دوسری شادی کرنے میں کوئی مشکل نہیں ہوئی تھی۔ اس کی دوسری بیوی پہلی سے بھی زیادہ حسین اور طرحدار تھی۔ وہ اس کے ساتھ جب کہیں جاتا تو لوگ اسے ہی دیکھتے رہ جاتے تھے اور اس وقت وہ بہت فخر محسوس کرتا تھا۔ مگر شادی کے چند سال بعد اس سے بھی اختلاف شروع ہو گئے اور معاملہ طلاق پر جا کر ختم ہوا۔ اس وقت جیسن نے پہلی بار اپنے اندر بے چینی محسوس کی تھی۔ تین سال کے اندر اس کی یہ دوسری شادی ختم ہوئی تھی۔

اس وقت وہ دونوں ہاتھوں سے دولت کما رہا تھا۔ مگر دوسری شادی کی ناکامی نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ اس کا اثر اس کے کام پر بھی پڑا اور وہ پہلے جیسی دل جمعی سے کام نہیں کر پا رہا تھا۔ اس کے بعد اس کے دو کیسز خراب ہوئے اور وہ دونوں افراد کو خودکشی سے بچانے میں ناکام رہا تھا۔ ان میں ایک ہالی ووڈ کی معروف اداکارہ تھی۔ وہ مجنوں اور فلموں کی ناکامی سے اتنی پریشان تھی کہ اس نے خودکشی کی کوشش کی اور اس میں بھی ناکام رہی۔ اس کے بعد اس نے جیسن سے رابطہ کیا تھا۔ جیسن نے اداکارہ کا علاج شروع کیا تھا کہ اس نے خودکشی کی دوسری کوشش کی اور اس بار کامیاب رہی۔ نہ جانے یہ بات کس طرح میڈیا تک جا پہنچی کہ اس کا علاج جیسن کر رہا تھا۔ اداکارہ کی خودکشی کا ذمے دار اسے قرار دیا گیا تھا۔ اس کے بعد جیسن کا زوال شروع ہو گیا۔

دو سال پہلے یہ حال تھا کہ منہ مانگی فیس کے باوجود اس کے پاس نئے مریضوں کو دینے کے لیے وقت نہیں ہوتا تھا اور بہت سارے لوگوں کو اسے انکار کرنا پڑتا تھا۔ مگر اس واقعے کے بعد اس کے پاس آنے والوں کی تعداد گھٹنے لگی تھی۔ پھر ایک صنعت کار کا واقعہ پیش آیا اور اس نے جیسن سے علاج کے دوران ہی خودکشی کر لی اور اس کے وارثوں نے جیسن کے خلاف مقدمہ کر دیا۔ اگرچہ عدالت نے چند ساعتوں کے بعد کیس خارج کر دیا تھا مگر جیسن کی جتنی شہرت ہونا تھی، وہ ہو چکی تھی۔ اس کے بعد اس کے کلائنٹس کی تعداد اتنی تیزی سے کم ہوئی تھی کہ وہ چند مہینوں کے اندر فارغ ہو گیا تھا۔ حد یہ کہ جن لوگوں نے پہلے سے اپائنٹ منٹ لے رکھے تھے انہوں نے بھی اپنے اپائنٹ منٹ منسوخ کرا دیے۔ آج پورے بیس دن بعد اس سے کسی نے رجوع کیا تھا اور اس کا بھی اسے کوئی صلہ نہیں ملا تھا۔ آخر میں وہ فیس کے بجائے گالیوں کا تحفہ لے کر رخصت ہوا تھا۔

اس نے اپنی محنت سے کمائی ہوئی دولت کو ایک ایسی کمپنی میں لگا دیا تھا جو جعلساز تھی اور اس نے ایک فرضی سونے کی کان کے حصص بیچے تھے۔ ان دنوں سونے کی قیمت بہت تیزی سے اوپر جا رہی تھی اور اسے یقین دلایا گیا تھا کہ چند مہینوں میں حصص کی قیمت دگنی سے زیادہ ہو جائے گی۔ مگر اس کے بجائے کمپنی کے مالکان ہی غائب ہو گئے تھے اور جن لوگوں نے اس کے حصص خریدے، ان حصص کی حیثیت کاغذ کے ٹکڑوں کی سی رہ گئی تھی۔ اب اس کے پاس کچھ نہیں رہا تھا۔ اس کے اوپر دفتر کا کرایہ واجب الادا ہو گیا تھا اور دوسرے بھی کئی افراد عنقریب اس کے دفتر اور گھر کا چکر لگانا شروع کر دیتے۔ چیک کا وہ ایک مقروض تھا۔ اس کے ذمے اتنی بڑی رقم کا قرض ہو گیا تھا کہ اسے ادا کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔

وہ کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ نیچے سڑک سے گزرنے والی گاڑیوں کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ البتہ سناٹا پہلے سے زیادہ ہو گیا تھا۔ ہوا کی تندی کے باوجود سناٹے میں کمی نہیں آئی تھی۔ اس نے گہری سانس لی۔ وہ آج تک لوگوں کو سمجھاتا آیا تھا اور انہیں خودکشی سے روکتا آیا تھا کیونکہ وہ ان کی نفسیات سمجھ جاتا تھا اور اکثر اپنے مقصد میں کامیاب رہتا تھا۔ مگر آج جب اس پر برا وقت آیا تھا تو وہ خود کو سمجھانے میں ناکام رہا تھا۔ اس نے خودکشی کا سوچا... کیونکہ اس کے خیال میں اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ اس نے ایک اور گہری سانس لی۔ اس نے سوچا۔ میں آج تک دوسروں کو سمجھاتا آیا ہوں۔ لیکن اس کیفیت میں آدمی پر کیا گزرتی ہے، اس کا مجھے اب پتا چلا ہے۔ ایسی زندگی سے تو موت بہتر ہے۔

اس نے خود سے کہا اور کھڑکی پر چڑھ کر نیچے چھلانگ لگا دی۔ اسے معلوم تھا کہ اسے بس چند سیکنڈ کی اذیت اٹھانی پڑے گی۔

اور میرے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ اول درجے کا بددیانت اور رشوت خور تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ آج کے دور میں دیانت دار اور سیدھا انسان کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔

ولسن میری عمر کا تھا... مارٹن سب سے بڑا تھا اور پروفیسر اوبرائن، مارٹن سے چھوٹا تھا۔ مارٹن بیچ تھا۔ ہم چاروں ایک ہی علاقے کے رہنے والے تھے۔ یہ پسماندہ بستی تھی جہاں کے رہنے والے نوجوان بدقماش اور جارح مزاج تھے۔ وہ زمانے سے زبردستی اپنا حق وصول کرنے کی باتیں کرتے تھے۔

جج مارٹن بھی بے ایمانی سے ترقی کر کے اس عہدے تک پہنچا تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی انصاف نہیں کیا تھا۔ جو پارٹی

ایک بوڑھے آدمی کی عقل مندی جس نے بچاؤ کے لیے ایک انوکھا طریقہ سوچ لیا تھا

ہر شخص چاہتا ہے کہ اس سے منسلک رشتے ہمیشہ پائیدار بنیادوں پر استوار رہیں ...ایک باپ کی مشکلات و تکالیف کا احوال ... وہ اپنی بیٹی کے لیے ایک خوبصورت مستقبل کا خواہاں تھا ...مگر حالات و واقعات اس کے اس خواب کو برباد کر دینا چاہتے تھے۔

سزا

ثمر عباس

www.pkdigest.com

اس کی جیب گرم کردیتی، وہ فیصلہ اس کے حق میں دے دیتا تھا اسی لیے وہ ترقی کرتے کرتے پسماندہ علاقے سے شہر کے وسط میں آچکا تھا۔ اب اس کے پاس سب کچھ تھا۔ مال دولت، بنگلا، کار، عیش وآرام۔

ولسن بھی پرلے درجے کا بدعنوان پولیس افسر تھا۔ فرض شناسی اس میں نام کو بھی نہیں تھی۔ اس کے کام کرنے کا انداز دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے وہ دنیا سے کوئی انتقام لے رہا ہے۔ پولیس کیپٹن ایک ذمے دار آفیسر ہوتا ہے مگر ولسن اس عہدے سے بھرپور ذاتی فائدہ اٹھا رہا تھا۔ اس کے انڈرورلڈ والوں سے گہرے مراسم تھے۔ وہ کہتا تھا کہ کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ دنیا کی کوئی عدالت مجھے سزا نہیں دے سکتی۔ جج مارٹن بھی چونکہ اسی کے مزاج کا اور اسی کے گروپ کا آدمی تھا اس لیے اسے اس کی سرپرستی بھی حاصل تھی۔

اوبرائن ویسے تو کالج میں پروفیسر تھا اور اسٹوڈنٹس کو قانون کی تعلیم دیتا تھا مگر تعلیم کے نام پر وہ انہیں بگاڑ رہا تھا۔ بدعنوان بنا رہا تھا اور اس کی تعلیم کے باعث معاشرے میں اچھے اور کارآمد انسان پیدا ہونے کے بجائے سرکش اور باغی پیدا ہو رہے تھے۔ ان سب کے درمیان میں بالکل مس فٹ تھا۔ چونکہ میں دیانت دار تھا اور فرض شناسی کا مظاہرہ کرتا تھا اس لیے مجرم میرے ہاتھ سے نہیں بچتے تھے۔ میں مجرموں کو پکڑتا اور عدالت میں پیش کرتا مگر اوبرائن ان مجرموں کا وکیل بن کر عدالت میں آتا اور انہیں مظلوم قرار دیتا، ان کی بے گناہی اور معصومیت کے فرضی قصے بیان کرتا۔ جج مارٹن انسانی حقوق کے نام پر مختلف قوانین کا سہارا لے کر ان مجرموں کو رہا کردیتا اور اس طرح میری محنت اکارت چلی جاتی۔

اگر کبھی میری وجہ سے کسی مجرم کو تھوڑی بہت سزا ہو بھی جاتی تو ان کی مدد کے لیے جیل میں، پولیس اسٹیشن میں ہر جگہ لوگ موجود تھے۔ کیپٹن ولسن ایسے مجرموں کی مدد کرتا اور انہیں جیل میں بھی گھر جیسی ہر آسائش اور سہولت فراہم کرتا تھا۔ اسی لیے میں نے ابتدا میں کہا تھا کہ ہم چاروں ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے ہیں اور چاہتے ہوئے بھی الگ نہیں ہو سکتے۔ قانون کی اس پامالی اور اپنی محنت رائگاں جانے پر مجھے بہت افسوس ہوتا تھا مگر میں کر بھی کیا سکتا تھا؟ اپنی حد سے آگے تو نہیں جا سکتا تھا۔ اس حد میں رہ کر ہی اپنا فرض ادا کر سکتا تھا۔ وہ میں کر رہا تھا۔

میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ جج مارٹن کی شکل دیکھوں یا اس کی عدالت میں حاضر ہوں مگر میں مجبور تھا۔ قانون کے رکھوالے کے نام پر وہ جس طرح قانون کی دھجیاں اڑا رہا تھا اس پر میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ میں اس پروفیسر اوبرائن سے بھی نفرت کرتا تھا اور ولسن کے نام سے تو مجھے چڑ ہو گئی تھی مگر میرے کام کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ دن میں متعدد بار میرا ان لوگوں سے نہ صرف سامنا ہوتا تھا بلکہ واسطہ پڑتا تھا اور میرا کام انہی لوگوں کے توسط سے آگے بڑھتا تھا۔

ایک روز گرینڈ جیوری نے مجھے عدالت میں طلب کیا۔ مجھے کسی کیس کے سلسلے میں بیان دینا تھا۔ ہوا یوں تھا کہ عدالت میں ایک سال پرانا کیس دوبارہ کھل گیا تھا۔ ایک سال پہلے مسٹر اور مسز مائیکل کے گھر میں ڈاکا پڑا تھا۔ ڈاکوؤں نے ان دونوں میاں بیوی پر بے حد تشدد کر کے ان سے تجوری کا کوڈ نمبر معلوم کیا تھا اور ان کی تجوری صاف کردی تھی جس میں نقدی، پرائز بانڈز، سیونگ سرٹیفکیٹس کے علاوہ ہزاروں ڈالرز کی جیولری بھی تھی۔ ڈاکوؤں نے کچھ بھی نہیں چھوڑا تھا۔ ان میاں بیوی کی تجوری میں جھاڑو پھیردی تھی مگر ان کی تمام جیولری بیمہ شدہ تھی۔ جب پولیس نے چوری شدہ جیولری کی فہرست بنائی تو اس کی آنکھیں کھل گئیں۔

اس کام میں، میں بھی شامل تھا۔ میرے ساتھ کیپٹن ولسن اور اس کا ماتحت بھی تھا۔ ہم تینوں نے تمام مسروقہ اشیا کی فہرست تیار کی تھی۔ مسٹر اور مسز مائیکل کی حالت خراب تھی۔ وہ دونوں اس قدر زخمی ہو گئے تھے کہ انہیں اسپتال میں داخل کرنا پڑ گیا تھا۔ پھر بھی انہوں نے یاد کر کے ہمیں فہرست بنوادی تھی۔ اسی دوران مسز مائیکل نے یہ انکشاف کیا تھا کہ انہوں نے کچھ جیولری احتیاطاً جوتے کے ایک ڈبے میں ڈال دی تھی اور دو کنگن گملے میں پلاسٹک کی تھیلی میں ڈال کر دبا دیے تھے۔ یہ اچھا ہی ہوا... مسز مائیکل کی اس ہوشیاری سے یہ چیزیں بچ گئی تھیں ورنہ ڈاکو انہیں بھی لے جاتے۔

میں نے، ولسن نے اور اس کے ماتحت نے دو فہرستیں تیار کی تھیں جس میں سے ایک فہرست میں وہ اشیا درج کی گئی تھیں جو چوری ہو گئی تھیں اور دوسری فہرست میں بچ جانے والی اشیا لکھی گئی تھیں جن میں سونے کے بیش قیمت کنگن بھی شامل تھے۔ ظاہر ہے ان چوری شدہ اشیا کا کوئی پتا نہیں چل سکا اور نہ ہی وہ ڈاکو پکڑے گئے۔ پکڑے بھی کیسے جاتے؟ ان کی سرپرستی مارٹن، ولسن اور اوبرائن جیسے لوگ جو کر رہے تھے۔ "رات گئی بات گئی" والا معاملہ تھا۔ سال بھر کی تفتیش کے بعد اس کیس کی فائل بند کردی گئی۔

مسٹر اور مسز مائیکل کے وہ زیورات چونکہ بیمہ شدہ تھے اس لیے انہوں نے انشورنس کمپنی سے رابطہ کیا۔ انشورنس والے ہر معاملے کی پوری تحقیق کرتے ہیں۔ وہ اس کیس کی چھان بین کر رہے تھے کہ ان کے ہائر کیے گئے ایک پرائیویٹ

سراغ رساں نے کوئی نئی بات معلوم کی اور اس کے بعد وہ کیس دوبارہ کھل گیا۔ عدالت نے اسی ضمن میں مجھے طلب کیا تھا۔ لہٰذا میں عدالت میں موجود تھا۔

ایک وکیل نے جج مارٹن کی اجازت سے مجھے ایک چھوٹا سا بکس دیا اور اسے کھولنے کو کہا تو میں نے کھول دیا۔ اندر سے دو نہایت عمدہ اور ایک جیسے کنگن نکلے جنہیں دیکھ کر ایک لمحے کو میں بھی حیران رہ گیا۔ وہ بے حد خوب صورت کنگن تھے جن میں بڑے اور قیمتی نگینے جڑے ہوئے تھے۔ میں سوچنے لگا کہ میں نے انہیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے... پھر مجھے سب یاد آگیا۔

میں نے وکیل کی طرف رخ کر کے کہا۔ "یہ وہ کنگن ہیں جو سال بھر پہلے ہمیں مسٹر اور مسز مائیکل کے گھر سے ملے تھے۔ ڈاکو ان کی ساری جیولری لے گئے تھے مگر یہ کنگن مسز مائیکل نے چونکہ ایک پلاسٹک کی تھیلی میں ڈال کر گملے میں دبا دیے تھے اس لیے یہ بچ گئے تھے۔"

"ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر وکیل نے جج مارٹن کی طرف گھوم کر کہا۔ "مائی لارڈ! سارجنٹ میٹ نے یہ کنگن پہچان لیے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ یہ کنگن چوری ہونے سے بچ گئے تھے جبکہ میں آپ کی خدمت میں جو فہرست پیش کر رہا ہوں اس میں یہ کنگن چوری ہونے والی اشیا کی فہرست میں درج ہیں۔"

یہ کہہ کر وکیل نے وہ فہرست جج کے سامنے رکھ دی۔ جج نے اس فہرست پر نظر ڈالی۔ پھر وہ فہرست میرے سامنے لائی گئی اور میں نے واضح طور پر دیکھ لیا کہ جو فہرست میں نے کیپٹن ولسن اور اس کے ساتھی کے ساتھ مل کر تیار کی تھی یہ وہ فہرست نہیں تھی... یہ دوسری فہرست تھی جس میں ان تمام اشیا کو بھی چوری شدہ ظاہر کیا گیا تھا جو ہمیں مسٹر اور مسز مائیکل کے گھر سے ان کے گملے اور جوتے کے ڈبے سے ملی تھیں۔ یہ دیکھ کر میرا سر چکرا گیا۔ میں نے بے بسی سے وکیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ایسا لگ رہا ہے جیسے کسی نے یہ فہرست بدل دی ہے۔"

"مائی لارڈ!" وکیل نے جج مارٹن کی طرف گھوم کر کہا۔ "اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کیپٹن ولسن اور اس کے ساتھی نے یہ فہرست بدل دی اور غیر مسروقہ اشیا بھی چوری شدہ ظاہر کر کے خود ہڑپ کرلیں۔ بعد میں اس نے اپنی کسی دوست کو یہ کنگن تحفے میں دے دیے... یہ سوچ کر کہ اب اسے کون دیکھے گا... مگر انشورنس کمپنی کے پرائیویٹ سراغ رساں نے اصل بات کا کھوج لگا لیا۔ اب یہ فہرست بھی آپ کے سامنے ہے اور یہ کنگن بھی۔ آپ فوراً ملزم کیپٹن ولسن کی گرفتاری کے احکامات جاری کریں تاکہ قانون کے تقاضے پورے کیے جا سکیں اور حق دار کو اس کا حق مل سکے۔"

میں کیپٹن ولسن کو خوب جانتا تھا۔ وہ بدعنوان تو تھا ہی... انڈرورلڈ والوں سے بھی اس کے تعلقات تھے جس کی بنیاد پر قانون شکنی کو اس نے اپنا حق سمجھ لیا تھا۔ اس نے چوری کا نہایت آسان طریقہ اختیار کیا تھا اور بہتی گنگا میں اس طرح ہاتھ دھوئے تھے کہ ان کنگنوں پر ہاتھ صاف کر کے وہ جرم سابقہ ڈاکوؤں کے کھاتے میں ڈال دیا تھا اور خود صاف بچ گیا تھا۔ مگر ایک مشکل یہ تھی کہ جب ولسن نے وہ فہرستیں تیار کی تھیں جس میں چوری شدہ اور بچ جانے والی اشیا کا اندراج کیا تھا تو اس وقت اس کے ساتھ اس کے ماتحت کے علاوہ میں بھی تھا۔

عدالت مجھے بھی مشتبہ سمجھ رہی تھی اور اس بدعنوانی میں کیپٹن ولسن کا ساتھی گردان رہی تھی۔ یہی چیز مجھے پریشان کر رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ جب میں عدالت میں تھا تو لوگ عجیب عجیب نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے اور جب میں باہر نکلا تو بھی کئی افراد نے میری طرف اشارے کر کے سرگوشیاں کی تھیں۔ اگر میں بدعنوان یا راشی یا بددیانت ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی مگر میں ایک فرض شناس اور ایمان دار سارجنٹ تھا اس لیے لوگوں کی نظریں اور ان کے مشتبہ اشارے میری روح کو زخمی کیے دے رہے تھے۔ میں

بطور خاص خواتین کیلئے

اب آپ کو بار بار تھریڈنگ یا ویکسنگ کی ضرورت نہیں

SHINE ON STRIPS

چہرے، کلائیوں، پنڈلیوں کے فاضل بالوں کو ہمیشہ کیلئے ختم کرنے کا ایک بہترین ٹریٹمنٹ ہے اسکا استعمال

چہرے کے کیل مہاسوں داغ دھبوں کو بھی دور کرتا ہے۔ چہرے کیلئے قیمت 450 روپے دیگر حصوں کے بالوں کیلئے قیمت 1350 روپے معہ ڈاک خرچ 50 روپے علاوہ گھر بیٹھے ایک خط لکھ کر وی پی پارسل طلب فرمائیں یا E-MAIL کریں۔

fairy.perfumers@hotmail.com

بے اولاد خواتین کیلئے خوشخبری

فیری پرفیومرس پوسٹ بکس نمبر 2209 کراچی۔ 74600

وہاں سے جلدی جلدی قدم اٹھا کر دور چلا جانا چاہتا تھا۔

☆☆☆

جب میں پولیس اسٹیشن پہنچا تو مجھ سے پہلے یہ خبر وہاں پہنچ چکی تھی۔ میرے ایک ساتھی سارجنٹ ڈان نے مجھے روک کر کہا۔ ''سارجنٹ میٹ! کیپٹن ولسن تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ جاؤ جا کر اس سے مل لو۔''

میں اس کی طرف گیا۔ وہ اپنے ایک ساتھی کے ساتھ عقبی کمرے میں بیٹھا تھا جہاں زیادہ تر کاٹھ کباڑ ابھرا ہوا تھا۔

''میٹ! سنا ہے کہ.....'' ولسن نے کہنا شروع کیا تو میں نے اس کی بات کاٹ دی اور بوجھل آواز میں کہا۔

''کیپٹن! تم خطرے میں ہو... تم پھنس چکے ہو۔'' اس کے بعد میں نے اسے تفصیل سے پوری کہانی سنا دی۔

چند لمحوں تک وہ خاموش رہا پھر اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ سچ ہے کہ میں نے وہ نگن اپنی ایک محبوبہ کو تحفے میں دیے تھے۔ ظاہر ہے میں اس سے یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ انہیں چھپا کر رکھے، کسی کے سامنے نہ پہنے۔ اس سے وہ میری طرف سے مشکوک ہو جاتی۔ بس اس نے وہ پہن لیے اور کسی نے دیکھ لیے۔ میرا خیال ہے انشورنس کمپنی کے اس سراغ رساں کی نظر ان نگنوں پر پڑ گئی، کسی نے اس کی اطلاع دے دی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ یہ بھی نہیں بتائے گی کہ اس کے پاس وہ نگنے کہاں سے آئے تھے۔''

''اب کیا ہو گا؟'' میں نے ولسن سے کہا۔ ''میرے خیال میں تو اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ تمہارے بچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی۔''

''تم میری فکر مت کرو۔'' کیپٹن ولسن نے کہا۔ ''میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ تم دیکھ لینا کہ میں صاف بچ جاؤں گا۔''

''مگر کیسے؟ معاملہ خاصا پیچیدہ ہو چکا ہے۔'' میں نے کہا۔

''تم پروفیسر اوبرائن کو جانتے ہو۔ وہ کتنا اچھا اور ماہر وکیل ہے۔ ہم اسے اپنے تحفظ کے لیے بھاری رقوم دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ جج مارٹن کے اور اوبرائن کے بہت اچھے تعلقات ہیں۔ وہ اس معاملے سے خود ہی نمٹ لے گا۔ تم اپنے آپ کو ہلکان مت کرو سارجنٹ میٹ!'' یہ کہہ کر کیپٹن ولسن نے بھرپور انداز سے قہقہہ لگایا اور میں سوچنے لگا کہ اس شخص نے قانون کو اپنے گھر کی لونڈی سمجھ رکھا ہے مگر اس مرتبہ یہ قانون کے شکنجے سے بچ نہیں سکے گا۔

پولیس اسٹیشن میں میرا چیف بارٹن اپنے کمرے میں میرا منتظر تھا۔ وہ میری طرح ایمان دار اور فرض شناس انسان تھا۔ کیپٹن ولسن اس کے اندر میں نہیں آتا تھا کیونکہ اس کا تعلق اندرورلڈ کے لیے قائم کی گئی خصوصی برانچ سے تھا۔ میں اور بارٹن اندرورلڈ برانچ سے دور ہی رہتے تھے کیونکہ اس کا ہر فرد بدعنوان تھا۔ بارٹن کو بھی پوری کہانی معلوم ہو چکی تھی۔ وہ خاصا فکر مند دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ ہر بار کی طرح اس بار بھی اوبرائن مجرم کو بے قصور ثابت کر دے گا اور جج مارٹن تاریخ کا ایک اور مکروہ فیصلہ دے گا جب وہ کیپٹن ولسن کو باعزت بری کرے گا۔ یہ قانون شکنوں کا ٹولہ ہے ان سے کوئی نہیں جیت سکتا۔''

''تو پھر پولیس کی کیا ضرورت ہے؟'' میں نے تلخی سے کہا۔ ''اس شعبے کو ختم کر دینا چاہیے۔ خوامخواہ لوگوں کو غلط فہمی میں کیوں رکھا جائے کہ پولیس ان کی محافظ ہے۔''

چیف بارٹن سنجیدگی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ میرے احساسات کو خوب سمجھ رہا تھا۔ اس کے اپنے احساسات بھی مجھ سے مختلف نہیں تھے مگر وہ خود کو بے بس محسوس کر رہے تھا۔ یکایک دروازے پر دستک ہوئی اور ایک پولیس اہلکار نے اندر داخل ہو کر چیف بارٹن کو سیلیوٹ کرنے کے بعد بتایا کہ جج مارٹن اس سے ملنے آیا ہے۔ یہ سنتے ہی بارٹن مستعد ہو گیا چند لمحوں بعد جج اندر داخل ہوا۔ اس کے جسم پر انتہائی بیش قیمت لباس تھا۔ آنکھوں پر سونے کے فریم والی عینک تھی۔ کلائی میں جو گھڑی تھی اس میں بیش قیمت جواہرات جگمگا رہے تھے۔ اس کے ہر انداز سے دولت اور اقتدار کا اظہار ہو رہا تھا۔

جج نے چیف بارٹن سے ہاتھ ملانے کے بعد مجھ سے بھی ہاتھ ملایا۔ تھوڑی دیر وہ خاموش رہا۔ ہم دونوں اس کے بولنے کے منتظر تھے۔ اس نے نپے تلے الفاظ میں کہا۔ ''میں سیدھی سیدھی بات کروں گا۔ ہم تینوں ایک دوسرے کو طویل عرصے سے جانتے ہیں اور ایک دوسرے کو خوب سمجھتے بھی ہیں۔ تم لوگ نہ جانے کیا سوچ رہے ہو گے کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں مگر میں اس لیے نہیں آیا ہوں جو تم سمجھ رہے ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں تم لوگوں سے زیادہ حقائق کو جانتا ہوں۔ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ہم کیپٹن ولسن اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کرنے جا رہے ہیں۔''

یہ کہہ کر وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ میں اور بارٹن اس کے بولنے کے منتظر تھے اور اس کی طرف ہی متوجہ تھے۔ پھر اس نے کہا۔ ''میں تم سے صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ کیپٹن ولسن کو بچانا نہیں چاہیے۔''

یہ سنتے ہی میں اور بارٹن ہونقوں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

''ظاہر ہے تمہیں توقع نہیں ہو گی کہ میں تم سے اس قسم کی بات کروں گا۔'' جج مارٹن نے ہماری حیرت کو سمجھتے ہوئے کہا۔

"تم اس بدمعاش ولسن کے خلاف مضبوط کیس تیار کرو اور تمام ضروری اور ٹھوس شہادتیں ڈھونڈو تاکہ اس کے بچنے کا کوئی امکان نہ رہے اور وہ بہرصورت سزا پائے۔"

ہم دونوں ابھی تک حیران تھے اور یہ سمجھ رہے تھے کہ مارٹن ہم سے مذاق کر رہا ہے مگر وہ بے حد سنجیدہ تھا اور کہہ رہا تھا۔ "میں تم جیسے دیانت دار پولیس افسران کی قدر کرتا ہوں اور بدعنوان اور راشی افسران سے شدید نفرت کرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کیس میں انصاف کے تمام تقاضے پورے کیے جائیں اور کوئی کسر نہ چھوڑی جائے۔ میرا خیال ہے کہ تم میری بات کو سمجھ چکے ہو۔"

"جی۔" چیف بارٹن نے آہستہ سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

جج مارٹن کے جانے کے بعد کافی دیر تک ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ آج ہم نے جج کا ایک نیا اور بدلا ہوا روپ دیکھا تھا اسی لیے ہمیں یقین نہیں آ رہا تھا۔

"مجھے جج کی بات کا یقین نہیں ہے۔" آخر بارٹن نے کہا۔

"مجھے بھی۔" میں نے کہا۔ "کیپٹن ولسن کے جج مارٹن سے کافی پرانے تعلقات ہیں۔ وہ ہم نوالہ اور ہم پیالہ ہیں۔ آخر ایسی کیا بات ہوگئی کہ جج اس سے دشمنی پر اتر آیا ہے؟"

"مدر مرفی سے رابطہ کرو۔" چیف بارٹن نے کہا تو میں نے جلدی سے ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ مدر مرفی ایک بوڑھی عورت تھی جسے ہم لوگ شہر بھر کی دائی کہتے تھے۔ اس کے پاس ہر سوال کا جواب ہوتا تھا۔ وہ پولیس کی بہت بڑی مخبر تھی۔ میں نے اس کا نمبر ملا کر ریسیور چیف کی طرف بڑھا دیا۔

تھوڑی دیر مدر مرفی سے بات کرنے کے بعد بارٹن نے سلسلہ منقطع کر دیا اور سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "اچھا تو یہ معاملہ ہے۔ اس بار ولسن نے جج کے گھر میں ڈاکا ڈالا ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے چونک کر سوال کیا۔

"کیپٹن ولسن جج مارٹن کی بیٹی روتھ کے ساتھ چکر چلا رہا ہے۔ وہ دونوں شادی کرنا چاہتے ہیں جبکہ جج اس سے شادی کا شدید مخالف ہے۔" چیف بارٹن نے جواب دیا۔

"اوہ..." میں نے کہا۔ "کیپٹن ولسن کتنا بڑا فراڈ ہے یہ بات جج مارٹن سے بہتر اور کون جان سکتا ہے۔ وہ ولسن کا کچا چٹھا جانتا ہے اسی لیے اپنی بیٹی کا ہاتھ ایک بدمعاش کے ہاتھ میں ہرگز نہیں دے گا جبکہ ولسن نے روتھ کو اپنی محبت کے جال میں پھانس لیا ہوگا اور وہ اس کا دم بھرتی ہوگی۔ یہ بات.... مارٹن کو بھی گوارا نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے مارٹن نے یہ چکر چلوا دیا ہے کہ ولسن کا کیس کھلوا دیا۔ اس سے ایک طرف تو ولسن کے اصل چور کا پتا لگ جائے گا اور دوسرے روتھ کو بھی ولسن کا اصل چہرہ نظر آ جائے گا اور وہ اس سے نفرت کرنے لگے گی وہ جسے اپنا جیون ساتھی بنانا چاہتی تھی۔"

"مگر جج کی پلاننگ کچھ اس طرح کی ہے کہ ولسن گرفتار ہو جائے اور جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا جائے۔" بارٹن نے کہا۔ "فی الحال تو روتھ کی بات اس فراڈ سے چھٹ جائے گی مگر بعد میں جب اس کی سزا مکمل ہو جائے گی تو جج کوئی اور ترکیب سوچے گا تاکہ ولسن کو جیل سے باہر نہ آنے دے۔" یہ کہہ کر بارٹن خاموش ہو گیا۔

دوسرے روز گرینڈ جیوری نے ایک خصوصی سیشن منعقد کیا جس میں کیپٹن ولسن کا کیس پیش کیا گیا۔ ولسن اپنے وکیل اوبرائن کے ساتھ آیا تھا۔ اس نے آتے ہی ایک درخواست جمع کرا دی تھی کہ وہ اس کیس کے ممکن میں عدالت کے سامنے ایک خصوصی بیان حلفی دینا چاہتا ہے جس کی اسے اجازت مل گئی۔ اس کے بعد ولسن اور اس کا وکیل اوبرائن لگ بھگ چار گھنٹے تک جیوری کے سامنے حاضر رہے جب وہ باہر آئے تو اوبرائن غیر معمولی طور پر خوش نظر آ رہا تھا۔ وہ کیوں خوش تھا؟ اس کی وجہ نہ میں جان سکا اور نہ میرا لباس بارٹن اس حوالے سے کچھ معلوم کر سکا۔

ایک گھنٹے بعد ہمیں اندر کے ایک آدمی نے آ کر بتایا کہ کیپٹن ولسن نے اپنے تمام جرائم کا اعتراف کر لیا ہے۔ اس نے وہ تمام تاریخیں بھی بتا دیں جب اس نے وہ کنگن اور دوسرے زیورات مسز مائیکل کے گھر سے اڑائے تھے۔ وہ تاریخیں بھی بتا دیں جس میں اس نے کاغذات تبدیل کیے تھے اور مکمل تفصیل چنوں کے ساتھ بیان کر دی تھی جیسے کوئی رپورٹر اپنے اخبار کے لیے اسٹوری تیار کرتا ہے۔ اس نے اپنے اسکواڈ کے دو لڑکوں کو بھی اس کام میں شامل کیا تھا اور انہیں اس کام کا معاوضہ بھی دیا تھا۔ اس نے ان دونوں کے نام بھی بتا دیے تھے۔ اس طرح اعتراف کرنے کے بعد اس نے اپنی جان بچالی تھی اور ریاستی قانون کے مطابق اب اسے کوئی بھی سزا نہیں دے سکتا تھا۔

"ایسا تو نہیں کہ اس نے عدالت سے کوئی ڈیل کر لی ہو؟" چیف بارٹن نے مجھ سے کہا۔ پھر اس نے خود ہی اپنا یہ خیال رد کر دیا اور کہا۔ "یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ جج مارٹن پھر اہوا ہے۔" ویسے یہ بات اوبرائن اور کیپٹن ولسن کے مزاج کے خلاف تھی کہ ان دونوں نے اتنی آسانی سے ہار مان لی تھی اور اپنے جرائم کا اعتراف کر لیا تھا۔

"چیف!" میں نے بارٹن سے کہا۔ "ولسن ناقابلِ اعتبار آدمی ہے۔ جب اس کی گردن پھنستی ہے تو وہ زبان سے جج اگل دیتا ہے اور دوسروں کو پھنسوا دیتا ہے۔"

"ویسے اگر کیپٹن ولسن چاہتا تو صاف انکار بھی کر سکتا تھا۔" چیف بارٹن نے کہا۔ "وہ کہہ دیتا کہ اس نے یہ کنگن کبھی نہیں دیکھے۔"

"اس صورت میں وہ پھنس جاتا۔" میں نے کہا۔ "اصل بات یہ ہے کہ جس نے بھی وہ سونے کے کنگن عدالت میں پیش کیے ہیں اسے اس عورت کو بھی عدالت میں پیش کرنا چاہیے تھا جس کے پاس سے وہ برآمد ہوئے ہیں۔ اگر وہ عورت ابھی تک سامنے نہیں آئی ہے تو اب اسے آنا ہوگا۔ وہ زیادہ دیر تک چھپی نہیں رہ سکتی۔"

"ہاں... یہ تو ہے۔" چیف بارٹن نے کہا۔ "اگر وہ عورت عدالت میں آ گئی تو بچ اگلے دے گی۔ پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا اور ساری بات کھل کر سامنے آ جائے گی۔"

"مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ جج کیپٹن ولسن کو سزا دلوانا چاہتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اس نے ہم سے جس طرح کی باتیں کی ہیں اور جس طرح روتھ اور ولسن کے عشق کے چرچے گلی گلی ہو رہے ہیں، اس کے بعد جج سے رحم کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔"

میں جج مارٹن کو بھی جانتا تھا اور کیپٹن ولسن کو بھی۔ وہ دونوں ہی ضدی اور اڑیل تھے۔ ان میں ہمدردی یا رحم نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ جج سخت مزاج انسان تھا۔ وہ اپنی بیٹی کو ایک رشوت خور پولیس افسر کے حوالے نہیں کر سکتا تھا۔ ویسے بھی وہ کیپٹن ولسن کی حرکتوں سے خوب واقف تھا۔

ادھر روتھ بھی کم نہیں تھا۔ وہ کسی قیمت پر بھی روتھ کو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ وہ بہرصورت اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ مجھے نہ جج سے کوئی ہمدردی تھی اور نہ ولسن سے۔ وہ دونوں ہی اپنے کردار کے باعث قابلِ نفرت بن چکے تھے۔ مگر میں اس صورتِ حال پر آنکھیں بند نہیں کر سکتا تھا اور ان دونوں کو ہی ان معاملات میں قانون شکنی کی اجازت نہیں دے سکتا تھا اسی لیے میں کچھ نہ کچھ کرنا چاہتا تھا۔

اگلے روز گرینڈ جیوری نے کیپٹن ولسن پر فردِ جرم عائد کر دی مگر اوبرائن اس کی ضمانت قبل از گرفتاری کے کاغذات پہلے ہی تیار کرا چکا تھا لہٰذا وہ اطمینان سے چلا گیا۔ اگلے روز صبح کے وقت اوبرائن اور ولسن جج مارٹن سے ملنے اس کے دفتر میں گئے۔ وہ دونوں جج کے چیمبر میں لگ بھگ آدھے گھنٹے تک رہے۔ جب ولسن باہر آیا تو اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا اور آنکھیں آگ اگل رہی تھیں۔ اوبرائن اسے تسلی دینے اور ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا مگر اس وقت میں حیران رہ گیا جب جج کی سیکریٹری نے مجھے یہ اطلاع دی کہ مجھے جج نے اپنے چیمبر میں طلب کیا ہے۔ میں سیدھا اس کے چیمبر میں چلا گیا۔ جج مارٹن بے حد پریشان لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ میں نے آج سے پہلے جج کو کبھی اتنا دل شکستہ نہیں دیکھا تھا۔

"میٹ! مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔" جج نے مجھ سے کہا۔

"میں حاضر ہوں مسٹر مارٹن!" میں نے کہا۔ "مجھے کیا کرنا ہے؟"

"کیپٹن ولسن کو پکڑ کر خوب مارو... اسے جان سے مار ڈالو۔ میں اسے مردہ دیکھنا چاہتا ہوں۔" جج نے بڑی مشکل سے کہا۔ "میرے خیال میں تم تمام حالات کو اچھی طرح جانتے اور سمجھتے ہو۔ یہ شخص میرے لیے خطرہ بن چکا ہے۔ وہ میری بیٹی روتھ کو مجھ سے چھین لینا چاہتا ہے مگر میں ایسا نہیں ہونے دوں گا... کبھی نہیں۔"

"جج صاحب! آپ اسے عدالت میں طلب کر چکے ہیں۔ اس پر فردِ جرم بھی عائد کر دی گئی ہے... اس کی ضمانت منسوخ کر دیں اور..."

"ایسا ممکن نہیں ہے..." اس نے کہا۔

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "کیوں ممکن نہیں ہے؟"

"دراصل ریاست کے قانون کے مطابق جس شخص نے اپنے جرائم کا اعتراف کر لیا ہو اور ضمانت بھی کرالی ہو اس پر مقدمہ تو چل سکتا ہے مگر اسے جیل نہیں بھیجا جا سکتا۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" میں نے کہا۔

"اس سے یہ فرق پڑے گا کہ وہ میری بیٹی روتھ سے برابر ملتا رہے گا اور اسے جی بھر کر ورغلاتا رہے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مقدمے کے دوران ہی وہ میری بیٹی کو بہکا کر اس سے شادی بھی کر لے جس کے بعد میرے ہاتھ کٹ جائیں گے اور میں اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکوں گا۔" جج مارٹن نے دکھ بھری آواز میں کہا۔ "دوسری بات یہ ہے کہ اسے کم بخت پروفیسر اوبرائن کی مدد حاصل ہے جو ایک ماہر اور ذہین وکیل ہے۔ وہ اسے کسی نہ کسی طرح چھڑا لے گا بلکہ اس پر لگے ہوئے بدنامی کے داغ بھی دھو ڈالے گا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم کسی بھی طرح اسے ہلاک کر دو۔ چاہو تو پولیس مقابلہ ظاہر کر کے اس کا قصہ پاک کر سکتے ہو۔"

"مسٹر مارٹن! مجھے تم سے پوری ہمدردی ہے مگر میں تمہارا یہ کام نہیں کر سکتا۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "اس کے بجائے تم قانون کی مدد لو اور اسے چھڑنے کی کوشش کرو۔"

"قانون اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" جج نے کہا۔ "وہ آج

www.pkdigest.com

نہیں تو کل رہا ہو جائے گا۔ میری عدالت اسے سزا دے گی تو اوپر والی عدالت اسے رہا کر دے گی۔ ہمارے قوانین میں اتنی لچک ہے کہ کسی کو اس کے کیے کی سزا نہیں دی جا سکتی۔''

''مگر میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا۔'' میں نے واضح طور پر انکار کر دیا۔

''روتھ میری زندگی کا محور ہے۔'' جج نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں تھی۔ ''تم جانتے ہو کہ اپنی بیوی کی موت کے بعد میں نے شادی نہیں کی... کیوں؟ صرف روتھ کی خاطر... مگر وہ کمینہ مجھ سے میری بچی کو چھین لینا چاہتا ہے۔ میں اس شخص کو پورے دس ہزار ڈالر انعام میں دوں گا جو ولسن کو زندہ یا مردہ میرے حوالے کرے گا۔'' اس زمانے میں دس ہزار ڈالر بہت بڑی رقم تھی۔

''جج! میں یہ بھول جاؤں گا کہ تم نے کبھی مجھ سے اس طرح کی کوئی بات کی تھی۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اجازت دو۔'' میں نے اس پر ظاہر کر دیا تھا کہ میں نے اس کی رشوت کی پیشکش کا سخت برا منایا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' جج نے کہا۔ ''تو پھر میں خود ہی اسے ہلاک کر دوں گا۔''

میں کمرے سے باہر آ گیا۔ میں جج کی حالت کو سمجھ رہا تھا۔ مجھے اس سے پوری ہمدردی تھی مگر میں وہ سب نہیں کر سکتا تھا جو جج مجھ سے کروانا چاہ رہا تھا اور نہ میں جج کو وہ کرنے دیتا جو وہ خود کرنے کا ارادہ ظاہر کر چکا تھا۔ اب جج پر نظر رکھنا ضروری ہو گیا تھا۔

اس کے بعد یہ خبر پورے شہر میں پھیل گئی کہ جج کیپٹن ولسن کو قتل کرنے کے درپے ہے۔ اس نے نہ جانے کتنی جگہ کھلم کھلا یہ اعلان کیا تھا لہٰذا میرے باس نے مجھے باقاعدہ اس پر نظر رکھنے کی ڈیوٹی سونپ دی تھی۔ جج بالکل پاگل ہو چکا تھا۔ اس نے ولسن کو قتل کرنے کی اتنی دھمکیاں دی تھیں کہ بے شمار لوگ اس کے ارادے کے گواہ ہو چکے تھے۔

ادھر ولسن کو کوئی فکر نہیں تھی۔ وہ جج کی کیفیت سے خوب لطف اندوز ہو رہا تھا اور اسے کھلم کھلا پاگل اور دیوانہ قرار دے رہا تھا۔ اس کی باتیں مارٹن کو اور بھی مشتعل کر رہی تھیں۔

اس دن ڈھائی بجے کے قریب میں عدالت سے باہر نکلا اور فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ یکایک میں نے جج مارٹن کو دیکھا جو سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جا رہا تھا۔ اسی لمحے میری نظر اوبرائن اور ولسن پر بھی پڑ گئی۔ وہ دونوں سیڑھیاں اتر کر نیچے آ رہے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر میرا خون خشک ہو گیا۔ وہ دونوں تھوڑی ہی دیر میں آمنے سامنے ہونے والے تھے۔ اس کے بعد کیا ہوتا، کچھ پتا نہیں تھا۔

میں تیزی سے واپس ہوا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگا۔ اس وقت تک وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے آ چکے تھے۔

میں نے جج مارٹن کو دیکھا۔ وہ چیخ کر ان دونوں سے کچھ کہہ رہا تھا مگر اس کے الفاظ میری سمجھ میں نہیں آئے۔ جج کی آنکھوں میں نفرت اور حقارت تھی۔ اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تو میں سمجھ گیا کہ وہ ولسن کو مارنے کے لیے پستول نکال رہا ہے۔ یہ دیکھتے ہی میں نے دوڑ لگا دی۔ میں نے دوڑتے دوڑتے اپنا پستول بھی نکال لیا تھا۔ اس دوران وہ دونوں ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے لگے تھے۔ ولسن بھی دیکھ چکا تھا کہ جج اسے ہلاک کرنے کے لیے پستول نکالنے کی کوشش کر رہا ہے اس نے پھرتی کے ساتھ اپنا پستول نکالا اور اس کا رخ جج کی طرف کر کے لگاتار تین فائر کیے۔ میں نے چیخ کر اسے روکنے کی کوشش کی مگر اس وقت تک جج مارٹن کا خون آلود جسم سیڑھیوں پر گر چکا تھا۔ میں نے اچھل کر ولسن پر چھلانگ لگائی اور پلک جھپکتے میں اس سے اس کا پستول چھین لیا۔ اس وقت تک کیپٹن ولسن کو بھی احساس ہو چکا تھا کہ اس سے کتنی بڑی غلطی ہو گئی ہے۔ وہ بے حد خوف زدہ ہو گیا تھا۔

''جلدی سے کسی ڈاکٹر کو بلاؤ۔'' میں نے چیخ کر کہا۔ جج مارٹن کا قیمتی سوٹ خون میں بھیگ چکا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ جج کچھ ہی دیر کا مہمان ہے۔ اس حالت میں بھی جج نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا اور اپنی جیب میں سے اپنا ہاتھ باہر نکال لیا مگر میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کے ہاتھ میں پستول کے بجائے لائٹر تھا۔ گویا اس نے ولسن کو قتل کرنے کی دھمکی دی تھی مگر اس کے پاس پستول نہیں تھا۔ جبکہ ولسن نے اسے قتل ہی کر ڈالا تھا۔

''سارجنٹ میٹ!'' جج نے رک رک کر کہا۔ ''اب ولسن کو سزائے موت سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ میں نے جان بوجھ کر یہ حرکت کی تھی کہ یہ مجھے قتل کر دے۔ اس نے مجھے قتل کر دیا۔ اب یہ جیل جائے گا اور میری بیٹی سے کبھی شادی نہیں کر سکے گا۔ میری بچی اس بدمعاش سے بچ گئی۔ خدا کا شکر ہے کہ میں نے مرتے مرتے ایک کام ایسا کر دیا جس سے شاید مجھے دوسرے جہاں میں معافی مل جائے۔ اب یہ جیل جائے گا اور... اس پر قتل کا مقدمہ... چلے گا... اس نے ایک جج کو... عدالت کے دروازے... پر قتل... کیا ہے... ایک پیشی... میں... ہی... اسے موت... کی سزا سنا دی جائے گی... اور... برقی... کرسی... اس... کا... مقدر ہوگی... میری روتھ... بچ... گئی...'' کہتے کہتے جج مارٹن کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔

ایک پراسرار رات جس کی سنسنی اور پراسراریت نے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا

جرم کرنے کے بعد اس سے چھٹکارا پانا مشکل ہو جاتا ہے ...ایک ایسے ہی شخص کا قصہ جو اپنے جرم سے گلو خلاصی چاہتا تھا۔

رازدار

محمد فاروق انجم

سورج غروب ہونے سے قبل بادلوں نے آسمان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اندھیرا چھا گیا۔ تیز طوفانی ہوائیں چلنے لگیں، بادلوں کی گڑگڑاہٹ گونجنے لگی اور تیز بارش شروع ہو گئی۔ بارش اس قدر شدید تھی کہ سڑکوں پر جابجا پانی کھڑا ہو گیا تھا۔ سڑکیں ویران ہو گئی تھیں۔ ایک طوفان کا سا سماں تھا۔

ہائی وے کی دائیں طرف ایک چوڑی سڑک نکلتی تھی۔ اس سڑک کے پیچھے آبادی تھی۔ آبادی سے ذرا ہٹ کر سڑک کے قریب ایک دو منزلہ عمارت تھی۔ اس کی اوپر والی منزل پر اس مکان کے مکین رہائش پذیر تھے جبکہ نیچے کافی ہاؤس تھا۔ اس سڑک پر دن میں ٹریفک کا رش رہتا تھا کیونکہ شہر سے نکلنے اور داخل ہونے کے لیے یہ شارٹ کٹ تھا جبکہ سورج غروب ہونے کے ساتھ ہی آنے جانے والوں کا رش تقریباً ختم ہو جاتا تھا۔ رات کی ویرانی میں اس سڑک پر سے گزرنے کا خطرہ شاذ ہی کوئی لیتا تھا۔ دن کو کافی وغیرہ پینے کے لیے لوگ اس جگہ رکتے تھے، شام ہوتے ہی وہ کافی ہاؤس بھی ویران ہو جاتا تھا۔

طوفانی بارش میں ایک کار اس کافی ہاؤس کے باہر آ کر رکی اور اندر سے راجر نامی نوجوان تیزی سے باہر نکل کر کافی ہاؤس کے داخلی دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے کالی پینٹ، سفید شرٹ اور ہلکے نیلے رنگ کا کوٹ پہنا ہوا تھا۔ اندر ایک مختصر سا ہال تھا جہاں چند میز کرسیاں قرینے سے لگی ہوئی تھیں۔ ایک طرف بڑا کاؤنٹر تھا۔ جب راجر اندر گیا تو کافی ہاؤس کا بوڑھا مالک آرام کرسی پر افسردہ سے انداز میں براجمان تھا۔ اس کا نام رابرٹ تھا۔ راجر کو اندر آتا دیکھ کر وہ چونکا۔

''باہر طوفانی بارش ہے۔ کیا ایک کپ کافی مل سکتی ہے...؟'' راجر آتے ہی بولا۔

www.pkdigest.com

’’بیٹھو۔‘‘ بوڑھے رابرٹ نے اس کا جائزہ لے کر کہا اور خود اٹھ کر بڑے کاؤنٹر کے پیچھے چلا گیا۔ راجر کھڑکی کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کھڑکی سے پردے ہٹے ہوئے تھے اور شیشوں سے باہر برستا پانی صاف دکھائی دے رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد رابرٹ دو بڑے کافی کے مگ پکڑے آ گیا۔ اس نے ایک مگ راجر کے آگے رکھا اور دوسرا اپنے سامنے رکھ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی نگاہیں بہ دستور راجر کے چہرے پر تھیں۔

’’یہ کافی میری طرف سے ہے۔‘‘ رابرٹ نے خفیف سی مسکراہٹ بکھیری۔

’’ویسے میرے پاس پیسے ہیں۔‘‘ راجر خوشگوار انداز میں بولا۔

’’میں چاہ رہا تھا کہ کافی پیوں۔ اکیلے پینے کو دل نہیں چاہتا... ویسے اس طوفانی بارش میں کہاں جانے کا ارادہ ہے؟‘‘ رابرٹ نے پوچھا۔

’’جب میں سفر کے لیے نکلا تھا تو اتنی شدید بارش نہیں تھی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ بارش طوفانی رخ اختیار کرلے گی۔ میں نے مناسب سمجھا کہ یہاں رک کر کافی پینے کے ساتھ بارش کے رکنے کا انتظار بھی کیا جائے۔‘‘ راجر نے کہا۔

’’کہیں دور جانے کا ارادہ ہے کیا...؟‘‘ رابرٹ نے استفسار کیا۔

’’اپنے قصبے جا رہا ہوں...‘‘

’’مسافر ہو...؟‘‘ راجر کی بات ادھوری رہ گئی۔ رابرٹ نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

’’فی الحال...!‘‘ راجر نے اس بار دانستہ مختصر جواب دیا۔

’’وہاں کیا کرتے ہو...؟‘‘ رابرٹ نے اگلا سوال داغ دیا۔

’’وہاں میں ملازم...‘‘ راجر نے کہنا شروع کیا۔

’’ملازمت... کس محکمے میں...؟‘‘ رابرٹ نے اگلا اندازہ خود لگا کر پھر سوال کیا۔ یہ اس کی پرانی عادت تھی کہ وہ مخاطب کی بات مکمل نہیں ہونے دیتا تھا۔

’’ایک ادارہ ہے...‘‘ راجر نے پھر منہ کھولا۔

’’تم سے مل کر خوشی ہوئی۔‘‘ رابرٹ نے پھر فوراً کہا۔ وہ اپنی عادت سے مجبور تھا۔ ’’میرا نام رابرٹ ہے۔‘‘

’’میرا نام راجر ہے۔‘‘

’’کتنا کما لیتے ہو؟‘‘

’’اپنی ضرورت جتنا۔‘‘ راجر مسکرایا۔

’’کبھی زیادہ کمانے کے لیے نہیں سوچا؟‘‘

’’کون زیادہ نہیں کمانا چاہتا۔‘‘

’’اگر کسی کو پچیس منٹ میں دس ہزار ڈالر کمانے کا اچانک موقع مل جائے تو اسے کیا کرنا چاہیے...؟‘‘ رابرٹ نے معنی خیز انداز میں راجر کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

’’اسے وہ موقع فوراً پکڑ لینا چاہیے۔‘‘ راجر نے فوراً کپ کر مگ اپنے لبوں سے لگا لیا۔ رابرٹ زیرِ لب مسکرایا۔ چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔ دونوں خاموشی سے کافی کی چسکیاں لیتے رہے۔ راجر اس کے بولنے کا انتظار کر رہا تھا جبکہ رابرٹ سوچ کے ایک خاص نقطے پر غور و فکر کر رہا تھا۔

’’تم مسافر ہو، تمہیں تو آگے جانا ہی ہے۔‘‘ رابرٹ نے اپنے مفروضوں کے تحت بولنا شروع کیا۔ ’’یہاں سے آگے بیس منٹ کی مسافت پر ایک دریا ہے۔ دریا پر ایک چھوٹا سا پل بنا ہوا ہے۔ اس کی دیواریں محض دو، ڈھائی فٹ اونچی ہیں۔ وہاں تک جانے میں بیس منٹ اور وہاں رک کر میرا ایک کام کرنے میں صرف پانچ منٹ لگیں گے۔ اگر تم میرا وہ کام کرنے کی ہامی بھرتے ہو تو جاتے جاتے پچیس منٹ میں تم دس ہزار ڈالر کما سکتے ہو۔‘‘ آخری فقروں پر رابرٹ کا لہجہ کچھ دھیما اور پُراسرار سا ہو گیا۔ اس دوران میں راجر متحیر نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی گفتگو سن رہا تھا۔

’’مجھے کرنا کیا ہوگا؟‘‘ راجر نے قدرے توقف کے بعد سوال کیا۔

’’دس ہزار ڈالر کمانا چاہتے ہو؟‘‘ اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے رابرٹ نے کاؤنٹر کے پیچھے جا کر دراز سے دس ہزار ڈالرز کی گڈی اٹھا کر راجر کے آگے میز پر رکھ دی۔

راجر نے نظر بھر کر رقم کی طرف دیکھا اور پھر ایک ایک لفظ پر زور دے کر اپنا سوال دہرایا۔ ’’مجھے کرنا کیا ہوگا...؟‘‘

’’میرا ایک پارسل اس دریا میں پھینکنا ہوگا۔‘‘

’’پارسل...؟‘‘

رابرٹ اس کا ہاتھ پکڑ کر کاؤنٹر کے پیچھے لے گیا۔ فرش پر سیاہ پلاسٹک میں لپٹا ہوا ایک لمبا سا بے ہنگم رول پڑا تھا۔ راجر نے اس کا سرسری جائزہ لے کر پوچھا۔ ’’یہ کیا ہے...؟‘‘

’’میری بیوی کی لاش...‘‘ رابرٹ کی آواز سرگوشی میں بدل گئی۔

’’لا... ش...؟‘‘ راجر گھبرا گیا۔

’’چالیس سال کی رفاقت تھی میری اور اس کی۔‘‘ رابرٹ اس کی حیرت یا گھبراہٹ کو نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔ ’’بہت چرب زبان، ضدی، بدتمیز اور جھگڑالو عورت تھی۔ ان چالیس سالوں میں کوئی دن ایسا نہ گزرا جب اس نے میرے ساتھ...... لڑائی نہیں کی یا اس نے زبان نہیں چلائی۔ آج میری برداشت جواب دے گئی۔ وہ مجھ سے ایک معمولی سی بات پر بری طرح الجھی اور میں نے اس کا گلا دبا دیا۔ وہ بہت تڑپی مگر میرا بھی دماغ سنک گیا تھا۔ جب تک اس نے دم نہیں توڑا میں اس کا گلا دبوچے رہا۔‘‘ رابرٹ ایک لمحے کے لیے رکا، پھر بولا۔ ’’میں اس انتظار میں تھا کہ کوئی آئے اور اس لاش کو ٹھکانے لگا دے۔ مجھے کسی نہ کسی پر تو اعتماد کرنا ہی تھا۔ تم آ گئے۔ اتفاق سے تم اس شہر کے بھی نہیں ہو۔ یہ لاش اپنی گاڑی میں لے جاؤ اور جاتے جاتے اسے دریا میں ڈال دو۔ ذرا سی محنت سے دس ہزار ڈالرز کے مالک بن جاؤ گے۔ تم جیسے ملازم پیشہ آدمی کے لیے یہ بہت بڑی رقم ہے۔‘‘

راجر خوف زدہ انداز میں بولا۔ ’’یہ خطرناک کام ہے۔‘‘

’’اس سڑک پر کوئی پولیس والا نہیں ہوتا۔ رات میں اس سڑک پر دور تک گہرے سناٹے کا راج ہوتا ہے۔ تم تو بہت بہادر معلوم ہوتے ہو۔ رات گئے اس سڑک پر سفر کرنے کے لیے نکلے ہو۔‘‘ رابرٹ نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ بارش بوندا باندی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ’’یہ دس ہزار ڈالرز تھامو اور لاش اٹھا کر لے جاؤ۔ ہم دونوں کے مسئلے حل ہو جائیں گے۔‘‘

’’م... میں یہ کام نہیں کروں گا۔‘‘ راجر نے نوٹوں کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔

’’کوئی خطرہ نہیں ہے۔ پچیس منٹ میں دس ہزار ڈالرز کما رہے ہو تم!‘‘ رابرٹ نے اس کی نگاہوں کے سامنے نوٹ لہرائے۔

’’یہ سڑک خالی ہوتی ہے نا...؟‘‘ راجر نے تھکی اور شکست خوردہ آواز میں پوچھا۔ رابرٹ نے سوچا شاید رقم کا لالچ راجر کے دل و دماغ پر غالب آ رہا ہے۔

’’بالکل... کوئی خطرہ نہیں ہے۔‘‘ رابرٹ نے پُرزور لہجے میں اسے یقین دلایا۔ ’’اگر میں اکیلا اسے اٹھا کر گاڑی میں رکھ کر دریا میں پھینک سکتا تو کسی کو اپنا رازداں نہ بناتا۔‘‘ رابرٹ نے بات مکمل کرتے ہی دس ہزار ڈالرز کی گڈی اس کی طرف سرکا دی۔ چند ثانیے کے لیے راجر جھجکا پھر اس نے وہ گڈی اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لی۔

ہوا تیز چل رہی تھی۔ بارش کا زور ٹوٹ گیا تھا اور بہت ہلکی بوندا باندی باقی رہ گئی تھی۔ راجر اپنی کار کی ڈکی میں رابرٹ کی بیوی کی لاش لے جا رہا تھا۔ دس ہزار ڈالرز کی رقم اس کی جیب میں محفوظ تھی۔

☆☆☆

رابرٹ بوکھلائے ہوئے انداز میں پولیس اسٹیشن میں داخل ہوا۔

وہ سیدھا میز کے پیچھے کرسی پر براجمان پولیس افسر کی طرف بڑھا۔ رابرٹ کے بال الجھے ہوئے تھے، کپڑے پانی سے گیلے تھے اور جوتے کیچڑ میں لت پت تھے۔ اس کے چہرے پر اضطراب عیاں تھا۔

’’میرا نام رابرٹ ہے۔ آج تقریباً پانچ بجے میری بیوی کافی ہاؤس کے لیے سامان وغیرہ خریدنے گئی تھی، ابھی تک واپس نہیں آئی ہے۔ اس کے پاس دس ہزار ڈالرز بھی تھے۔ نیو ویلی میں، میں اپنی بیوی کے ساتھ کافی ہاؤس چلاتا ہوں۔ میں اپنی بیوی کو ہر جگہ تلاش کر آیا ہوں مگر وہ نہیں ملی۔‘‘ وہ رک رک کر اپنی بات کہتا چلا گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اتر آئے تھے۔ سب انسپکٹر جان اپنی جگہ بیٹھا اس کی طرف دیکھتا رہا۔

’’میں آپ کی رپورٹ لکھ لیتا ہوں۔‘‘ کچھ دیر کے سکوت کے بعد سب انسپکٹر جان رجسٹر اپنے سامنے کرتے ہوئے بولا۔ ’’لیکن رپورٹ آپ کی بیوی کی گمشدگی کی نہیں ہوگی...‘‘

’’گمشدگی کی نہیں ہوگی تو پھر...؟‘‘ رابرٹ نے تحیر آمیز لہجے میں حسبِ عادت اس کی بات کاٹ دی۔

’’دس ہزار ڈالرز اور آپ کی بیوی کی لاش ہمارے پاس ہے۔‘‘ جان نے سرد لہجے میں اسے آگاہ کیا۔

’’کیا...؟‘‘ رابرٹ بری طرح اچھل پڑا جیسے اس کے پیروں میں بم پھٹ گیا ہو۔

’’دراصل جس نوجوان کے ذمے آپ نے یہ کام لگایا تھا وہ اس وقت اس پولیس اسٹیشن میں موجود ہے۔‘‘ جان نے اطمینان سے کہا۔ ’’اس نے سب کچھ بیان کر دیا ہے۔‘‘

رابرٹ کا منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا۔ اپنے پیچھے قدموں کی چاپ سن کر اس نے گھوم کر دیکھا، راجر پُرسکون انداز میں چلتا ہوا اس کے قریب آیا اور حیرت کے سمندر میں غوطہ زن رابرٹ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ ’’تمہارا پلان زبردست تھا۔ اگر تم میری بات بار بار نہ کاٹتے تو جو کچھ میں بتانا چاہ رہا تھا، اس سے تمہیں معلوم ہو جاتا کہ میں اپنے قصبے سے ٹرانسفر ہو کر بہ حیثیت پولیس انسپکٹر یہاں آیا ہوں۔‘‘

www.pkdigest.com

پرواز

طاہر جاوید مغل

آٹھویں قسط

فرقت کی چبھن، ملن کے گداز اور محبت کے راز افشا کرتے قلم کا شاہکار

ایک سیدھے سادے لیکن ہر فن مولا کی داستان۔ اس کے بازو توانا تھے اور قدم مستحکم۔ منطقی ذہن اس کا رہنما تھا اور نقارہ بجاتا دل محبت کی تال پر دھڑکتا تھا۔ رگوں میں خون کی جگہ جوش دوڑتا اور لبوں پر نغمے مچلتے رہتے... پھر اس کی سماعت میں گھلنے والے رس نے اس کے لبوں کو ایک نئی تشنگی سے آشنا کیا اور وہ طلب کے منہ زور دھارے کے آگے بے دست و پا ہو گیا۔ بے کراں طلب اور تند جذبوں کے اس بہاؤ میں وہ تنہا نہ تھا۔ وہ ہستی بھی اس کے ہم دوش تھی جس کی فقط ایک نگاہ نے اس کے دل کا فیصلہ کر دیا تھا۔ بہاؤ کی سمت غلط تھی یا درست، اس سے بے خبر، اس سیلِ بلا خیز میں وہ بہے چلے جا رہے تھے!

[illegible]

www.pkdigest.com

کچھ دیر بعد تیمور بھی ہمارے پاس آن کھڑا ہوا اور خاموشی سے موت کے اس حصار کو دیکھنے لگا جو بڑی ہوشیاری سے ہمارے اردگرد بنا دیا گیا تھا۔

"لگتا ہے کوئی مخبری ہوئی ہے۔" تیمور نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

"جو بھی ہوا... لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔" شاہ نواز نے دانت پیسے۔

ہم نے چند سیکنڈ تک مشورہ کیا اور پھر اپنی اپنی پوزیشنوں کی طرف دوڑے۔ شاہ نواز کے سارے ساتھیوں میں بھی ہلچل مچ گئی تھی۔

شاہ نواز نے کہا۔ "خاور! میں نہیں چاہتا کہ ہماری مارا ماری میں چاچے ملنگے اور اس کے ساتھیوں کو کوئی نقصان پہنچے۔ ان کا قصور بس اتنا ہے کہ انہوں نے ہمیں پناہ دی ہے۔"

"تو پھر کیا کیا جائے؟"

"میرا خیال ہے کہ ان کو باہر بھیج دیا جائے۔ یہ ہاتھ اٹھا کر باہر چلے جائیں تو پولیس والے ان پر گولی نہیں چلائیں گے۔"

میرے ذہن میں فوراً پانچ دن پہلے کا واقعہ آ گیا۔ جب ہم مورے میں گھرے ہوئے تھے، بدقسمت ناجا اسی طرح ہاتھ اٹھا کر باہر نکلا تھا اور گولیوں سے بھون دیا گیا تھا۔ ملنگے اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ بھی یہی کچھ ہو سکتا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" شاہ نواز نے پوچھا۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ میری رائے ہے کہ کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے ہمیں پولیس کا ارادہ معلوم کر لینا چاہیے۔ مطلب یہ کہ وہ ہماری گرفتاری چاہتے ہیں یا پھر پولیس مقابلہ بنا کر ہماری لاشیں گرانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

"مجھے تو تمہاری دوسری بات ہی ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔"

"پھر بھی ہمیں تصدیق کرنی چاہیے۔"

"اور تصدیق کرنے کا طریقہ کیا ہوگا؟" شاہ نواز نے ذرا ترش لہجے میں پوچھا۔

"ایک طریقہ ہے۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "ہم ان سے کہتے ہیں کہ ہم گرفتاری دینے کے لیے تیار ہیں لیکن اس شرط کے ساتھ کہ انتظامیہ کا کوئی اعلیٰ عہدے دار یہاں آئے اور ہمیں ضمانت دے دے کہ ہمارے ساتھ قانون کے مطابق سلوک ہوگا۔"

"تمہاری بات تو سمجھ میں آ رہی ہے لیکن..."

ابھی شاہ نواز کا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ یخ بستہ صبح کا

سناٹا فائرنگ کی لرزہ خیز تڑتڑ سے گونج اٹھا۔ کئی گولیاں اردگرد کے درختوں میں پیوست ہوگئیں اور بے شمار پرندے شور مچاتے ہوا میں پرواز کر گئے۔ اس کے ساتھ ہی میگا فون پر ایک کرخت آواز گونجی۔ میاں وارث کی یہ آواز میں نے بآسانی پہچان گیا۔ وہ مخصوص انداز میں بولا۔ ''یہاں سے کسی نے بھاگنے کی کوشش کی تو بے موت مارا جائے گا۔ تم چاروں طرف سے پولیس کے گھیرے میں ہو۔ جان بچانا چاہتے ہو تو ہاتھ اٹھا کر اور قطار بنا کر باہر آجاؤ۔ میں اپنا اعلان ایک بار پھر دہراتا ہوں۔ یہاں سے کسی نے بھاگنے کی کوشش کی...''

میاں وارث کی دھمکاتی ہوئی آواز قبرستان میں گونج رہی تھی اور فضا کو سراسیمہ کررہی تھی۔

میں نے شاہ نواز کے ساتھی سراج کو اشارہ کیا۔ اس کی آواز خاصی پاٹ دار تھی۔ وہ میرے اور شاہ نواز کے قریب آگیا۔ میں نے اسے بتایا کہ وہ میاں وارث کو کیا جواب دے۔

سراج نے بہ آواز بلند پکار کر کہا۔ ''ہم گرفتاری دینے کو تیار ہیں انسپکٹر وارث لیکن اس کے لیے ہم کو یہ تسلی ہونی چاہیے کہ...''

''تم اپنی شرطیں نہ سناؤ۔ یہ بتاؤ گرفتاری دے رہے ہو یا نہیں؟'' سراج کی بات تیزی سے کاٹ دی گئی۔

''ہم گرفتاری دے رہے ہیں۔ پر ہمیں اپنی جان کا خطرہ ہے۔'' سراج نے کہا۔

''تمہیں ہماری طرف سے کوئی خطرہ نہیں۔ اگر کوئی خطرہ ہے تو تمہاری اپنی بے وقوفی سے ہے۔ میں تمہیں سوچنے کے لیے زیادہ وقت نہیں دے سکتا۔ اگلے پانچ منٹ کے اندر اندر تم لوگ فیصلہ کرلو کہ تمہیں باہر آنا ہے یا ہم اندر آجائیں۔ اور میں ایک بار پھر کہتا ہوں شاہ خاور! تم اس بار کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرنا... ورنہ بری موت مارے جاؤ گے۔'' اس نے مجھے مخاطب کرکے یہ جتایا کہ وہ میری موجودگی کے بارے میں پُر یقین ہے۔

میاں وارث کا رویہ توقع کے عین مطابق بہت سخت تھا۔ اسے اس بات کا مان تھا کہ اس نے ہمارے گرد بہت مضبوط گھیرا بنا لیا ہے اور اب ہم اس سے کوئی بھی بات منوانے کے قابل نہیں ہیں۔

صورتِ حال ہماری توقع سے زیادہ سنگین تھی۔ شاہ نواز نے ہمیں پناہ دی تھی اور اس کی غیرت کا تقاضا تھا کہ وہ ہمیں بچانے کی ذمے داری کو شدت سے محسوس کرے... اور وہ محسوس کررہا تھا۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''شاہ خاور! میرا خیال ہے کہ تم [illegible] اس وقت میاں وارث کا اصل نشانہ تم دونوں ہی ہو۔''

''نہیں شاہ نواز! تمہیں بچانا ہی ہے۔ مجھے چھپنا بھی پسند نہیں رہا۔ میں اب بھی نہیں چھپوں گا... اور نیچے تو کسی صورت نہیں جاؤں گا۔'' نیچے سے مراد وہ دونوں کھوکھلی قبریں تھیں جن کا تذکرہ میں کرچکا ہوں۔

اسی دوران میں ایک دو انجنوں کا شور سنائی دیا۔ غالباً یہ پولیس کی جیپیں تھیں جو کچھ اور نزدیک آگئی تھیں۔

میں نے کہا۔ ''شاہ نواز! میری رائے ہے کہ ہم چاچے ملنگے اور اس کے تینوں ساتھیوں کو نیچے بھیج دیں۔ ان کا اس سارے معاملے سے کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ ہمارے قصوروں کی سزا ان کو نہ ملے تو اچھا ہے۔''

مشورے کے بعد ہم نے اس پر عمل کرنے کا سوچا مگر اس سے پہلے کہ پوری طرح عمل ہو پاتا، صورتِ حال ایک دم ہی سنگین تر ہوگئی۔ پانچ منٹ پورے ہونے سے پہلے ہی میاں وارث کی طرف سے ایک بار پھر میگا فون پر اعلان کیا گیا اور ابھی اعلان جاری ہی تھا کہ دائیں جانب سے اچانک تابڑ توڑ فائرنگ شروع ہوگئی۔ مجھے یوں لگا، جیسے کسی نے یہاں سے بھاگنے کی کوشش کی ہے اور پولیس والوں نے اسے جھاڑیوں میں دیکھنے کے بعد نشانہ بنایا ہے۔

اس کے دو منٹ بعد ہی اندھا دھند گولیاں برسنے لگیں۔ کوٹھڑی کی ایک کھڑکی توڑتی ہوئی آئی اور شاہ نواز کے ایک بھائی کی ٹانگ میں لگی۔ وہ وہیں پکی قبر پر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ ایک دوسری گولی اس صراحی کو لگی جس میں تازہ بھنگ گھوٹ کر ڈالی گئی تھی۔

ہم نے مختلف جگہوں پر پوزیشنیں لے لیں لیکن ابھی تک ہماری طرف سے کوئی گولی نہیں چلائی گئی تھی۔ پولیس پر جوابی گولی چلانا ایک بڑا مشکل کام ہوتا ہے کیونکہ جس وقت پہلی گولی چلائی جاتی ہے اسی وقت یہ پولیس مقابلہ بن جاتا ہے اور کیس کی صورت میں ارادۂ قتل اور دوسری سنگین دفعات لاگو ہوجاتی ہیں۔

...مگر یہاں اب صورتِ حال ایسی ہو چکی تھی کہ جوابی گولی کے بغیر چارہ نہیں تھا۔ پھر پہلی گولی شاہ نواز ہی کی طرف سے چلائی گئی۔ اس کے بعد سراج نے فائرنگ شروع کی، پھر ہم سب شریک ہوگئے۔

''وہ دیکھو... اُدھر سے وہ بالکل پاس آگئے ہیں۔'' تیمور دائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے چلایا۔

''سور کے بچے!'' شاہ نواز نے دانت پیسے اور اپنی

رائفل کا رخ دائیں جانب کرکے چھوٹے چھوٹے دو برسٹ چلائے۔ قبروں کی مٹی ہوا میں اڑتی نظر آئی۔

ان برسٹوں کے بعد فائرنگ میں ایک دم شدت آگئی۔ گولیاں ہم پر مینہ کی طرح برسنے لگیں۔ یہ گولیاں درختوں کے تنوں میں پیوست ہورہی تھیں، پتوں اور شاخوں سے ٹکرا رہی تھیں، کچی دیواروں میں گھس رہی تھیں۔ ایک دم ہی کہرام سا مچ گیا تھا۔ میں اپنی سیون ایم ایم رائفل سے سنگل شاٹ فائر کررہا تھا۔ تیمور میرے کندھے سے کندھا ملائے بیٹھا تھا، اس کے ہاتھ میں ماؤزر تھا۔ اچانک ایک گولی آئی اور تیمور کے سر پر سے ہوتی ہوئی پیچھے کھڑے سراج کے چہرے پر لگی۔ وہ رائفل کے میگزین میں گولیاں بھر رہا تھا۔ پشت کے بل گرا اور گرنے کے فوراً بعد ہی ٹھنڈا ہوگیا۔ میں نے اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں کی جھلک دیکھی اور اس کی پیشانی کا سیاہی مائل سوراخ دیکھا۔

شاہ نواز نے بھی یقیناً یہ منظر دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر سرخ شعلوں کی لپک دکھائی دی۔ ''مار دیا... حرامزادو مار دیا۔'' وہ عجیب آہنگ میں دہاڑا۔ اس کے ساتھ ہی وہ رائفل سونت کر اندھا دھند گولیاں چلانے لگا۔ پورے کمرے میں گولیوں کے گرم خول بکھر گئے۔ مجھے لگا کہ وہ اسی طرح فائر کرتا ہوا باہر آنگن میں نکل جائے گا۔ میں نے اسے کمر سے پکڑ لیا۔ ''نہیں شاہ نواز! یہ ٹھیک نہیں۔''

وہ چھڑانے کے لیے زور لگانے لگا۔ میں نے تیمور سے مل کر اسے بہ مشکل نیچے بٹھایا۔

دوسرے کمرے سے شاہ نواز کے ساتھی فیروز نے پکار کر کہا۔ ''سراج صاحب! یہ لوگ مزار کی طرف سے آگے آرہے ہیں۔ آپ کے بالکل دائیں طرف ہیں۔''

فیروز نامی یہ بندہ نہیں جانتا تھا کہ سراج سننے اور سمجھنے کی حد سے گزر چکا ہے۔ گولی اس کی عین پیشانی پر لگی ہے اور اس نے اس قسم کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔ سراج کے بجائے فیروز کو میں نے جواب دیا۔ ''ٹھیک ہے فیروز! میں نے دیکھ لیا ہے۔ ہم ان کو روکتے ہیں، تم اپنی سائیڈ پر دھیان رکھو۔ ابھی ان پر سیدھا فائر نہ کرو لیکن ان کو پاس بھی نہ آنے دو۔''

''کیوں سیدھا فائر نہ کرو... کیوں نہ کرو۔'' شاہ نواز گرجا۔ اس نے گالی دی اور بولا۔ ''وہ ہماری چھاتیوں پر مار رہے ہیں۔ ہم ان کے پیروں پر کیوں ماریں؟''

وہ رائفل سونتا ہوا دوسرے کمرے میں فیروز کے پاس چلا گیا۔

کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہورہا ہے۔ میں پولیس

لوڈشیڈنگ کے فائدے

☆ بجلی کے بل میں کمی واقع ہوجاتی ہے۔ آپ جس بل کو زیادہ سمجھتے ہیں، درحقیقت وہ کم ہوتا ہے۔ لوڈشیڈنگ نہ ہو تو بل آپ کو چیخیں مارنے پر مجبور کرسکتا ہے۔

☆ ٹی وی بند ہوجاتا ہے جس سے پورے گھرانے کا اخلاق بہتر ہوتا ہے۔ تربیت کا اس سے بہتر اور سستا ذریعہ کوئی نہیں۔

☆ بچوں کی مشکوک سرگرمیاں رک جاتی ہیں کیونکہ ان کو موبائل کی بیٹری چارج کرنے کے زیادہ مواقع نہیں ملتے۔

☆ ملک میں بے روزگاری کی شرح میں کمی آتی ہے۔ جنریٹر، یو پی ایس، پیٹرومیکس، ٹارچ، لالٹین، لیمپ، چراغ اور موم بتیاں بیچنے والوں کا کاروبار خوب چلتا ہے۔ مرمت (آپ کی نہیں، مذکورہ اشیا کی) کرنے والوں کی آمدنی میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

☆ بچت کی عادت کو فروغ ملتا ہے۔ بجلی ہونے کے باوجود اکثر سب کچھ بند رکھنے کو دل چاہنے لگتا ہے تاکہ بل دیکھ کر بلبلانے کی نوبت نہ آئے۔

☆ گھر والوں میں باہمی محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ اندھیرے میں ٹٹول کر چلنے کے سبب وہ اجالے میں بھی سنبھل کر چلتے ہیں تاکہ کسی اور سے نہ ٹکرا جائیں اور اسے زخمی نہ کردیں۔

☆ قربِ الٰہی حاصل ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر حال میں صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

☆ بندہ شکر گزار بن جاتا ہے۔ بجلی جانے کے بعد جب بھی آتی ہے، سب یک زبان ہو کر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ دن میں پندرہ بیس دفعہ ایسا ہوتا رہے تو ہر شخص عادی شکر گزار بن جاتا ہے۔

☆ صابر و شاکر ہونے کی بنا پر فی الفور جنت نشین ہو جانے کے قوی امکانات پیدا ہوجاتے ہیں۔

☆ چھوٹے جرائم میں نمایاں کمی ہو جاتی ہے کیونکہ اندھیرے میں کوئی بھی گھر سے نکلنا پسند نہیں کرتا۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جہاں بھی جائے گا وہاں بجلی نہیں ہوگی۔ مجرم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہ جاتے ہیں۔

☆ تخلیقی کاموں میں رکاوٹ ضرور پڑتی ہے لیکن ایک شعبے میں اس کا زبردست فائدہ ہوتا ہے۔ بہبود آبادی کے محکمے کا کام ہلکا ہوجاتا ہے، آبادی کنٹرول میں رہتی ہے۔

☆ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے سبب سے انفرادی بینائی کو شدید افاقہ ہوتا ہے۔ فرد وہ سب دیکھنے لگتا ہے جو ہمیں قوم کی حیثیت سے قطعاً نظر نہیں آتا۔

☆ مذکورہ فوائد کی بنا پر ''سال کے 365 دن، ہر گھنٹے لوڈشیڈنگ'' ہمارا قومی مطالبہ ہونا چاہیے۔ وزارتِ بجلی اس نعرے کو اپنا موٹو بھی بنا سکتی ہے۔

مقابلہ کرنا نہیں چاہتا تھا، نہ ہی ڈکیت یا قاتل بننا چاہتا تھا۔ قدرت نے میری اور تیمور کی رہائی کا ایک بہترین سبب پیدا کر دیا تھا۔ چودھری عزیز اور انور ہمارے قبضے میں آ گئے تھے اور انہوں نے اپنے جرموں کا اعتراف بھی کر لیا تھا لیکن عین اس وقت جب سب کچھ ہمارے حق میں ہونے والا تھا، یہ پولیس والے بلائے ناگہانی بن کر ٹپک پڑے تھے۔ یہ سب کچھ میرے لیے بے حد تکلیف دہ تھا۔ اب اگر میرے یا تیمور کے ہاتھوں کوئی پولیس والا مر جاتا تو ہم میں اور شاہنواز یا سراج میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا تھا۔ وہی پھانسی کا تختہ یا ان کاؤنٹر والی فوری موت!

میواتی کی چلاتی ہوئی آواز نے میرے خیالوں کو درہم برہم کر دیا۔ پہلے تو میں نے سمجھا کہ شاید اسے گولی وغیرہ لگ گئی ہے مگر وہ کچھ اور کہہ رہا تھا۔ ''چودھری صیب... چودھری صیب!'' وہ دل دوز آواز میں پکارا۔ ''اوئے یہ کیا ہو گیا... ارے کوئی کچھ کرو...''

''میرا خیال ہے کہ چودھری عزیز کو کچھ ہوا ہے۔'' تیمور نے سرگوشی کی۔

میں جھک کر چلتا ہوا اس کمرے کی طرف گیا جہاں چودھری عزیز کو رکھا گیا تھا... چودھری عزیز کی طرف جاتے ہوئے مجھے ایک کھڑکی کے سامنے سے گزرنا تھا۔ اس وقت یہ کھڑکی پوری طرح فائرنگ کی زد میں تھی۔ کھڑکی کی آہنی سلاخوں سے مسلسل پگھلا ہوا لوہا ٹکرا رہا تھا اور چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں۔ تیمور نے مجھے روکنے کی کوشش کی مگر میں کہنیوں اور پیٹ کے بل رینگتا ہوا یہ سات آٹھ فٹ کا نہایت خطرناک فاصلہ طے کر گیا۔ میں دوسرے کمرے میں پہنچا تو آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ چودھری عزیز اوندھا پڑا تھا۔ گولی اس کی کھوپڑی توڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔ بائیں طرف سے گولی جہاں سے داخل ہوئی تھی معمولی سا سوراخ تھا مگر دائیں جانب سر میں ایک بڑا روشن دان بن گیا تھا۔ چودھری کے خون سے وہ سارے نوٹ بھیگ گئے تھے جو کچھ دیر پہلے اس نے بڑی مکاری سے مجھے ''زحمتِ سفر'' کے طور پر دینے چاہے تھے۔ میں سکتے میں رہ گیا۔

میواتی دیوار کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیلی پڑ رہی تھیں۔ ''یہ کیا ہو گیا جی۔ ایک منٹ میں ہمارے سامنے سب کچھ ختم ہو گیا۔''

''اگلے منٹ میں تم بھی ختم ہو جاؤ گے۔ اپنا سر نیچے رکھو۔'' میں نے دانت پیس کر کہا۔

دو گولیاں سنسناتی ہوئی میواتی کے پاس سے گزریں اور وہ تقریباً سجدے کی حالت میں چلا گیا۔

تیمور بھی فوجی انداز میں کہنیوں کے بل رینگتا ہوا ہمارے پاس آ گیا۔ چودھری عزیز کی خون آلود لاش دیکھ کر اس کے ہونٹ بھی سکڑ گئے۔ ''اوہ خدایا! مر گیا یہ... اب کیا ہو گا؟'' اس نے جیسے خود ہی سے پوچھا۔

فائرنگ کچھ دیر کے لیے تھم سی گئی۔ اندازہ ہوا کہ قبرستان کے اندر پولیس والوں کی پیش قدمی نہیں ہو سکی۔ درحقیقت سراج کو گولی لگنے کے بعد شاہنواز اور اس کے ساتھیوں نے بے دریغ سیدھی فائرنگ کی تھی۔ اس اندھا دھند فائرنگ نے پولیس فورس کو محتاط ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

میری رائفل کا چوبیس گولی والا میگزین خالی ہو چکا تھا۔ میں نے نیا میگزین رائفل سے انٹیچ کیا۔ اس دوران میں میری نگاہ مسلسل چودھری عزیز کی لاش کا جائزہ لیتی رہی۔ اس کے ہاتھ پاؤں ابھی تک بندھے ہوئے تھے۔ چہرے پر نیل تھے اور چوٹوں کے نشان تھے۔ یہ سب اس مار پیٹ کا نتیجہ تھا جو تیمور نے اس سے کی تھی اور جس کے نتیجے میں چودھری اپنی زبان کا تالا کھولنے پر آمادہ ہوا تھا۔ اب وہ یوں پڑا تھا جیسے کبھی زندہ ہی نہیں تھا۔ زیادہ کی ہوس نے اسے زندگی سے ہی محروم کر دیا تھا۔ وہ اپنے ساڑھے تیرہ مربعے کے چکر میں اپنی سانسوں سے ہی محروم ہو گیا تھا۔ اب وہ ساڑھے تیرہ مربعے اور باقی کے قریباً پچیس مربعے اور زیورات اور انعامی بانڈوں سے بھری ہوئی دو تجوریاں، پانچ ٹیوب ویل، دو طویلے اور نہ جانے کیا کچھ اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ وہ سب کچھ اس کے لیے بے کار تھا۔ اب وہ چند گز لٹھے اور دو گز زمین کے سوا کسی شے کا حق دار نہیں تھا۔ میں نے اس شخص پر اعتماد کیا تھا۔ اس نے میرے بے مثال اعتماد کو توڑا تھا اور اس کے علاوہ بھی اس نے اپنی مکاری سے نہ جانے کیا کیا توڑا اور برباد کیا تھا۔ اس نے اپنا کینہ، کسی قیمتی شے کی طرح اپنے دل میں رکھا تھا۔ آج اس شخص کی ساری سیاہ کاریوں کا حساب اس کمرے کے کچے فرش پر چکتا ہو گیا تھا۔ خون پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ گردن کا اکڑاؤ ایک حسرت ناک ڈھیلے پن میں بدل گیا تھا۔

اچانک میرا دھیان اس ٹیپ کی طرف چلا گیا جس پر ہم تھوڑی دیر پہلے چودھری کی آواز ریکارڈ کر رہے تھے۔ یہ ٹیپ ریکارڈر ہم نے چودھری کے پاس ہی ایک کمبل کے نیچے چھپا رکھا تھا۔ میں لپک کر کمبل تک پہنچا لیکن کمبل کے نیچے کچھ نہیں تھا۔ ٹیپ ریکارڈر وہاں سے اٹھایا جا چکا تھا۔

میں نے رونق علی کو آواز دی۔ ''رونق بھائی! کہاں ہو؟''

جواب نہیں آیا۔ رونق کے بجائے شاہنواز نے دوسرے کمرے سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے خاور ے؟''

''ٹیپ کہاں ہے؟''

''مجھے نہیں پتا۔'' شاہنواز نے بھی پکار کر جواب دیا۔

''اور رونق بھائی؟''

''اس کا بھی نہیں پتا۔''

میواتی نے کانپتے لہجے میں کہا۔ ''ہمار کا خیال ہے کہ ٹیپ ریکارڈر رونق بھائی کے پاس تھا۔ وہ اس کو لے کر جھاڑیوں کی طرف جاوت تھے۔''

''پھر؟''

''ہم... ہمار کو ٹھیک سے معلوم نہیں جی۔ ہمار کو لگتا ہے کہ ان کو... ہمار کا مطلب ہے کہ ان کو... گگ... گولی لگ گئی ہے... یا پھر وہ پکڑت گئے ہیں۔''

''کیا بکتے ہو؟'' میں دہاڑا۔

''وہ سروع (شروع) میں ایک دم جھاڑیوں کے اندر جو فائرنگ ہوئی تھی وہ چودھری رونق پر کی گئی تھی۔ ساتھ میں ایک اور بندہ تھا۔ ہمار کو نہیں معلوم اس کا کیا بنا۔''

جو خبر بھی مل رہی تھی، بد سے بدتر مل رہی تھی۔ میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ چودھری عزیز کی لاش سامنے پڑی تھی اور ٹیپ ریکارڈر میں ہم نے اس کا جو اقبالی بیان محفوظ کیا تھا وہ شاید عیاں وارث کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔

تیمور نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ ''اگر رونق بھائی پکڑا گیا ہے تو پھر شاید پولیس نگران والی بھی جا پہنچے گی اور اگر وہاں پہنچی تو پھر ہمارا آخری آسرا بھی ختم ہو جائے گا۔''

میں تیمور کا اشارہ سمجھ رہا تھا۔ وہ چودھری کے ہرکارے انورے کی بات کر رہا تھا۔ اب آ جا کے انور ہی رہ گیا تھا جس کا اقبالی بیان ہمیں شہوار اور ثمینہ کے قتل سے بری الذمہ کر سکتا تھا، یا ایسا کرنے میں ہماری مدد کر سکتا تھا لیکن ابھی میں ٹیپ ریکارڈر کی طرف سے بھی پوری طرح مایوس نہیں ہوا تھا۔ اور یہ ٹیپ ریکارڈر ایک ایسا ثبوت تھا جس کو بڑی سے بڑی عدالت بھی جھٹلا نہیں سکتی تھی۔ ان دنوں عدالتوں میں ایسے مواد کی اہمیت آج سے بہت زیادہ تھی۔

شروع میں جنتر کی گھنی جھاڑیوں کی طرف پولیس نے اندھا دھند فائرنگ کی تھی، یہ جھاڑیاں ہماری دائیں طرف تھیں۔ سورج نکلتے ہی چاروں طرف ہلکی دھند پھیل گئی تھی اور پندرہ قدم سے آگے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ یہ صورتِ حال ہمارے لیے فائدہ مند ثابت ہو سکتی تھی۔ اگر رونق علی واقعی ان جھاڑیوں کی طرف گیا تھا اور پکڑا نہیں گیا تھا بلکہ زخمی ہوا تھا تو پھر عین ممکن تھا کہ وہ ابھی تک ٹیپ ریکارڈر سمیت وہیں موجود ہو۔

میں نے تیمور سے کہا۔ ''تم یہیں رکو، میں ابھی آتا ہوں۔''

''کیا ارادہ ہے؟'' اس نے مضبوطی سے میرا بازو تھام لیا۔

''یار! اس وقت ہیڈ ماسٹر بننے کی کوشش نہ کرنا۔ میں جو کرنا چاہتا ہوں، مجھے کرنے دو۔'' میں نے جھٹکے سے اپنا بازو چھڑایا... اور پیٹ کے بل رینگتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔

''میں بھی ساتھ آؤں؟'' تیمور نے آخری حربہ استعمال کیا۔

''نہیں، تم یہاں رک کر اکا دکا فائر کرو ورنہ پولیس والے آگے آ جائیں گے۔ کوشش کرنا کسی کو گولی نہ لگے۔'' میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

''یار! مجھے نہیں لگتا کہ رونق بھائی وہاں ہو گا۔'' تیمور نے کہا۔ تیمور کی سنی ان سنی کر کے میں آگے بڑھا۔ قبروں کے درمیان میں پیٹ کے بل رینگ رہا تھا۔ دھند اور اوس کے سبب زمین گیلی تھی اور گیلاہٹ سینے کے راستے پورے جسم میں سرایت کر رہی تھی۔ پولیس اہلکار چاروں طرف موجود تھے مگر دکھائی نہیں دیتے تھے۔ بس ان کی مدھم آوازیں ہی وقفے وقفے سے کانوں تک پہنچتی تھیں۔ وہ غالباً اپنی پوزیشنیں بہتر کر رہے تھے۔ ان کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ کسی طرح کی رعایت نہیں دیں گے۔

شدید خطرہ مول لے کر میں ان گھنی جھاڑیوں تک پہنچ گیا جہاں رونق علی کو آخری بار دیکھا گیا تھا۔ ٹھنڈی زمین پر اوندھے لیٹے لیٹے میں نے ارد گرد نگاہ دوڑائی۔ رونق نظر نہیں آیا۔ نہ ہی کہیں ٹیپ ریکارڈر کے آثار تھے۔ پھر ایک چیز نے میرے جسم میں سنسناہٹ دوڑا دی۔ یہ خون کے دھبے تھے۔ یہ دھبے زمین پر اور ارد گرد کی شاخوں پر نظر آ رہے تھے۔ اس کے علاوہ گیلی زمین پر کسی کو گھسیٹے جانے کا واضح نشان تھا۔ تو کیا رونق علی کو ٹیپ ریکارڈر سمیت زخمی حالت میں پکڑ لیا گیا تھا؟ آثار سے تو یہی نظر آ رہا تھا مگر... صورتِ حال مختلف بھی ہو سکتی تھی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ یہ خون کے دھبے رونق کے بجائے اس دوسرے بندے کے ہوں جو اس کے ساتھ بھاگا تھا۔

جھاڑیوں میں ایک جگہ کوئی سیاہی مائل شے نظر آئی۔

www.pkdigest.com

میرا دل شدت سے دھڑک اٹھا۔ یہ ٹیپ ریکارڈر بھی ہو سکتا تھا۔

میں نے حوصلہ جمع کیا اور پیٹ کے بل رینگتا ہوا مزید آگے کی طرف گیا۔ پولیس والوں سے میرا فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ اب میں ان کے ہتھیاروں کی کھڑکھڑاہٹ بھی سن سکتا تھا۔ میری حسیں پوری طرح بے دار تھیں اور میں ہر خطرے سے نمٹنے کے لیے سو فیصد تیار تھا۔ قریباً سات آٹھ میٹر آگے جانے کے بعد میں اس شے کو ٹھیک سے دیکھنے کے قابل ہوا۔ اس شے کو پہچان کر مایوسی کا اندھیرا کچھ اور گہرا ہو گیا... یہ ٹیپ ریکارڈر نہیں تھا۔ کالے رنگ کی گرم شال تھی اور میں اس شال کو بہ آسانی پہچان گیا۔ یہ رونق علی ہی کی تھی... اس کا مطلب تھا کہ وہ ٹیپ ریکارڈر سمیت پکڑا جا چکا ہے یا پھر ویسے ہی ''پار'' ہو گیا ہے۔

شاید اس نے بھاگ کر غلطی کی تھی۔ وہ بیمار تھا اور اپنے موٹاپے کے سبب زیادہ تیزی سے حرکت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے لیے ممکن نہیں تھا کہ پولیس والوں کو چکما دے کر نکل جاتا۔ دکھ کی ایک گہری لہر نے میرے پورے سراپا کو جکڑ لیا۔ اور یہی وقت تھا جب مجھے اپنی بائیں جانب حرکت کا احساس ہوا۔ میں نے تیزی سے پلٹا کھایا اور اپنی جگہ چھوڑی۔ ایک شخص اڑتا ہوا سا میرے پہلو میں گرا۔ یہ ایک نہایت تنومند باوردی پولیس اہلکار تھا۔ میں نے رائفل کے دستے سے اس کے سر کے پچھلے حصے پر ضرب لگائی۔ اس کی ٹوپی اچھل کر دور جا گری۔ ایک دوسرے اہلکار نے دائیں طرف کی جھاڑیوں سے اپنی جھلک دکھائی۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ ''خبردار...'' وہ چنگھاڑا۔ ابھی بس یہی لفظ اس کے منہ سے نکلا تھا کہ میں نے اس کی رائفل کا بیرل پکڑ کر اوپر اٹھا دیا اور سر کی بھرپور ضرب اس کے سینے پر رسید کی۔ وہ اوغ کی آواز نکالتا ہوا ایک شکستہ قبر پر گرا۔ ایک سفید پوش اہلکار سامنے سے جھپٹا۔ جھپٹنے کے ساتھ ساتھ وہ ہولسٹر میں سے اپنا ریوالور برآمد کر رہا تھا۔ ابھی وہ مجھ سے آٹھ دس قدم دور ہی تھا کہ یکا یک لڑکھڑا گیا۔ اس کی ایک ٹانگ ران کے بالائی سرے تک ایک کھوکھلی قبر میں دھنس گئی تھی۔ اس سنہری موقعے سے فائدہ نہ اٹھانا بے وقوفی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر رائفل کی شدید ضرب سفید پوش کی کلائی پر لگائی۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر ہوا میں اڑتا دکھائی دیا۔ اس نے قبر سے نکلنے کی کوشش کی مگر اس کوشش میں اس کی دوسری ٹانگ بھی اندر چلی گئی۔

''میاں جی... میاں جی۔'' وہ گلے کی پوری طاقت سے چلایا۔

میں واپس پلٹا... ذہن میں زلزلہ سا برپا تھا۔ میرے اندر سے سوال ابھرا۔ ''کیا یہ قدرت کی طرف سے اشارہ ہے کہ میں یہاں سے بھاگنے کی ایک بھرپور کوشش کروں؟''

میں حتی الامکان حد تک جھک کر مخالف سمت میں دوڑا۔ روشنی پھیل چکی تھی لیکن گاڑھی سفید دھند نے نظر کا راستہ مسدود کیا ہوا تھا۔ رونق علی ایسی دھند کو سفید اندھیرا کہا کرتا تھا۔

''دیکھو... کوئی حرامی جانے نہ پائے۔'' انسپکٹر میاں وارث کی کڑکتی ہوئی آواز مجھے قبرستان کے مشرقی کنارے سے سنائی دی۔ اس کے ساتھ کچھ قاتل گولیاں سیٹیاں بجاتی میرے دائیں بائیں سے گزر گئیں۔ گولی کا بوسہ تو ظالم ہوتا ہی ہے، اس کا آس پاس سے گزر جانا بھی کوئی کم آفت ناک نہیں ہوتا۔

میں اوندھے منہ گر گیا۔ چند فٹ کرالنگ کرنے کے بعد پھر اٹھا اور جھک کر بھاگتا ہوا قبرستان کی چار فٹ اونچی کچی دیوار تک پہنچ گیا۔ اس دیوار کو میں نے جست لگا کر پار کیا۔ یہ جست بالکل ویسی ہی تھی جیسی پیراک پانی میں کودتے ہوئے لگاتا ہے۔ میں جھاڑیوں کے درمیان اگی ہوئی لمبی گھاس میں گرا۔ ایک قریباً ساڑھے چھ فٹ لمبا ہیڈ کانسٹیبل غضب سے مجھ پر جھپٹا۔ میرے جسم میں جیسے بجلی سی بھری ہوئی تھی۔ میں نے کانسٹیبل پر چھلانگ لگائی اور اسے اپنے ساتھ لیتا بیس پچیس فٹ نشیب میں لڑھک گیا... اور یہاں سرکنڈے تھے... سرکنڈے جو ہمیشہ سے چھپنے والوں کو پناہ فراہم کرتے رہے ہیں۔ کوئی بھی چھوٹے سے چھوٹا یا بڑے سے بڑا جاندار ہو سرکنڈا اسے اپنے اندر چھپا لیتا ہے... یہ خودرو پودا بعض اوقات پندرہ سولہ فٹ تک لمبا ہوتا ہے... عام طور پر یہ ہر وقت لہلہاتا رہتا ہے۔ اس کے اندر چھپنے اور بھاگنے والے کی حرکت کو نوٹ کرنا آسان نہیں ہوتا۔

سرکنڈوں میں گرنے کے بعد میں نے ہیڈ کانسٹیبل کی شکل دیکھی تو ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ یہ وہی خبیث تھا جو چند روز پہلے میرا دھکا کھا کر کنوئیں میں گرا تھا۔ اس کے کنوئیں میں گرنے کے بعد میں اور تیمور فرار ہونے میں کامیاب ہوئے تھے۔ ہیڈ کانسٹیبل نے کنوئیں میں گرنے کے بعد جو واویلا مچایا تھا، وہ میرے کانوں میں گونجنے لگا۔ میں نے اس کے تھوبڑے پر ایک زوردار مکا رسید کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ تم نے میرے ہاتھوں سے ہی مرنا ہے۔''

وہ چلا کر رہ گیا۔ میں نے رائفل کی نال اس کی گردن

سے لگا دی اور اسے اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا قبرستان کی مخالف سمت میں بڑھا۔ مجھے امید تھی کہ اب مجھ پر اندھا دھند گولی نہیں چلائی جائے گی۔

قبرستان کی طرف سے شور مچاتی آوازیں ابھر رہی تھیں۔

''اس طرف گیا ہے۔''

''نہیں، ادھر ہے۔''

''سوچ کیا رہے ہو... گولی چلاؤ۔''

''نہیں نہیں... رحمت اللہ بھی ساتھ ہے۔ گھیر کر پکڑو...''

آخر میں گالیاں تھیں۔ رونق کی موت کے خیال نے میرے اندر انگارے سے بھر دیے تھے۔ جی چاہ رہا تھا، ساری مصلحتیں بالائے طاق رکھ دوں۔ پولیس والوں پر سیدھی فائرنگ کروں۔ انہیں مارتا کاٹتا ہوا یہاں سے نکل جاؤں یا پھر ان سرکنڈوں کے اندر ہی ختم ہو جاؤں۔

میرے انداز نے رحمت اللہ کو مسمرائز سا کر دیا تھا۔ وہ گن پوائنٹ پر بے چون وچرا میرے ساتھ چلا آ رہا تھا۔ میرا ایک ہاتھ اس کی اونی جرسی کے گریبان میں تھا۔ یہ سرکنڈے بہت آگے تک چلے گئے تھے۔ شاید اگر میں چاہتا تو دو تین فرلانگ تک ان سرکنڈوں کے اندر ہی چل سکتا تھا۔

ایک جگہ زمین بہت دلدلی تھی۔ ہیڈ کانسٹیبل پھسل کر پہلو کے بل گر گیا۔ میں نے یہ موقع غنیمت جانا اور رائفل کے وزنی دستے کی دو طوفانی ضربیں اس کے سر اور گردن پر لگائیں۔ گردن پر لگنے والی ضرب زیادہ کارآمد ثابت ہوئی۔ ہیڈ کانسٹیبل رحمت اللہ قریباً بے سدھ ہو گیا۔ میں نے جلدی سے اس کی جرسی اور قمیص اتاری... اور خود پہن لی۔ پتلون اتارنے کا وقت نہیں تھا۔ موت کے ہرکارے تیزی سے میرے قریب آ رہے تھے۔ رحمت اللہ کی سرکاری ٹوپی سر پر رکھنے کے بعد میں ایک بار پھر آگے بڑھا۔ گہری دھند معاون ثابت ہو رہی تھی... لیکن یہی گہری دھند دشمن بھی ثابت ہوئی۔ کوئی جانور تیزی سے میری طرف بڑھا۔ میں اسے تب دیکھ سکا جب وہ مجھ سے صرف آٹھ دس قدم کی دوری پر تھا۔ شروع میں، میں نے اسے کتا سمجھا لیکن وہ جنگلی سور تھا بلکہ سورنی تھی۔ جنگلی سورنی اپنے بچوں کے ہمراہ زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ وہ تیر کی طرح میری طرف آئی۔ میں نے فقط دو تین فٹ کے فاصلے سے اس پر فائر کیا۔ گولی اس کی تھوتھنی میں لگی، وہ لہرا کر گری۔ اس کے عقب میں اس کے بچے تھے۔ میں نے بچوں کو تو دیکھا لیکن دھند اور سرکنڈوں کی وجہ سے اس نر کو نہ دیکھ سکا جس نے بائیں پہلو سے حملہ کیا۔ یہ عین یہی لگا جیسے کسی نے ہتھوڑے سے میرے کولہے پر ضرب لگائی ہو۔ چند سال پہلے مجھے پاشا کے بنگالی شیر نے اتنا نقصان نہیں پہنچایا تھا جتنا اس خبیث جانور نے پہنچا دیا۔ میں کئی فٹ دور بدبودار پانی کے ایک گڑھے میں گرا۔ چند لمحوں کے لیے رائفل بھی میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھل کر نکل سکتا، مجھے اپنی تین اطراف سے بھاگتے قدموں کی آوازیں آئیں۔

''اس طرف گیا ہے... اس طرف ہے۔'' یہ چنگھاڑتی ہوئی آواز میاں وارث کی تھی۔

پھر کسی نے مجھے دیکھ لیا اور للکارا۔ ''خبردار اوئے... گولی ماردیں گے۔''

میں نے مڑ کر دیکھا... بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ کم از کم چار رائفلیں میری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ ابھی مزید اہلکار آ رہے تھے۔ نرسور مجھے ناقابل تلافی نقصان پہنچا کر اوجھل ہو چکا تھا۔

اب مزاحمت کا مطلب خودکشی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے بھیگی ہوئی کیچڑ آلود رائفل ایک طرف پھینک دی۔ مجھے گریبان سے پکڑ کر گڑھے سے باہر کھینچا گیا اور تلاشی لی گئی۔ میاں وارث کا چہرہ آگ کی طرح دہک رہا تھا۔ اس نے میرے بالائی جسم پر رحمت اللہ کے کپڑے دیکھ لیے تھے۔

''رحمت اللہ کہاں ہے؟'' وارث نے مجھے سر کے بالوں سے جکڑ کر پوچھا۔

میں نے عقب میں سرکنڈوں کی طرف اشارہ کیا۔

''مار دیا ہے اس کو بھی؟'' وارث نے میرے سر کو وحشیانہ جھٹکا دیتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں، وہ صرف بے ہوش ہے۔''

میری ران کا چند دن پرانا زخم پھر خون اگلنے لگا تھا۔ اس کے علاوہ جہاں جنگلی سور کی خوفناک ٹکر لگی تھی، وہاں بھی زخم ہو گیا تھا اور مسلسل خون رس رہا تھا۔

میری تلاشی لینے کے بعد پولیس اہلکاروں نے مجھے بے دردی سے رائفلوں کے بٹ مارے اور گالیوں کی بوچھاڑ کی۔ پھر رحمت اللہ کی قمیص، ٹوپی اور جرسی میرے جسم سے علیحدہ کر لی گئی۔ مجھے یخ بستہ زمین پر اوندھا لٹایا گیا اور میرے ہاتھ پشت پر ہتھکڑی سے جکڑ دیے گئے۔ اب تک کی زندگی میں یہ پہلا واقعہ تھا جب مجھے باقاعدہ ہتھکڑی لگی تھی۔

قبرستان کی طرف ابھی تک فائرنگ جاری تھی۔ یہ فائرنگ زیادہ تر پولیس والوں کی طرف سے ہی ہو رہی تھی۔ پولیس اہلکار مجھے دھکیلتے اور گاہے بہ گاہے رائفل کے

www.pkdigest.com

بٹ مارتے ہوئے واپس قبرستان کی طرف لے چلے۔ جس سورنی کو میری گولی لگی، وہ اپنے ہی خون میں لت پت تھی اور ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ نیم بے ہوش رحمت اللہ کو اٹھا کر سرکنڈوں سے باہر لے جایا جا رہا تھا۔

سرکنڈوں سے باہر لے جا کر مجھے ایک بند جیپ میں بٹھا دیا گیا۔ تین رائفل بردار میرے اردگرد بالکل چوکس تھے۔ ان کی آنکھوں میں رحم کی کوئی رمق نہیں تھی۔ پاس ہی ایک دوسری جیپ کھڑی تھی۔ یہ چھت کے بغیر تھی۔ اس میں پولیس کی آہنی ٹوپیوں، رائفلوں اور ایمونیشن کی چوبی پیٹیوں کے ساتھ ساتھ مجھے وہ ٹیپ ریکارڈر بھی نظر آیا جو رونق علی سے چھینا گیا تھا۔ ایک مسلح حوالدار ٹیپ ریکارڈر کے پاس موجود تھا۔ میرا اور ٹیپ ریکارڈر کا فاصلہ بہ مشکل تیس فٹ ہوگا لیکن اب یہ ناقابلِ عبور فاصلہ بن چکا تھا۔ ایک اور لرزہ خیز منظر دو لاشوں کا تھا۔ یہ لاشیں زمین پر پڑی تھیں اور ان پر کپڑا ڈال دیا گیا تھا۔ خون کے دھبے کپڑے پر بھی نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک لاش کافی فربہ تھی۔ میرا دل رونق کے خیال سے کٹ کر رہ گیا۔

میاں وارث نے مجھ پر ایک قہرناک نظر ڈالی... اور اپنے اہلکاروں سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”میں آ رہا ہوں پانچ منٹ میں... بالکل چوکس بیٹھو... تمہیں پتا ہے، یہ اپنے زمانے کا شیر شاہ سوری ہے۔“

”بے فکر رہیں جناب! اس کی ساری شیر شاہی ناک کے راستے نکال دیں گے۔ یہ بلی کی طرح میاؤں میاؤں نہ کرے تو پھر ہم آپ کے نوکر تو نہ ہوئے۔“ ایک لمبے تڑنگے اے ایس آئی نے بھاری مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

ایک ہیڈ کانسٹیبل نے آگے بڑھ کر ایک بار پھر میری ہتھکڑی چیک کی اور اطمینان سے سر ہلایا۔

میاں وارث کے قبرستان کی طرف جانے کے بعد ایک بار پھر فائرنگ میں تیزی آ گئی۔ یہ تیزی چار پانچ منٹ تک برقرار رہی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ پولیس والے اب قبرستان میں کچھ اور آگے چلے گئے تھے۔ انہوں نے شاہ نواز کے ایک زخمی ساتھی کو پکڑ لیا تھا اور اسے کھینچتے ہوئے جیپوں کی طرف لا رہے تھے۔ دو افراد اس سے پہلے پکڑے جا چکے تھے۔

کچھ دیر بعد میاں وارث واپس آیا تو میں نے اس سے کہا۔ ”اگر تم کہو تو میں اندر موجود لوگوں سے بات کرتا ہوں۔ وہ لڑنا نہیں چاہتے۔ وہ گرفتاری دینا چاہتے ہیں۔ بس انہیں ڈر ہے کہ...“

میرا فقرہ بھی مکمل نہیں ہوا تھا کہ میاں وارث نے ہاتھ گھمایا اور الٹے ہاتھ کا زوردار تھپڑ میرے چہرے پر لگا۔ میں نشست پر ہی ایک طرف کو جھک گیا۔ منہ میں خون کا نمکین ذائقہ گھل گیا۔ وارث دہاڑا۔ ”ہمیں کسی کتے سے یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں کہ ہمیں کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔“

پھر اس نے اپنے ساتھی ایس آئی کو کچھ ضروری ہدایات دیں اور اچھل کر جیپ میں بیٹھ گیا۔ چند ہی لمحے بعد جیپ کچے راستے پر دھول اڑاتی تیزی سے سرکنڈوں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔ قبرستان میں ہونے والی فائرنگ کی آوازیں پیچھے رہتی جا رہی تھیں۔ سردیوں کی کمزور زرد دھوپ درختوں کی چوٹیوں پر چمک رہی تھی۔ گہری دھند مسلسل اس دھوپ کا راستہ روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میرا بالائی جسم عریاں تھا۔ ہوا برچھیوں کی طرح جسم پر لگ رہی تھی۔ کولہے کی چوٹ تکلیف دے رہی تھی۔

”کہاں لے جا رہے ہو مجھے؟“ میں نے ہمت کر کے پوچھا۔

”گھبرا مت۔ جہاں بھی لے جائیں گے وہ جگہ تیری شان کے مطابق ہوگی۔“ میاں وارث نے زہرخند لہجے میں کہا۔ ”آخر تو کوئی معمولی بندہ نہیں ہے۔ اپنی ہوشیاریوں کی وجہ سے بہت بڑا چودھری بن چکا ہے۔ بڑی اونچی گُڈی ہے تیری... اور پھر تو ایک بہت بڑے خاندان کا جوائی بھی تو ہے۔ ہم نے تجھ سے کوئی گستاخی کی تو اپنے پیروں پر لات [illegible] تھوڑی ماری ہے... [illegible]“

میں خاموش ہو گیا۔ جیپ ہوا میں اڑتی رہی۔ ابھی دن کی عام چہل پہل شروع نہیں ہوئی تھی۔ اکثر راستے سنسان تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ مجھے کسی قریبی تھانے یا چوکی میں لے جایا جا رہا ہے۔ وہاں جا کر کیا ہوگا؟ میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا... لیکن اگلے آدھ گھنٹے میں جو کچھ ہوا، وہ میری توقع کے بالکل برخلاف تھا۔

پولیس کی جیپ درختوں کے ایک ویران جھنڈ میں رکی۔ یہاں ایک نیلی ڈاٹسن کار موجود تھی۔ کار پر گوجرانوالہ کا نمبر تھا۔ اس کے شیشے رنگ دار تھے۔ قریب ہی دو مسلح دیہاتی موجود تھے۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں نے ان میں سے ایک بندے کو کہیں دیکھا ہوا ہے۔ مجھے کھینچ تان کر پولیس جیپ سے اتارا گیا اور کار میں سوار کر دیا گیا۔ لیکن کار میں سوار کرنے سے پہلے میری جوتی اتروا لی گئی۔ اس کے علاوہ مجھے ایک کچے راستے پر تھوڑا سا چلایا بھی گیا۔ ان دونوں ”حرکات“ کی وجہ چند گھنٹے بعد میری سمجھ میں آئی۔

کار میں سوار ہونے کے فوراً بعد مجھے کچھ کچھ اندازہ ہو گیا کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ کار نے تیزی کے ساتھ سفر کیا۔ کار کے اندر مکمل خاموشی اور شدید تناؤ تھا۔ ایک سفید پوش پولیس اہلکار بھی کار میں موجود تھا۔

میں نے ایک بار پھر پوچھا۔ ”کہاں لے جا رہے ہو مجھے؟“

وہ اطمینان سے بولا۔ ”ڈسکے... وہاں تمہیں سیخ کباب اور تکے وغیرہ کھلائیں گے۔“

”لیکن یہ رستہ تو قلعہ والا کو جاتا ہے۔“

پولیس والے نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”دراصل تمہیں اپنی بیوی سے محبت ہی اتنی تھی کہ ہر راستہ تمہیں اپنے سسرال کا راستہ لگتا ہے۔ واہ! میاں بیوی میں سلوک ہو تو ایسا... یہ تو شکر کا مقام ہے کہ جوان جہان بیوی کی اچانک موت نے تمہیں دیوانہ نہیں کر دیا... ورنہ بہت سے لوگ تو ایسی موت کے بعد کسی کام کے نہیں رہتے۔“

اب قلعہ والا کی آبادی سامنے نظر آ رہی تھی۔ جلد ہی ہم آصف جاہ کی مشہور و معروف حویلی میں داخل ہوئے اور احاطے میں درختوں کے نیچے رک گئے۔ شکاری کتوں کی لرزہ خیز آوازیں ایک بار پھر میرے کانوں میں پڑنے لگی تھیں۔ یہ وہی سلوکی ہاؤنڈز تھے جن کی خون آشامی میں نے پانچ چھ دن پہلے دیکھی تھی۔ ان میں سے چار کتے تو میرے اور تیمور کے ہاتھوں ہلاک ہوئے تھے۔ باقی یقیناً آصف جاہ کے پاس ہی تھے۔ اندازہ تھا کہ ان کتوں کی تعداد پھر پوری کر لی گئی ہوگی یعنی اب وہ پھر آٹھ ہوں گے۔

مجھے گاڑی سے اتارا گیا اور کچھ ہی دیر بعد میں حویلی کے ایک شاندار اندرونی کمرے میں آصف جاہ کے روبرو تھا۔ اپنے ڈیل ڈول کی طرح آصف جاہ کا چہرہ بھی بہت بڑا اور دبنگ تھا لیکن اس وقت تو یہ چہرہ کچھ اور بھی دبنگ بلکہ ہولناک نظر آ رہا تھا۔ آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی تھیں۔ نشے سے نقوش بگڑے ہوئے تھے۔ بیڑی کا دھواں اس کے اردگرد پھیلا ہوا تھا۔

مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں عجیب جنونی کیفیت ابھری۔ وہ اپنے کارندوں سے گرج کر بولا۔ ”اوئے! کیا کرتے ہو؟ کیوں پکڑا ہوا ہے ان کو... پتا نہیں ہے، یہ اس حویلی کے جوائی ہیں۔ چھوڑو ان کو۔ پلنگ پر سفید کھیس بچھاؤ ان کے لیے۔“

مجھے فوراً چھوڑ دیا گیا۔ بہرحال، میرے ہاتھ بہ دستور میری پشت پر ہتھکڑی میں جکڑے رہے۔ ایک کارندہ جلدی سے گیا اور بالکل نیا نکور سفید کھیس لے آیا۔ کھیس پلنگ پر بچھا دیا گیا۔

”بیٹھو، داماد جی۔“ آصف جاہ نے پلنگ کی طرف اشارہ کیا۔ میں جھجکتا ہوا بیٹھ گیا۔

میرے پاؤں ابھی تک ننگے تھے اور گرد میں لتھڑے ہوئے تھے۔ آصف جاہ نے کہا۔ ”او ہو داماد جی! تمہارے پاؤں کا تو ستیاناس ہو رہا ہے۔“ پھر وہ اپنے ملازموں سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”اوئے! او دیکھتے کیا ہو۔ بیٹا جی کے پاؤں شاؤں دھلواؤ۔“

”نہیں جی۔ آپ تکلیف نہ کریں۔ میں خود دھو لیتا ہوں...“

”نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تم اس حویلی کے لیے عزت کی جگہ پر ہو۔ تمہاری چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا خیال رکھنا ہمارا فرض ہے۔ یہاں کے ملازم تو تمہارے پاؤں دھو دھو کر پئیں تو بھی کم ہے۔ تم ان کی چھوٹی بی بی کے مجازی خدا ہو... اور مجازی خدا تو پھر مجازی خدا ہی ہوتا ہے۔“ آصف جاہ کے لہجے میں بے شمار زہر تھا۔

”دیکھیں آصف صاحب! میں آپ سے اکیلے میں بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”او باتیں وغیرہ بھی ہوتی رہیں گی داماد جی... پہلے ذرا سانس تو لے لو۔ تھوڑا سا کھا پی لو۔ ہم لوگ جوائیوں کی خاطر میں کسی طرح کی کمی نہیں رہنے دیتے اور کمی رہنی بھی نہیں چاہیے... سچی بات یہ ہے کہ یہ جوائی جو ہوتا ہے نا اس کے ساتھ معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے۔ جوائی کے ماتھے پر ذرا بل آ جائے تو بیٹی کے لیے بلکہ سارے گھرانے کے لیے خطرے کی گھنٹی بج گئی۔ بیٹی کی شادی کے بعد اس کی خوشی کا سارا اختیار جوائی کے پاس ہی چلا جاتا ہے اور جن کی بیٹیاں ذرا زیادہ لاڈلی ہوتی ہیں، ان کی جان تو ہر وقت جوائی اور جوائی کے گھر والوں کے شکنجے میں رہتی ہے۔“

”میں جانتا ہوں آصف صاحب! آپ کا غم بہت بڑا ہے۔ میں اسی بارے میں آپ سے ایک بالکل خاص بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں آپ کو...“

”یار جی! پھر وہی بات کرتے جا رہے ہو۔ میں تمہیں بتا تو رہا ہوں کہ تسلی سے ساری بات کریں گے۔ بالکل بے فکر رہو۔“

اسی دوران میں دو لڑکیاں ایک پیتل کی پرات لے کر آ گئیں۔ ساتھ میں گرم پانی کے دو بڑے بڑے لوٹے تھے۔

جب میں پچھلی دفعہ والدہ کے ساتھ یہاں آیا تھا تو بھی رسم کے مطابق ملازماؤں نے والدہ کے پاؤں پرات میں رکھ کر

www.pkdigest.com

دھوئے تھے۔ بعدازاں میرے بہت انکار کے باوجود میرے پاؤں بھی دھوئے گئے تھے۔

اب پھر وہی عمل ہو رہا تھا مگر اس مرتبہ اس عمل کے پیچھے میزبانی کے بجائے شدید قسم کا طنز اور تشدد پوشیدہ تھا۔ آصف جاہ کے اصرار پر مجھے اپنے پاؤں پیتل کی پرات میں رکھنا پڑے۔ پاؤں واقعی بہت گندے ہو رہے تھے۔ خوبرو ملازمہ نے پہلے اپنے ہاتھوں سے تھوڑی سی مٹی جھاڑی پھر گرم پانی والا لوٹا پاؤں کی طرف بڑھایا۔ ایک لمحہ پہلے مجھے احساس ہوا کہ کوئی گڑبڑ ہے لیکن تب تک دیر ہو چکی تھی۔ ملازمہ پلاسٹک کے لوٹے کو ٹونٹی کی طرف سے پکڑ کر میرے پاؤں پر انڈیل چکی تھی۔ یہ تقریباً ابلتا ہوا پانی تھا۔ مجھے لگا جیسے میرے دونوں زخمی پاؤں آگ میں ڈال دیے گئے ہیں۔ میں نے تڑپ کر پاؤں پیچھے ہٹا لیے۔ مگر تب تک پانی اپنا کام کر چکا تھا۔ پاؤں پاؤں کی اوپری کھال کباب ہو چکی تھی۔ کچھ دیر بعد کھال کا کافی حصہ اوپر سے اتر گیا۔

آصف جاہ نے چلا کر ملازمہ سے کہا۔ ''او کڑیے! یہ کیا کر دیا تو نے۔ خانہ خراب! تو نے دیکھا نہیں تھا پانی کو؟''

وہ خاموشی سے پیچھے ہٹ گئی۔ ظاہر ہے کہ اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ وہی کچھ کر رہی تھی جو اس سے کہا گیا تھا۔

آصف جاہ نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''چلو تم سب لوگ باہر جاؤ۔ کیا مجمع لگا رکھا ہے تم نے یہاں۔'' اس کا اشارہ [illegible] ملازموں کی طرف تھا۔

وہ سب باہر چلے گئے۔ فقط آصف جاہ کے دو خاص الخاص کارندے وہاں رہ گئے۔ مجھے ان کے نام شیر افگن اور مولوی مظفر معلوم ہوئے تھے۔

آصف جاہ نے منہ سے چچ چچ کی آواز نکالی... اور بولا۔ ''یہ ساری اس الو کی پٹھی کی غلطی ہے، میں اسے الٹا لٹکواؤں گا۔'' پھر اس نے اپنے بڑے سائز کے سفید رومال سے میرے گیلے پاؤں کو پونچھا تو پاؤں کی بالائی کھال بھی رومال کے ساتھ لگ گئی۔ آصف جاہ نے ایک بار پھر چچ چچ کی آواز نکالی اور تاسف سے سر ہلایا۔

میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''آصف جاہ صاحب! آپ مجھ سے جہاں اور جتنی بڑی قسم چاہیں لے لیں، شہوار کے قتل میں... میرا کوئی ہاتھ نہیں۔ میں نے تو...''

''پتر جی! کہا تو ہے کہ تم سے ساری بات سنوں گا۔'' آصف نے ایک بار پھر تیزی سے میری بات کاٹی۔ پھر دونوں کارندوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔ ''ان کو ذرا جا لینے دو پھر اپنے اپنے دکھڑے کہتے ہیں۔'' اس کے بعد آصف جاہ نے میرے زخمی پاؤں پر برنال وغیرہ لگا کر پاؤں کی مرہم پٹی کروائی۔ یہاں پھر ایک قابل ذکر واقعہ ہوا۔ دونوں پاؤں پر پٹیاں باندھ کر انہیں آپس میں بھی ایک دوسرے سے باندھ دیا گیا۔ یعنی دونوں پاؤں جکڑ دیے گئے۔ یہاں احتجاج کا موقع تھا اور نہ ہی اس کا کوئی فائدہ تھا۔

اسی دوران میں دو ملازم کھانا لے آئے۔ اب دوپہر ہونے والی تھی۔ میں نے ناشتا نہیں کیا تھا۔ اس کے باوجود بھوک کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ ذہن مسلسل قبرستان کے معرکے میں الجھا ہوا تھا۔ کچھ پتا نہیں تھا کہ تیمور اور دیگر ساتھیوں کا کیا بنا ہے۔

کھانا بڑے اہتمام سے لایا گیا تھا۔ دو بڑے بڑے گول ٹرے تھے جن میں پھول دار خوان بچھے ہوئے تھے۔ گرم پلاؤ سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ مختلف اقسام کے سالن تھے۔ ساتھ میں تلی ہوئی مچھلی کے بڑے بڑے ٹکڑے تھے۔

آصف جاہ بولا۔ ''چلو، پہلے تھوڑی سی پیٹ پوجا کر لیں۔ میں نے بھی صبح بس تھوڑی سی شردائی ہی پی تھی۔''

''مجھے بھوک نہیں ہے۔'' میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ پاؤں کی جلن ناقابل برداشت تھی۔

''کھانا شروع کرو گے تو بھوک بھی لگ جائے گی داماد جی... اور پھر مچھلی بھی ہے۔ یہ تو تمہاری پسندیدہ شے ہے۔ کوئی فارمی مچھلی نہیں ہے یہ۔ فارمی مچھلی ہم ساری کتوں کو ڈال دیتے ہیں۔ یہ اصلی راوی دریا کی رہو ہے۔''

''اس وقت میرا بالکل دل نہیں چاہ رہا۔''

''پتر جی! کیسی بات کرتے ہو۔ ایسی سردی میں تو تمہارے جیسے جوان جہان بندے مچھلی پر ٹوٹ پڑتے ہیں... اور پھر اپنے سسرال میں تو مچھلی اور تنگڑ بٹیرے وغیرہ کھانے کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔'' آصف جاہ کے لہجے کی تہ میں طنز آمیز نفرت کی آگ چھنکار رہی تھی۔

مجبوراً مجھے کھانے میں شریک ہونا پڑا۔ ذہن میں... ان گنت اندیشے کلبلا رہے تھے۔ پتا نہیں تھا کہ آصف جاہ میرے ساتھ کیا سلوک کرنے جا رہا ہے۔ یہ کھانا جو میں کھا رہا تھا، یہ بھی مشکوک تھا۔ اس کھانے کے بعد میں کسی طرح کی بے ہوشی یا پھر موت کا شکار بھی ہو سکتا تھا۔ آصف جاہ مجھے اصرار کر کے کھانا کھلا رہا تھا۔ میری ہتھکڑی کھول دی گئی تھی تاہم مسلح محافظ کمرے کے اندر اور باہر موجود تھے۔ میرے پاؤں مسلسل مضحکہ خیز حالت میں بندھے ہوئے تھے۔ یہ حالت ایسی تھی کہ مجھے خود اپنے آپ پر ہی ترس آنا شروع ہو

گیا تھا۔ جسم زخموں سے چور تھا۔ سرکنڈوں کا کیچڑ شلوار اور بالائی جسم پر خشک ہو چکا تھا اور مجھے اسی حالت میں بے حد اصرار کے ساتھ کھانا کھانے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔

پیٹ بھر گیا تو میں نے ہاتھ ہٹا لیا اور اس وقت آصف جاہ نے اصل کھیل شروع کیا۔ وہ بڑی ''محبت'' سے بولا۔ ''اور کھاؤ داماد جی! داماد جتنا زیادہ ٹھونس ٹھونس کر کھاتے ہیں سسرالیوں کا دل اتنا ہی باغ باغ ہو جاتا ہے۔ چلو کھاؤ شاباش۔''

میں سمجھ گیا کہ آصف جاہ بدترین ہتھکنڈوں پر اتر رہا ہے۔ اچانک دو افراد نے مجھے دائیں بائیں سے دبوچ لیا۔ تیسرے نے پستول نکال لیا اور زہرناک لہجے میں بولا۔ ''کھاؤ جناب! بڑے لیڈر صاحب اتنی محبت سے کہہ رہے ہیں۔''

''آصف صاحب! آپ بہت بڑی غلطی کر رہے ہیں... بلکہ یہ دہری غلطی ہے۔ ایک طرف آپ مجھ بے گناہ کو ماردیں گے، دوسری طرف میری بیوی اور آپ کی بیٹی کے اصل قاتل آپ کے سامنے دندناتے رہیں گے۔ اصل قاتل چودھری عزیز تھا... اور موکل ہیں۔ میں آپ کو پوری تفصیل سے بتا دیتا ہوں اور ثبوت بھی دیتا ہوں... اگر آپ...''

میری بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ آصف جاہ نے کھڑے کھڑے زوردار ٹھوکر میرے منہ پر رسید کی۔ ایک بار پھر منہ کے اندر خون کا نمکین ذائقہ گھل گیا۔ آصف جاہ بے پناہ قہر سے دہاڑا۔ ''کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ مچھلی کھلاؤ اس کو... آج جتنی بھی مچھلی ہے ساری اس کو کھانی ہے۔ اس کے گلے تک مچھلی ٹھونس دو۔ اگر ٹکڑا بھی بچا تو میں وہ ٹکڑا...'' وہ اتنے طیش میں تھا کہ اپنے ملازموں کے ساتھ بھی بدزبانی پر اتر آیا تھا۔

لمحوں میں میرے لیے جیسے قیامت برپا ہو گئی۔ میرے پاؤں بدستور سفید رنگ کی سوتی پٹی میں جکڑے ہوئے تھے۔ شیر افگن اور مظفر نے مجھے دائیں بائیں سے دبوچ لیا۔ ایک پہلوان نما کارندے نے میرے گلے میں مفلر ڈال کر پیچھے کی طرف کھینچا۔ بے ساختہ میرا منہ کھل گیا۔ ایک شخص نے میری باچھوں میں ہاتھ دیا اور دوسرا زبردستی مچھلی میرے منہ میں ٹھونسنے لگا۔ وہ مچھلی پوری طرح میرے منہ میں نہیں ٹھنسی سکا۔ کچھ میرے نتھنوں میں چلی گئی۔ کچھ اس نے میرے منہ پر مل دی۔ ایک اور شخص نے میری باچھوں میں انگلیاں دے رکھی تھیں اور ساتھ ساتھ پھنکار رہا تھا۔ ''منہ کھولو چودھری صاحب... منہ کھولو جی۔''

لگتا تھا کہ وہ وحشت کے عالم میں میری باچھیں چیر کر رکھ دے گا۔ پس منظر میں کتوں کا شور تھا جو کبھی کم اور کبھی زیادہ ہو جاتا تھا۔

اب یہ سب کچھ میری برداشت سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔ میرے لہو میں چنگاریاں سی چھوٹ گئیں۔ میں نے نتائج سے بے پروا ہو کر سر کی ایک زوردار ٹکر پہلوان نما شخص کی ناک پر رسید کی۔ وہ اس زبردست حملے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا بلکہ شاید ان میں سے کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ وہ سب یہی سمجھ رہے تھے کہ مجھ پر پوری طرح حاوی ہو چکے ہیں۔ پہلوان ٹکر کھا کر دور جا گرا۔ مجھے زبردستی مچھلی کھلانے والے کے چہرے پر میرا طوفانی گھونسا لگا۔ اس کا جبڑا چٹخنے کی مدھم آواز ابھری۔ اپنے دونوں جڑے ہوئے پاؤں میں نے ایک تیسرے شخص کے سینے پر رسید کیے۔

اس کے بعد کچھ دیر کے لیے حویلی کے اس کمرے میں زلزلہ سا برپا ہو گیا۔ میں نے آصف جاہ کے کارندوں کو کاری ضربیں لگائیں۔ انہوں نے کئی بار مجھے دبوچنا چاہا لیکن میں ہر بار مچھلی کی طرح تڑپ کر ان کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ میری سب سے بڑی مجبوری میرے بندھے ہوئے پاؤں تھے۔ اگر میرے پاؤں آزاد ہوتے تو شاید چند لمحوں میں لڑائی کا نقشہ بدل جاتا۔ تاہم میں اب بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھ رہا تھا۔ بعد میں تو میرے ساتھ جو کچھ ہونا تھا وہ ہونا تھا لیکن اب میں دل کی بھڑاس پوری طرح نکال لینا چاہتا تھا... اور میں نے حقیقی معنوں میں لیڈر آصف اور اس کے گماشتوں کو بوکھلا کر رکھ دیا۔ ایسی خوفناک مزاحمت کی توقع ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔

اب آصف جاہ کے ہاتھ میں پستول تھا مگر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس پستول کا کیا کرے۔ وہ چلا رہا تھا۔ ''مارو اس کو... مارو۔''

لیکن مارنے والے تعداد میں کافی زیادہ ہونے کے باوجود بے بس ہو گئے تھے۔ ان میں سے کئی ایک تو بری طرح لہولہان تھے۔ ان کی آنکھوں میں ناچتا ہوا خوف اس بات کا گواہ تھا کہ میں نے اس چھت کے نیچے مزاحمت کا حق ادا کر دیا ہے۔ اسی دوران میں پھل کاٹنے والی وہ چھری میرے ہاتھ میں آ گئی جو کھانے کی خوب صورت گول ٹرے میں رکھی تھی۔ میں نے دیوانہ وار چھری چلا کر دو افراد کو زخمی کیا، پھر میں نے چھری سے اپنے پاؤں کو باہم جوڑنے والی پٹی کاٹنے کی کوشش کی۔ میری پہلی کوشش جزوی طور کامیاب ہوئی۔ اس سے پہلے کہ میں دوسری کوشش کر...

عقب سے کوئی وزنی شے میرے سر سے ٹکرائی۔ میں پہلو کے بل گر گیا... اس کے بعد... آصف کے کارندوں نے مجھے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا... وہ کالی بھڑوں کی طرح مجھ سے چمٹ گئے... چھری میرے ہاتھ سے چھین لی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ لوگ ایک بار پھر مجھے الٹی ہتھکڑی لگانے میں کامیاب ہو گئے۔

آصف جاہ کا پارہ جیسے آسمان کو چھو رہا تھا۔ میں نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا، اس کے ہاتھ میں چمڑے کا کوئی تین میٹر لمبا کوڑا تھا۔

وہ خوفناک آواز میں بولا۔ ''تُو نے میری بچی کو جتنا تڑپایا ہے، میں اس سے ہزار گنا زیادہ تڑپاؤں گا تجھے... اور ساتھ ساتھ تیرے گھر والوں کو بھی۔ ایک ایک سے گن گن کر حساب لوں گا... گن گن کر حساب لوں گا۔''

اس کے ساتھ ہی کوڑا شائیں کی مخصوص آواز سے حرکت میں آیا اور میری ننگی کمر پر جیسے کسی نے دہکتی ہوئی سلاخ رکھ دی۔

میں سینے کی پوری قوت سے چلایا۔ ''آصف! میں نے تیری بچی کو نہیں مارا... میں نے نہیں مارا۔''

''تُو نے مارا ہے کتے... طریقہ کوئی بھی ہو مگر اسے موت کے منہ تک تُو نے ہی پہنچایا ہے۔''

اس نے مجھ پر کوڑوں کی بارش کر دی۔ کوڑے کی مار کوئی معمولی مار نہیں ہوتی... بندے کو اذیت پہنچانے کا یہ طریقہ... ان گنت زمانوں سے یونہی اتنا مقبول نہیں ہے۔ کئی چوٹیں جسم کو سن کر دیتی ہیں، کئی کچھ دیر بعد اپنا اثر کھونے لگتی ہیں لیکن یہ کوڑا تو شاید بے ہوش یا نیم مردہ شخص کو بھی اذیت کا احساس دلانے میں کامیاب رہتا ہے۔

میں قالین پر ماہی بے آب کی طرح تڑپتا رہا اور آصف جاہ مجھے مارتا رہا۔ میں بہت ضبط کر رہا تھا مگر کسی وقت بے ساختہ چلانے پر مجبور بھی ہو جاتا تھا۔ آخر میری ہمت جواب دے گئی اور مجھ پر غشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔

غشی کی یہ کیفیت پہلے بہت گہری تھی، پھر اس میں کچھ کمی واقع ہونے لگی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ مجھے دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹا دیا گیا ہے۔ میرے تصور نے مجھے شہوار کی شبیہ دکھائی۔ وہ سامنے ایک زرنگار کرسی پر بیٹھی تھی۔ زرق برق کپڑوں میں وہ بہت حسین لگ رہی تھی... شاید شام ہونے والی تھی۔ شہوار کی آنکھوں میں خوب صورت رنگ تھے۔ ہر نوبیاہتا دلہن کی طرح اس کے نینوں میں بھی ایک محبت بھرا بستر بچھا ہوا تھا۔ اس کی چوڑیاں کھنکھنا رہی تھیں، اس کے رخسار کو دے رہے تھے۔

...لیکن پھر میں نے تصور کی نگاہ سے دیکھا کہ ایک دم شہوار کا چہرہ بجھ گیا ہے۔ وہ اسی طرح زرنگار کرسی پر بیٹھی رہی۔ گجروں سے لدی ہوئی اور تازہ پھولوں سے مہکی ہوئی... مگر اس کے لباس پر خون کے بڑے بڑے دھبے نمودار ہو گئے۔ وہ الوداعی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس نے اپنے ہونٹوں کو حرکت دی۔ ''خدا حافظ خاور... میں جا رہی ہوں، ہمارا ساتھ بس اتنا ہی تھا۔''

میں تصور ہی تصور میں اس کی طرف لپکا۔ اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑا۔ ''نہ جاؤ شہوار... واپس آ جاؤ... تم چلی گئیں تو لوگ مجھے گناہ گار ٹھہرائیں گے۔ میری گردن میں پھانسی کا پھندا ڈالیں گے۔ نہ جاؤ شہوار...''

''نہیں خاور... میں نہیں رک سکتی۔ میری سانسیں بس اتنی ہی تھیں۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ پھر یہ آنکھیں بند ہونے لگیں۔

میرے تصور نے مجھے دکھایا۔ آصف جاہ ایک جلاد کی صورت میرے سامنے کھڑا تھا... اس کی آنکھوں میں پتلیوں کی جگہ دو انگارے تھے۔ قدیم زمانے کے جلادوں کی طرح اس کے ہاتھ میں ایک وزنی کٹار تھی۔ میں آصف کی طرف متوجہ ہوا۔ اس سے پکار کر کہا۔ ''آصف صاحب! دیکھ لو... آپ کی بیٹی اور میری بیوی ابھی مری نہیں ہے۔ اس کی کچھ سانسیں ابھی باقی ہیں۔ اس سے پوچھ لو... میں نے اس پر کوئی ظلم نہیں کیا۔ میں نے اپنی طاقت اور ہمت کے مطابق اسے خوش رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے غصے اور اس کی ناراضی کو بھی جھیلا ہے... اور میں نے اسے مارا بھی نہیں ہے۔ اسے مارنے والے کوئی اور ہیں... پوچھ لو اس سے...''

آصف جاہ کی آنکھوں کے انگارے اور زیادہ دہکنے لگے... میں نے مڑ کر دیکھا تو شہوار مردہ نظر آئی...

غشی کی یہ کیفیت نہ جانے کتنی طویل تھی تاہم اس کیفیت میں آہستہ آہستہ کمی واقع ہو رہی تھی۔ اب مجھے اردگرد کی مدھم آوازیں کسی دور افتادہ بازگشت کی طرح سنائی دینے لگی تھیں۔ حویلی کے کسی حصے میں خوں خوار تھوتھنیوں والے سلوکی ہاؤنڈز شور مچا رہے تھے۔ پھر میرے کانوں میں آصف جاہ کی آواز پڑی۔ وہ شاید مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ ''ہاں، کیا پتا چلا؟'' اس کی گونج دار آواز ابھری۔

جواب میں شاید مظفر نے کہا۔ ''چودھری خاور کی ماں بہن کا پتا چل گیا ہے جی۔ وہ دونوں کیکراں والی گاؤں میں ہیں... یہ بیگم بلقیس کی خالہ زاد کا گھر ہے جی...''

www.pkdigest.com

''پوری طرح تصدیق کر لی ہے تم نے؟'' آصف جاہ کی آواز میں دبا دبا جوش تھا۔

''بالکل لمبڑ دار جی۔''

''ان دونوں عورتوں کو یہاں لانے کے لیے تمہیں کتنا وقت چاہیے؟'' لمبڑ دار آصف جاہ نے پوچھا۔

''میں تو انہیں دو تین گھنٹوں میں یہاں لا سکتا ہوں جی... پر مسئلہ اور ہے۔''

''کیا مسئلہ؟'' آصف جاہ پھنکارا۔

''جاگیر کی بیگم جی سامنے آگئی ہیں۔ انہوں نے علی الاعلان کہہ دیا ہے کہ وہ چودھری خاور کی والدہ اور بہن کی ہر طرح حفاظت کریں گی۔ انہوں نے اپنے گارڈز اور کوئی ایک سو گھڑ سوار فوری طور پر نگراں والی بھیج دیے ہیں۔ اب وہاں سے ان دونوں عورتوں کو لانا آسان نہیں ہے۔''

''یہ تھانے دار وارث کس مرض کی دوا ہے؟''

''وارث صاحب بھی کچھ آگے پیچھے ہو رہے ہیں جی۔ ظاہر ہے کہ وہ بیگم جی سے پوری طرح بگاڑ تو نہیں سکتا۔ دوسرے اس نے بیگم جی اور چودھری عزیز سے کچھ پیسا بھی کھایا ہوا ہے۔''

یہ آوازیں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح میرے کانوں میں اتر رہی تھیں۔ آصف جاہ کا انتقام اب مجھ سے آگے میری والدہ اور بہن تک پہنچ رہا تھا۔ تو پھر کیا ایسی زندگی سے موت بہتر نہیں تھی؟ میرا دل چاہا کہ میں ایک بار پھر تڑپ پھڑک کر اس جال سے نکلنے کی کوشش کروں یا اس جال کو توڑ دوں یا یہیں پر زندگی ہار جاؤں۔ باگو بھی تو مر گیا تھا۔ چودھری نشاط اور روشن علی بھی تو زندگی ہار گئے تھے۔ زندگی سے بھرپور جواں سال شہوار بھی چلی گئی تھی۔ دنیا میں آنے اور جانے کا سلسلہ ایسے ہی چلتا رہتا ہے۔ کسی ایک کے آنے یا جانے سے کیا فرق پڑتا ہے۔

میرے چہرے اور سینے پر پانی کے چھینٹے دیے گئے۔ یخ بستہ پانی کے سبب جلد ہی میرے حواس بحال ہونے لگے۔ میرے ہاتھ الٹی ہتھکڑی میں تھے۔ ہتھکڑی کی سختی میری زخمی کلائیوں کو مزید زخمی کر رہی تھی۔ میرے پاؤں کو اب بینڈیج والی پٹی کے بجائے رسی سے باندھ دیا گیا تھا۔ کوڑے کی مار سے میرا پورا جسم جل رہا تھا۔ میں قالین پر پہلو کے بل پڑا تھا۔

کچھ دیر بعد میں نے دیکھا کہ کمرے میں میرے اور آصف جاہ کے سوا اور کوئی نہیں۔ آصف جاہ رنگین پایوں والی کرسی پر ٹانگ چڑھائے بیٹھا تھا۔ اس کی اونچی نوک والی چمکیلی جوتی کا رخ میری طرف تھا۔ اس نے شراب کا گھونٹ بھرا، پھر بیڑی کا ایک طویل کش لے کر بولا۔

''تجھے پتا ہے کہ اس صندوق میں کیا ہے؟''

آصف جاہ کے سامنے قالین پر ایک بڑا اٹیچی کیس پڑا تھا۔ یہ ریکسین کا بنا ہوا تھا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

آصف جاہ نے اٹیچی کھولی۔ اس میں کچھ کھلونے تھے۔ کپڑے کی چھوٹی اور بڑی گڑیاں تھیں۔ کپڑے تھے جن کے سائز دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک جوان ہوتی بچی کے کپڑے ہیں۔ کاپیاں اور کتابیں تھیں... پراندے اور اوڑھنیاں تھیں۔ آصف جاہ عجیب ہیجانی لہجے میں بولا۔ ''یہ سب چیزیں اس بچی کی ہیں جسے میں نے پال پوس کر پورا پورا بڑا کیا تھا۔ میں جس کو دیکھ کر جیتا تھا اور جو آنکھوں سے اوجھل ہوتی تھی تو آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا تھا۔ میں نے اس نازوں کی پالی کو تیرے حوالے کیا تھا اور تجھے اس کے سیاہ سفید کا مالک بنا دیا تھا۔ اس وقت مجھے پتا نہیں تھا کہ میں اسے ایک انسان کے بجائے ایک جانور کے حوالے کر رہا ہوں۔ وہ جانور اسے مرنے دے گا نہ جینے دے گا۔ وہ اسے مارے گا بھی اور رونے پر بھی پابندی لگائے گا۔ وہ اس کے گھر سے جوتیں کھا کھا کر آئے گی اور میرے سامنے آنسو چھپا چھپا کر مسکرائے گی۔ کاش! مجھے وقت پر پتا چل جاتا کہ تیرے اور تیرے گھر والوں کے ہاتھوں اس کا انجام یہ ہونے...''

میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''آصف جاہ! ہر گھر میں کوئی بات سچ نہیں ہوتی... اور بعض دفعہ تو آنکھوں دیکھی بات بھی جھوٹ نکلتی ہے۔ ہم میاں بیوی میں چھوٹے بڑے جھگڑے ضرور تھے لیکن... لیکن شہوار کو کسی طرح کا نقصان پہنچانے کا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اور یہ میں کوئی زبانی کلامی بات نہیں کہہ رہا ہوں آصف جاہ! میرے پاس اپنی بے گناہی کے ٹھوس ثبوت ہیں اور سب سے اہم ثبوت چودھری عزیز کا اپنا اعترافی بیان ہے۔ اس ریکارڈ شدہ بیان میں چودھری نے وضاحت سے بتایا ہے کہ اس نے شہوار کی جان کیوں اور کیسے لی۔''

''کہاں ہے وہ ریکارڈ شدہ بیان؟''

''یہی تو میری بدقسمتی ہے۔ وہ ریکارڈ شدہ ٹیپ میاں وارث کے پاس چلی گئی ہے... میاں وارث کی بدنیتی صاف ہے۔ وہ مجھے ہر حال میں لاش کی صورت دیکھنا چاہتا ہے اور مجھے لاش بنانے کے لیے وہ آپ سے اور موکھلوں سے دونوں سے پیسا کھا رہا ہے۔ وہ اب اس ٹیپ کو سامنے کیوں آنے دے گا؟'' میں کراہ رہا تھا اور تکلیف کے سبب میری آواز بار بار ٹوٹ رہی تھی۔

آصف جاہ اٹھ کر باہر چلا گیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اس سفید پوش پولیس والے سے بات کرنے گیا ہے جو میرے ساتھ یہاں موجود تھا۔ چند منٹ بعد آصف جاہ واپس آکر پھر کسی جج کی طرح رنگین پایوں والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''تم بکواس کر رہے ہو۔'' وہ کرخت آواز میں بولا۔ ''پولیس کو خالی ٹیپ ریکارڈر ملا ہے۔ یہ ٹیپ ریکارڈر قبرستان کے بھنگیوں کا تھا۔''

''میں نے کہا تھا نا... انسپکٹر وارث وہ بیان کبھی سامنے نہیں آنے دے گا۔''

آصف جاہ زہریلے لہجے میں بولا۔ ''تیرے بارے میں سنا تھا کہ تو ہرفن مولا ہے۔ شاید ٹھیک ہی کہا جاتا ہے۔ تیرے ایک جسم میں بہت سی گندی روحیں گھسی ہوئی ہیں۔ ان میں خرانٹ وکیل، چالباز چودھری اور خبیث قاتل کی روحیں بھی شامل ہیں۔ میں یہ ساری روحیں ایک ایک کر کے تیرے جسم سے نکالوں گا اور بہت آہستہ آہستہ۔ اسی لیے تجھے ایک بار نہیں کئی بار مرنا پڑے گا۔''

میں نے نمبردار آصف کے منہ سے نکلتے شعلوں کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ ''آصف جاہ! میں سمجھتا ہوں کہ تمہارا غم اور غصہ برحق ہے لیکن اس غم و غصے میں اتنا آگے نہ چلے جاؤ کہ تمہیں بعد میں خود پچھتانا پڑے... دیکھو، میں تمہارے ساتھ ثبوتوں کے ساتھ بات کر رہا ہوں۔ میرے پاس دوسرا ثبوت چودھری عزیز کے خاص ملازم انورے کی صورت میں ہے۔ انورا وہ بندہ ہے جس نے اپنے ہاتھ سے شہوار کی جان لی ہے۔ وہ قتل کا آلہ بھی برآمد کرا دے گا۔ انورے تک میرا پہنچنا کسی کرشمے سے کم نہیں ہے۔ بس یوں سمجھو کہ شہوار کا خون بولا ہے اور اس نے مجرم کے چہرے سے نقاب کھینچا ہے...''

میں نے یہاں تک کہا تھا کہ ذرا ٹھٹک گیا۔ وہ نیلے نگ والا کلپ میری شلوار کی اندرونی جیب میں چند کرنسی نوٹوں اور دو تین رسیدوں کے ساتھ ہی رکھا تھا لیکن مجھے سرکنڈوں سے پکڑنے کے بعد تو پولیس والوں نے میری تلاشی لی تھی۔

''بک کیوں نہیں رہے ہو؟'' نمبردار آصف جاہ نے میری خاموشی کو توڑنا چاہا۔

''میری شلوار کی جیب میں ایک چیز ہے، میں وہ تمہیں دکھانا چاہتا ہوں۔''

میرے ہاتھ ہتھکڑی میں تھے۔ آصف جاہ نے ملازم مظفر کو آواز دی۔ وہ دندناتا ہوا آیا اور آصف کے حکم پر اس

کون کہتا ہے کہ؟

اولاد نہیں ہو سکتی

آج بھی لاکھوں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ مایوسی گناہ ہے۔ انشاء اللہ اولاد ہوگی۔ خاتون میں کوئی اندرونی پرابلم ہو یا مردانہ جراثیم کا مسئلہ۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کیا ہے۔ جو آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھلا سکتا ہے۔ آپ کے گھر میں بھی خوبصورت بیٹا پیدا ہو سکتا ہے۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر تمام حالات سے آگاہ کر کے بذریعہ ڈاک وی پی VP بے اولادی کورس منگوائیں۔

المُسلم دارالحکمت رجسٹرڈ (دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد۔ پاکستان

0300-6526061

0547-521787

فون اوقات

صبح 9 بجے سے رات 11 بجے تک

آپ ہمیں صرف فون کریں

دوائی آپ تک ہم پہنچائیں گے

نے زپ کھول کر میری شلوار کی جیب دیکھی۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اندیشہ بالکل درست نکلا۔ بے کار رسیدیں تو جیب میں موجود تھیں مگر کرسی اور کلپ نہیں تھا... اور مجھے خدشہ تھا کہ وہ میری اشیا کی فہرست میں بھی لکھا نہیں گیا ہوگا... ایسی قیمتی چیزیں ہوشیار پولیس اہلکار کم ہی لکھتے ہیں۔

''کیا بات ہے؟'' آصف نے میرے تاثرات دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم کرشمے کی بات کر رہے تھے۔''

''ہاں، کرشمہ تو ہوا ہے۔ اور یہی کرشمہ ہے جس کی وجہ سے میں پہلے انور ے اور پھر چودھری عزیز تک پہنچا۔ اور مجھے پتا چلا کہ شہوار کی جان لینے والے اصل بندے کون ہیں۔''

''اب کچھ بکواس بھی کرو گے یا صرف پہیلیاں بجھواؤ گے۔''

میرا گلا بالکل خشک ہو رہا تھا۔ میں نے پانی طلب کیا۔ مظفر مجھے پانی پلا کر باہر چلا گیا۔ میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''شہوار پر چاقو کے وار کرنے اور اسے بے جان کرنے کے بعد انور ے نے یونہی وہاں سے شہوار کا ایک چھوٹا ہار اٹھا لیا تھا۔ میں اس ہار کو بڑی اچھی طرح پہچانتا تھا۔ میں نے کچھ دن پہلے اس ہار کا ایک نیلم انور ے کی بیوی عابدہ کے کلپ میں دیکھا تھا۔ یہ نیلم دیکھنے کے بعد ہی میرا دھیان انور ے اور چودھری عزیز وغیرہ کی طرف گیا۔''

اس کے بعد میں نے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں وہ... ساری بات آصف جاہ کے گوش گزار کر دی۔ میں نے اسے بتایا کہ کس طرح قبائلی علاقے کی طرف نکلنے سے پہلے میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں بس ایک دفعہ اپنی والدہ سے مل لوں۔ کس طرح میں اور تیمور رات کے وقت قبرستان سے روانہ ہو کر کیکراں والی گاؤں پہنچے اور وہاں انور ے اور اس کی بیوی سے ملاقات ہوئی...

ابھی میری بات جاری ہی تھی کہ سادہ کپڑوں میں پولیس والا پھر دروازے پر نمودار ہوا اور آصف جاہ کو بلا کر کمرے سے باہر لے گیا۔ کمرے سے نکلتے ہوئے آصف اور پولیس والے نے ایک ساتھ مجھ پر خشمگیں نگاہ ڈالی۔ آصف میری باتیں سن تو رہا تھا تاہم اس کے چہرے کی جنونی کیفیت میں کوئی خاص کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔

آصف کے باہر جانے کے تھوڑی دیر بعد ایک ملازم میرے عریاں جسم کے لیے ایک قمیص اور جرسی لے کر آیا۔ اس کا صرف ایک بازو تھا۔ میں اسے یہاں بیرونی گیٹ پر پہلے بھی دیکھ چکا تھا... یہ وہی بدنصیب ماسٹر تھا جو چند برس پہلے شہوار پر ہاتھ اٹھانے کی وجہ سے آصف جاہ کے عتاب کا نشانہ ہوا تھا۔ وہ بہت کم گو شخص تھا۔

مجھے قمیص پہنانے کے لیے میری ہتھکڑی اتارے جانے کی ضرورت تھی، لہٰذا مجھے سردی سے بچانے کے لیے اس نے جرسی ویسے ہی میرے خون آلود جسم کے گرد لپیٹ دی۔ ادھر ادھر دیکھ کر وہ آہستہ سے بولا۔ ''اگر تیرے پاس کوئی پکا ثبوت شبوت ہے تو ان کے سامنے رکھ دے۔ مجھے نہیں لگتا کہ یہ لوگ تجھے زیادہ وقت دیں گے۔'' پھر اس نے میری آنکھوں میں جھانکا اور کانپتی ہوئی سی آواز میں بولا۔ ''لمبڑدار جی کے ارادے تیرے بارے میں بڑے خطرناک ہیں۔''

''میں اپنا دل چیر کر دکھا سکتا تو دکھا دیتا۔ اب بھی میں پوری سچائی کے ساتھ کہہ رہا ہوں اور ہر ایک سے کہہ رہا ہوں کہ میں نے شہوار کو نہیں مارا۔''

ملازم نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ''اول تو یہ بہت مشکل ہے لیکن اگر تم کسی طرح یقین دلا بھی دو کہ شہوار کا قتل تم نے نہیں کیا تو بھی نمبردار کا غصہ تمہاری جان لے سکتا ہے۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''تمہارا یہ قصور بھی نمبردار کے نزدیک کم نہیں ہوگا کہ تم اپنی بیوی کی حفاظت کرنے میں ناکام رہے... اور پھر یہ بات تو سچ ہے کہ وہ تمہاری طرف سے مطمئن نہیں تھی۔ تم اس سے جھگڑتے تھے، ایک دو بار تم نے غصے میں اس پر ہاتھ بھی اٹھایا۔ یہ ساری باتیں شہوار بی بی کی ملازمہ شیداں بڑھا چڑھا کر نمبردار جی کے سامنے بیان کرتی رہی ہے۔ میں تمہیں ذرا نہیں رہا ہوں، بس یہ سمجھا رہا ہوں کہ اگر اپنی صفائی میں ان لوگوں کو کچھ بتا سکتے ہو تو بتا دو۔''

ایک دم اس ملازم کو چپ ہونا پڑا۔ آصف جاہ ایک بار پھر دندناتا ہوا اندر داخل ہو گیا تھا۔ اس نے ملازم کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ ملازم چلا گیا تو آصف نے ایک بار پھر تھانے داری لہجے میں مجھ سے پوچھ گچھ شروع کی۔ وہ مجھے خونی نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری شلوار کی جیب میں کیا ہے جو مجھے دکھانا چاہ رہے ہو؟''

''یہ وہی کلپ تھا جس کا میں بتا رہا ہوں۔ اب وہ جیب میں نہیں ہے۔''

''ٹیپ ریکارڈر کی طرح وہ بھی پولیس والوں نے نکال لیا ہوگا؟'' آصف جاہ کے لہجے میں طنز کی شدید کاٹ تھی۔

''بالکل ایسا ہی ہوا ہے۔ انہوں نے مجھے پکڑنے کے

تمہیں بتا دیں۔ اس کلپ پر جو چھوٹا نیلم لگا ہوا ہے، وہ شہوار کے ہار کا ہے۔ انورا خود اس بات کو قبول کر چکا ہے۔''

''انورا اب کہاں ہے؟'' آصف کے انداز میں یہ دستور زہر میں بجھے ہوئے تیر تھے۔

''وہ وہیں کیکراں والی میں ہے۔ اس کی بیوی عابدہ عرف چیو بھی ساتھ ہے۔ آپ مجھے وہاں لے چلیں یا ان دونوں کو یہاں بلا لیں۔ وہ سب کچھ آپ کے سامنے بک دیں گے۔''

''لیکن کیکراں والی میں اس گھر پر تو تمہاری بلقیس بیگم نے پہرا بٹھایا ہوا ہے۔ یہ تو تم ہی اس سے گزارش کرو تو وہ کسی کو یہاں بھیج سکتی ہے... یا ہمیں وہاں جانے کی اجازت دے سکتی ہے۔'' تمہاری بلقیس کا لفظ آصف نے بہت چبا کر کہا تھا۔

میں نے اس کے لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے نہیں پتا اس گھر پر کون پہرا دے رہا ہے لیکن اگر تم کسی طرح ان سے میرا رابطہ کرا دو تو میں ان سے بات منوا سکتا ہوں۔''

''پر کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ میاں بیوی اب بھی وہیں ہوں گے؟''

''وہ کہیں نہیں جا سکتے۔ ہم نے ان دونوں کو باندھ دیا تھا۔ گھر والے ان کی پوری نگرانی کر رہے ہیں۔''

آصف جاہ نے مظفر کو اندر بلایا۔ اسی نے تھوڑی دیر پہلے آصف جاہ کو اطلاع دی تھی کہ میری والدہ اور بہن کیکراں والی میں چودھری اختر کے گھر میں موجود ہیں۔

آصف جاہ نے میرے سامنے ہی مظفر سے پوچھا۔ ''وہاں بلقیس کی بہن کے گھر میں کون کون ہے؟''

مظفر نے کہا۔ ''لمبڑدار جی... جہاں تک میری اطلاع ہے چودھری خاور کی بے بے جی اور بہن دونوں وہاں موجود ہیں۔ یہ بالکل پکی خبر ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔ اس کے علاوہ اور کون کون ہے؟'' آصف جاہ نے ترخ کر پوچھا۔

''اس کے علاوہ چودھری اختر ہے۔ اس کی بیوی خدیجہ ہے۔ دو بچے ہیں۔ باقی ایک دو نوکرانیاں ہیں۔''

''اس کے علاوہ تو کوئی بندہ نہیں۔ میرا مطلب ہے کوئی مہمان شہمان؟''

''نہیں جی، ایسا تو کوئی نہیں۔ لیکن اگر آپ کہتے ہیں تو میں تھوڑا سا اور پتا کر لیتا ہوں۔ وہ بندے باہر ہی بیٹھے ہیں جو اختر کی حویلی سے ہو کر آئے ہیں۔''

''ان کو اندر ہی لے آؤ۔'' آصف جاہ نے کہا۔

چند سیکنڈ بعد وہ دونوں اندر آ گئے۔ یہ باپ بیٹا تھے اور آج کل اختر کے کھیتوں میں ہی مزدوری کرتے تھے۔ باپ بڑی عمر کا تھا، لڑکے کی عمر سترہ اٹھارہ سال ہوگی۔ معلوم ہوا کہ وہ کبھی کبھی سبزی وغیرہ لے کر اختر کے گھر بھی چلا جاتا ہے۔ اسی مدثر نامی لڑکے نے اندر کی خبریں آصف جاہ کے خاص کارندے مظفر تک پہنچائی تھیں۔ مدثر نامی یہ لڑکا اور اس کا باپ شکل سے ہی لالچی اور ضرورت مند نظر آتے تھے۔ تاہم اب مخبری کرنے کے بعد وہ کافی ڈرے ہوئے بھی تھے۔

آصف جاہ نے مدثر نام کے اس لڑکے سے پوچھا۔ ''تمہیں پکا پتا ہے کہ اس وقت گھر میں مالک مالکن اور دو مہمان عورتوں کے سوا اور کوئی نہیں؟''

''بالکل جی! میں کل شام بھی کھیتوں سے کچھ سامان لے کر گھر گیا تھا۔ وہاں کوئی اور نہیں تھا۔ ہاں، پرسوں کچھ اور لوگ بھی تھے مگر مجھے لگتا ہے کہ وہ رات کو ہی چلے گئے تھے۔''

گشت جاری ہے

شام کا وقت تھا۔ ہاتھوں میں بندوقیں تھامے دو سپاہی بھاری بوٹ کھڑکھڑاتے ہوئے گشت کر رہے تھے۔ تھوڑی دور جا کر ویران سڑک پر انہوں نے ایک جگہ کچھ لوگ کھڑے دیکھے۔ دونوں تیزی سے اس طرف بڑھے۔ لوگوں کے درمیان ایک لاش پڑی تھی۔ کوٹ پتلون پہنے مرنے والا کسی اچھے کھاتے پیتے گھر کا فرد معلوم ہوتا تھا۔ سپاہیوں کی آنکھوں میں بھوک سی چمکی اور انہوں نے بھیڑ منتشر کر دی۔

ایک سپاہی نے آنے جانے والوں پر نگاہ رکھی، دوسرا سپاہی تیزی سے لاش کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ اور جو کچھ بھی ملا اپنی جیبوں میں ٹھونستا چلا گیا۔ مرنے والے کی انگلی میں سونے کی انگوٹھی چمک رہی تھی اس کے ساتھی نے کہا۔

''اوئے جلدی کر... اتنی دیر...؟ چاروں طرف نگرانی ہو رہی ہے!''

''انگوٹھی ہے سونے کی!'' سپاہی نے ساتھی کو بتایا۔

''اتار لے... اتار لے... جلدی کر۔''

''اترتی ہی نہیں ہے، پھنسی ہوئی ہے۔ انگلی کاٹ دوں؟''

''نہیں نہیں۔ چھوڑ دے، درمت کر... انگوٹھی بڑے صاحب کے لیے چھوڑ دے... وہ ابھی گشت پر آنے والا ہے۔''

دونوں بندوقیں سنبھالے گشت کے لیے آگے بڑھ گئے۔

(ہندی پنجابی ادب مصنف۔ درشن متوا)

(انتخاب۔ محمد الیاس چوہان، کراچی)

"تم نے ان کی شکلیں نہیں دیکھیں؟"

"نہیں جی، پر میرا اندازہ ہے کہ ان میں سے ایک مرد تھا اور ایک زنانی۔ مرد شاید بیمار تھا۔ میں نے اس کی ہائے ہائے کی آواز سنی تھی۔"

آصف جاہ نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "ہاں، اب بتاؤ۔ تم کچھ کہہ رہے ہو، یہ منڈا کچھ اور کہہ رہا ہے اور اسے جھوٹ بکنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"میں غلط نہیں کہہ رہا۔ انورا اور اس کی بیوی وہیں اختر کی حویلی میں ہیں۔ یہ لڑکا تو صحن اور برآمدے سے گھوم پھر کر آجاتا ہوگا۔ وہ دونوں کسی اندر کے کمرے میں ہیں۔ اختر اچھی طرح جانتا ہے کہ میاں بیوی کو پوری حفاظت سے رکھنا ہے۔ اسے اس سارے معاملے میں انورے کی قدر و قیمت بھی پوری طرح معلوم ہے۔ انورے نے اختر صاحب کے سامنے ہی اپنے جرم کا اقرار کیا ہے۔"

آصف جاہ نے زہریلی نظروں سے مجھے گھورا پھر مولوی مظفر کی طرف دیکھ کر تعریفی انداز میں سر ہلایا۔ "دیکھو بھئی! ہمارے داماد صاحب نے کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہوئیں۔ پورے پورے ثبوت ہیں ان کے پاس۔ یہ اور بات ہے کہ جب یہ اپنے ثبوت کو ہماری ہتھیلی پر رکھنے لگتا ہے تو ثبوت غائب ہو جاتا ہے۔ اب یہ انورے والا ثبوت بھی لگتا ہے کہ یونہی اڑن چھو ہو جائے گا۔"

مظفر پھنکارا۔ "چھوڑو لمبڑدار جی! ننگا کر کے دو کتے چھوڑو اس پر۔ ایک منٹ میں سب کچھ بک دے گا۔ ایسے بڑے چتر بولتے ہوئے دیکھے ہیں ہم نے۔"

"کتے تو چھوڑنے ہی چھوڑنے ہیں لیکن اگر اس کے بجائے اس کے گھر والوں پر چھوڑے جائیں تو نتیجہ ذرا جلدی نکل آئے گا اور اچھا بھی نکلے گا۔ میرا خیال ہے کہ تم ٹائم ضائع نہ کرو اور جو تمہیں کہا ہے اس پر عمل کرو۔"

مولوی مظفر اثبات میں سر ہلاتا ہوا باہر نکل گیا۔ سخت سردی کے باوجود پسینا میری گردن پر چل رہا تھا اور میری ٹانگوں پر رینگ رہا تھا۔ میں بھانپ رہا تھا کہ آصف جاہ میری والدہ اور بہن کو یہاں قلعہ والا میں لانے کی بات کر رہا ہے۔ اس کی اس خواہش کے راستے میں بلقیس دیوار بن گئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ ایک مضبوط دیوار ہے۔ گزرے ماہ و سال نے اس کے اندر بہت اعتماد بھرا تھا اور یہ معاملہ میری عزت اور زندگی موت کا معاملہ تھا۔ اس معاملے کو وہ سہل لے ہی نہیں سکتی تھی۔ مجھے امید تھی کہ وہ اپنی ہمت کی آخری حد تک میری عزت کے سامنے سینہ تان کر کھڑی رہے گی۔ لیکن کیا وہ کامیاب ہو سکتی تھی؟ یہ بڑا اہم سوال تھا۔

پھر کچھ دیر پہلے ملازم کے کہے ہوئے الفاظ میرے کانوں میں گونجے۔ اس نے کہا تھا... کہ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں جو کرنا چاہتا ہوں جلدی کر لوں۔

میں نے ایک بار پھر نرم التجائی لہجہ اختیار کیا اور آصف جاہ سے کہا۔ "آصف جاہ صاحب! آپ کسی طرح ایک بار مجھے وہاں لے جائیں یا پھر کسی طرح چودھری اختر کی بات مجھ سے کرا دیں۔ انورے اور اس کی بیوی کے بارے میں اصل حقیقت کھل جائے گی۔ انورا آپ کے سامنے ہر بات کا کھل کر اعتراف کرے گا اور آپ کا دل گواہی دے گا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے درست کہہ رہا ہے۔"

"داماد جی! تم ہر وہ بات کر رہے ہو جو نہ ہونے والی ہو۔" آصف جاہ نے شراب کا ایک بڑا گھونٹ بھر کر بیڑی کا طویل ترین کش لیا۔ "اب چودھری اختر کو آپ جناب سے گل بات کرانے کے لیے کون یہاں لائے... اور کیسے لائے؟"

ملازم شیر افگن نے آگے بڑھ کر آصف جاہ کے کان میں دو چار سرگوشیاں کیں۔ آصف جاہ کے شرابی چہرے کی تمتماہٹ کچھ کم ہوئی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور افگن باہر نکل گیا۔ تقریباً پانچ منٹ بعد وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ دو سفید پوش پولیس والے تھے۔ انہوں نے ایک بڑا سا وائرلیس سیٹ اٹھا رکھا تھا۔ وائرلیس سیٹ سے مسلسل شور ابھر رہا تھا اور کسی پولیس والے کے پیغام سنائی دے رہے تھے۔

وائرلیس سیٹ کو کھڑکی کے پاس رکھ دیا گیا۔ پولیس والے فریکوئنسی سیٹ کرنے میں مصروف ہو گئے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ڈیک نالے کے اس دور دراز گاؤں کیراں والی سے رابطے کی کوشش کر رہے ہیں جہاں چودھری اختر کے گھر میں انورا اور اس کی بیوی موجود ہیں۔ یقیناً اب وہاں پولیس کی نفری بھی تھی۔

انہیں جلد ہی کامیابی ہو گئی۔ دوسری طرف سے کسی اے ایس آئی شہباز نے بات کی... آصف جاہ نے اسے بتایا کہ وہ گاؤں کے زمیندار چودھری اختر سے بات کرنا چاہتا ہے۔ قریباً دس منٹ بعد خدیجہ کا شوہر اختر وائرلیس سیٹ پر موجود تھا۔ آصف جاہ نے میری بات اختر سے کرائی مگر بات کرانے سے پہلے اس نے مجھے بھرا ہوا پستول دکھا دیا تھا اور سختی سے یہ ہدایت کر دی تھی کہ میں صرف انورے اور اس کی بیوی کے بارے میں ہی بات کروں گا۔ کوئی بھی دوسری بات نہیں ہو گی۔

پنجابی انداز میں بولنے لگا۔ "خاور! یہ... یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ کہاں ہو تم؟ تیمور کہاں ہے؟ چودھری عزیز قتل ہو گیا ہے۔ اس کا جنازہ راجوال کی حویلی میں پڑا ہے۔ سنا ہے کہ وہاں قبرستان کے اندر شاہنواز اور اس کے یار سراج کو بھی گولیاں لگی ہیں۔ سراج وہیں مر گیا ہے اور شاہنواز کی حالت نازک ہے۔ کیا یہ سب سچ ہے... تم تو خیریت سے ہو؟"

اس نے ایک ہی سانس میں بہت سے سوال پوچھ لیے۔

میں نے کہا۔ "میں خیریت سے ہوں چودھری اختر! تم بتاؤ بے بے جی اور عارفہ کہاں ہیں؟"

"وہ یہیں پر ہیں۔ کچھ لوگ منڈاسے باندھ کر آئے تھے۔ وہ انہیں زبردستی اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ مگر اللہ کا شکر ہے، بیگم بلقیس نے اپنے کافی سارے بندے یہاں بھیج رکھے ہیں۔ انہوں نے آنے والوں کو بھگا دیا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ وہ تمہارے سسرال کے لوگ تھے۔ یہاں بہت گڑبڑ ہے یار۔"

آصف جاہ نے مجھے پستول کے ساتھ زور سے ٹہوکا دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں صرف کام کی بات کروں۔ میں نے وائرلیس سیٹ پر کہا۔ "اختر صاحب! باقی باتیں ہوتی رہیں گی۔ مجھے یہ بتائیں کہ انورا اور اس کی بیوی آپ کے پاس ہی ہیں نا؟"

چند لمحے خاموشی رہی پھر اختر کی حیرت زدہ آواز ابھری۔ "کیا کہہ رہے ہو خاور! انورے اور عابدہ کو تو تم نے بلا لیا تھا۔"

"میں نے بلا لیا تھا؟ یہ کیا بات کر رہے ہو؟ وہاں سے آنے کے بعد تو تمہارے ساتھ میری بات ہی نہیں ہوئی۔"

"لیکن... تم نے کے ٹو کو بھیجا تھا یار۔ اس نے کہا تھا کہ انورے اور اس کی بیوی کو فوراً یہاں سے نکالنا ہے۔ انہیں ایس پی صاحب کے سامنے پیش کرنا ہے۔"

"میں نے کے ٹو کو بھیجا تھا؟" میرا دماغ چکرا گیا۔

اس کے ساتھ ہی مجھے احساس ہوا کہ کوئی زبردست دھوکا ہو گیا ہے۔ آصف جاہ شاید ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ انورا اور عابدہ وہاں اختر کے گھر میں موجود نہیں تھے۔

"کب آیا تھا کے ٹو تمہارے پاس؟" میں نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

"پرسوں شام کے بعد۔ تمہارا پرانا یار اعجاز بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ رات کو بارہ بجے کے قریب انورے اور عابدہ کو ٹویوٹا گاڑی میں ڈال کر لے گئے تھے۔"

میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ یہ بات میں محاورتاً کہہ رہا ہوں۔ ورنہ میرے دونوں ہاتھ تو ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے تھے۔ کے ٹو کی صورت نگاہوں میں گھومنے لگی۔ اس کی گمشدگی مجھے اور تیمور کو مسلسل پریشان کرتی رہی تھی۔ اس کے پاس کافی روپے پیسے بھی تھے جو وکیل کرنے کے لیے دیے گئے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ کسی مصیبت میں پھنس گیا ہے... مگر اب انکشاف ہو رہا تھا کہ وہ تو خود ہی مصیبت کا روپ دھار چکا ہے۔ وہ ہمارا پرانا یار تھا اور ہمارا خیال تھا کہ ہم اس کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں۔ لیکن آج پتا چل رہا تھا کہ جس کے بارے میں سب کچھ جاننے کا دعویٰ ہوتا ہے، وہ بھی کبھی کبھی بالکل اجنبی نکلتا ہے۔

بے بے جی کہا کرتی تھیں۔ "مصیبت اکیلی نہیں آتی۔ اور مصیبت کے وقت ہی چہروں کی اصل پہچان بھی ہوتی ہے۔"

پچھلے کچھ دنوں میں، میں نے بھی بہت سے چہروں کا اصل روپ دیکھا تھا۔ قتل کے الزام کی سیاہی میرے چہرے پر تھی لیکن شکلیں دوسروں کی بدل گئی تھیں۔ راجوال میں بے شمار لوگ ایسے تھے جو میرے پسینے پر خون گرانے کا دعویٰ کرتے تھے مگر پچھلے دنوں میں نے ان کو اجنبیوں کی طرح پاس سے گزرتے دیکھا تھا۔ اور اب یہ کے ٹو... یہ بھی بے وفائی کر گیا تھا۔ انورے اور عابدہ کے بارے میں میری اس

ڈاکٹر اللہ رکھا مرحوم

ڈاکٹر اللہ رکھا مرحوم حکمت اور پنسیری کے کام کے علاوہ ایک اخبار میں کالم بھی لکھتے تھے، وہ خود کو کالم نگار کہتے تھے مگر لوگ انہیں "گالم نگار" قرار دیتے تھے کیونکہ ان کے "کالم" میں گالیوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا تھا اور یہ گالیاں وہ انہیں نکالتے تھے جو ان کی حکمت اور پنسیری کے کاموں میں مہارت سے انکاری ہوتے تھے اور یا پھر ان کو جو ان کی کالم نگاری کو "گالم نگاری" قرار دیتے تھے، آخری عمر میں مرحوم نے داڑھی رکھ لی تھی اور پگڑی باندھنا شروع کر دی تھی، اب وہ گالیاں بہت دیتے تھے بلکہ منہ زبانی ہر ایک کو "تباہ کر دوں گا، برباد کر دوں گا" کی دھمکیاں دیتے تھے لیکن انسان فانی ہے، وہ خدا کی زمین پر اکڑ اکڑ کر چلتے ہوئے خواہ جتنے بڑے بڑے دعوے کرے ایک دن خود اس کے فانی جسم نے تباہ ہو جانا ہے چنانچہ ڈاکٹر اللہ رکھا بھی ایک دن ایک عام آدمی کی طرح فوت ہو گئے!

عطاء الحق قاسمی کی تصنیف مصیبت یہ ہے سے انتخاب

www.pkdigest.com

سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی اور وہ میرا نام لے کر انہیں وہاں سے نکال لے گیا تھا۔ یہ کام یقیناً اس نے کسی اچھی نیت سے نہیں کیا تھا۔ اب عین ممکن تھا کہ یہ میاں بیوی بھی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے یا پھر انہیں کہیں لاپتا کر دیا جاتا۔ اس کے پیچھے یقیناً موکھلوں کا ہاتھ تھا یا پھر چودھری عزیز کا!

آصف جاہ نے میرے کیچڑ آلود بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر زور سے جھنجوڑا۔ ''ہاں، اب تیرے پاس کہنے کو کچھ اور ہے یا نہیں... اگر نہیں تو وائرلیس بند کر دوں؟''

میرے پاس واقعی کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ دوسری طرف سے اختر کی نہایت پریشان آواز ابھری۔ ''یہ سب کیا ہو رہا ہے خاور! اور تم کس تھانے میں ہو... مجھے بتاؤ، میں بلقیس کو اطلاع پہنچاتا ہوں۔''

وہ وائرلیس کی وجہ سے سمجھ رہا تھا کہ میں کسی تھانے میں ہوں۔

''حرامزادہ!'' آصف جاہ نے دانت پیستے ہوئے وائرلیس سیٹ بند کر دیا۔ پھر شرابیوں کی طرح میری آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرا کر بولا۔ ''کتے کا بچہ... کتنے درد سے کہہ رہا تھا، میں بیگم بلقیس کو اطلاع پہنچاتا ہوں۔ وہ کیوں کہہ رہا تھا ایسے... کیوں کہہ رہا تھا؟'' اس نے میرے بال جھنجوڑے، سر سے رستا ہوا خون اور تیزی سے رسنے لگا۔

آصف جاہ نے جنونی انداز میں خود ہی جواب دیا۔ ''وہ اس لیے کہہ رہا تھا کہ... تیری اصل بیوی وہی ہے... وہ حرامزادی تیری اصل گھر والی ہے۔ تو ہمیشہ اس کے اشاروں پر ناچتا رہا ہے اور اب بھی ناچ رہا ہے۔ اسی کتیا کا کلیجا ٹھنڈا کرنے کے لیے تو نے شہوار کی جان لی ہے۔ اسے تڑپا تڑپا کر مار دیا ہے۔ پر میں تجھ سے پوچھتا ہوں خاور... میں تجھ سے پوچھتا ہوں۔ اگر وہ تیری اصل گھر والی یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتی تھی اور نہ تو کر سکتا تھا تو پھر میری پھول سی بچی کی زندگی برباد کرنے کی کیا ضرورت تھی تم دونوں کو... کیا ضرورت تھی؟'' آخر میں وہ اتنے زور سے گرجا کہ دیواریں گونج اٹھیں اور اس کے ہاتھ کے گلاس سے سنہرے رنگ کی وہسکی اچھل کر دور جا گری۔

میں نے منہ میں جمع ہو جانے والا خون تھوکتے ہوئے کہا۔ ''آصف جاہ! تم میرے جسم کے ٹکڑے بھی کر دو گے تو ہر ٹکڑے سے یہی آواز آئے گی کہ میں شہوار کا قاتل نہیں ہوں۔''

اس نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں۔ بس اپنی بہکی ہوئی رو میں بولتا چلا گیا۔ اس کا لہجہ نشے سے چور تھا۔ ''میں تمہیں بتاتا ہوں... تم نے شہوار سے شادی کا ناٹک کیوں رچایا... اس میں تمہیں ایک نہیں تین تین فائدے نظر آئے... ہاں تین... تم کروڑوں کی جائداد کے مالک بنے۔ اس شادی سے تم نے موکھلوں کو الگ تھلگ کر دیا اور پھر تیسرا سب سے بڑا فائدہ... ہاں سب سے بڑا فائدہ... میری بچی تمہارے اور بلقیس کے گناہوں کے لیے ڈھال بن گئی۔ ہاں تین تین فائدے!'' اس نے ہاتھ کی تین انگلیاں کھڑی کر کے میری آنکھوں کے سامنے لہرا دیں۔

وہ بولتا چلا گیا۔ ''تم اس کے ساتھ راجوال کی حویلی میں رنگ رلیاں مناتے رہے... گناہ کے اندھیرے میں اس کا بستر گرم کرتے رہے اور میری بچی تمہاری ایک محبت بھری نظر کو ترستی رہی۔ تم نے اگر کبھی اسے بچی کچی محبت دی بھی تو یہ وہی محبت تھی جو ایک بدتمیز بچے کو کھلونے سے ہوتی ہے۔ وہ اس کو توڑتا مروڑتا ہے اور اس کو برباد کر کے خوش ہوتا ہے۔ تم نے دو دو مزے حاصل کیے۔ ایک طرف تمہاری معشوقہ، دوسری طرف کچھ نہ کہنے والی اور ہر زخم خاموشی سے سہہ جانے والی بیوی... تم نے اس کے ساتھ کھیلا اور آخر میں اس ناگن کی خاطر اس کی زندگی سے ہی کھیل گئے۔''

''تم انتقام میں اندھے ہو رہے ہو آصف جاہ! تمہیں میرے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا۔'' میں کراہا۔

وہ رواں دواں لہجے میں بولا۔ ''مجھے تمہارے علاوہ تمہاری ماں اور بہن بھی نظر آ رہی ہے۔ اور وہ گندی عورت بھی نظر آ رہی ہے، جس کی وجہ سے میری بچی کی جان گئی۔ میری خواہش تو یہی تھی کہ یہ تینوں عورتیں یہاں ہوتیں یا کم از کم تیری ماں اور بہن ہی ہوتیں۔ میں انہیں تیری موت کا تماشا دکھا کر بتا سکتا کہ کسی پیارے کی موت کا غم کیا ہوتا ہے... مگر اب لگتا ہے کہ یہ آخری خواہش مشکل سے ہی پوری ہوگی۔ وہ گندی زنانی جسے بیگم بلقیس کہتے ہیں، ہوشیار ہو گئی ہے۔ اس نے وہاں بڑا پکا انتظام کر لیا ہے۔ پھر بھی میں ایک آخری کوشش کر کے ضرور دیکھوں گا۔''

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ دندناتا ہوا باہر نکل گیا۔

میں کسی بے بس پرندے کی طرح جکڑا ہوا وہیں یخ بستہ قالین پر پڑا رہا۔ آصف جاہ نے جو کچھ کہا تھا، وہ کانوں میں انگاروں کی طرح دہک رہا تھا۔ وہ میرے گھر والوں کے لیے اور بلقیس کے لیے نہایت گھٹیا الفاظ استعمال کر رہا تھا۔ شراب کے نشے اور انتقام کی آگ نے اسے بے حد بھڑکا رکھا تھا۔ اب خدا کے بعد میری ساری امیدیں بلقیس سے وابستہ تھیں۔ دیکھنا یہ تھا کہ وہ کس حد تک اس زبردست دباؤ کا سامنا کر سکتی

ہے... کہاں تک بے بے جی اور عارفہ کے سامنے دیوار بن سکتی ہے۔

مجھے اسی طرح بندھی ہوئی حالت میں تین بندوں نے اٹھایا اور حویلی کے پچھواڑے ایک چھوٹی سی پکی کوٹھڑی میں پہنچا دیا۔ یہاں اسی طرح کی پانچ چھ مزید کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ اس یخ بستہ کوٹھڑی میں فقط پرالی کے اوپر چادر بچھا کر ایک بستر سا بنا دیا گیا تھا اور ایک میلا سا لحاف رکھا تھا۔

میں اس کوٹھڑی میں تقریباً دس گھنٹے بھوکا پیاسا زخمی حالت میں پڑا رہا... مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ جنونی آصف جاہ کے ہاتھوں میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ دوسری طرف یہ بھی پتا نہیں تھا کہ وہ والدہ اور عارفہ کے خلاف کیا کارروائی کرنے والا ہے۔ اس نے نشے کی حالت میں بتایا تھا کہ وہ میری والدہ اور عارفہ کو یہاں لانے کے لیے ایک آخری کوشش کرنے والا ہے۔ خبر نہیں کہ وہ کوشش کیا تھی۔ اپنی اس حالت میں تو میں بس گڑگڑا کر دعا ہی کر سکتا تھا کہ وہ اپنے ارادوں میں ناکام رہے۔

شام کے وقت مجھے اندازہ ہوا کہ شاید آصف کی کوشش پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکی۔ کوٹھڑی کا دروازہ دھماکے سے کھلا اور آصف جاہ طوفان کی طرح اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں تین فٹ لمبا وہی چمڑی کوڑا تھا جو میرے جسم پر بے شمار جلتے ہوئے نشان بنا چکا تھا۔

اندر آتے ہی وہ پھنکارا۔ ''میں تجھے بڑی بری موت ماروں گا۔ میں بوٹی بوٹی کر دوں گا تیری۔''

اس کے ساتھ ہی اس کا کوڑا ہوا میں لہرانے لگا۔ شائیں شائیں کی مخصوص آواز ابھری اور میرے زخمی جسم پر ایک بار پھر دہکی ہوئی سلاخیں رکھی جانے لگیں۔ میں پرالی پر لوٹتا رہا اور حتی الامکان ضبط بھی کرتا رہا۔ مگر پھر بے ساختہ میرے ہونٹوں سے کراہیں نکلنے لگیں۔ یہ کراہیں آہستہ آہستہ بلند ہوتی گئیں۔ آصف جاہ ہیجانی انداز میں پھنکار رہا تھا۔ ''وہ تیری بڑی پکی سکی ہے۔ تجھ پر اپنے درجنوں بندے ہی نہیں، اپنی جان بھی فدا کر سکتی ہے۔ بڑی گہری عشق معشوقی ہے تم دونوں میں۔ ٹھیک ہے، کرتی رہے عشق۔ میں بھی اس کے عشق اور عاشق کے ٹوٹے کر کے چھوڑوں گا۔''

ہنٹر مارنے سے تسلی نہیں ہوئی تو اس نے مجھے وزنی جوتی کی ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ میں اذیت کی انتہا سے گزر رہا تھا۔ وہ مار مار کر ہانپ گیا تو بلند آواز میں دہاڑا۔

''ادھر آؤ۔ اٹھاؤ اس بیگم کے عاشق کو اور لے جاؤ طویلے میں۔''

دونوں بٹے کٹے کارندے اندر داخل ہوئے۔ آصف جاہ نے گالیاں بکنے کے بعد میری طرف تھوکا اور پاؤں سے زمین کوٹتا ہوا باہر نکل گیا۔

جس جگہ کو طویلا کہا گیا تھا وہ ایک ہال نما کچا کمرا تھا۔ یقیناً اسے گھوڑے یا بھینسیں وغیرہ باندھنے کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہوگا۔ اس کی کھڑکیوں پر سرد ہوا سے بچانے کے لیے کپڑے کے پردے لگائے گئے تھے۔ اس مستطیل کمرے کے کچے فرش پر جو منظر نظر آیا، اس نے میرا دل دہلا دیا۔ یہاں تقریباً بارہ افراد موجود تھے۔ یہ سارے بندے نوجوان یا درمیانی عمر کے تھے۔ ان سب کے جسموں پر مار پیٹ کے نشان تھے اور لباس بہت میلے کچیلے ہو چکے تھے۔ ان میں سے بیشتر کی ڈاڑھیاں بڑھی ہوئی تھیں۔

حیرت ناک بات یہ تھی کہ ان سب کے گلے میں جانوروں کی طرح زنجیریں نظر آ رہی تھیں۔ ان زنجیروں کی وجہ سے ان میں سے بیشتر کے گلے زخمی تھے۔

میرے ساتھ آنے والے افراد نے میری الٹی ہتھکڑی کھول دی۔ میری طرف کم از کم تین رائفلیں اٹھی ہوئی تھیں اور رائفل برداروں کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ مجھ سے کوئی رعایت نہیں کریں گے۔

آخر میں میرے پاؤں کی رسی کھولی گئی تاہم رسی کھولنے سے پہلے ایک زنجیر میرے گلے میں بھی پہنا دی گئی۔ زنجیر کے بالائی سرے پر لوہے کی موٹی پتری کا حلقہ سا تھا جس میں باقاعدہ جندری یعنی چھوٹا تالا لگا تھا۔ اس کے بعد مجھے اس طویلے میں دھکیل دیا گیا۔ طویلے کا دروازہ لوہے کی موٹی چادر کا تھا۔ کھڑکیوں میں بھی آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ پہلے سے موجود افراد مجھے سخت حیرت سے دیکھنے لگے۔ ان میں سے دو چار شاید مجھے پہچانتے بھی تھے۔ ان کی سوالیہ نظریں مجھ پر جم کر رہ گئیں۔

''تم چودھری خاور ہو نا؟'' ایک کمزور چہرے والے شخص نے میرے ابتر حلیے کو بڑے تعجب سے دیکھتے ہوئے کہا۔

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، تیس بتیس سال کی عمر کا ایک شخص تنک کر بولا۔ ''ہاں جی، یہی ہے جس کی وجہ سے یہاں ہماری اتنی عزت کی جا رہی ہے۔ یہ سارا اسی چودھری صاحب کا کیا دھرا ہے۔''

اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا، طویلے میں موجود سارے افراد کی توجہ دروازے کے پاس والی دو کھڑکیوں کی طرف چلی گئی۔ کھڑکیوں کی آہنی سلاخوں کے اندر سے رونیاں اندر

www.pkdigest.com

چھینکی جارہی تھیں۔ یہ روٹیاں اس کھرلی نما جگہ میں ہی پھینکی جارہی تھیں، جہاں مویشی چارہ وغیرہ کھاتے ہیں۔ ان روٹیوں کو دیکھتے ہی زنجیروں میں بندھے ہوئے سارے بندے ان کی طرف جھپٹے۔ میں نے ایک تکلیف دہ منظر دیکھا۔ یہ لوگ جانوروں ہی کی طرح ایک دوسرے سے روٹیاں چھیننے لگے۔ شاید روٹی جان بوجھ کر کم پھینکی گئی تھی۔ ایک نوجوان لڑکے نے درمیانی عمر کے ایک شخص کو زور سے دھکا دیا، وہ پھسل کر دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس کی مٹھی میں دبی ہوئی ایک چوتھائی روٹی بھی ایک دوسرے بندے نے چھین لی۔ درمیانی عمر کا شخص جس مائع شے سے پھسل کر گرا تھا، وہ کچھ اور نہیں پیشاب تھا۔ اس پیشاب کی بو پورے طویلے میں پھیلی ہوئی تھی۔

میں سکتہ زدہ کھڑا یہ تماشا دیکھتا رہا۔ یہ کون لوگ تھے؟ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نیم گنجے سر والے نے کہا تھا کہ یہ سارا میرا ہی کیا دھرا ہے۔ میں نے کیا کیا تھا جس کی وجہ سے ان لوگوں کو یہ تکلیف پہنچ رہی تھی؟

سلاخ دار کھڑکیوں میں سے روٹیاں پھینکنے والے جیسے تماشا دیکھ رہے تھے۔ پھر وہ اوجھل ہو گئے۔ زنجیروں سے بندھے ہوئے افراد بالکل جانوروں کا سا رویہ اپنائے ہوئے تھے۔ ان کے ناخن بڑھ چکے تھے، چہرے اور سر کے بال جھاڑ جھنکاڑ بنے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے فاقہ زدہ تھے اور آنکھوں میں عجیب سا ہراس جم چکا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کم وبیش چار چار ماہ سے یہاں بند ہیں۔ تاہم ان میں سے دو چار ایسے بھی تھے جنہیں شاید اس بندی خانے میں زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ ان کی حالت قدرے بہتر تھی۔

طویلے میں عجیب سی سڑانڈ اور بو تھی۔ دماغ پھٹا جارہا تھا۔ میں ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ ایک قمیص اور جرسی مجھے دے دی گئی تھی، وہ میں نے پہن لی۔ مگر سردی کم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ اس کی وجہ اس طویلے کا گیلا پن اور کچے فرش کی نمی تھی۔ نیم گنجے سر والا شخص اپنی لمبی زنجیر کو ہاتھ سے سیدھا کرتا ہوا میرے پاس آبیٹھا اور زہرخند لہجے میں بولا۔ ''آخر آگئے ہو نا تم یہاں۔ مجھے پتا تھا، ایک دن تم ضرور آؤ گے۔ یہ سارے میری بات مانتے نہیں تھے پر میں اچھی طرح جانتا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ نمبردار آصف جاہ کے سر میں اگر دماغ کی جگہ آگ بھری گئی ہے تو اس کی وجہ صرف تم ہو۔ یہ سب تمہارا ہی کیا دھرا ہے۔'' وہ لہجے سے کچھ پڑھا لکھا لگتا تھا۔

''پتا نہیں تم کون ہو اور کیا بکواس کررہے ہو؟''

''میں بکواس نہیں کررہا۔ وہی کہہ رہا ہوں جو حقیقت ہے۔'' وہ اپنی بڑی بڑی ذہین آنکھیں میری طرف گھما کر بولا۔ ''یہ تم ہی ہو جس نے آصف جاہ کی بیٹی سے شادی کی پھر اس کو دکھ دیے پھر اسے جان سے مارا... اور آصف جاہ کو نفسیاتی مریض بنایا۔ اب وہ اپنے جنون میں کچھ بھی کرسکتا ہے۔''

''تمہاری باتیں... میری سمجھ میں نہیں آرہیں۔''

''لیکن میری سمجھ میں سب کچھ آرہا ہے۔ آصف جاہ نے ہم میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑنا۔ وہ ہم سب کو مار دے گا... اور بڑی بری موت مارے گا۔''

''لگتا ہے کہ تم اپنے ہوش میں نہیں ہو۔'' میں نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

''ہوش میں تم نہیں ہو۔'' وہ ترخ کر بولا۔ ''تمہیں ہی نئی چودھراہٹ کا نشہ چڑھا ہوا تھا۔ اور عاشقی معشوقی نے اس نشے کو دوآتشہ کیا ہوا تھا۔ دوآتشہ سمجھتے ہو نا تم؟''

مجھ سے اور برداشت نہیں ہوا۔ بے ساختہ میرا ہاتھ گھوما اور ایک زوردار مکا اس نیم گنجے شخص کے چوڑے تھوبڑے پر پڑا۔ وہ اس وار کے لیے قطعی تیار نہیں تھا۔ وہ پشت کے بل گیلی زمین پر گرا۔ اس کا ایک ساتھی چنگھاڑتا ہوا میری طرف آیا۔ میرے دماغ میں بھی انگارے بھرے گئے تھے۔ میں ذرا سا پیچھے جھکا اور اس شخص کو اپنے سر سے اوپر اچھال کر آہنی کھرلی پر دے مارا۔ نیم گنجا شخص گالیاں بکتا ہوا اٹھا۔ اس مرتبہ میں نے اس کے پیٹ میں گھٹنے رسید کی اور پھر چہرے پر گھٹنے کی ضرب لگا کر اسے دور پھینک دیا۔

ایک اور دراز قد شخص آگ بگولا ہو کر نیم گنجے کی حمایت میں اٹھا لیکن تب ایک دوسرے شخص نے اس کا راستہ روک لیا اور گریبان سے پکڑ کر دیوار کے ساتھ لگا دیا۔

چند سیکنڈ کے اندر طویلے میں موجود افراد کے دو گروپ بن گئے... اور پوری شدت سے آپس میں دست و گریباں ہو گئے۔ نیم گنجے اور اس کے دو ساتھیوں کو ٹھیک ٹھاک مار پڑی۔ نیم گنجے کا سر لہولہان ہو گیا اور اس کی پسلی کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ قیدیوں کی زنجیریں آپس میں بری طرح الجھ گئیں۔ ایک فاقہ زدہ نوجوان کی گردن زنجیر کے گھیرے میں آگئی اور وہ دم گھٹنے سے بے ہوش ہو گیا۔

اس ساری کارروائی کے دوران میں باہر سے کوئی مداخلت نہیں ہوئی۔ دو پہرے دار سلاخ دار کھڑکی میں سے دیکھتے رہے اور طنزیہ انداز میں مسکراتے رہے۔ ان کے رویے سے ظاہر تھا کہ انہیں اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ اندر موجود افراد میں سے کوئی مرتا ہے یا جیتا ہے۔ سب افراد

نے تو ذرا اپنی ابھی ہوئی زنجیروں کو سلجھایا اور ہانپتے کانپتے ہوئے بیٹھ گئے۔ نیم گنجے شخص کا نام ارشد تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، وہ محکمہ انہار میں کلرک تھا اور اس کی شادی حال ہی میں قلعہ والا گاؤں کی ایک لڑکی سے ہوئی تھی۔

اس کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ درد سے بری طرح کراہ رہا تھا۔ اس کا سارا دم خم ختم ہو چکا تھا۔ اس کے دونوں ساتھی بھی کونوں میں سمٹے ہوئے گم صم بیٹھے تھے اور اپنی لال لال آنکھوں سے دیگر ساتھیوں کو گھور رہے تھے۔

میری مدد کے لیے سب سے پہلے اٹھنے والے شخص کا نام غازی محمد تھا۔ یہ شخص مجھے بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ میں نے غازی کے ساتھ مل کر نیم گنجے ارشد کو دیکھا۔ اس کی ہڈی ٹوٹی ضرور تھی مگر اپنی جگہ سے زیادہ ہٹی نہیں تھی۔ میں نے اپنے اندازے کے مطابق اسے ٹھیک بٹھایا اور دو پرانے کپڑوں کی گدیاں سی بنا کر کندھے کے دونوں طرف رکھ دیں... باہر سے ایک پہرے دار نے تھوڑی سی روئی بھی پھینک دی۔ ارشد ہائے وائے کررہا تھا۔

غازی نے کہا۔ ''اوئے گھبرا نہ باؤ... اپنے سالار صاحب ہرفن مولا بندے ہیں، سب کچھ ٹھیک کر لیتے ہیں۔ تیری ہڈی تو کوئی شے ہی نہیں ہے۔''

میں نے اچھی طرح پٹی باندھ دی اور ارشد کو ایک گدیلے پر لٹا کر اوپر لحاف دے دیا۔

ارشد کے چہرے پر ابھی بھی سخت ناراضی تھی۔ بہرحال، تکلیف کی وجہ سے وہ چپ تھا۔ ایک پہرے دار نے سلاخ دار کھڑکی میں سے ایم کی ڈلی اندر پہنچائی۔ ہم نے وہ ارشد کو کھلا دی۔ وہ کچھ دیر کراہتا رہا پھر سو گیا۔

غازی نے مجھے بتایا۔ ''اس کی شادی کوئی آٹھ دس ماہ پہلے ہوئی تھی۔ یہ طبیعت کا ذرا سخت ہے۔ بیوی سے جھگڑا ہو گیا۔ وہ میکے آگئی۔ یہ کچھ دن بعد اسے زبردستی اپنے ساتھ لے گیا۔ یہ خبر نمبردار آصف تک پہنچی۔ اس نے راتوں رات اسے اٹھوا لیا۔ میرے اندازے کے مطابق اس واقعے کو اب چار پانچ مہینے ہو چکے ہیں۔ اس چار دیواری سے باہر کسی کو پتا نہیں ہوگا کہ باؤ ارشد اب کہاں ہے؟''

''کسی کے گھریلو جھگڑے میں نمبردار کو کودنے کی کیا ضرورت تھی... اور وہ بھی اس طرح کہ بندہ ہی غائب کرکے یہاں پہنچا دیا گیا۔'' میرا لہجہ دھیما تھا۔

غازی نے عجیب لہجے میں کہا۔ ''یہاں آپ کو مجھ سمیت جتنے بھی نظر آرہے ہیں، ان کی کہانی اس سے ملتی جلتی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے سرگوشی میں پوچھا۔

''وہ جو سامنے بلی آنکھوں والا ہے نا، یہ قلعہ والا گاؤں کا ہی ہے۔ اس نے اپنی بیوی سے جھگڑے کے بعد اپنی ساس کے ماتھے پر اسٹیل کا گلاس مارا تھا جس سے اس کا خون نکل آیا تھا۔ اس جرم کی سزا میں یہ بھی رات کے اندھیرے میں اٹھایا گیا اور یہاں پہنچا دیا گیا۔ اس کی بہت لمبی لمبی مونچھیں تھیں۔ نمبردار نے اس کی مونچھوں کو گدھے کے پیشاب سے نرم کر کے منڈوا دیا۔ اور وہ جو تیسرے نمبر پر اونچی ناک والا بیٹھا ہے، اسے دیکھ رہے ہیں؟''

''ہاں... اس نے کیا کیا ہے؟''

''اس کی شادی بھی دو تین مہینے پہلے ہوئی ہے۔ اپنے سسرالیوں سے اس کا جھگڑا ہوا۔ اس نے بیوی پر پابندی لگا دی کہ وہ اپنے میکے کے کسی شخص سے نہیں ملے گی۔ اس کی ساس نے نمبردار تک شکایت پہنچائی کہ وہ بیمار ہے اور اپنی بچی کو دیکھنے کے لیے ترس رہی ہے۔ نمبردار نے اس وقت تو کوئی کارروائی نہیں کی مگر آٹھ دس دن بعد جب یہ اشفاق نامی بندہ باردانہ خرید کر گوجرانوالہ سے واپس آرہا تھا، کچھ لوگوں نے اسے کھیتوں میں دبوچ لیا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو یہ اس طویلے میں تھا۔ یہ تقریباً ایک مہینے سے یہاں ہے۔ پانچ چھ دن پہلے اس کے ساتھ بڑا ظلم ہوا ہے۔ اللہ ایسا وقت کسی کو نہ دکھائے جی...'' غازی نے کانپ کر کانوں کو ہاتھ لگائے۔

''کیا ہوا؟''

''بس چھوڑیں جی، اس بات کو۔ ایسی باتوں سے دل دکھتا ہے۔ بس سمجھیں جی کہ ہم سب یہاں ایک بہت بڑی مصیبت کے گھیرے میں ہیں۔ ہمارے ساتھ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ نمبردار آصف کی ذہنی حالت آپ نے دیکھ ہی لی ہوگی۔ وہ بالکل جنونی ہو چکا ہے۔ اوپر سے ہر وقت شراب کی بوتل اس کے منہ سے لگی رہتی ہے۔ اولاد کے مرنے کا غم واقعی بہت بڑا غم ہوتا ہے لیکن اس غم کی وجہ سے ان جان لوگوں کو جیتے جی مار دینا اور زندگی موت کے درمیان لٹکا دینا کہاں کا انصاف ہے؟''

''شاید تم شہوار کی موت کی بات کررہے ہو۔ شہوار کی موت کی وجہ سے تم لوگوں پر ظلم ڈھانے کا کیا مطلب ہے؟''

''بس یہی بات تو سمجھ میں نہیں آتی۔ لیکن جب غور کریں تو تھوڑی تھوڑی سمجھ میں آتی بھی ہے۔ اب میری طرف ہی دیکھیں۔ میری بیوی شروع سے بدزبان تھی۔ چار پانچ سال میں نے جیسے تیسے گزارے۔ جن دنوں پچھلی فارم والے رقبے کے لیے موکھلوں سے دوسری بار لڑائی ہوئی تھی، میں بھی آٹھ دس دوسرے بندوں کے ساتھ گرفتار ہوا تھا۔

www.pkdigest.com

ڈیڑھ سال جیل میں رہا۔ اس دوران میں اس نے میرے ماں باپ کو بڑا تنگ کیا... میرے گھر سے سامان اور روپیا پیسا اٹھوا کر اپنے ماں باپ کا گھر بھرتی رہی۔ میرا کوئی بچہ نہیں ہے۔ میں نے اسے طلاق دینے کا ارادہ کرلیا۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ دنیا میں یہ سب کچھ ہوتا ہے مگر میرے لیے یہ ایک بہت بڑا جرم بن گیا۔ ایک روز میں اپنے سسر سے ملنے کے لیے قلعہ والا آیا تو واپس نہ جا سکا۔ رات کو کچھ ڈھاٹا پوش بندوں نے مجھے گھوڑی سے اتار کر مارا اور بے ہوش کرکے یہاں پہنچا دیا...“ غازی کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔

”کب سے ہو یہاں؟“

”پورے چار مہینے ہو گئے ہیں۔ میری بہن کی شادی ہونے والی تھی۔ والدہ بھی بیمار تھی۔ مجھے اپنے پچھلوں کی کچھ خبر نہیں ہے۔ اب تو لگتا ہے کہ شاید یہاں سے زندہ نکلنا ہی نصیب نہیں ہوگا۔ سورج کی روشنی دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی ہیں۔ نہائے ہوئے مدتیں گزر گئی ہیں۔ سردی اور بھوک ہڈیوں کو گلا رہی ہے۔ ہمیں چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک بار کھانا دیا جاتا ہے اور وہ بھی جانوروں کی طرح۔ دس بارہ دن پہلے ایک قریبی پنڈ جل پور کا لڑکا بھوک اور نمونیے سے مر چکا ہے۔ اس کی گردن میں زنجیر کی وجہ سے بڑا گہرا زخم بن گیا تھا۔“

زخم کا تصور کرکے غازی محمد نے جھرجھری سی لی۔

”اس سارے معاملے کی تمہیں کیا سمجھ آرہی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”جی، پہلے پہلے تو کچھ سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ ہر کوئی اپنے ذہن کے مطابق اس مصیبت کے پیچھے کوئی نئی وجہ ڈھونڈتا تھا لیکن اب سب کو پتا چل گیا ہے۔“ غازی نے ایک گہری سانس لی۔

”کیا پتا چل گیا ہے؟“

”آپ کو یہ بات عجیب سی لگے گی۔ لیکن یہ ہے ویسے ہی جیسے میں آپ کو بتا رہا ہوں۔ میرے خیال میں اگر میں آپ کو نہ بھی بتاؤں گا تو ایک دو دن میں آپ کو خود ہی پتا چل جائے گا۔“ غازی محمد نے ایک بار پھر طویل سانس لی اور بولا۔ ”دراصل اس منحوس طویلے میں آپ کو جتنے بندے نظر آرہے ہیں، ان کا قصور صرف اور صرف یہ ہے کہ... یہ داماد ہیں۔“

”داماد؟“

”جی ہاں داماد... نمبردار آصف جاہ اپنے دیوانے پن میں داماد کے لفظ سے ہی بدترین نفرت کرنے لگ گیا ہے۔ یہ لفظ اور یہ رشتہ اس کے سینے میں زہر سے بجھے تیر کی طرح لگتا ہے اور وہ ہوش و حواس سے بے گانہ ہو جاتا ہے۔ اس نے یہاں اپنے دیوانے پن کا ایسا تماشا دکھایا ہے کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔“

لالٹین کی مدھم روشنی میں ہم ایک گوشے میں سمٹے مدھم آواز میں باتیں کررہے تھے۔ باقی افراد میں سے زیادہ تر بالکل لاتعلق بیٹھے تھے۔ اپنی اپنی کہانی میں گم... اپنی اپنی سوچوں کے گھیرے میں... ان میں سے ایک شخص نے مجھے ایک بوسیدہ سا کوٹ بھی دیا۔ بعدازاں پتا چلا کہ یہ ایک مرنے والے قیدی کے جسم سے اترا تھا۔

اسی دوران میں ارشد جسے یہاں ارشد باؤ کہا جاتا تھا، اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے کندھے کی تکلیف اب کچھ کم تھی۔ لڑائی، مارکٹائی کے بعد اس کے چہرے پر دوستانہ تاثرات کی جھلک تھی۔ غازی نے اسے اپنے قریب بلا لیا۔ کچھ دیر بعد وہ بھی ٹھنڈی دیوار سے ٹیک لگا کر ہمارے ساتھ گفتگو میں شریک ہو چکا تھا۔

اس نے اپنی بڑی بڑی ذہین آنکھیں میرے چہرے پر گاڑیں اور نحیف آواز میں بولا۔ ”شاہ خاور! پتا نہیں کیوں میرے دل میں یہ وہم بیٹھا ہوا تھا کہ تم بھی ضرور اس طویلے میں نظر آؤ گے۔ نمبردار تمہیں بھی کسی نہ کسی طرح پھنسا کر یہاں لے آئے گا... اور میری اس بات کا برا نہ ماننا جب میں یہ کہتا ہوں کہ نمبردار کا اصل شکار تم ہی ہو... اور ہم سب صرف اس لیے شکار ہوئے ہیں کہ تم اس کی پہنچ سے دور تھے... تو میں کوئی غلط نہیں کہتا۔ تم اپنے دل میں جھانک کر بتاؤ، کیا میں غلط کہتا ہوں؟“

”جی بات یہ ہے کہ میں ابھی تک اس معاملے کو پوری طرح سمجھ نہیں سکا ہوں۔“

”یہ کوئی حساب کا ایسا پیچیدہ سوال نہیں ہے شاہ خاور... سب جانتے ہیں کہ شہوار، نمبردار آصف جاہ کی اکلوتی اولاد تھی۔ وہ بچپن سے اسے بے حد پیار کرتا تھا۔ آصف جاہ کی ساری محبتیں اپنی بیٹی میں ہی اکٹھی ہوگئی تھیں۔ وہ اس کے لیے بہتر سے بہتر بر کی تلاش میں تھا اور اس کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتا تھا۔ اس نے اپنے اردگرد نظر دوڑائی تو تم رشتوں کی بھیڑ میں اسے ایک چڑھتے سورج کی طرح نظر آئے۔ اس نے اپنی لاڈلی کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دینے کا فیصلہ کرلیا۔ لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔ ایک ایسی کہانی بن گئی جس کی کسی کو توقع نہیں تھی۔ ہاں... یہاں میں تمہیں ایک اور بات بتانا چاہتا ہوں جو شاید تمہیں پتا نہ ہو۔“

اس نے ذرا توقف کیا اور اپنے رندھے ہوئے گلے کو دبانے کے بعد بولا۔ ”آصف جاہ کی بہن بھی بس ایک ہی تھی اور وہ بھی گھر والوں کی بہت لاڈلی تھی۔ بدقسمتی سے اس لڑکی کی گھریلو زندگی بھی بڑی تلخ گزری۔ شادی کے پانچ چھ ماہ بعد ہی اس کے زمیندار شوہر نے اس کے چہرے پر تیزاب پھینک دیا تھا۔ بعد میں اس لڑکی نے کنوئیں میں کود کر جان دے دی اور اس کا شوہر باہر کے ملک فرار ہوگیا۔“

ارشد نے ذرا توقف کے بعد بات جاری رکھی۔ ”میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت نمبردار آصف جاہ کے اندر جو جنون نظر آرہا ہے، اس کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ اپنی بیٹی کی موت کے بعد وہ بالکل دیوانہ ہوگیا ہے۔ اب وہ ہر اس بندے سے انتقام لے رہا ہے جس میں اسے ”جوائی پن“ کی کوئی بھی جھلک نظر آتی ہے۔ یہ ایک خطرناک نفسیاتی بیماری ہے۔ اگر تم ایسی بیماریوں کو تھوڑا بہت سمجھتے ہو تو شاید تم میری بات سمجھ جاؤ۔“

یہ بڑی انوکھی صورت حال تھی۔ آصف جاہ کے جنون نے یہاں کچھ ایسے لوگوں کو جمع کرلیا تھا جو تقریباً بے قصور تھے۔ وہ گھریلو جھگڑوں میں ملوث تھے۔ ایسے جھگڑے کہاں نہیں ہوتے۔ کہیں ان کی شدت کم ہوتی ہے کہیں زیادہ۔ مگر آصف جاہ نے ایسے جھگڑوں میں ملوث لوگوں کو مجرم گردانا تھا اور انہیں اپنی شدید نفرت کے گھیرے میں لے لیا تھا۔ یہاں سوچنے کی بات اور بھی تھی۔ اگر وہ ان لوگوں کو صرف اس لیے بدترین غضب کا شکار بنا رہا تھا کہ ان میں اسے میری یا اپنے بہنوئی کی جھلک نظر آتی تھی تو پھر وہ مجھے کس سلوک کا مستحق ٹھہرا سکتا تھا۔ شاید اس نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ وہ میری موت کو بہت مشکل بنا دے گا۔

اچانک ہم سب کو بری طرح چونکنا پڑا۔ کسی عورت کے رونے چلانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ یہ آوازیں کسی بند کمرے کے اندر سے بلند ہو رہی تھیں۔ غازی اور ارشد کے رنگ زرد ہو گئے... اونچی ناک والا نوجوان بھی ایک دم مضطرب نظر آنے لگا۔

”یہ کیا چکر ہے؟“ میں نے سرگوشی میں پوچھا۔

”یہ وہی چکر ہے جو میں نے آپ کو بتایا تھا۔“ غازی نے سرگوشی میں کہا۔

میری سوالیہ نظریں بدستور غازی کے چہرے پر جمی رہیں۔ وہ اونچی ناک والے کی طرف اشارہ کرکے ہولے سے بولا۔ ”اس کا نام اشفاق ہے۔ نمبردار آصف کے کارندے اس کی والدہ کو یہاں ساتھ والے کمرے میں لے آئے تھے۔ اس کی عمر پینتالیس سال کے قریب ہے۔ بے چاری عورت کے کپڑے اتار دیے گئے اور اسے سخت سردی میں کئی گھنٹے کمرے میں کھڑا رکھا گیا۔ وہ بیٹھتی تھی تو اس کی ٹانگوں پر بید کی چھڑی سے چوٹیں لگائی جاتی تھیں۔ جب وہ نڈھال ہوگئی تو نمبردار آصف جاہ آگیا۔ اس نے اپنے سامنے اسے ہنٹر سے بری طرح پٹوایا۔ وہ اسے لعنتی ساس کا خطاب دے رہا تھا۔ جب وہ بے ہوش ہو کر گر گئی تو اسے اٹھا کر باہر لے گئے۔ میرا خیال ہے کہ آج پھر وہی کچھ ہونے والا ہے۔“

میں سمجھ گیا، ابھی تھوڑی دیر پہلے غازی نے جس اندوہناک واقعے کا ذکر کرکے کانوں کو ہاتھ لگائے تھے... وہ یہی تھا۔

اونچی ناک والا اشفاق جس کی ماں کے ساتھ یہ بہیمانہ سلوک ہوا تھا... اور شاید پھر ہونے جا رہا تھا... ہلدی کی طرح زرد دکھائی دیتا تھا۔

مگر پھر چند سیکنڈ بعد وہ قدرے نارمل نظر آنے لگا۔ غازی، ارشد اور دیگر افراد کے تاثرات بھی کچھ بدلے بدلے دکھائی دیے۔

ارشد نے سرگوشی میں کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ یہ اشفاق کی والدہ کی آواز نہیں ہے۔“

”مجھے تو لگتا ہے کہ یہ کوئی جوان لڑکی ہے۔“ غازی نے خیال ظاہر کیا۔

رونے چلانے کی آوازیں قریب آتی گئیں۔ طویلے میں موجود افراد ایک کھڑکی کے آگے سے کپڑا ہٹا ہٹا کر ساتھ والے کمرے میں جھانک رہے تھے۔ کچھ دیر بعد نسوانی آوازیں فلک شگاف ہو گئیں۔ وہ لڑکی یا عورت جو بھی تھی، اب ساتھ والے کمرے میں تھی۔ میں اور غازی بھی کھڑکی کی طرف گئے۔ سلاخ دار کھڑکی کے آگے کپڑے کو کیلوں سے ٹھونک دیا گیا تھا تاکہ طویلے میں سرد ہوا کی آمد و رفت کچھ کم ہو سکے۔ کپڑے کو ایک طرف سے ہٹا کر میں نے ساتھ والے کمرے میں جھانکا تو دماغ چکرا کر رہ گیا۔

یہاں ایک لڑکی موجود تھی۔ اس کے جسم پر بہت تھوڑا لباس تھا۔ اس کے بال ایک شخص کی مٹھی میں جکڑے ہوئے تھے۔ وہ اسے کھینچتا ہوا کمرے کے وسط میں لا رہا تھا۔ پھر اس نے اسے گھما کر پرالی پر پھینک دیا۔ لڑکی کی ایک آنکھ نیلی ہو رہی تھی۔ چہرے اور جسم کے مختلف حصوں پر چوٹیں تھیں۔ یہاں لانے سے پہلے اسے اتنی مار لگائی گئی تھی کہ بے چاری کا دم خم ختم ہو چکا تھا۔ زیادہ دردناک منظر یہ تھا کہ اس کے

www.pkdigest.com

دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔

"بچاؤ... بچاؤ... کوئی ہے۔" لڑکی چلا رہی تھی۔

بنے کٹے شخص نے اس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ رسید کیا۔ اس کے بال بکھر گئے اور وہ بالکل نڈھال سی ہو گئی۔ کوشش کے باوجود میں یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکا۔ میں اپنے گلے کی زنجیر کو کھینچتے ہوئے کھڑکی کے پاس آیا اور سلاخوں سے منہ لگا کر زور سے بولا۔ "اوئے... خدا کا خوف کر... چھوڑ دے اس لڑکی کو۔ میں کہتا ہوں چھوڑ دے۔"

بنے کٹے شخص نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں۔ وہ بہ دستور روتی چلاتی لڑکی کے ساتھ کشتی لڑتا رہا۔ ایک دوسرے پہرے دار کی آواز دروازے کی طرف سے آئی۔ مجھے اس کی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس نے ایک نہایت زہریلا فقرہ میرے کانوں میں اتارا۔ وہ بولا۔ "شیر شاہ صاحب! ابھی اتنا اچھلنے کی ضرورت نہیں۔ جب تمہاری اپنی بہن یہاں آئے گی پھر جتنا مرضی شور مچا لینا۔"

میری آنکھوں کے سامنے سرخ چادر سی تن گئی۔ جی چاہا کہ اپنی اس زنجیر کو اتنی زور سے جھٹکے دوں کہ وہ دیوار ہی اکھڑ جائے جس سے یہ پیوست ہے۔ تڑپ پھڑک کر خود ختم ہو جاؤں یا ان بے رحم رکاوٹوں کو ختم کر دوں۔ یہ سب کچھ ناقابل برداشت تھا۔ میں ایک بار پھر چلایا۔ "حرام زادے! تیری اپنی ماں، بہن بھی تو ہو گی۔ اس کے ساتھ ایسا ہوا تو کیا کرے گا... چھوڑ دے اس کو۔"

وہ شخص تو جیسے اندھا بہرا ہو چکا تھا۔ اس درندے کی طرح جو اپنے پنجوں میں آئے ہوئے شکار کے علاوہ کچھ دیکھ سکتا ہے نہ محسوس کر سکتا ہے۔ وہ شراب کے نشے میں وحشت تھا۔ ہماری آنکھوں کے عین سامنے وہ لڑکی کو تاراج کرنے پر تلا ہوا تھا...

اچانک ایک آواز نے میری توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ یہ طویلے کے اندر سے ہی بلند ہوئی تھی۔ "نہیں... خدا کے لیے نہیں... چھوڑ دو اسے... یہ بے قصور ہے۔ میری جان لے لو۔ چھوڑ دو اسے۔" ایک نوجوان پوری طاقت سے پکار رہا تھا۔ میں نے مصیبت زدہ لڑکی کی صورت دیکھی تھی۔ اس روتے کرلاتے نوجوان کو دیکھ کر میں ایک لمحے میں سمجھ گیا کہ یہ اس کی بہن یا قریبی کزن ہو گی۔

وہ اپنی زنجیر کو دیوانہ وار جھٹکے دینے لگا۔ ہر جھٹکے کے ساتھ اس کی گردن خوفناک انداز میں ایک طرف مڑ جاتی تھی۔ مجھے یہ ہی لگا کہ وہ اپنی دبلی پتلی فاقہ زدہ گردن تڑوا بیٹھے گا۔ دو تین افراد نے نوجوان کو پکڑ لیا۔ وہ اسے سنبھالنے کی کوشش کرنے لگے لیکن ناکام رہے۔ نوجوان نے تڑپ کر شیشے کی ایک بوتل اٹھائی۔ اسے دیوار پر مار کر توڑا۔ یہ ایک خطرناک ہتھیار بن گئی۔ پلک جھپکنے میں نوجوان نے یہ بوتل اپنی گردن پر مار لی۔ خون کی دھار نکلنے لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ خود پر دوسرا اور زیادہ سنگین وار کرتا، میں نے لپک کر اس کا بوتل والا ہاتھ تھام لیا۔ وہ چلانے لگا۔ "چھوڑ دو مجھے... مر جانے دو... مجھے مر جانے دو۔"

پھر وہ ایک دم تیورا کر پرالی یعنی چاول کی چھال پر گر گیا۔ اس کا رنگ بالکل زرد ہو گیا تھا۔ پتلیاں اوپر چڑھ گئیں۔ جسم اینٹھنے لگا۔ اسے ہارٹ اٹیک ہو رہا تھا یا کسی طرح کا اعصابی دورہ پڑ گیا تھا۔ اس کے ساتھی واویلا کرنے لگے۔ غازی اس کی گردن کا خون روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

یہ سفاکی کی انتہا تھی۔ اس ساری صورت حال کے باوجود ساتھ والے کمرے میں بنا کٹا شخص بہ دستور روتی چلاتی لڑکی سے گتھم گتھا رہا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ بے بس ہو گئی۔ دروازے پر کھڑے پہرے دار نے، جس کی شکل مجھے دکھائی نہیں دے رہی تھی، ایک کمبل لڑکی اور مرد کے اوپر پھینک دیا۔ اس کے بعد کے مناظر دیکھنا میرے بس میں نہیں تھا۔ شاید کسی کے بس میں بھی نہیں تھا۔ متحرک کمبل کے نیچے اس روئے زمین کا بدترین فعل انجام دیا جا رہا تھا۔ اسے کون انجام دے رہا تھا؟ وہی اشرف المخلوقات جسے ملائک نے سجدہ کیا تھا۔ جسے قدرت نے تمام جانداروں میں سے بہترین صلاحیتیں دے کر نہایت لطیف جذبوں سے نوازا ہے۔

دوسرے کمرے سے ابھرنے والی آوازوں کو سماعت تک پہنچنے سے روکنے کے لیے بیشتر افراد نے اپنی انگلیاں کانوں میں ٹھونس لی تھیں۔ شاید میں بھی ٹھونس لیتا۔ مگر پھر یہ آوازیں خود ہی ناپید ہو گئیں۔ شاید روتی بلکتی لڑکی ہوش و حواس سے بے گانہ ہو گئی تھی۔ ایک طرف فاقہ زدہ بھائی بے ہوش پڑا تھا۔ دوسری طرف کمزور و ناتواں بہن تھی۔ دونوں کے زخموں سے رستا ہوا لہو پرالی کو داغ دار کر رہا تھا۔

نوجوان کے جسم میں اکڑاؤ کی کیفیت اب ختم ہو گئی تھی۔ سانس میں آنے والے جھٹکے بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ تاہم وہ اب بھی مکمل بے ہوش تھا۔ اس کی نہایت زرد پیشانی پر پسینے کی بوندیں تھیں۔

وہ رات بڑی اذیت میں گزری۔ رات پچھلے پہر بدقسمت بہن کے بدنصیب بھائی کی طبیعت کچھ سنبھل گئی۔ اس کی ذہنی کیفیت کچھ ایسی ہو رہی تھی کہ وہ کسی بھی وقت خودکشی کی کوشش کر سکتا تھا۔ بہرحال، اس کے ساتھیوں نے

اسے سنبھالا ہوا تھا۔ ساتھ والے کمرے میں اب کوئی نہیں تھا۔ وہ لڑکی اب نہ جانے کہاں اور کس حال میں تھی۔ نہ چاہنے کے باوجود میرا ذہن بار بار اپنے گھر والوں کی طرف جا رہا تھا۔ سینے میں کچھ ہونے لگتا تھا۔ ایک سلگتی ہوئی آگ الاؤ بننے لگتی تھی۔ یہ الاؤ اس وقت کچھ اور بھی بلند ہو جاتا تھا جب پہرے دار کا کہا ہوا زہریلا فقرہ کانوں میں گونجتا تھا... اس نے کہا تھا۔ "ابھی اتنا اچھلنے کی ضرورت نہیں۔ جب تمہاری بہن یہاں آئے گی تب جتنا جی چاہے شور مچا لینا۔"

مجھے لگتا تھا کہ میری اذیت، میری برداشت سے باہر ہو جائے گی۔

صبح نو بجے کے قریب آصف جاہ کی شکل ایک کھڑکی سے باہر نظر آئی۔ اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا اور آنکھیں حسب معمول کبوتر کے خون کی طرح سرخ تھیں۔ دو محافظ اس کے عقب میں تھے۔ ان محافظوں کے ہاتھوں میں قیمتی زنجیروں سے بندھے ہوئے دو شکاری کتے تھے۔ وہی خوفناک مصری سلوکی ہاؤنڈز۔

آصف جاہ نے بیڑی کے چند طویل کش لے کر ارد گرد کی فضا کو دھوئیں سے مکدر کیا اور زہرخند لہجے میں طویلے کے قیدیوں کو مخاطب کر کے بولا۔ "ہاں بھئی! جاگ گئے ہیں سارے داماد؟"

کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بیشتر سر جھکائے بیٹھے رہے۔

وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "تم ہی کچھ بولو، ہمارے داماد صاحب!"

میں نے بھی منہ پھیر لیا۔

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "لگتا ہے کہ دامادوں کو رات والی لڑکی کا تماشا زیادہ پسند نہیں آیا۔ کیوں مظفر! یہی بات ہے نا؟" اس نے اپنے خوفناک صورت محافظ کی تصدیق چاہی۔

"ہاں جی! ایسا ہی لگتا ہے۔"

آصف جاہ نے ہم سے مخاطب ہو کر کہا۔ "یار! وہ کوئی لڑکی تھوڑی تھی۔ وہ تو نند تھی۔ صرف نند تھی۔ لمبی زبان والی، سخت بڈھیر والی۔ ایسی کراری نندیں بڑی بھیڑی شے ہوتی ہیں۔ اپنی بھابیوں کا جینا حرام کر دیتی ہیں۔ جب تک وہ اپنے گھر کی نہیں ہو جاتیں، بھابیوں کی جان سولی پر ٹنگی رہتی ہے۔ ایسی نندوں کو تو رول رول کر مارنا چاہیے۔" آصف جاہ کے لہجے میں ہیجان تھا۔

میں نے آصف کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"آصف! تجھے تیری نفرت نے بالکل اندھا کر دیا ہے۔ کیا تو نے یہ بھی سوچا ہے کہ جس کو تو نند کہہ رہا ہے وہ صرف نند نہیں تھی۔ وہ کسی کی بیٹی بھی ہے اور بہن بھی ہو گی۔ جس طرح تو شہوار کو چاہتا تھا، کوئی اس لڑکی کو بھی چاہتا ہو گا..."

ایک لمحے کے لیے نمبردار کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ مگر پھر فوراً ہی اس نے بیڑی کو مٹھی میں دبا کر دو مزید کش لیے اور بولا۔ "تم مجھے کتابی باتیں نہ سناؤ۔ مجھے وہ بتاؤ جو تم نے میری بیٹی کے ساتھ کیا اور جو تمہاری ماں، بہن نے کیا... اور پھر تمہاری معشوقہ نے بھی۔ میں کچھ بھی بھولا نہیں ہوں۔ ایک ایک زیادتی میرے سینے پر لکھی ہوئی ہے۔ یہاں... یہاں!" اس نے سینے پر زور سے دو دفعہ ہاتھ مارا اور اس کی آنکھوں میں قہر لشکارے مارنے لگا۔

"میں نے کہا ہے نا... اس میں تیرا قصور نہیں ہے۔ تجھے نفرت اور انتقام نے اندھا کر دیا ہے اور اس اندھے پن کی سزا تجھے یہ مل رہی ہے کہ تیری بیٹی کے اصل قاتل تیرے ارد گرد دندنا رہے ہیں اور تو بے گناہوں کو پکڑ پکڑ کر اپنا اعمال نامہ کالا کر رہا ہے۔"

"ابھی کالا کہاں ہوا ہے۔ ابھی تو ایک دو نقطے پڑے ہیں اس پر۔ اگر شہوار کی ساس اور نند یہاں پہنچ گئیں تو پھر شاید یہ کالا ہو جائے۔" اس کے لہجے میں خوفناک دھمکیاں پوشیدہ تھیں۔

اور یہی خطرات تھے جو مجھے دہکتے انگاروں پر لوٹا رہے تھے۔ میرے دل کی کیفیت کچھ عجیب ہو رہی تھی۔ میں ساری زنجیریں توڑ کر ساری دیواریں ڈھا کر اپنی ماں اور بہن کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ ان کے گرد اپنے بازوؤں کا ایسا آہنی حصار بنانا چاہتا تھا جس سے ٹکرا کر ہر خطرہ پاش پاش ہو جائے۔

لیکن یہاں سے نکلنا آسان نہیں تھا۔ آصف جاہ نے اس طویلے کو ایک ایسے بندی خانے کا روپ دے دیا تھا جس کی دیواروں سے ٹکرایا تو جا سکتا تھا، رہائی حاصل نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس جگہ کو انسانی اصطبل کہا جاتا تو غلط نہ ہوتا۔ انسان گھوڑوں ہی کی طرح بندھے ہوئے تھے۔ یہاں وہی بدبو اور نمی تھی جو مویشی خانوں کا خاصا ہوتی ہے۔

ہر قیدی کی زنجیر کی لمبائی بیس پچیس فٹ کے قریب تھی۔ یہ زنجیریں ہر وقت عجیب سا شور برپا رکھتی تھیں۔ اور بعض اوقات آپس میں الجھ بھی جاتی تھیں۔ ایک دیوار کے ساتھ چھوٹا سا دروازہ تھا۔ یہ دروازہ اس کوٹھڑی کا تھا جس میں یہ قیدی ضروریات سے فارغ ہونے کے لیے جاتے تھے۔

ان میں سے بیشتر افراد اپنی زندگی سے عاجز آچکے تھے۔ شام کے وقت آہنی سلاخوں کی دوسری طرف سے ان دامادوں کو اسی طرح روٹی پھینکی گئی جیسے کل پھینکی گئی تھی۔ بھوک سے بے حال افراد زیادہ روٹی حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے پر جھپٹ پڑے۔ روٹی کے ساتھ کسی بھی طرح کا سالن نہیں تھا۔ بہر حال کل کی نسبت آج روٹی کچھ زیادہ تھی۔ پینے کے پانی کے دو گھڑے رکھے تھے۔ ان میں سے ایک گھڑا کل کی دھینگا مشتی میں ٹوٹ چکا تھا۔ ایک اونچا مٹکا (مٹی) اس کوٹھڑی میں تھا جسے باتھ روم کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔

رات کے وقت جب اس زنداں کے مدقوق قیدی بے چارگی اوڑھ کر سو گئے تو میں جاگتا رہا۔ سینے میں نیلے شعلے بھڑک رہے ہوں تو نیند آنکھوں سے دور چلی جاتی ہے۔ میں کبھی بیٹھ جاتا، کبھی اٹھ کر ایک دیوار کے ساتھ ساتھ ٹہلنے لگتا۔ مجھے یہاں سے نکلنا تھا۔ اس سے پہلے کہ میرے پروں کی پھڑپھڑاہٹ ختم ہو جاتی اور میں بھی یہاں موجود دوسرے افراد کی طرح اس پنجرے کو ہی گھر سمجھنے لگتا، مجھے یہاں سے نکلنے کی ایک سرتوڑ کوشش کرنا تھی۔ اس کوشش کا انتظام میں نے کل رات ہی کر لیا تھا۔ کل جس نامعلوم لڑکی کو ساتھ والے کمرے میں تاراج کیا گیا تھا... اس کی بے بسی نے جہاں میرے دل پر گہرے گھاؤ لگائے تھے وہاں مجھے ایک ہتھیار بھی فراہم کر دیا تھا۔ یہ ہتھیار ایک موٹی "ہیئر پن" کی صورت میں تھا۔ شرابی مرد کا تھپڑ کھا کر لڑکی پرالی پر گری تھی اور اس کے منتشر بالوں سے یہ ہیئر پن جدا ہو کر کھڑکی کے قریب آگئی تھی۔ سلاخ دار کھڑکی کی اونچائی زمین سے ڈھائی تین فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ کل رات ہی میں نے سلاخوں کے اندر سے بازو گزار کر یہ ہیئر پن اٹھالی تھی۔

میں ہرفن مولا تھا یا نہیں لیکن ایک بات تھی، میں جو کام کرتا تھا پوری دل جمعی اور یکسوئی سے کرتا تھا۔ وہ کام کرتے ہوئے مجھے باقی سب کام تقریباً بھول جاتے تھے۔ کام جیسا بھی ہوتا تھا میں اس میں کھو جاتا تھا اور خود کو یقین دلاتا تھا کہ یہ کام میں نے ہی کرنا ہے اور کسی کی بھی مدد کے بغیر۔ اور اکثر وہ کام ہو جاتا تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ میری صلاحیتوں سے زیادہ میرے یقین کی بات تھی۔ میرے یقین کے سبب قدرت بھی میری مدد کرتی تھی۔

میں نے کل رات والی بدنصیب لڑکی کی ہیئر پن کو موڑ کر ایک تار کی شکل دے دی اور اس تار سے وہ چھوٹا سا تالا کھولنا شروع کر دیا جسے عام زبان میں جندری کہا جاتا ہے۔ یہ تالا میرے گلے کی آہنی پٹی کو مقفل کرتا تھا۔ میں لیٹا رہا اور بڑی خاموشی سے کوشش کرتا رہا۔ لالٹین کی روشنی بہت دھیمی تھی۔ سلاخ دار کھڑکیوں سے باہر پہرے دار اونگھ رہے تھے۔ ایک طویل سرد رات نے قلعہ والا کے نشیب و فراز پر اپنے پنجے گاڑے ہوئے تھے۔ مہیب سناٹے میں بس کبھی کبھی کسی پہرے دار کی آواز گونجتی تھی۔ "جاگدے رہو" یا پھر گاؤں کی کسی گلی میں کوئی ٹھٹھرا ہوا کتا اپنی موجودگی کا احساس دلاتا تھا۔

میرے چلے ہوئے دونوں پاؤں پر آبلے پڑ گئے تھے... اور سر کی ایک جانب دو گومڑ سے بنے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ بھی اندرونی بیرونی بہت سی چوٹیں تھیں۔ دبے پاؤں سے گزرتی ہوئی رات میں عجب سا فسوں تھا۔

اچانک "کلک" کی ایک دھیمی سی آواز امید کی کرن بن کر ابھری۔ تالے کے ساتھ میری مسلسل چھیڑ چھاڑ بالآخر رنگ لے آئی تھی۔ میری گردن کا طوق کھل گیا۔ چوبیس گھنٹے میں ہی اس منحوس طوق نے میری گردن پر خراشیں ڈال دی تھیں۔ گلے سے زنجیر نکلنے کے بعد بالکل یہی لگا جیسے میری گھٹی ہوئی سانسیں بحال ہو گئی ہیں۔ آزادی اور غلامی کا فرق بھی معلوم ہوا۔

جس طویلے میں ہمیں رکھا گیا تھا اس کی چوڑائی بیس فٹ اور لمبائی ساٹھ فٹ کے لگ بھگ تھی۔ چھت شہتیر والی اور بالوں کی تھی۔ اس چھت میں دو جگہ چوکور خلا تھے۔ یہ خلا روشنی اور ہوا وغیرہ کے لیے رکھے جاتے ہیں، دیہات میں انہیں "مگھ" کہا جاتا ہے۔ عام طور پر یہ مگھ کھلے ہوتے ہیں لیکن اس طویلے کے دونوں مگھوں میں تین تین آہنی سلاخیں تھیں۔ میرا اندازہ تھا کہ مٹی میں لگی ہوئی یہ سلاخیں زیادہ مضبوط نہیں ہیں اور انہیں کوشش کرکے اکھاڑا جا سکتا ہے۔

میں نے اپنے قریب لیٹے غازی محمد کو جگایا... اور بڑی دھیمی آواز میں اسے بتایا کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔ وہ بہت حیران ہوا۔ نیند سے بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "خاور صاحب! مجھے آپ کی بات سمجھ میں نہیں آرہی۔ ہمارے گلے میں جو زنجیر ہے وہ کسی صورت ہمیں اس مگھ تک نہیں پہنچنے دے گی۔"

"لیکن اگر زنجیر نہ ہو تو؟" میں نے کہا۔

"میں سمجھا نہیں۔"

میں نے اسے اپنی گردن کا آہنی حلقہ کھول کر دکھایا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ میں نے اسے بتایا کہ

www.pkdigest.com

پچھلے ڈھائی تین گھنٹے کی میری کوشش کس طرح اچانک رنگ لائی ہے۔ میں نے کچھ دیر تک غازی کی زنجیر کے تالے کے ساتھ بھی کوشش کی مگر یہ کام ایسا آسان نہیں تھا اور نہ ہی اتنی جلدی ہونے والا تھا۔

غازی بولا۔ ''مجھے چھوڑیں خاور صاحب! آپ یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں۔ آپ نکل گئے تو شاید ہمارا بھی کچھ ہو جائے۔''

''شاید کیوں کہہ رہے ہو... یہ ضرور ہوگا۔ یہ میری ذمے داری ہے۔ تم نے سنا نہیں تھا ارشد کیا کہہ رہا تھا۔ نمبردار کا اصل قصوروار تو میں ہوں۔ تم سب اس لیے آفت میں ہو کہ میں نمبردار کے ہتھے نہیں چڑھ رہا تھا۔ اور ارشد نے یہ کوئی غلط بات نہیں کی ہے...''

ہمارے درمیان چند منٹ مشورہ ہوا۔ پھر طویلے کی اکلوتی لالٹین ہم نے بجھا دی۔ مکمل اندھیرا چھا گیا۔ غازی صحت مند اور مضبوط کاٹھی کا تھا۔ وہ ایک مگھ کے عین نیچے کھڑا ہو گیا۔ میں اس کے کندھوں پر چڑھا۔ پھر اس کے کندھوں پر پاؤں رکھ کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ میرے ہاتھ مگھ تک پہنچنے لگے۔ میرے ہاتھ میں وہی ٹوٹی ہوئی بوتل تھی جس سے ایک دن پہلے نوجوان نے اپنی گردن زخمی کی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے یہ بوتل چھین کر پرالی کے نیچے چھپا دی تھی۔ اب یہ بوتل میرے لیے مٹی کھودنے کا ایک مناسب اوزار تھی۔ مگھ کی دو سلاخوں کو اکھاڑنا میرے لیے توقع سے زیادہ آسان ثابت ہوا۔ شاید میرے اندر کی وہ توانائی بھی بھرپور کام کر رہی تھی جس کا ماخذ میرے سینے میں بھڑکنے والے نیلے شعلے تھے۔ تھوڑی سی خوش قسمتی بھی شامل حال رہی۔ ہماری کارروائی کے دوران میں کسی پہرے دار نے مداخلت نہیں کی۔ یقیناً انہیں اس قسم کی کسی حرکت کی توقع ہی نہیں تھی۔

میں نے بازوؤں کے زور پر اپنے جسم کو اوپر اٹھایا اور چھت کے سوراخ میں سے باہر نکل آیا۔ چھت پر اوندھے لیٹ کر میں نے سر اوپر اٹھایا۔ تاریک آسمان پر ٹھٹھرے ہوئے تاروں کا منظر عجیب لگا۔ ہوا کی ٹھنڈک رگوں میں خون جما دینے والی تھی مگر میرے اندر کی بے پایاں تپش نے اس ٹھنڈک کو بے اثر کر دیا۔ میں نے چھت پر اوندھے لیٹے لیٹے ہی اس جگہ کا پورا جائزہ لے لیا۔ فی الحال میرے پاس واحد ہتھیار مٹی کے تیل کی وہی ٹوٹی ہوئی بوتل تھی۔

میں بڑی احتیاط کے ساتھ چھت سے اترا اور دیوار کے ساتھ ساتھ بیرونی چار دیواری کی طرف بڑھا۔ یہاں درخت تھے جو مجھے بہترین آڑ فراہم کر رہے تھے۔ مگر پھر اچانک یوں ہوا کہ رکھوالی کے کتوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ مجھے ان کی گونجتی ہوئی آوازیں مین دروازے کی طرف سے آئیں۔ اس کے ساتھ ہی پہرے داروں کے بولنے کی آوازیں سنائی دیں۔ اس سے پہلے کہ میں بیرونی چار دیواری تک پہنچتا اور اسے پھلانگنے کی کوشش کرتا، دو انسانی سائے مجھ پر جھپٹے۔

''خبردار اوئے... گولی مار دیں گے۔'' ایک شخص للکارا۔

میں نے آواز پہچان لی۔ یہ آصف جاہ کا خاص کارندہ مولوی مظفر ہی تھا۔

میرے جسم میں اضافی توانائی کی بلند لہریں تھیں۔ اس سے پہلے کہ مظفر کے ہاتھ میں پکڑی رائفل شعلہ اگلتی میں جست لگا کر اس پر جا پڑا۔ میرے ہاتھ اس کی رائفل پر آئے اور میرے سر کی طوفانی ضرب عین اس کی ناک پر لگی۔ وہ ڈکراتا ہوا پودوں میں گرا۔ رائفل کچے ہوئے پھل کی طرح اس کے گرفت ہاتھوں سے جدا ہو گئی۔

دوسرے پہرے دار نے پہلو کی طرف سے مجھ پر حملہ کیا۔ میں نے رائفل کا دستہ گھما کر اس کے چہرے پر مارا۔ دانت ٹوٹنے کی واضح آواز آئی اور وہ شخص بھی پشت کے بل گرا۔ مظفر سنبھل کر پھر میری طرف آیا۔ اس شخص کے لیے میرے دل میں رحم کی کوئی رمق نہیں تھی۔ اس کا کہا ہوا ہر ایک فقرہ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔ میں نے اس پر سیدھا فائر کیا۔ گولی اس کی ران میں لگی اور وہ تڑپ کر دوہرا ہو گیا۔ دوسری گولی میں نے اس کی دوسری ٹانگ میں ماری۔ وہ اپنی تمام طاقت، پھرتی اور وحشت سمیت ایک کیاری میں گر کر تڑپنے لگا۔

میں اندھا دھند مین گیٹ کی طرف بھاگا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ تین چار سلوکی ہاؤنڈ پوری رفتار سے بھاگتے ہوئے میری طرف آ رہے تھے۔ ان کے پیچھے شور مچاتے پہرے دار تھے۔ مجھے دیکھ کر گیٹ کے قریب کھڑا پہرے دار بالکل چوکس ہو گیا۔ اس نے بے دریغ مجھ پر فائر کیا مگر یہاں میری قسمت نے یاوری کی۔ دو گولیاں مجھے چھوئے بغیر گزر گئیں۔ تیسری پہرے دار کی رائفل میں ہی پھنس گئی۔ میں نے بھاگتے بھاگتے اس پہرے دار کی گردن پر رائفل کا وزنی دستہ مارا۔ یہ چوٹ اسے کسی ایسی جگہ لگی کہ وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گیٹ کے سامنے انگیٹھی کے قریب گرا اور بے حرکت ہو گیا۔

''پکڑو... پکڑو!'' کتوں کے عقب میں بھاگتے ہوئے پہرے دار چلا رہے تھے۔

میں نے گیٹ کا دوسرا کھٹکا کھولنا چاہا مگر جلدی جلدی میں ناکام رہا۔ اس دوران میں کتے بالکل قریب پہنچ گئے۔ مجھے لگا کہ اب میں یہاں سے نکل نہیں سکوں گا، شاید ابھی رہائی کا وقت نہیں آیا تھا۔ آخری کوشش کے طور پر میں نے اپنا رخ پھیرا اور پشت گیٹ کے ساتھ لگا کر رائفل سیدھی کر لی۔ میری چلائی ہوئی پہلی گولی ہی اگلے سلوکی ہاؤنڈ کے چہرے پر لگی۔ وہ چلایا اور لڑھکنیاں کھاتا ہوا درخت میں گرا۔ دوسری گولی دوسرے کتے کو چاٹ گئی۔

باقی دو کتوں کی رفتار ایک دم کم ہوئی اور وہ خطرہ محسوس کر کے چند لمحوں کے لیے رک گئے۔ میرے لیے اتنی مہلت کافی تھی۔ میں نے ایک ہاتھ سے ہوائی فائر کیے اور دوسرے سے گیٹ کا کھٹکا کھول دیا۔ گیٹ سے نکلتے ہی میرے ذہن نے بروقت کام کیا اور میں نے باہر سے گیٹ کا کھٹکا چڑھا دیا۔ کتے ایک نہایت مختصر وقفے کے بعد پھر برق رفتاری سے گیٹ کی طرف آئے۔ گیٹ کے نیچے خلا موجود تھا، مگر اتنا زیادہ نہیں تھا کہ سلوکی ہاؤنڈ اس کے نیچے سے نکل سکتا۔ انہوں نے اپنی تھوتھنیاں گیٹ کے نچلے خلا میں گھسیڑ دیں اور پوری قوت سے باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگے۔ ان کی آوازیں فلک شگاف تھیں۔

میں اس تھان کی طرف دوڑا جہاں گھوڑے بندھے رہتے تھے۔ تھان کے اندر سے ایک سایہ دوڑتا ہوا باہر نکلا۔ میں نے اس کی ٹانگ پر فائر کرنے کے لیے رائفل سیدھی کی مگر پھر اس کی صورت دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ یہ وہی ایک بازو والا ماسٹر تھا جسے کچھ سال پہلے نمبردار کی طرف سے بازو کاٹے جانے کی سزا ملی تھی۔ لبلبی پر رکھی ہوئی میری انگلی رک گئی۔

''بھاگ جاؤ ماسٹر صاحب۔'' میں پھنکارا۔

اپنی آواز کی بے پناہ وحشت خود مجھے بھی واضح طور پر محسوس ہوئی۔ ماسٹر جی کی ذہانت نے اسے سمجھا دیا کہ اگر اس نے اپنی نوکری بچانے کے لیے کسی بھی طرح کی نمک حلالی دکھانے کی کوشش کی تو وہ گولی کا نشانہ بن جائے گا۔

اس نے اپنا اکلوتا ہاتھ اوپر اٹھا کر اپنی پسپائی کا اشارہ دیا اور تیزی سے ایک طرف اوجھل ہو گیا۔ مجھے دو ہی گھوڑے ایسے نظر آئے جن پر کاٹھی پڑی ہوئی تھی۔ میں نے ایک گھوڑا سنبھالا اور اصطبل سے نکل کر بڑی تیزی سے کھیتوں میں آ گیا۔

تب تک حویلی کے محافظ حویلی کے پہلو کی طرف سے دیوار پھاند کر باہر آ چکے تھے۔ مجھے فوری خطرہ ایک جیپ سے ہو سکتا تھا جو اصطبل کے سامنے کھڑی تھی اور میرے تعاقب میں آ سکتی تھی۔

میں نے بھاگتے بھاگتے دو فائر مزید کیے اور اس کا ایک اگلا ٹائر برسٹ کر دیا۔ رات کی ٹھٹھری ہوئی تاریکی میری معاون ثابت ہو رہی تھی۔ ایک جانب سے کچھ افراد کی چلائی ہوئی آوازیں آئیں... اور دو فائر ہوئے تاہم میں محفوظ رہا۔ میں مکئی کے کھیتوں میں گھسا اور اندھا دھند گھوڑا بھگاتا چلا گیا۔ مجھے امید تھی کہ گھوڑوں پر کاٹھیاں ڈالتے ڈالتے یا حویلی کے اندر سے کسی گاڑی کے نکلنے تک میں محفوظ فاصلے پر پہنچ جاؤں گا۔ مولوی مظفر سے چھینی ہوئی رائفل میرے ہاتھ میں تھی، میرے اندر ایک طوفان پل رہا تھا۔ اس طوفان نے مجھے ہر خطرے سے بے نیاز کر دیا تھا۔ شاید یہ وہی حالت تھی جس میں بندہ مرنے یا مار دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ میرا رخ ڈیک نالے کی طرف تھا۔ وہی ڈیک نالہ جس کے ایک دور افتادہ کنارے پر کیکراں والی گاؤں آباد تھا۔ جہاں میری والدہ، بہن اور اس کا بچہ موجود تھے... اور ان کے گرد سنگین خطرات منڈلا رہے تھے۔ گھوڑا بھگاتے ہوئے میرا ذہن بار بار ایک دن پہلے کے اس واقعے کی طرف جا رہا تھا، جب آصف جاہ دندناتا ہوا ایک کوٹھڑی میں داخل ہوا تھا اور جھلائے ہوئے انداز میں مجھ پر ہنٹروں کی بارش کر دی تھی۔

اس کی جھلاہٹ سے اندازہ ہوا تھا کہ میری والدہ اور بہن پر ہاتھ ڈالنے کی اس کی ایک اور کوشش ناکام ہوئی ہے۔ اس موقعے پر اس نے جو فقرہ کہا تھا، وہ بھی ابھی تک میری سماعت میں تازہ تھا۔ اس نے کہا تھا۔ ''وہ تیری بڑی پکی نکلی ہے۔ تجھ پر اپنے درجنوں بندے ہی نہیں، اپنی جان بھی فدا کر سکتی ہے۔''

اس کا اشارہ بیگم بلقیس کی طرف تھا اور یقیناً وہاں کیکراں والی میں کوئی ایسی کشمکش ہوئی تھی جس میں آصف جاہ کو منہ کی کھانی پڑی تھی۔

تاریک نشیب و فراز میں گھوڑا دوڑ رہا تھا۔ میں عام راستے سے ہٹ کر کھیتوں اور چھوٹی پگڈنڈیوں کو استعمال کر رہا تھا۔ مقصد یہی تھا کہ پیچھے آنے والوں سے بچا رہوں۔ اور میں ابھی تک اپنی اس کوشش میں کامیاب تھا۔ ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ مجھے اپنے اردگرد کے حالات کا کچھ پتا نہیں تھا۔ معلوم نہیں تھا کہ میرا مددگار شاہنواز بھی زندہ بچا ہے یا نہیں... اس کے زخمی ہونے کی خبر تھی مگر تیمور کی تو کوئی خبر ہی نہیں تھی۔ میرے پکڑے جانے کے بعد قبرستان میں جو کچھ ہوا، وہ میری نظروں سے یکسر اوجھل تھا۔

ایک ڈھول سے اٹے ہوئے راستے کے کنارے ایک

گاڑی کی عقبی سرخ بتیاں نظر آرہی تھیں۔ رات کے اس پہر پولیس کی گاڑی بھی ہو سکتی تھی۔ بہرحال، یہ ایسی جگہ تھی کہ مجھے اس گاڑی کے قریب سے ہی گزرنا پڑا۔ یہ ایک کار تھی۔ اس کا بونٹ اٹھا ہوا تھا اور ایک شخص گرم چادر میں لپٹا لپٹایا کار کے ریڈی ایٹر میں پانی ڈال رہا تھا۔ دوسرا شخص پاس کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ ٹارچ کی روشنی میں مجھے ریڈی ایٹر پر جھکے ہوئے شخص کی مختصر سی جھلک نظر آئی اور میں بری طرح چونک گیا۔ اس کے ساتھ ہی میرے دل کی دھڑکن بڑھ گئی اور جسم سنسنا اٹھا۔ مجھے شک گزرا کہ کار کے ریڈی ایٹر میں پانی ڈالتا ہوا شخص کوئی اور نہیں ساجا کے ٹو ہے۔

میں گھوڑے کو سیدھا بھگاتا چلا گیا۔ سردی سے بچنے کے لیے میں نے اپنا چہرہ اچھی طرح مفلر میں چھپایا ہوا تھا۔ اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ گاڑی کے پاس موجود افراد کو مجھ پر کسی طرح کا شبہ ہوا ہوگا۔ میں نے قریباً ایک فرلانگ آگے جا کر گھوڑا ایک کماد کی آڑ میں روک دیا۔ میرا دل پوری شدت سے گواہی دے رہا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے جس شخص کو دیکھا ہے، وہ کوئی اور نہیں یار مار کے ٹو ہے... اگر وہ واقعی کے ٹو ہی تھا تو پھر میں کیکراں والی کی طرف اپنا سفر جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔ پہلے مجھے کے ٹو سے ملاقات کرنی تھی۔

ابھی مجھے وہاں بلند قامت کماد کے عقب میں کھڑے دو چار منٹ ہی ہوئے تھے کہ کار کے انجن کا شور ابھرا اور وہ اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھنے لگی۔ وہ میری طرف ہی آرہی تھی۔ قریباً تین چار منٹ بعد وہ میرے پاس سے گزری۔ ایک اچھا اتفاق تھا کہ اس کی اندرونی بتی جل رہی تھی۔ میں نے اس مدھم روشنی میں کار کی اگلی نشست پر جس شخص کو دیکھا، وہ کے ٹو کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ اسے دیکھ کر میرا سینہ جل اٹھا۔ کار کی عقبی سیٹ پر غالباً ایک یا دو عورتیں تھیں۔ وہ پردے میں تھیں، مجھے ان کی صورتیں نظر نہیں آ سکیں۔

کار کچھ فاصلے پر چلی گئی تو میں نے بھی گھوڑے پر سوار ہو کر اس کی لگام کو ہلکا جھٹکا دیا اور کار کی ہچکولے کھاتی سرخ بتیوں کا پیچھا کرنے لگا۔

☆☆☆

قریباً آدھ گھنٹے بعد میں کماد اور مکئی کے کھیتوں کے عین درمیان واقع ایک گھر کے سامنے موجود تھا۔ یہ کچا گھر تین چار کمروں، ایک برآمدے اور وسیع صحن پر مشتمل تھا۔ بیرونی دیوار قریباً چھ فٹ اونچی تھی۔ گھر کے صحن میں ایک بڑا کتا چکرا رہا تھا۔ کار صحن میں پہنچ چکی تھی، تاہم اس کے چاروں دروازے کھلے تھے اور ٹیپ زور شور سے بج رہا تھا۔ ایک پنجابی گانے کی دھنا دھن فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔

منڈا شہر لہور دا، میرے دل تے تیر چلاوے

میں نے گھوڑے کو ایک کیکر سے باندھ دیا... اور رائفل کو چیک کرنے کے بعد احتیاط سے گھر کی بیرونی چار دیواری کے قریب پہنچ گیا۔ گھر کے پہلو میں کچھ درخت تھے اور کنوئیں کے آثار بھی دکھائی دیتے تھے۔ میں نے بیرونی چار دیواری کے اوپر سے احتیاط کے ساتھ اندر جھانکا۔ گھر کے برآمدے میں لالٹینوں کی روشنی نظر آئی... اور باتوں کی مدھم آواز بھی کانوں تک پڑی۔

بے شک یہ ساجے کے ٹو کی آواز تھی۔ وہ نشے میں تھا اور اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا۔ ''اوئے گامے! ایک بوتل اور کھول لے۔ آج کوئی کسر نہ رہ جائے۔ بعد میں بڑ بڑ کرے گا۔''

''اونہیں یار... بس ٹھیک ہے۔ زیادہ چڑھ گئی تو پھر کسی کام کا نہیں رہوں گا۔'' گامے نے ہاتھ لہرا کر کہا۔

ان دونوں کے قریب ہی دو عورتیں کھڑی تھیں۔ فاصلے سے ان کی عمر اور صورت کا اندازہ لگانا مشکل تھا، تاہم اپنے لباس سے وہ بازاری دکھائی دیتی تھیں۔

کے ٹو کچھ زیادہ ہی ترنگ میں تھا۔ اس نے لہک کر کہا۔

''ادھر آ میری سوہنی۔''

پھر اس سے پہلے کہ سوہنی اس کے پاس آتی، وہ خود ہی اس کے پاس چلا گیا۔ اس نے اسے اٹھا کر کندھے پر لادا اور موسیقی کی دھنا دھن پر الٹا سیدھا ناچنا شروع کر دیا۔ اس کی نقل کرتے ہوئے اس کے ساتھی نے بھی اپنے حصے کی عورت کو اٹھایا... اور ناچنے کی کوشش کی مگر اس کی ٹانگ میں کوئی نقص تھا، وہ ٹھیک سے ناچ نہیں سکا اور گر گیا۔

کے ٹو اور دونوں عورتیں ہنس ہنس کر دوہری ہونے لگیں۔ کے ٹو کی مدھم آواز میرے کانوں تک پہنچی۔ وہ گامے سے کہہ رہا تھا۔ ''اوئے! اس دوسری کو بھی میرے کندھے پر لاد دے۔ دونوں کو اٹھا لوں گا۔''

رکھوالی کے کتے نے شاید میری موجودگی محسوس کر لی تھی۔ اس کی آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کچھ مضطرب ہے۔ مگر کے ٹو اور اس کا ساتھی اپنی حرکتوں میں اتنے مگن تھے کہ انہوں نے خطرے کی اس گھنٹی کو بالکل اہمیت نہیں دی۔ پھر میں نے دیکھا کہ کے ٹو نے بے صبری کے انداز میں ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور ناچنے والی لڑکی کو کندھے پر لادے لادے اندر گھس گیا۔

اس کا ساتھی گاما دوسری لڑکی کے ساتھ برآمدے میں ہی ایک چارپائی پر ڈھیر ہو گیا۔ حالانکہ سردی تھی مگر لگتا تھا کہ

شراب اور شباب کی گرمی نے ان کے لیے سردی کو بے اثر کر رکھا ہے۔

دفعتاً مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ صحن میں موجود بے چین کتے نے اپنی زنجیر کھونٹے سے اکھاڑ لی تھی۔ وہ تیزی سے دیوار پھلانگ کر میری طرف آیا۔ میری سمجھ میں یہ بالکل نہیں آیا کہ اس نے دیوار کس طرح پھلانگی۔ میں نے اس کی پرچھائیں کو اپنی طرف لپکتے دیکھا۔ میرے بوسیدہ کوٹ کی جیب میں ابھی تک وہ ٹوٹی ہوئی بوتل موجود تھی جسے میں نے طویلے میں سے ایک ہتھیار کے طور پر لیا تھا۔ کتے پر فائر کرنے کے بجائے میں نے اسے تیز دھار بوتل سے نشانہ بنانا بہتر سمجھا۔

میری یہ کوشش توقع سے زیادہ کامیاب ثابت ہوئی۔ کتے نے مجھ پر جست لگائی۔ میں نے بوتل کے ٹوٹے ہوئے حصے سے اس کے سینے کو نشانہ بنایا۔ باقی کا کام کتے کے آگے بڑھتے ہوئے جسم نے خود ہی کر دیا۔ بوتل کے تیز دھار کنارے نے کتے کے پیٹ کو قریباً دو فٹ تک پھاڑ کر رکھ دیا۔ کتا مکئی کے پودوں میں گرا اور بری طرح تڑپنے لگا۔

اسے اس کے حال پر چھوڑ کر میں نے دیوار پھاندی اور کچے صحن میں کود گیا۔ وسیع صحن کے دوسرے کنارے پر نیم روشن برآمدہ نظر آ رہا تھا۔ گاما نشے میں بالکل ہی بے سدھ ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ جو عورت وہ اپنی رنگ رلیوں کے لیے لایا تھا، وہ بھی اس کے لیے بے کار ہو چکی تھی۔ وہ عورت نما لڑکی اسے ہلا کر اٹھانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ ''اوئے اٹھ جا... تُو تو شیر بننے سے پہلے ہی بکری ہو گیا ہے۔''

گاما چارپائی پر اوندھے منہ پڑا تھا۔

اور یہی وقت تھا جب عورت نما لڑکی نے گھوم کر عقب میں دیکھا۔ میں رائفل بدست اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے چلانے کے لیے منہ کھولا مگر میں بالکل قریب تھا۔ میں نے رائفل کی لمبی نال اس کے منہ میں ڈال دی۔ ''خبردار... آواز نہ نکالنا۔'' میں نے کہا۔

میرے لہجے کی وحشت نے اسے جیسے ہپنا ٹائز کر دیا۔ گاما اس کی گود میں سر رکھے اتنا غافل ہو چکا تھا۔ میں نے کہا۔ ''چلو اترو چارپائی سے۔''

وہ لرزتی کانپتی اتر گئی۔ رائفل کی نال اس نے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر منہ سے نکال دی تھی۔

چار دیواری سے باہر کھیت میں کتا جان کنی کے مرحلے سے گزر رہا تھا۔ اس کی مدھم آوازیں برآمدے تک پہنچ رہی تھیں۔ میں نے اس ستائیس اٹھائیس سال کی جواں سال عورت کو [illegible] کر ایک کمرے میں بند کر دیا۔ اس کے بھڑکیلے لباس اور بھاری میک اپ سے عیاں تھا کہ وہ بازاری ہے۔

''اگر آواز نکالو گی تو کل کا سورج دیکھنا نصیب نہ ہو گا۔'' میں نے رائفل اس کی گردن میں دھنساتے ہوئے کہا۔

اس نے اثبات میں سر ہلا کر اپنی اطاعت مندی کا یقین دلایا۔ وہ مسلسل کانپ رہی تھی۔ رائفل کی نال کی رگڑ سے اس کے تالو سے خون بہنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ اپنے دوپٹے سے مسلسل ہونٹوں تک آنے والا خون پونچھ رہی تھی۔

اسے کمرے میں بند کر کے، میں دوسرے کمرے کی طرف بڑھا۔ ایک نہایت زوردار لات مار کر میں نے لکڑی کا یہ دروازہ کھول دیا۔ آہنی کنڈی اکھڑ کر دور جا گری۔ سامنے لالٹین کی روشنی میں ڈرامائی منظر نظر آیا۔

لڑکی عریاں تھی اور کے ٹو نیم عریاں۔ رنگین پایوں والے نواڑی پلنگ پر چادر کی جگہ بہت سے نوٹ بکھرے ہوئے تھے۔

لڑکی زور سے چلائی اور اس نے کچھ نوٹ اٹھا کر اپنے بالائی جسم کو ڈھانپنے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے کہ یہاں یہ نوٹ ہی چادر اور بچھونے کا کام کر رہے تھے... کے ٹو کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔ اس کے جسم پر فقط ایک دھوتی تھی۔ میرے چہرے پر ابھی تک ڈھاٹا تھا۔ وہ مجھے پہچاننے میں ناکام رہا تھا لیکن میری تنی ہوئی رائفل تو سب کے لیے قابل شناخت ہوتی ہے اور اس سے نکلنے والی گولی کا مطلب بھی ہر ایک کو معلوم ہوتا ہے۔

کے ٹو کو دیکھ کر میرے لیے اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے سینے پر بڑے زور سے لات رسید کی۔ وہ اچھل کر دیوار سے ٹکرایا... قریب ہی اس کا پستول لٹک رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے محسوس ہوا کہ وہ پستول کی طرف لپکنا چاہ رہا ہے۔ میں نے اس کے پاؤں کے پاس فائر کیا۔ کے ٹو دھماکے کے ساتھ ہی اچھلا اور کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔

لڑکی زمین پر بیٹھ گئی اور میری طرف سے رخ پھیر کر قمیص پہننے لگی۔ میں نے آگے بڑھ کر دیوار سے کے ٹو کا پستول اتار لیا اور کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔

''کون ہو تم؟'' بدحواسی کے سبب شاید کے ٹو میری آواز پہچان نہیں سکا تھا۔

''تمہیں لالچ اور ہوس نے اندھا کیا ہوا ہے۔ تم کسی کو کیسے پہچان سکتے ہو۔'' میں نے منڈاسا چہرے سے اتار دیا۔

ساجا کے ٹو سکتہ زدہ کھڑا رہ گیا۔ اگلے ایک منٹ میں،

www.pkdigest.com

میں نے کے ٹو کی ساتھی لڑکی کو بھی کمرے میں بند کر دیا۔ کمرے میں ایک سلاخ دار کھڑکی کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ کے ٹو کے ساتھ والی لڑکی ہاتھ جوڑ کر گھگیائی۔ ''ہمارا کوئی قصور نہیں ہے جی... ہم تو پیٹ کی خاطر یہ سب کرتے ہیں۔ ہم صبح نادیتے ہیں جی۔ کبھی ناغہ نہیں کیا۔''

وہ اس بھتے کی بات کر رہی تھی جو غالباً پولیس والوں کو دیا جاتا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ مجھے بھی سادہ کپڑوں میں کوئی پولیس والا ہی سمجھ رہی ہے۔

میں نے انہیں خاموش رہنے کی ہدایت کی اور دروازے کو باہر سے بند کر دیا۔ گاما بے سدھ تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ ڈیڑھ دو گھنٹے سے پہلے اپنے حواس میں نہیں آئے گا اور اگر ہم اس کے سرہانے ڈھول بھی پیٹتے رہے تو وہ اسی طرح مردار بن کر پڑا رہے گا۔

دونوں عورتوں کی طرف سے مطمئن ہو کر میں نے کے ٹو والے کمرے کا دروازہ کھولا... رائفل بالکل تیار حالت میں اور میری انگلی لبلبی پر تھی۔

کے ٹو کا سارا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔ وہ کسی مجرم کی طرح سر جھکائے پلنگ پر بیٹھا تھا... یہ وہی پلنگ تھا جس پر اس نے اپنی خودنمائی اور عیاشی کے لیے نوٹ بچھار کھے تھے۔ کم ظرف لوگ ایسی حرکتیں اس وقت کرتے ہیں جب ان کے پاس اچانک کہیں سے بہت ساری دولت آجاتی ہے۔

میں نے کہا۔ ''کے ٹو! مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا۔ دنیا بھر کے غداروں کا مقابلہ کرایا جائے تو مجھے یقین ہے کہ تو پہلے نمبر پر آجائے گا۔''

''تو پہلے... م... میری پوری بات سن لے۔ تجھے غلط فہمی ہو رہی ہے...''

ابھی اس کا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ میں نے رائفل کا دستہ گھما کر اس کے منہ پر مارا۔ وہ الٹ کر نوٹوں کی چادر پر جا گرا۔ اس کے ہونٹوں سے بہنے والا خون نوٹوں کو رنگین کرنے لگا۔ یقیناً ان بہت سے نوٹوں میں وہ نوٹ بھی شامل ہوں گے جو چاچے رفاقت کی جمع پونجی تھے اور اس نے بڑے ایثار کے ساتھ یہ نوٹ کے ٹو کے حوالے کیے تھے تاکہ وہ میرے لیے کوئی بہت اچھا وکیل ڈھونڈ سکے۔

میں نے رائفل کی نال بے دریغ کے ٹو کی کنپٹی سے لگا دی۔ ''کے ٹو! کل تک ہم یار تھے لیکن آج بدترین دشمن ہیں اور مجھ سے کسی رعایت کی توقع نہ رکھنا۔ اگر تو نے اپنے کالے کرتوتوں میں سے کوئی ایک کرتوت بھی چھپانا چاہا تو میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں، آج تجھے یہاں اسی جگہ مار کر گاڑ دوں گا۔''

ہکلایا۔

''مجھے کچھ نہیں سننا کے ٹو... اور نہ میرے پاس وقت ہے۔ تیرے جیسے حرامزادوں کی وجہ سے میں اس وقت سخت مصیبت میں ہوں۔ میرے گھر والوں کی جان خطرے میں ہے اور ان کو خطرے سے نکالنے کے لیے میں آج رات تیرے جیسے دس غداروں کا قتل بھی کر سکتا ہوں۔ اور یہ کوئی زبانی دعویٰ نہیں ہے کے ٹو... میں جو کہہ رہا ہوں وہ کر کے بھی دکھاؤں گا۔''

''م... میں ایک بڑی مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ دراصل جب میں چاچے رفاقت کے گھر سے پیسے لے کر نکلا...''

اس کا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی میں نے ایک اور ٹانگ اس کے سینے پر رسید کی۔ وہ بری طرح کھانسنے لگا۔ ''تم کسی مصیبت میں نہیں پھنسے تھے کے ٹو... تم اب پھنسے ہو اور یہ اتنی بڑی مصیبت ہے کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ تمہیں اچھی طرح پتا ہے جب میں کسی بندے سے کچھ اگلوانے پر آجاؤں تو پھر اسے اگلنا ہی پڑتا ہے۔''

میں ایک دم اس پر پل پڑا۔ وہ مجھ سے کم طاقتور نہیں تھا مگر میرے اندر کچھ ایسی وحشت لہریں لے رہی تھی کہ میں نے لمحوں میں کے ٹو کو دھنک کر رکھ دیا۔ کمرے کی کئی اشیا ٹوٹ گئیں۔ پلنگ پر بچھے ہوئے پچاس، سو اور پانچ سو کے نوٹ اچھل کر فرش پر بکھرنے لگے۔ باہر صحن میں گاڑی کے اندر موسیقی کی دھنا دھن جاری تھی۔ گلوکارہ اپنی سریلی آواز میں کسی کو دعوت دے رہی تھی۔

گڈی وانگوں اج مینوں بجناں... اڑائی جا اڑائی جا...

میں نے لہولہان کے ٹو کو گھما کر فرش پر پٹخا اور رسی سے اس کے بازو پشت پر باندھنے کی کوشش کی۔ اس نے ایک دم آخری زور لگایا۔ تڑپ کر میری گرفت سے نکلا۔ اس کی ٹانگ بڑے زور سے میری ران پر لگی۔ یہ وہی ران تھی جس پر چند دن پہلے گولی کا زخم آیا تھا۔ یہ ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔ میں چند لمحے کے لیے تلملا کر رہ گیا۔

اس سے پہلے کہ میں سنبھل سکتا، کے ٹو میری گرفت سے نکل کر تیر کی طرح دروازے کی طرف گیا۔ میں لنگڑاتا ہوا اس کے پیچھے لپکا۔

وسیع صحن پار کر کے وہ باہر نکل گیا۔ میں نے بھی حتی الامکان تیزی سے اس کا پیچھا کیا۔ کے ٹو کی طرح میرے پاس بھی کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ گھر سے نکل کر کے ٹو بائیں طرف مڑا۔ شاید وہ گنے کی بلند قامت فصل کے اندر گھسنا چاہتا تھا۔

جوہڑی میں اسے باندھنے لگا تھا، وہ ابھی اس کی ایک کلائی پر ہی بندھ سکی تھی۔ یہ رسی اس کے پیچھے گھسٹتی جارہی تھی۔

اچانک کے ٹو کا پاؤں پھسلا۔ یہ پھسلن دراصل اس پانی کی وجہ سے تھی جو چھوٹے کنوئیں (کھوئی) کے اردگرد موجود تھا۔ کے ٹو پھسلا تو سیدھا کھوئی کے اندر گیا۔ میں نے جست لگا کر اس کے عقب میں گھسٹتی ہوئی رسی تھام لی۔ یوں وہ کھوئی کی گہرائی میں گرنے سے بچ گیا۔

کھوئی میں گرتے ہوئے وہ دردناک انداز میں چلایا تھا۔ وہ اب بھی چلا رہا تھا۔ ''پکڑو... بچاؤ... اوئے پکڑو...''

اور میں نے واقعی اسے پوری طاقت سے پکڑ رکھا تھا۔ یہ کھوئی جس کا میں ذکر کر رہا ہوں، عام کنوؤں سے بہت گہری ہوتی ہے۔ پانی اس کی تہ میں کسی تارے کی طرح نظر آتا ہے اور اس کا گھیرا بھی عام کنوؤں کی نسبت بہت کم ہوتا ہے۔ ایسی کھوئیوں سے طویل رسی اور بوکے وغیرہ کے ذریعے پانی کھینچا جاتا ہے۔ جان بچانے کی کوشش میں کے ٹو بھاگا تھا اور خود ہی ایک سنگین خطرے کا شکار ہو گیا تھا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ وہ کھوئی میں لٹک رہا تھا اور میں نے آٹھ دس فٹ لمبی رسی کی مدد سے اسے تھاما ہوا تھا۔

ایک دم مجھے احساس ہوا کہ شاید دستِ قدرت نے میری مدد کی ہے اور میں باطن سا جاکے ٹو سے خود ہی پوچھ گچھ کے لیے مناسب ترین جگہ بنا دی ہے۔

بہت گہری کھوئی کے اندر لٹک جانے کی دہشت نے کے ٹو کا پتا پانی کر دیا تھا۔ وہ پکار رہا تھا۔ ''خاور ے... رسی نہ چھوڑنا... مجھے اوپر کھینچو خاور ے...''

میں اوندھے منہ آگے کو کھسک کر کھوئی کے بالکل کنارے پر آگیا۔ کے ٹو تقریباً پانچ فٹ نیچے لٹک رہا تھا۔ میں نے دھیان سے دیکھا۔ ایک تبدیلی مزید آئی تھی۔ رسی کے ٹو کی کلائی سے کھل گئی تھی۔ اب اس نے رسی کو دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔

بازوؤں کے زور پر کسی شے سے لٹکنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ لمحوں میں ہاتھ اور کندھے شل ہونے لگتے ہیں۔ کے ٹو کا حال بھی کچھ یہی تھا۔ وہ چند سیکنڈوں میں موت کے دہانے پر آگیا تھا۔

''خاور! میں گر رہا ہوں۔'' وہ کرب ناک آواز میں بولا اور پھسلتی ہوئی رسی کو ہاتھ کے گرد لپیٹنے کی کوشش کی۔ وہ دو تین بل دینے میں کامیاب رہا مگر خطرہ بدستور موجود تھا۔

''تو ایک ہی صورت میں باہر نکل سکتا ہے کے ٹو... مجھے بتا کہ انور اور اس کی بیوی کہاں ہیں۔ تو انہیں کن کے کہنے پر اختر کے گھر سے لے گیا تھا؟''

''میں انہیں بچانا چاہتا تھا۔ میں نے...''

میں نے رسی کو ذرا ڈھیل دی۔ کے ٹو ایک خوفناک جھٹکے سے مزید تین چار فٹ نیچے گیا۔ اس کی آواز ذبح ہونے والے جانور سے مشابہ تھی۔ میں دہاڑا۔ ''کے ٹو! مجھے اصل بات بتا دے ورنہ تو جا رہا ہے نیچے۔''

''م... مجھے باہر نکالو۔ میں تمہیں بتاتا ہوں سب کچھ۔''

''نہیں کے ٹو! یہ نقد و نقد کا سودا ہے۔ ابھی بتانا پڑے گا یا نیچے جانا پڑے گا۔''

''خدا کے لیے۔'' کے ٹو بلکا۔ اس کی آواز نے گونج کر کھوئی کی اتھاہ گہرائی بتائی۔ کھوئی کی چرخی ٹوٹی ہوئی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ عرصے سے بند پڑی ہے۔ ایسی اتھاہ گہرائی میں زہریلی گیسیں جمع ہو جاتی ہیں اور نیچے جانے والے کم ہی اوپر آتے ہیں۔ کے ٹو بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے پاس مہلت نہایت کم ہے۔ زندگی پر سے اس کی گرفت کمزور ہوتی جارہی تھی۔

میں نے بے رحم لہجے میں کہا۔ ''بتاؤ... انور ے اور عابدہ کو کس کے کہنے پر اختر کے گھر سے غائب کیا؟''

''م... مجھے... چ... چودھری عزیز نے کہا تھا۔''

''اب وہ کہاں ہیں؟'' وہ چپ رہا۔ میں دہاڑا۔ ''اب وہ کہاں ہیں؟''

''وہ اب... نہیں ہیں۔'' کے ٹو نے جان کنی کے عالم میں جواب دیا۔

''مار دیا ہے ان دونوں کو؟''

''نہیں... میں نے نہیں مارا... میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔''

''چودھری عزیز سے تیرا رابطہ کب سے ہے؟''

''میں سب کچھ بتا دیتا ہوں تجھے۔ مجھے اوپر آنے دے۔''

میں نے رسی کو چند فٹ مزید چھوڑا۔ کے ٹو کے چلانے کی آواز ہولناک تھی۔ رات کے سناٹے میں یہ آواز کھوئی کی عمیق گہرائی سے نکل کر عجیب تاثر پیدا کرتی تھی... جیسے کوئی بدروح نوحہ کر رہی ہو۔

میں نے اپنا سوال دہرایا۔ کے ٹو نے بلکتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میرا رابطہ دو تین سال سے تھا... خدا کے لیے... اب مجھے... باہر نکالو... میرے ہاتھ چھوٹ رہے ہیں۔''

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا، اب وہ کسی بھی وقت کھوئی کی مہلک گہرائی میں اتر سکتا تھا۔ میں نے زور لگا کر اسے چند فٹ اوپر کھینچا پھر اس کا ہاتھ تھام کر اسے باہر نکال لیا۔ وہ خشک پتے

www.pkdigest.com

کی طرح لرز رہا تھا۔ میں نے اسے گریبان سے پکڑا اور گھسیٹتا ہوا واپس مکان میں لے آیا۔

اگلا آدھ گھنٹا بہت انکشاف انگیز تھا۔ سب سے پہلا انکشاف تو یہ ہوا کہ میری والدہ اور بہن اب کیکراں والی میں نہیں تھیں۔ یعنی میرا کیکراں والی جانا بالکل بے کار تھا۔ وہ دونوں واپس راجوال پہنچ چکی تھیں۔

”کون لے کر گیا تھا انہیں؟“ میں نے کے ٹو سے پوچھا۔ کے ٹو کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔

”بیگم بلقیس... ان کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ اگر تمہاری والدہ اور بہن کیکراں والی میں رہیں تو نمبردار آصف ان کا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ وہ راتوں رات بڑی خوشی سے انہیں واپس لے گئیں۔ سنا ہے کہ اس رات نمبردار نے ان دونوں کو وہاں سے اٹھوانے کا پکا منصوبہ بنایا ہوا تھا۔ چودھری اختر کے دو تین ملازم بھی اس منصوبے میں شامل ہو گئے تھے۔ ان میں ایک مدثر نام کا لڑکا اور اس کا باپ بھی ہیں۔“

اس حوالے سے کے ٹو نے مجھے کچھ اور تفصیل بھی بتائی۔ اب میری سمجھ میں یہ بات آ رہی تھی کہ پرسوں رات نمبردار آصف اچانک سخت مایوس اور آگ بگولا کیوں ہو گیا تھا۔ اس نے کوٹھڑی میں گھس کر مجھے بے دریغ ہنٹروں سے پیٹا تھا اور بلقیس کو بھی بے نقط سنائی تھیں۔

میں نے کے ٹو سے پوچھا۔ ”چودھری عزیز میرا اتنا ہی دشمن تھا تو پھر وہ میری والدہ اور بہن کی حفاظت کیوں کر رہا تھا؟ اگر وہ مجھے قتل کیس میں پھنسائے رکھنے کے لیے انورے اور اس کی بیوی کو وہاں سے نکالنے کا حکم دے سکتا تھا تو میری والدہ اور عارفہ کو بھی ہر طرح کا نقصان پہنچا سکتا تھا۔“

”مجھے نہیں پتا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا تھا۔ میں نے تو وہی کچھ کیا جو اس نے کہا تھا۔ نہ اس سے کم نہ زیادہ۔“

”یعنی تم اس کے حکم کے غلام تھے لیکن پھر بھی تمہارے دماغ میں یہ بات نہیں آئی کہ میرا دشمن ہونے کے باوجود چودھری عزیز مجھے اور میرے گھر والوں کو پولیس سے کیوں بچا رہا ہے...؟“

کے ٹو چند لمحے خاموش رہا۔ اس کے جسم کا لرزہ ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ میں اس خبیث کے مزاج کو سمجھتا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ یہ سگریٹ کے بغیر مر رہا ہے۔ میں نے اس کی جیب سے نکلا ہوا سگریٹ سلگا کر اس کے ہونٹوں سے لگایا۔ اس نے تین چار لمبے کش لیے۔ میں نے سگریٹ نکال کر ایک طرف رکھ دیا۔

وہ میرے سوال کے جواب میں بولا۔ ”جہاں تک میرا اندازہ ہے خاور ے... چودھری عزیز مجھے مروانا یا پکڑوانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی ایک ہی خواہش تھی کہ تو کسی طرح جاگیرے چلا جائے... ہمیشہ کے لیے نظروں سے دور ہو جائے۔“

”ایسا کیوں چاہتا تھا وہ؟“

”میں اس بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا... ہاں، مجھے یہ پتا ہے کہ... نمبردار اور موکھل پاشا تمہارے خون کے پیاسے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ تمہارے گھر والوں سے بھی ہر برے سے برا سلوک کر سکتے ہیں۔“

”اس بات کا پتا مجھے تمہارے بتائے بغیر بھی ہے۔ مجھے وہ بات بتاؤ جو مجھے معلوم نہیں۔ نمبردار آصف اور پولیس کو کیسے پتا چلا کہ میری والدہ اور بہن کیکراں والی میں اختر کے گھر ہیں؟“

”مجھے اس کا کچھ پتا نہیں۔ میں نے تو بس اتنا ہی کام کیا جتنا چودھری عزیز نے مجھ سے کہا۔ میرا خیال ہے کہ ان دونوں کے بارے میں نمبردار کو بتانے والے اختر کے اپنے ہی کارندے ہیں۔ شاید وہ لڑکا مدثر ہی ہو۔ وہ اختر کے گھر کی ہر بات جانتا تھا۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اس جیسے غدار اور یار مار تو ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔“

مجھے لگا کہ یہ تیر سیدھا کے ٹو کے سینے میں لگا اور اس کا رنگ کچھ اور بھی بدلا ہوا نظر آنے لگا۔

کے ٹو کے ساتھ قریباً ایک گھنٹے کی جو گفتگو ہوئی اس کا خلاصہ یہ تھا کہ چودھری عزیز نے کوئی ڈھائی تین سال پہلے کے ٹو کو اپنے دام میں پھنسایا تھا۔ شروع میں کے ٹو کا رابطہ بس انورے کے ساتھ تھا بعد میں عزیز سے بھی ہو گیا۔ انورا... کے ٹو کو مال کھلاتا رہا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے لیے عیاشی کا بہترین سامان بھی فراہم کرتا رہا۔ ایک موقعے پر کے ٹو نے چودھری عزیز سے دو لاکھ روپے قرض بھی لیا اور یوں پوری طرح اس کے شکنجے میں آ گیا۔ ہمارے اندر کی بے شمار باتیں کے ٹو کے ذریعے ہی انورے اور چودھری عزیز تک پہنچتی رہیں۔ کے ٹو کا کردار صحیح معنوں میں ”یار مار“ کا تھا۔

چند دن پہلے چاچے رفاقت نے وکیل کرنے کے لیے کے ٹو کو جو رقم دی تھی، وہ بھی لاہور کی ایک معروف فلمی ڈانسر کے شباب پر خرچ ہو چکی تھی۔

آخر میں، میں نے کے ٹو سے پوچھا۔ ”انورے اور اس کی بیوی کا کیا کیا تم نے؟“

اس نے ایک بار پھر بڑی شدومد سے انکار میں سر ہلایا۔ ”میں نے ان کے ساتھ کچھ نہیں کیا۔ میں نے بس اتنا کام ہی

... میں بابر خان نامی بندے کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد میرا کام ختم ہو گیا۔“

”پر تم کہتے ہو کہ وہ مارے گئے ہیں۔“

کے ٹو نے سر جھکا لیا۔ ”ہاں... میرا خیال ہے کہ وہ زندہ نہیں بچے ہوں گے۔ بابر نام کا یہ بندہ بہت خطرناک ہے اور جہاں تک مجھے پتا چلا ہے کہ اس کو کرائے کا قاتل بھی کہتے ہیں۔ آگے اللہ بہتر جانے۔“

”تیمور کے بارے میں تمہیں کیا پتا ہے؟“

”میں سچ کہتا ہوں، مجھے کچھ پتا نہیں۔ وہاں قبرستان سے چار لاشیں راجوال آئی تھیں۔ ان میں چودھری عزیز اور سراج کی لاشیں بھی تھیں۔ اس کے علاوہ کچھ پتا نہیں۔ بس سنی سنائی بات ہے کہ وہاں دو پولیس والوں سمیت آٹھ دس بندے مارے گئے ہیں۔“

”شاہنواز اور سائیں ملنگا وغیرہ؟“

”شاہنواز کو گولیاں لگی ہیں اور وہ اسپتال میں ہے۔ پولیس نے سائیں اور اس کے ساتھیوں کو دو کھلی قبروں کے اندر سے نکالا تھا۔ وہ بھی گرفتار ہیں...“

بات کرتے کرتے کے ٹو اچانک چونکا۔ اس نے ایک طرف لکڑی کی میز پر پڑا ہوا ٹائم پیس دیکھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہو گئے۔

”کیا بات ہے؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”میرے سینے میں درد ہو رہا ہے۔ میں نے دوائی کھانی تھی۔“

”ابھی تجھے بہت کچھ ہونا ہے کے ٹو... کس کس چیز کی دوائی کھائے گا۔ بہتر ہے کہ ایک ہی دفعہ پستول کی گولی کھا لے۔ تیرے سارے دکھ دور ہو جائیں گے۔“

وہ مجھ سے نظر ملا نہیں پا رہا تھا۔ چہرے پر لعنت برس رہی تھی۔ مجھے کے ٹو کی کچھ باتیں ہمیشہ سے بری لگتی تھیں مگر میں تیمور اور باگو کی وجہ سے چپ رہتا تھا۔

ایک آواز نے مجھے چونکایا۔ یہ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز تھی۔ چند لمحے بعد بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ ”کون ہے یہ؟“ میں نے پوچھا۔

”پتا نہیں۔ شش... شاید رفیق ہو گا۔“

”رفیق کون ہے؟“

”میرا ایک یار ہے گوجرانوالے کا۔“

کے ٹو کے منہ سے ”یار“ کا لفظ مجھے زہر لگا۔ جی چاہا اس کے منہ پر ایک زنانے کا تھپڑ رسید کروں۔

... میں کہا۔ ”اوئے بوہا کھولو یار۔ مجھ کو بھی صلح مار لو... کہ اکیلے اکیلے ساری کھیر کھا جاؤ گے؟“

میں نے کے ٹو کو بالکل خاموش رہنے کی ہدایت کی اور کمرے کا دروازہ باہر سے مقفل کر کے بیرونی دروازے پر پہنچ گیا۔ رائفل میری گرم چادر کے نیچے تھی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ سامنے ایک لمبا تڑنگا شخص کھڑا تھا۔ وہ دیہاتی لباس میں تھا، کندھوں پر گرم چادر تھی۔ اس نے ایک شاپر میں بھنی ہوئی مرغی کے پیس ڈالے ہوئے تھے، دوسرے شاپر میں کلچے تھے۔ کلچہ میلوں ٹھیلوں میں عام دیکھا جا سکتا ہے اور دیہات میں بڑے شوق سے کھایا جاتا ہے۔ اسے ہم پرانے دور کا پیزا بھی کہہ سکتے ہیں۔

”تم کون ہو؟“ نووارد نے شرابی انداز میں میرے سینے پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ اس نے میرے چہرے کے زخموں اور ابتر حلیے کو ذرا غور سے دیکھا تھا۔

”یار ہوں کے ٹو کا۔ اور تم شاید رفیق ہو۔ اس نے شام کو تمہارا ذکر کیا تھا۔“

”ہاں... ہاں رفیق ہوں۔“ اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ پھر آنکھ مار کر بولا۔ ”کدھر ہے شہزادہ؟“

”اندر ہے شہزادی کے ساتھ۔“ میں نے بھی آنکھ مار کر کہا۔

”[illegible]“

”وہ سامنے لیٹا ہوا ہے۔ زیادہ پی لی ہے۔ کچھ موج میلہ کیے بغیر ہی سو گیا ہے۔“

”اور دوسری کڑی؟“ رفیق نے پوچھا۔

میں نے جلدی سے بات بنائی۔ ”وہ بھی اندر ہی ہے۔“

رفیق کی آنکھوں میں شیطانی چمک ابھری۔ ”شاوا بھئی شاوا... ایک کمرے میں دو دو کڑیاں... دو دو پلیٹوں سے کھیر کھا رہا ہے اپنا شہزادہ۔ شاوا بھئی شاوا۔“ پھر وہ نشے میں لہراتا ہوا بند دروازے تک پہنچا اور ہانک لگائی۔ ”اوئے میں قربان جاواں تیرے اوپر... سب کچھ اکیلا ہی ہڑپ کر جائے گا۔ اوئے دو چار چمچیاں ہمارے منہ میں بھی جانے دے... اور ذرا جلدی کر۔ تیرے لیے ایک بڑی کڑاکے دار خبر بھی لایا ہوں راجوال سے۔ کل سویرے وہاں بڑا لمبا کھڑاک ہونے والا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ موکھلوں نے سارے اگلے پچھلے بدلے چکا دینے ہیں راجوالیوں سے... آ جاؤ ذرا جلدی سے ویلا ہو کے باہر۔“ رفیق نے لوفر انداز میں کہا۔

اسے اندر کی صورتِ حال کا کچھ پتا نہیں تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس کا یار کے ٹو اندر موج میلہ کر رہا ہے اور نوٹ لٹا رہا

ہے۔ اسے پتا نہیں تھا کہ وہ اندر بندھا پڑا ہے۔

اندر سے ایک عورت نے واویلا شروع کر دیا۔

''بچاؤ... کوئی ہے... بچاؤ۔''

نشے میں دھت رفیقے نے عورت کی اس پکار کو بھی موج میلے کا حصہ سمجھا اور ہاتھ لہرا کر بولا۔ ''اوئے ذرا ہتھ ہولا رکھ۔ کھیر کو کھیر سمجھ کر کھا۔''

پھر اس نے گامے کو ذرا جھنجوڑنے اور جگانے کی کوشش کی۔ گاما بس کسمسا کر اور بڑبڑا کر رہ گیا۔

گامے کے قریب پڑی بوتل سے رفیقے نے شراب کے دو گھونٹ مزید لیے اور برآمدے میں ہی ایک چارپائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اس نے راجوال کے بارے میں جو بات کی تھی اس نے میرے کان کھڑے کر دیے تھے۔ میں نے اس کے قریب بیٹھ کر دو سگریٹ سلگائے، ایک اس کے منہ سے اور دوسرا اپنے منہ سے لگایا۔ قریب رکھی ہوئی انگیٹھی گھسیٹ کر پاس کر لی۔ ''یہ راجوال کی کیا بات کر رہے تھے تم؟'' میں نے رفیقے سے پوچھا۔

''سنا ہے وہاں زبردست پھڈا ہونے والا ہے۔ تمہیں وہاں کے جھگڑے کا تو پتا ہی ہوگا۔ بڑی دیر سے موکھلوں اور راجوالیوں میں پچھلی فارم والے رقبے کا معاملہ چل رہا تھا۔ اس رقبے کے معاملے میں تو راجوالیے جیت گئے تھے۔ فیصلہ ان کے حق میں ہو گیا تھا۔ مگر اب موکھلوں نے اس کا بدلہ دوسری جگہ لینے کا ارادہ کیا ہے اور مجھے پکی اطلاع ملی ہے یہ ارادہ کل سویرے ہی پورا ہو جاتا ہے۔''

''کیا کہنا چاہ رہے ہو؟''

''سویرے راجوال کے میلے کا آخری دن ہے۔ پیر فضل حق کے مزار پر اور میلے کی جگہ پر موکھل بھی اپنا حق جتاتے رہے ہیں۔ اٹھارہ بیس سال پہلے جب والی جی کا باپ زندہ تھا، اس مزار کی ملکیت پر کئی جھگڑے ہوئے تھے۔ دو تین سال پہلے بھی اس معاملے پر پنچایت بیٹھی تھی۔ اس وقت معاملہ ٹھنڈا ہو گیا تھا کیونکہ راجوال والے زور میں تھے۔ سالار شاہ خاور کا تو پتا ہوگا تمہیں؟'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''ان دنوں سالار خاور بھی زور میں تھا۔ لوگ اس کے پیچھے تھے۔ اس کی آواز پر سب ایک ہو جاتے تھے۔ پر اب تو بھٹہ ہی بیٹھ چکا ہے۔ خاور پر دوہرے قتل کا الزام ہے۔ وہ پولیس سے اور اپنے سسر سے چھپتا پھرتا ہے۔ عام لوگ اس کا نام سننا بھی پسند نہیں کرتے ہیں۔ موکھلوں کے لیے یہ بڑا چنگا موقع ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اس بار انہوں نے راجوالیوں کو ادھیڑ کر رکھ دینا ہے۔ چھ سات دن پہلے جو کچھ ہوا اس کا پتا ہے تمہیں؟''

میں نے ان جان بن کر نفی میں سر ہلایا۔

''موکھلوں نے بڑی بے عزتی خراب کی ہے راجوالیوں کی۔ ادھے پنڈ کو چھتر مارے ہیں۔ عورتوں کو گھسیٹا ہے۔ ان کے بہت سارے ڈنگر چھین کر لے گئے ہیں۔ اب ان کا حوصلہ اور بڑھ گیا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اب مزار والی جگہ انہوں نے راجوالیوں کے پاس نہیں رہنے دینی۔ اب تو پولیس بھی پوری سائیڈ لے رہی ہے موکھلوں کی۔''

میرے ذہن میں چلتی ہوئی آندھی تند و تیز ہو گئی۔ طوفان کی شکل اختیار کر گئی۔ جب سے میں نے سنا تھا کہ موکھلوں نے راجوال پر ہلا بولا ہے اور مویشی وغیرہ ہانک کر لے گئے ہیں، مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ کوئی اس سے بڑی کارروائی کریں گے اور آج رات یہاں اس نامعلوم چار دیواری میں، ایک ٹھٹھری ہوئی تاریکی میں یہ یقین درست ثابت ہو گیا تھا۔ میرے دل نے پکار کر کہا... خاور! تم اپنی زندگی کے ایک نازک ترین موڑ پر کھڑے ہو۔ اگر تم اب کچھ نہ کر سکے تو بدترین پچھتاووں کے سوا کچھ تمہارے حصے میں نہیں آئے گا۔ جس جاگیر کی دیواروں کو تم نے اپنے خون پسینے سے اٹھایا ہے، جس کی خوش حالی اور بہتری کے لیے تم نے اپنی بہترین توانائیاں صرف کی ہیں... وہ جاگیر ٹوٹ پھوٹ کر تاراج ہونے والی ہے۔ اس کے کھیتوں کی وہ ساری آن بان جو تم نے ذرہ ذرہ کر کے جوڑی تھی، ریزہ ریزہ ہونے والی ہے۔ وہ سارا اعتماد اور حوصلہ بکھرنے والا ہے جو پچھلے برسوں میں ہزار تکلیفیں سہہ کر پور پور پروان چڑھایا گیا تھا۔

''میں یہ نہیں ہونے دوں گا۔'' میں نے دل ہی دل میں تہیہ کیا۔ ''اگر اس کے لیے بہت بڑی قربانی بھی دینا پڑی تو دے دوں گا۔''

رفیقے نے ایک بار پھر نشیلے انداز میں ہانک لگائی۔ ''اوئے کے ٹو! کیا کھیر کی پوری دیگ کھا کر باہر نکلے گا۔ آ جا اب تو رات ڈھلنے والی ہے شہزادے۔''

شہزادے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ دے بھی کیسے سکتا تھا۔ وہ کھیر نہیں کھا رہا تھا، ہری مرچیں چبا رہا تھا اور میں نے اسے سی سی کرنے سے بھی منع کر رکھا تھا۔

میں رفیقے کو مزید ٹٹولنا چاہ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''سنا ہے نمبردار آصف... خاور کی ماں اور بہن کو ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔ بڑے خطرناک ارادے ہیں اس کے۔''

''ارادے تو واقعی خطرناک ہیں۔ پر حق بات یہ ہے کہ بیگم بلقیس کی بھی تعریف کرنی پڑتی ہے۔ پہلی دفعہ یوں لگا ہے

کہ وہ جاگیر کی والی وارث ہے اور جاگیر کو سنبھال سکتی ہے۔ وہ اپنے پرانے یار کی ماں اور بہن کی حفاظت کا ذمہ لے چکی ہے اور اب اس ذمے کو پوری ہمت سے نبھا بھی رہی ہے۔ گھگراں والی گاؤں میں نمبردار آصف نے بڑا زور مارا ہے پر بیگم نے اس کی ایک نہیں چلنے دی۔ دونوں طرف سے تین تین بندے مرے بھی ہیں۔ جب بیگم نے دیکھا کہ خطرہ بڑھ گیا ہے، تو وہ بھیس بدل کر خود گھگراں والی پہنچی اور خاور کے گھر والوں کو بڑی ہوشیاری سے واپس راجوال لے گئی۔ کہتے ہیں نمبردار آصف کو اس بات کی بڑی سخت تکلیف پہنچی ہے کہ دونوں عورتیں واپس راجوال پہنچ گئی ہیں۔''

''سنا ہے کہ بیٹی کی موت کے بعد آصف بالکل جنونی ہو گیا ہے۔ دیوانوں جیسی باتیں کرتا ہے۔ بے گناہ لوگ بھی اس کے ہاتھوں نقصان اٹھا رہے ہیں۔ وہ ہر ایک کو اپنا قصوروار سمجھ رہا ہے۔''

''کہنے والے تو یہی کہہ رہے ہیں۔'' رفیقے نے سر ہلا کر تائید کی اور شاپر میں سے بھنی ہوئی مرغی کی ران نکال کر چبانے لگا۔ وہ اس مصیبت سے بالکل بے خبر تھا جو میری صورت میں اس کے بالکل قریب موجود تھی۔

دفعتاً اندر سے پھر رونے چلانے کی آوازیں سنائی دیں۔ اس مرتبہ یہ آوازیں نسوانی نہیں مردانہ تھیں۔ یہ یقیناً ساجا کے ٹو تھا اور کسی مشکل میں تھا۔

رفیقے نے پھر اونچی آواز میں ہانک لگائی۔ ''کیا بات ہے کے ٹو شہزادے... کھیر زیادہ تتی (گرم) ہے؟''

مجھے اس کمرے میں روشنی نظر آئی جہاں کے ٹو بند تھا۔ یہ آگ کی روشنی تھی۔ میں رائفل سنبھالتا ہوا کمرے کی طرف لپکا۔ دروازہ کھولا تو منظر ہولناک تھا۔ کے ٹو کو آگ لگی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے اور وہ زمین پر لوٹنیں لگا رہا تھا۔ اس کی دونوں ٹانگیں پوری طرح آگ کی لپیٹ میں تھیں۔ میں نے بھاگ کر اس پر کمبل ڈالا اور گھسیٹتا ہوا باہر لے آیا۔ دوسرے کمرے میں بند عورتوں نے بھی شدید واویلا شروع کر دیا تھا۔

رفیقا بھاگ کر گیا اور اس نے پانی کا گھڑا کے ٹو پر الٹ دیا۔ گاڑھے دھوئیں نے ہر شے کو لپیٹ میں لے لیا۔ آگ اب پورے کمرے میں پھیل گئی تھی اور دوسرے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ آگ میں وہ کرنسی نوٹ بھی جلنا شروع ہو گئے تھے جو کے ٹو نے پورے کمرے میں بکھیر رکھے تھے۔ اور یہ سارے نوٹ اس کے نہیں تھے۔ ان میں چاچے رفاقت کی جمع پونجی بھی تھی۔ میں دوبارہ کمرے میں داخل ہوا اور بہت سے نوٹ جلنے سے بچائے۔

دوسرے کمرے میں دھواں جمع ہو گیا تھا۔ دونوں طوائفوں کے کھانسنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ چلاتی ہوئی باہر نکلیں اور جدھر منہ اٹھا بھاگتی چلی گئیں۔ میں نے انہیں روکنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

اس شور قیامت نے مردار پڑے گامے کو بھی جگا دیا تھا۔ وہ ہکا بکا دم بخود پھیلتی آگ کو دیکھنے لگا۔ کچھ ایسی ہی حیرت اور ہراس کی کیفیت رفیقے یا فیقے کی آنکھوں میں بھی تھی۔

کے ٹو کی دھوتی جل کر مکمل طور پر ناپید ہو گئی تھی۔ اس کی دونوں ٹانگوں کا برا حشر تھا۔ وہ تڑپ رہا تھا۔ ''اوئے میں مر گیا... اوئے میرا کچھ کرو۔''

اس کی پشت پر بندھے ہوئے ہاتھ دیکھ کر رفیقے کی حیرت میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ وہ کانپتی آواز میں بولا۔ ''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ یہاں... کیا... ہو رہا تھا؟''

''تمہاری سمجھ میں نہ ہی آئے تو اچھا ہے۔'' میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

گاما بدحواسی میں تڑپتے ہوئے کے ٹو کے ارد گرد ناچ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ کے ٹو کی عریاں ٹانگوں سے چربی بہہ رہی تھی۔

''اب اس کا کیا کرنا ہے؟'' رفیقے نے پھٹی پھٹی آواز میں مجھ سے پوچھا۔ ساتھ ساتھ وہ کے ٹو کے ہاتھوں کی ادھ جلی رسی کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''بہتر تو یہ ہے کہ اس پر تھوڑا سا اور تیل ڈال کر اسے آگ ہی لگا دو... اور اگر دل نہیں مانتا اور یاری جوش مارتی ہے تو پھر ڈالو کسی ریڑھے پر اور لے جاؤ کسی اسپتال میں۔'' میرے لب و لہجے نے گامے اور رفیقے کو کچھ اور ششدر کر دیا۔ وہ بھونچکے دکھائی دینے لگے تھے۔

کے ٹو کے ہاتھوں کی ادھ جلی رسی اور کمرے میں ٹوٹی ہوئی لالٹین دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ کے ٹو نے اپنی فطرت کے مطابق ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تھی۔ اس نے پہلے لالٹین کی چمنی توڑی تھی پھر اپنے ہاتھوں کی رسی کو لالٹین کی لو سے جلانے کی کوشش کی تھی۔ اسی دوران میں لالٹین الٹ گئی اور پاس رکھے ہوئے لحافوں اور کرنسی نوٹوں وغیرہ نے آگ پکڑ لی۔

اب کے ٹو کی حالت دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ مشکل سے بچ پائے گا اور اگر بچ بھی گیا تو اس کی ایک یا دو ٹانگوں کا نقصان تو ہو جائے گا۔

آگ پھیلتی جا رہی تھی۔ جب گاما اور رفیقا اپنے یار کو اٹھا

کر آگ سے دور لے جا رہے تھے، میں خاموشی سے گنے کے کھیتوں میں داخل ہو گیا۔ میرا رخ اپنے گھوڑے کی طرف تھا جو کھیتوں سے پار بندھا ہوا تھا۔ مردہ گنے کے پاس سے گزر کر میں گھوڑے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ آگ کی روشنی دور تک پھیل رہی تھی۔ اس سرخ روشنی میں دھوئیں کے بادل بھی شامل ہو رہے تھے۔ یقیناً کھیتوں میں رات کے وقت کام کرنے والے اکا دکا مزدور اس آگ کو دیکھ چکے تھے اور اب وہ کسی بھی وقت یہاں پہنچنے والے تھے۔ میں نے کرنسی نوٹ ایک بڑے رومال میں باندھ کر اپنی کمر سے باندھ لیے اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ ☆☆☆

قریباً ایک گھنٹے بعد میں ایک دوراہے پر کھڑا تھا۔ ایک راستہ ڈکے کی طرف جاتا تھا اور دوسرا راجوال کی طرف... راجوال جہاں میری والدہ تھی، بہن تھی اور... بلقیس تھی۔ میری زندگی کے سارے جواز راجوال میں تھے اور زندگی بھی شاید وہیں تھی۔ بلقیس نے اب تک بڑی ہمت سے میرا اور میرے گھر والوں کا دفاع کیا تھا۔ اس نے تعلق کی پائیداری اور طاقت کو ثابت کیا تھا۔ اب میں اسے مزید امتحان میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ اب میں اپنے سارے بوجھ خود اٹھانا چاہتا تھا۔ اور یہی نہیں، میں جاگیر کو بچانا بھی چاہتا تھا۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ جاگیر ایک زندہ شے کی طرح ہے۔ وہ مجھے دیکھتی ہے، میرا انتظار کرتی ہے، اسے میری کمی محسوس ہوتی ہے۔ اس کے سنہرے کھیت، اس کے سرسبز باغ، اس کے کچے راستے سب میری راہ دیکھتے ہیں۔ خاموشی کی زبان میں پکارتے ہیں۔ ہمیں تم پر بڑا بھروسا ہے شاہ خاور... تم ہمارا مان ہو، تم نے ہمیں نئی زندگی دی تھی۔ ہماری بے جانی میں روح پھونکی تھی۔ اب ہمیں تنہا نہ چھوڑنا۔ ہمیں تمہاری ضرورت ہے...

مگر دوسری طرف میں دیکھتا تھا کہ میں خود ایک بے وسیلہ شخص کا روپ دھار گیا ہوں۔ مجھے دہرے قتل کے الزام کا سامنا تھا۔ پولیس میرا پیچھا کر رہی تھی۔ میرے سسرالی میرے خون کے پیاسے تھے۔ اور ابھی تک اپنی بے گناہی کا کوئی ثبوت میں حاصل نہیں کر سکا تھا... میں جانتا تھا، نہایت ٹھوس ثبوتوں کے بغیر میں مجرم ہوں۔ قانون کی نظر میں بھی اور جاگیر کے عام لوگوں کی نظر میں بھی۔ حقیقت تلخ تھی لیکن حقیقت یہی تھی کہ عام لوگوں کی نگاہ میں، میں وقعت کھو چکا ہوں۔ بہت کم لوگ ہوں گے جو اب بھی میرے لیے دل میں نرم گوشہ رکھتے ہوں گے۔

تو پھر کیا کروں؟ کس طرف جاؤں؟

یہ سوال بے پناہ شدت سے بار بار میرے اندر سے اٹھ رہا تھا اور مجھے بے حال کر رہا تھا۔ اگر میں جاگیر جاتا اور پھر جاگیر کے لیے کچھ کر بھی نہ سکتا تو یہ دہرا نقصان تھا۔ لوگوں کے دلوں میں میرے لیے رہا سہا اعتماد بھی ختم ہو جاتا۔ اور عین ممکن تھا کہ پولیس یا میرے دوسرے دشمن مجھے پھر جا لیتے۔ میں اپنے لیے کچھ کر سکتا، نہ گھر والوں کے لیے، نہ جاگیر کے لیے!

تو پھر کیا کروں؟ کیا ابھی چند دن ایک طرف رہ کر حالات کا رخ دیکھوں؟ یہ جاننے کی کوشش کروں کہ انورا اور اس کی بیوی ختم ہو چکے ہیں یا زندہ ہیں۔ اور بالفرض زندہ ہیں تو کہاں ہیں؟

ذہن نے خود ہی اس خیال کو رد کیا۔ ایسا کرنا مشکل تھا۔ جاگیر اور جاگیر کے باسیوں کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔

تو پھر؟ سوال ذہن کو جھنجوڑ رہے تھے۔ جی چاہا گھوڑا دوڑاتا جاگیر پہنچوں۔ راجوال کے بڑے چوراہے میں حویلی کے سامنے بنے چبوترے پر چڑھ جاؤں۔ پکار پکار کر لوگوں کو اپنی طرف بلاؤں۔ ان کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دوں۔ اور اگر وہ پھر بھی مجھے مجرم گردانیں تو ان سے کہوں، ٹھیک ہے۔ میں دشمنوں کے ہاتھوں ذلیل موت مرنا نہیں چاہتا۔ وہ مجھے خود ہی اس جگہ اپنے ہاتھوں سے مار دیں۔

میں کچھ دیر تک بیٹھے ہوئے گھوڑے پر سوار خاموش کھڑا رہا۔ میری آنکھیں بند تھیں۔ پھر ایک کشش... ایک نامعلوم کشش مجھے اپنی طرف کھینچنے لگی۔

یہ وہی کشش تھی جو میری زندگی کی سب سے بڑی توانائی بن چکی تھی۔ یہ صحیح تھی، غلط تھی یا بہت بڑا گناہ تھی... لیکن جو بھی تھی، یہ موجود تھی۔ آج بھی پہلے دن والی آب و تاب اور طاقت کے ساتھ!

اور یہ وہی کشش تھی جو کسی رکاوٹ، کسی مجبوری اور دلیل کو نہیں مانتی۔

یہ کچے گھڑے پر تیرتی ہے اور امر ہو جاتی ہے۔

یہ آگ میں کودتی ہے اور اسے گلزار بناتی ہے۔

یہ زہر کا پیالہ پی کر جینا سکھاتی ہے۔

یہ شیشے سے پتھر کو توڑنے کا دعویٰ کرتی ہے... اور پھر توڑتی بھی ہے۔

میں نے ایک طویل سانس لی۔ سب خیالوں کو ذہن بدر کیا۔ گھوڑے کی لگام میں موڑیں اور برق رفتاری سے راجوال کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس ریچھرے نوجوان کی مزید معرکہ آرائیاں آئندہ ماہ پڑھیے

...کے عزائم بہت بلند تھے اور وہ دنیا بھر میں شہرت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ شاید اس لیے اس کا تعلق ایک عام سے گھرانے اور ایک عام سے علاقے سے تھا۔ وہ وسطی امریکا کی ریاست نبراسکا کے ایک چھوٹے سے قصبے میں پلا بڑھا تھا۔ اس کا باپ گاڑیوں کا مکینک تھا اور ہر وقت تیل مٹی میں اٹا رہتا تھا۔ اس کے ہاتھ ہمیشہ کالے رہا کرتے تھے۔ جب وہ گھر آتا تو لیری کی ماں اس پر چلانا شروع کر دیتی کہ وہ چیزوں کو ہاتھ لگا کر ان کو گندہ نہ کرے۔ وہ بھی بے چارہ بیوی سے ڈر کر احتیاط کرتا تھا اس کے باوجود اس سے کوئی نہ کوئی چیز گندی ہو جاتی تھی اس پر اسے بیوی سے بے بھاؤ کی سننا پڑتی تھی۔ لیری کو باپ سے ہمدردی تھی مگر وہ اپنی ماں سے متفق تھا کہ آدمی کو خود کو اور اپنے ماحول کو صاف رکھنا چاہیے۔

اسرار ابرام

مریم کے خان

مہم جوئی کے شوقین افراد کے لیے تحفۂ خاص، اسرار و تحیر میں ڈوبی ایک ہنگامہ خیز کہانی

حسن کسی بھی نوعیت کا ہو اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتا ہے... فطرت کے نظاروں کی بات ہو... کہساروں کی... بہتے چشموں یا اونچے اونچے پہاڑوں کی... یہ خوبصورتیاں انسان کو مبہوت کر دیتی ہیں... براعظم انٹارکٹیکا بھی برفیلے موسم اور فطری حسن کے باعث منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اس سرد علاقے میں ریسرچ کرنے والی ٹیم کو پیش آنے والے واقعات کا دلچسپ احوال۔

www.pkdigest.com

لیری کی ماں ایک اسکول میں پڑھاتی تھی اور اس نے خاص طور سے ماحول کے بارے میں کورس کر رکھے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اسے صفائی ستھرائی کا بہت خیال رہتا تھا۔ وہ اکثر شوہر سے کہتی تھی۔ ''آٹو انڈسٹری آغاز سے انجام تک صرف آلودگی ہے۔''

''یہ تو ہے مگر تم سوچو کہ ہمارا اس کے بغیر گزارہ بھی نہیں ہے۔'' میری کہتا تھا۔ ''اگر گاڑیاں نہ ہوں تو ہمارا سارا نظام ہی ٹھپ ہو جائے۔ اس لیے زندگی کا پہیا رواں رکھنے کی یہ قیمت تو ادا کرنی پڑے گی۔''

یہ بات تو ڈیبی بھی سمجھتی تھی اس لیے اس کا زیادہ زور ذاتی صفائی پر تھا۔ اور گھر میں وہ ذرا سی بھی گندگی برداشت نہیں کرتی تھی اس نے لیری اور اس کے بہن بھائیوں کی تربیت بھی اس طرح کی تھی کہ وہ صفائی پسند بن گئے تھے اور چھوٹی سی عمر میں صفائی کا خیال رکھتے تھے۔ خاص طور سے لیری اس معاملے میں بہت حساس تھا اگر اس کی کوئی چیز یا بستر ذرا بھی گندہ ہو جاتا تھا تو وہ اس وقت تک بے چین رہتا تھا جب تک ماں اسے صاف کر کے نہیں دیتی تھی۔ اگر وہ خود کر سکتا تھا تو اس کام میں ایک لمحے کی دیر نہیں کرتا تھا۔

جب وہ اسکول میں پڑھتا تھا تو ان دنوں ماحولیاتی آلودگی کا بڑا چرچا تھا اور دنیا اس کی طرف متوجہ ہو رہی تھی۔ وہ ویسے بھی اس موضوع کو پسند کرتا تھا اس لیے اسکول کے سالانہ مقابلہ مضمون نویسی میں اس نے ماحول کے موضوع پر ایک مضمون لکھا اور جب اسے اس کے استاد نے پڑھا تو اسے بہت سراہا تھا۔ ''لیری تم نے بہت اچھا مضمون لکھا ہے۔''

''شکریہ سر۔'' اس نے شرمیلے لہجے میں کہا۔

''ہم اسے بین الاسکول مقابلے میں بھیج رہے ہیں اور ہمیں امید ہے یہ مضمون وہاں کوئی نہ کوئی انعام ضرور حاصل کرے گا۔''

لیری بہت خوش ہو گیا تھا، مشہور ہونا اور توجہ حاصل کرنا تو اس کی کمزوری تھی۔ اس نے گھر آتے ہوئے ایک ایک کو پکڑ کر یہ بات بتائی کہ اس کا مضمون ریاست کے اسکولوں کے درمیان ہونے والے مقابلے میں بھیجا جا رہا ہے۔ اگرچہ اس کے مضمون کو کسی انعام سے نہیں نوازا گیا مگر یہ بھی اعزاز کیا کم تھا کہ اسے اسکول کی طرف سے منتخب کیا گیا۔ جبکہ وہ مضمون نویسی کے مقابلے میں حصہ لینے والا اسکول کا سب سے کم عمر طالب علم تھا۔ کئی ہفتے تک اس بات کا چرچا رہا اور اس کے ماں باپ کے جاننے والے اور دوست رشتے دار اسے مبارک دینے آتے رہے۔ اس کامیابی کا نشہ بہت عرصے تک اس کے سر پر سوار رہا پھر آہستہ آہستہ سب بھول گئے تو بادل ناخواستہ اسے بھی سب بھلا کر کسی نئے معرکے کے بارے میں سوچنا پڑا۔ مگر ایک تو وہ کم عمر تھا اور دوسرے اسے پڑھنا ہوتا تھا اس لیے وہ کسی اور طرف اتنی توجہ نہیں دے سکتا تھا اس لیے اس نے اگلے مقابلے کے لیے ابھی سے تیاری شروع کر دی تھی۔ اس نے ماحولیات کے موضوع پر بہت ساری کتابیں کھنگال ڈالی تھیں۔ اس نے اسکول کی لائبریری سے خوب استفادہ کیا۔ یہی وجہ تھی کہ اس بار اس کا مضمون نہ صرف اسکولوں کے درمیان ہونے والے مقابلے میں بھیجا گیا تھا بلکہ اسے ایک خصوصی انعام سے بھی نوازا گیا تھا۔ یہ خصوصی انعام دس اچھے مضامین کے لیے تھا جو پہلے تین نمبروں پر آنے والے مضامین کے علاوہ تھے۔ اسے مایوسی ہوئی تھی، اس کا خیال تھا کہ اس کا مضمون پہلی تین پوزیشن میں سے ایک حاصل کرنے میں کامیاب ہوگا۔

اس کے ماں باپ نے اس کی حوصلہ افزائی کی تھی کہ یہ کامیابی بھی کم نہیں تھی۔ صرف بارہ سال کی عمر میں اس نے مضمون نویسی میں کوئی انعام حاصل کر لیا تھا اور وہ انعام حاصل کرنے والا سب سے کم عمر لڑکا تھا مگر یہ اس کی تسلی کے لیے کافی نہیں تھا، وہ تو سب کی توجہ کا مرکز بننا چاہتا تھا۔ اسے دوسروں کے ساتھ کھڑے ہونا اچھا نہیں لگتا تھا، وہ اکیلا سب کے سامنے رہنا چاہتا تھا۔ دس دوسرے مضمون نگاروں کی بھیڑ میں وہ گم ہو کر رہ گیا تھا۔ سب کو اسٹیج پر ایک ساتھ طلا کر ان کو ایک ساتھ ہی انعامات دیے گئے تھے۔ جبکہ پہلی تین پوزیشن حاصل کرنے والے طلبا کو اسٹیج پر الگ الگ بلا کر ان کو انعامات دیے گئے تھے۔ لیری اس سے اتنا دل برداشتہ ہوا تھا کہ اس نے پھر مضمون نویسی کے مقابلے میں حصہ نہیں لیا۔ حالاں کہ اس کے استاد اور ماں باپ اسے کہتے رہے تھے کہ وہ کوشش کرے تو ایک دن اول انعام بھی حاصل کر سکتا ہے۔ مگر اس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔

اس نے ماحولیات پر مضمون نویسی تو چھوڑ دی تھی لیکن اسے اس مضمون سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور اس نے ڈھونڈ کر اس موضوع پر کتابیں اور رسائل پڑھنا شروع کر دیے۔ اب اس کی عمر اور تعلیم بھی اتنی ہو گئی تھی کہ وہ بہت ساری باتیں سمجھ سکتا تھا۔ ہائی اسکول پاس کرنے سے پہلے ہی اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اسی مضمون میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرے گا۔ ممکن ہے وہ کوئی ایسی چیز دریافت کر لے کہ ساری دنیا میں اس کی دھوم

فریادی

ایک شخص نے اپنے بیٹے کے خلاف مجسٹریٹ کی عدالت میں فریاد کی۔

''تم نے اپنے بیٹے کو سمجھایا بھی یا نہیں؟'' مجسٹریٹ نے تحمل سے پوچھا۔

''حضور بہت سمجھایا مگر میری ایک بھی نہیں سنتا۔ وہ تو گدھا ہے اور ہمیشہ گدھوں کی رائے پر عمل کرتا ہے۔ اب حضور سے درخواست ہے کہ آپ ہی اسے سمجھائیں۔'' فریادی نے التجا کی۔

ہی تھا۔

وہ ادارے کے دفتر پہنچا تو اسے مایوسی ہوئی تھی۔ یہ چھوٹی سی عمارت کے ایک کونے میں گھسا ہوا دفتر صرف ایک کمرے پر مشتمل تھا اور وہاں ایک بوڑھا سا شخص سال خوردہ میز کے پیچھے بیٹھا ہوا خود آثار قدیمہ لگ رہا تھا۔ اس نے اپنی عینک کے اوپر سے لیری کا جائزہ لیا اور کسی قدر مایوسی سے بولا۔ ''تم تو نوجوان ہو؟''

لیری جو پہلے ہی دل برداشتہ تھا، بھنا گیا۔ اس نے کہا۔ ''میں نے اپنے جو کاغذات بھیجے تھے ان میں میری عمر بھی درج تھی، کیا میں تمہیں اس سے بھی چھوٹا لگ رہا ہوں؟''

''کچھ ایسا ہی ہے پر خوردار۔'' بوڑھے نے برا مانے بغیر کہا۔ ''دراصل ہمیں ایک کسی قدر تجربے کار شخص کی ضرورت تھی مگر تمہارا تعلیمی ریکارڈ اتنا شاندار ہے کہ تمہیں بلانا مناسب سمجھا۔''

''اس پر میں جناب کا شکر گزار ہوں۔'' اس نے کسی قدر بے زاری سے کہا۔ ''میں جاب کی نوعیت سمجھنے سے قاصر ہوں۔''

''اشتہار میں صاف لکھا تھا' ایک تحقیقی معاون کی ضرورت ہے۔'' بوڑھے نے حیرت سے کہا۔

''لیکن اس سے کام کی نوعیت تو ظاہر نہیں ہے مسٹر...''

''اسٹی رچرڈ۔'' بوڑھے نے تعارف کرایا۔ ''اور جہاں تک تحقیق کا تعلق ہے تو وہ ماحولیات سے متعلق ہی ہوگی۔''

یہ دفتر دیکھنے کے بعد لیری کا خیال تھا کہ یہ ادارہ اگر کوئی تحقیق بھی کر رہا تھا تو اس کی نوعیت اس دفتر جیسی ہی ہوگی بلکہ اسے شبہ ہونے لگا کہ کہیں اسے رضا کارانہ طور پر بنا کسی تنخواہ کے کام کرنے کو نہ کہا جائے۔ اس لیے وہ اسٹی رچرڈ کے سوالوں کے جوابات بے دلی سے دے رہا تھا۔ اب اسے

www.paksociety.com

اس ملازمت کے حصول میں خاص دلچسپی نہیں رہی تھی۔ مگر ابھی پوری سنجیدگی سے اس کا انٹرویو کررہا تھا اور اس کے بعض سوالات سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ لیری کو کوئی بہت ہی اہم ملازمت دینے جارہا ہو۔ آخر میں اس نے پوچھا۔

''اگر تمھیں انٹارکٹیکا جاکر کام کرنے کو کہا جائے تو تم انکار تو نہیں کروگے؟''

''انٹارکٹیکا؟'' وہ چونک گیا۔

''ہاں، ہمارا اصل کام وہیں ہے۔ تم نے ہمارے ادارے کے نام پر غور نہیں کیا۔ اس کا نام ہے انٹارکٹیکا کنکشن۔''

''میں نے واقعی غور نہیں کیا تھا۔'' اس نے معذرت کی۔ ''وہاں کام کیا ہوتا ہے؟''

''یہ تمھیں وہاں جانے کی صورت میں پتا چل جائے گا۔'' ابھی نے جواب دیا۔ ''لیکن تمھیں ہمارے ساتھ دس سال کا ایگری منٹ کرنا ہوگا، اس سے پہلے تم ملازمت نہیں چھوڑ سکتے۔''

''دس سال، یہ تو طویل مدت ہے۔''

''وہ تو ہے مگر ہم تنخواہ بہت معقول دیتے ہیں۔''

''مجھے کتنی تنخواہ ملے گی؟''

''دو لاکھ ڈالرز سالانہ۔ اس کے علاوہ اچھی کارکردگی پر پچاس ہزار ڈالرز کا بونس بھی ملے گا۔''

''ڈھائی لاکھ ڈالرز سالانہ۔'' وہ دنگ رہ گیا کیونکہ اسے معلوم تھا نوآموز افراد کو زیادہ سے زیادہ ستر سے نوّے ہزار ڈالرز سالانہ ملتے تھے اور بونس بھی نہیں دیا جاتا تھا۔ اتنی تنخواہ بھی صرف بڑے اداروں میں دی جاتی تھی جن کا سالانہ کروڑوں ڈالرز کا بجٹ ہوتا ہے۔ وہ فوری طور پر اس ملازمت میں دلچسپی لینے لگا۔ اس نے ان کے کام کے بارے میں کئی سوالات کیے مگر بوڑھا ابھی بہت ہوشیاری سے اسے ٹال رہا تھا۔ تحقیقی کام کے بارے میں اس کا یہی جواب تھا کہ جب وہ وہاں جائے گا تو خود دیکھ لے گا کہ وہاں کیا ہورہا ہے۔ لیری کو شبہ ہونے لگا کہ یہ لوگ کوئی غلط کام تو نہیں کررہے تھے۔ وہ کسی چکر میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ ابھی نے اس کا خیال بھانپ لیا تھا' اس نے کہا۔ ''تم فکر مت کرو' ہمارا ادارہ کوئی غلط کام نہیں کررہا ہے اور غلط کام کے لیے انٹارکٹیکا جانے کی کیا ضرورت ہے یہاں اس کے مواقع کم ہیں کیا؟''

وہ بات کرکے خود ہی ہنسا تھا۔

''تنخواہ تو تم بہت اچھی دے رہے ہو لیکن یہ دس سال کی پابندی...''

''یہ ضروری ہے کیونکہ لوگ اتنی اچھی تنخواہ کے باوجود وہاں سے کام چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔ ایک سرد ویرانے میں رہنا آسان کام نہیں ہوتا ہے۔''

''جب تک میں اس جگہ کو نہیں دیکھ لیتا' یہ شرط قبول نہیں کرسکتا...'' اس نے انکار کیا۔

''اس صورت میں تمھیں یہ جاب نہیں دی جاسکتی۔ گزشتہ تین سال میں دو افراد اسی طرح ملازمت کرکے چھوڑ گئے۔ اس سے ہمیں بہت نقصان ہوتا ہے۔'' ابھی نے صاف کہا۔ ''اگر تمھیں یہ ملازمت کرنی ہے تو اسی شرط کے ساتھ کرنی ہوگی۔''

''تو کیا مجھے پورے دس سال کے لیے وہاں رہنا ہوگا؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں یہ تم سے کس نے کہہ دیا۔ سردیوں میں تین مہینے کی چھٹی ملتی ہے اور اسی وقت بونس دیا جاتا ہے تاکہ تم یہ تین مہینے اپنی مرضی سے گزار سکو۔''

لیری کو اب یہ ملازمت اچھی لگنے لگی تھی مگر وہ ابھی سوچنا چاہتا تھا، اس نے بوڑھے ابھی سے کہا۔ ''کیا میں اس معاملے میں سوچ سکتا ہوں؟''

''ہاں تمھارے پاس دو دن کی مہلت ہے۔ اس کے بعد ہم نیا اشتہار دے دیں گے۔''

''تو کیا تم نے صرف مجھے بلایا ہے؟''

''ہاں ہم چھان پھٹک کر صرف ایک کو ہی بلاتے ہیں۔''

''میں دو دن میں جواب دوں گا۔'' لیری کھڑے ہوکر بولا۔ وہاں سے نکلتے ہوئے اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اس ملازمت کو قبول کرلے گا مگر ابھی وہ اس معاملے میں میلینا سے مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ میلینا سے اس کی دوستی یونیورسٹی میں ہی ہوئی تھی' وہ دوسرے شعبے میں تھی مگر ان کی اچھی دوستی ہوگئی تھی۔ لیری اسے محبت کا نام تو نہیں دے سکتا تھا کیونکہ ان دونوں نے بھی ایک دوسرے سے اس حوالے سے بات نہیں کی تھی مگر ان دونوں کے اندر ایک احساس تھا کہ وہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ اس لیے لیری اپنے مستقبل کے حوالے سے کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے اس سے مشورہ کرنا چاہتا تھا۔

میلینا کا تعلق آرکنساس سے تھا اور وہ ہاسٹل میں رہتی تھی۔ اس لیے لیری نے اسے باہر بلایا۔ اس کے لہجے سے میلینا نے اندازہ لگالیا کہ کوئی اہم بات ہے اور وہ وقت پر اس کی بتائی جگہ پہنچ گئی۔ لیری کو بتاتے ہوئے شرمندگی ہورہی تھی مگر میلینا نے اس کی بات پوری سنجیدگی سے سنی اور اسے مشورہ دیا۔ ''میرا خیال ہے یہ جاب تمھارے لیے اچھی ہے۔ تم ان کی پیش کش قبول کرلو۔''

''لیکن میں ایک طویل عرصے کے لیے تم سے اور اپنے گھر والوں سے دور چلا جاؤں گا۔''

''کوئی بات نہیں' تم تین مہینے کے لیے تو آؤگے۔''

''میلینا! بات یہ ہے کہ میں تمھیں پسند کرتا ہوں۔'' لیری نے ہمت کرکے اس سے وہ بات کہہ دی جو وہ دو سال میں آج تک نہیں کہہ پایا تھا۔ ''میں نے جب بھی اپنی بیوی کے بارے میں سوچا میرے ذہن میں تم ہی آئیں۔''

''لیری! تم بھی بہت اچھے لڑکے ہو اور میں نے ہر معاملے میں تمھیں دوسرے لڑکوں سے مختلف پایا ہے۔ لیکن سچی بات ہے میں نے ابھی شادی کے بارے میں نہیں سوچا ہے اور نہ ہی دو سال تک میں شادی کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ اس لیے میرا مشورہ ہے کہ تم یہ جاب قبول کرلو۔ دو سال بعد جب میں شادی کے بارے میں سوچوں گی تو میرے ذہن میں سب سے پہلے تم ہوگے۔''

لیری خوش ہوگیا۔ ''شکریہ میلینا! تم نے میرے ذہن سے ایک بوجھ اتار دیا ہے، اب میں سکون سے یہ کام کرسکتا ہوں۔''

''میرا خیال ہے' یہ اچھی ملازمت ہے اور تم اس سے بہت کچھ سیکھ سکوگے۔ سب سے بڑی بات ہے کہ تمھیں تنخواہ اتنی اچھی مل رہی ہے اور تمھارا سارا خرچ بھی ان کے ذمے ہوگا۔ تمھیں اور کیا چاہیے۔''

مگر لیری کو کسی قدر یہی بات پریشان کررہی تھی کہ وہ لوگ نارمل سے تین گنا زیادہ تنخواہ کیوں دے رہے تھے۔ میلینا نے اسے تسلی دی۔ ''تم نے بتایا تو تھا کہ کام بہت مشکل ہے اور ظاہر ہے ایک ویرانے میں سال کے نو مہینے رہنا آسان کام نہیں ہے اسی وجہ سے وہ اتنی اچھی تنخواہ دے رہے ہیں۔ تم فکر مت کرو اگر ان لوگوں نے کچھ غلط کرنے کی کوشش کی تو تم لاوارث نہیں ہو۔''

میلینا نے اس کے ذہن سے سارے بوجھ اتار دیے تھے۔ اس نے اگلے ہی دن ابھی کو فون کرکے اس کی پیش کش قبول کرلی۔ ابھی خوش ہوگیا۔ ''مجھے یقین ہے تم اس فیصلے پر کبھی نہیں پچھتاؤگے۔ تم آجاؤ تو میں تم سے قانونی معاہدہ دستخط کراؤں گا۔ تم چاہو تو اپنے ساتھ کسی وکیل کو لاسکتے ہو یا یہ معاہدہ کسی کو دکھاسکتے ہو۔''

لیکن جب لیری نے معاہدہ دیکھا تو اسے لگا کہ یہ بہت سیدھا اور صاف ستھرا قسم کا معاہدہ ہے۔ اس لیے اس نے اس پر دستخط کردیے تھے۔ اس معاہدے کے مطابق اسے اس کا معاوضہ ملازمت کے نویں مہینے میں بمع بونس دیا جائے گا۔ اس سے پہلے وہ معاوضے کا مطالبہ کرنے کا مجاز نہیں ہوگا۔ اس نے تسلیم کرلیا۔ انٹارکٹیکا میں اس کی رہائش اور دوسرے تمام اخراجات کی ذمے داری ادارے کی ہوگی اور اس کی تنخواہ سے اس مد میں کسی قسم کی کٹوتی نہیں کی جائے گی۔ اسے ایک ہفتے کے اندر جانا تھا۔

''تمھیں وہاں بریڈ فوسٹر ملے گا۔ وہ ادارے کا سینئر سائنس داں ہے۔ تم اس کی معاونت کروگے۔''

لیری رہائش اور دوسرے انتظامات جاننا چاہ رہا تھا مگر ابھی نے اسے بتایا کہ ان چیزوں کا اسے وہیں جاکر پتا چلے گا۔ اس لیے وہ جانے کی تیاری کرے۔ لیری نے اپنا سامان باندھا۔ گھر والوں اور دوستوں سے الوداعی ملاقاتیں کرنے لگا۔ میلینا اگرچہ اس سے خوشی خوشی ملی تھی مگر لیری کو صاف لگ رہا تھا کہ وہ بہت اداس ہے۔ اس نے میلینا کو تسلی دی۔

''میں نو مہینے بعد لوٹ آؤں گا۔''

''صرف تین مہینے کے لیے۔'' میلینا نے اداسی سے کہا۔

''دیکھو اب تم میری ہمت کم کررہی ہو۔'' لیری نے اسے وارننگ دی تو وہ جلدی سے مسکرانے لگی۔

لیری کو روانگی سے دو دن پہلے ابھی کی جانب سے کاغذات ملے تھے' ایک ٹکٹ اور بعض ضروری چیزیں تھیں۔ اس سفر کے لیے کچھ رقم بھی دی گئی تھی۔ ان کا تحقیقاتی مرکز انٹارکٹیکا کے جنوبی امریکا کے ساتھ ملنے والے ایک جزیرے پر تھا۔ اس جزیرے پر سارے سال برف جمی رہتی تھی مگر اس کے اردگرد سمندر گرمیوں کے تین مہینوں میں پگھل جاتا اور سردیوں کے نو مہینے منجمد رہتا۔ لیری اب بے تاب تھا کہ وہاں جلد از جلد پہنچ جائے' ویسے بھی انٹارکٹیکا کسی بھی ماہر ماحولیات کے لیے جنت سے کم نہیں ہوتا۔ ہر ماہر یہاں جانے کے خواب دیکھتا ہے مگر ان میں سے کم لوگوں کو یہاں جانے کا موقع ملتا ہے۔

انٹارکٹیکا زمین کے انتہائی جنوب میں ایک براعظم ہے جس کا بیشتر حصہ سارے سال برف سے ڈھکا رہتا ہے اور سال کے نو مہینے کے لیے پورا براعظم برف کی موٹی چادر تلے ڈھک جاتا ہے۔ یہاں دنیا کے سب سے بڑے گلیشیر پائے جاتے ہیں۔ اس براعظم کی برف میں پایا جانے والا میٹھا پانی دنیا کے کل میٹھے پانی کا نوّے فی صد ہے۔ اس پر بھی کوئی انسانی آبادی نہیں رہی ہے۔ البتہ چند جانور یہاں پائے جاتے ہیں جیسے پینگوئن اور سیل وغیرہ۔ اس کے چاروں طرف

www.pkdigest.com

آرکٹک کا سمندر ہے۔ آج کل اس پر مختلف ممالک کے سائنس داں اور ماہرین تحقیق کر رہے ہیں۔ خاص طور سے ماحول کے بارے میں تحقیق کی جارہی ہے۔

لیری طویل سفر کر کے پہلے بیونس آئرس پہنچا اور وہاں چند گھنٹے قیام کے بعد ارجنٹائن کے انتہائی جنوبی شہر روانہ ہو گیا۔ اس بار طیارہ چھوٹا اور خستہ حال تھا۔ اس سے پرواز کے دوران مسلسل آوازیں آتی رہیں مگر اس نے لیری کو صحیح سلامت منزل مقصود پر پہنچا دیا تھا۔ طیارے سے اتر کر اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔ اسے معلوم ہوا کہ رسد لے جانے والا طیارہ فنی خرابی کی وجہ سے اب اگلے دن جائے گا۔ اسے اس دوران میں ایک ہوٹل میں رکنا ہوگا۔ جنوری کے مہینے میں بھی یہاں ایسی سردی تھی کہ بغیر گرم کپڑوں کے بالکل بھی گزارا نہیں تھا۔ جس جزیرے پر اسے جانا تھا، وہ یہاں سے کوئی چار سو میل دور چلی کے ساحل سے بھی آگے تھا۔

طیارے کا پائلٹ سوگوجی ایک ہنس مکھ نوجوان تھا۔ وہ مخلوط النسل تھا، اس کا باپ مقامی اور ماں ہسپانوی نژاد تھی۔ وہ کئی برسوں سے انٹارکٹیکا میں کام کرنے والی جماعتوں کو رسد پہنچانے کا کام کر رہا تھا اور اس کے پاس ایک چھوٹا شوٹر طیارہ تھا جس کے نیچے پہیوں کے بجائے اسکیز لگے تھے کیونکہ اسے برف کے رن وے پر اترنا ہوتا تھا۔ وہ مہینے میں ایک بار بریڈ فوسٹر کے لیے سامان رسد لے کر جاتا تھا۔

''بے چارہ اکیلا آدمی ہے، میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ وہاں کرتا کیا ہے۔'' سوگوجی نے افسوس سے کہا۔

لیری چونکا۔ ''اکیلا رہتا ہے۔ کیا مطلب؟''

''بس وہ پورے جزیرے پر اکیلا رہتا ہے۔ برسوں سے اس کے ساتھ کوئی نہیں ہے۔ تین سال کے دوران میں دو نوجوان اس کے ساتھ رہنے کے لیے آئے تھے مگر وہ پھر بھاگ گئے۔ اب تم تیسرے ہو۔''

''بھاگ کیسے گئے؟'' لیری نے پوچھا۔ ''آنے جانے کے لیے تو تمہارا طیارہ استعمال ہوتا ہے۔''

''ہاں مگر ہنگامی حالات کے لیے جزیرے پر ایک کشتی بھی ہوتی ہے، وہ اسی کی مدد سے جزیرے سے نکل گئے تھے۔''

''نکل کر کہاں گئے؟'' لیری بولا۔ ''میرا مطلب ہے جزیرے کے چاروں طرف سمندر ہے۔''

سوگوجی نے شانے اچکائے۔ ''کیا کہا جاسکتا ہے۔ ممکن ہے وہ سمندر میں ڈوب گئے ہوں کیونکہ کشتی بھی نہیں ملی تھی۔''

لیری کو یہ بات عجیب سی لگی تھی کہ دونوں نے ایک ہی طریقہ اختیار کیا حالانکہ وہ چاہتے تو ملازمت چھوڑ کر بھی جا سکتے تھے۔ معاہدے کو عدالت میں بھی چیلنج کیا جاسکتا تھا۔ ان کے ساتھ کوئی زبردستی تو نہیں کر سکتا تھا۔ پھر وہ اس طرح کیوں گئے تھے؟ لیری سوگوجی سے جزیرے کے بارے میں اور بھی معلوم کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ اسے پتا چلا کہ جزیرہ ادارے کے پاس ہے اور اس کی مرضی کے بغیر وہاں کوئی نہیں جاسکتا۔ دوسرے وہاں تحقیق اور رہنے کی تمام سہولیات ہیں۔ سوگوجی ہر مہینے وہاں کے لیے خاصا سامان رسد لے کر جاتا تھا۔ البتہ آدمی گزشتہ تیس برس سے ایک ہی تھا یعنی بریڈ فوسٹر!

''میں چار سال سے سامان لے جارہا ہوں اور مجھے بھی نہیں معلوم کہ وہاں پر کس قسم کی تحقیق ہو رہی ہے۔ مگر فوسٹر اچھا آدمی ہے۔''

بریڈ فوسٹر واقعی اچھا آدمی ثابت ہوا تھا۔ اس نے جزیرے کے رن وے پر لیری کا استقبال کیا تھا۔ پہلے تو سوگوجی نے اسے فضا سے چکر لگا کر پورا جزیرہ دکھایا۔ یہ زیادہ بڑا نہیں تھا، کوئی چار میل لمبا تھا اور تین میل چوڑا۔ اس کا لمبائی والا حصہ جنوب میں منجمد سمندر سے جا ملتا تھا۔ تمام خصیات شمالی حصے میں تھیں کیونکہ جنوب میں پورے جزیرے پر برف سے ڈھکے میدان اور اونچی نیچی پہاڑیاں ہیں۔ صرف شمال کا یہ حصہ کسی قدر ہموار تھا۔ اس پر ایک چھوٹا سا رن وے تھا جس پر صرف چھوٹے طیارے اتر سکتے تھے۔ سوگوجی نے طیارے سے اتر کر بریڈ فوسٹر سے ہاتھ ملایا۔

''کیسے ہو دوست! میں آج تمہارے لیے ایک مہمان لایا ہوں۔'' اس نے لیری کا تعارف کرایا۔ بریڈ نے گرم جوشی سے لیری سے ہاتھ ملایا اور سوگوجی سے بولا۔ ''میں اس سے واقف ہوں۔ تم ایک دن دیر سے آئے ہو۔''

''طیارہ خراب تھا۔'' سوگوجی نے طیارے سے سامان اتارتے ہوئے کہا۔ اس میں لیری کا ذاتی سامان تھا اور باقی رسد تھی۔ تیل کے ڈرم، گتے کے کارٹن جن میں کھانے کا سامان تھا اور خشک راشن کے تھیلے۔ یہ سارا سامان اتارنے کے بعد وہ بریڈ فوسٹر کے لائے ہوئے چمڑے اور فالتو سامان کے ڈبے طیارے میں بھرنے لگا۔ وہ ہر مہینے سامان لانے کے علاوہ یہاں سے کچرا بھی لے جاتا تھا تاکہ جزیرے پر کسی قسم کی آلودگی نہ ہو۔

''اچھا دوست! اب اگلے مہینے ملاقات ہوگی۔'' سوگوجی نے جانے سے پہلے ان دونوں سے ہاتھ ملایا اور طیارے میں بیٹھ کر روانہ ہوگیا۔ اس کے جانے کے بعد بریڈ فوسٹر سامان اپنی چھوٹی سی گاڑی میں بھرنے لگا۔ لیری اس کی مدد کی اور وہ ذرا دور نظر آنے والے ایک گنبد نما مکان کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ پورا ایلومینیم کا بنا گنبد تھا اور اس کے اندر ان کا سائنٹ کیمپ اور رہائش تھی۔ اس کے اندر درجۂ حرارت معقول تھا اور باہر جیسی قیامت خیز سردی نہیں تھی۔ اس نے پہلے لیری کو اس کا کمرا دکھایا۔ یہ خاصا آراستہ پیراستہ تھا۔ فرنیچر کے ساتھ وہاں تفریح کے لیے ٹی وی اور میوزک سسٹم بھی تھا۔ اس کے علاوہ ایک کمپیوٹر بھی رکھا تھا۔

''ہمارا رابطہ دنیا سے انٹرنیٹ کی مدد سے ہوتا ہے کیونکہ یہاں کوئی فون لائن نہیں ہے اور موسم کی وجہ سے وائرلیس بے کار ہو جاتا ہے۔'' بریڈ نے اسے بتایا۔

''انٹرنیٹ کس ذریعے سے حاصل کیا جارہا ہے؟''

''یہ سیٹلائٹ انٹرنیٹ ہے جو ہمیشہ بہتر کام کرتا ہے۔''

لیری نے سامان رکھا اور بریڈ سے فرمائش کی۔ ''میں یہ عمارت دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''ابھی تو تم تھکے ہوئے آئے ہو، کل دیکھ لینا۔''

''نہیں، میں نے کل خوب آرام کر لیا تھا۔'' لیری نے انکار کیا۔ ''میں بالکل تازہ دم ہوں۔''

''جیسی تمہاری مرضی۔'' بوڑھے بریڈ نے شانے اچکائے۔ ''آؤ میرے ساتھ۔''

وہ اسے گنبد نما عمارت دکھانے لگا۔ یہ کوئی چالیس فٹ قطر کا گنبد تھا جس کی اونچائی زیادہ سے زیادہ بیس فٹ تھی اور سب کچھ اس کے اندر ہی تھا۔ رہائش اور تحقیق کے لیے مخصوص حصے یہیں سامان رکھنے کا گودام تھا۔ البتہ ایندھن برابر میں ایک چھوٹی سی عمارت میں رکھا جاتا تھا، اسی جگہ پر بجلی کا جنریٹر تھا حالانکہ یہ دو جنریٹر تھے جنہیں باری باری چلایا جاتا تھا۔

''میں بجلی کے استعمال میں کفایت شعاری کی کوشش کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے تم بھی ایسا ہی کرو گے۔ ہمارے پاس کچھ بیٹریاں ہیں، ان میں بجلی ذخیرہ ہوتی ہے۔ میں اسی سے کام چلاتا ہوں۔''

لیری نے اسے یقین دلایا کہ وہ بھی کچھ ایسی ہی سوچ رکھتا ہے۔ بریڈ اسے سب سے آخر میں تحقیق کے لیے مخصوص حصے میں لایا تھا۔ وہاں خاص قسم کے آلات اور مشینیں تھیں۔ ان میں سے زیادہ تر کمپیوٹرائزڈ تھیں۔ بریڈ نے اس سے کہا۔ ''بنیادی طور پر ہم یہاں اس بات کی تحقیق کر رہے ہیں کہ ہماری دنیا کا ماحول کس طرح بدل رہا ہے اور اس کی ذمے داری کس حد تک ہم پر آتی ہے اور اس کا سدباب کس طرح کیا جاسکتا ہے۔''

''یعنی ہمیں تین کام کرنے ہیں۔'' لیری نے غور کیا۔

''ایک واقعات جاننا، دوسرے اسباب جاننا اور تیسرا سدباب کرنا۔''

''بالکل۔'' بریڈ خوش ہو کر بولا۔ ''تم ذہین آدمی ہو۔''

''مگر اس کام کے لیے کیا دو آدمی کافی ہیں؟''

''بالکل کافی ہیں بلکہ میں اکیلا بھی کام کر رہا تھا مگر پچھلے کچھ عرصے سے میں کمزور ہوتا جارہا ہوں۔ اصل میں بوڑھا ہو گیا ہوں نا اس لیے مجھے ایک نائب کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے۔''

''مجھ سے پہلے بھی تمہارے پاس دو نوجوان آئے تھے؟'' لیری نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔

''ہاں مگر ان کا دل نہیں لگا تھا اور دونوں چپکے سے یہاں سے نکل گئے۔'' اس نے سرد آہ بھری۔

''ان کو چپکے سے جانے کی کیا ضرورت تھی؟''

''یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔'' بریڈ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''شاید وہ ڈر گئے تھے کہ انہوں نے بتا کر جانے کی کوشش کی تو میں معاہدے کے مطابق انہیں روک لوں گا۔''

''حالانکہ قبل از وقت ملازمت چھوڑنے سے وہ صرف اپنی سالانہ تنخواہ سے محروم ہوتے۔''

''اس کے علاوہ وہ کہیں اور جاب بھی نہیں کر سکتے تھے۔'' بریڈ نے کہا۔ ''مگر انہوں نے اپنے کاغذات کی پروا بھی نہیں کی تھی۔''

''کیا مطلب؟ کیا وہ اپنے کاغذات بھی تمہاری تحویل میں چھوڑ گئے تھے؟'' لیری نے بے یقینی سے پوچھا۔ ''ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی اپنے کاغذات چھوڑ جائے؟''

''میرے نہیں ادارے کے دفتر میں۔'' بریڈ نے شانے اچکائے۔ ''اور مجھے نہیں معلوم کہ وہ اپنے کاغذات کیوں نہیں لینے آئے۔''

''دفتر!'' لیری ہنسا۔ ''میں نے دفتر دیکھا ہے، اس میں کچھ بھی نہیں تھا۔''

''وہ دفتر نہیں ہمارا بھرتی کا دفتر ہے۔'' بریڈ نے وضاحت کی۔ ''اصل دفتر فلاڈلفیا میں ہے۔ مگر وہ بھی کوئی بہت بڑا نہیں ہے۔''

''میں اب تک ادارے کے صرف دو افراد سے ملا ہوں۔ ایک ایسی اور دوسرے تم ہو۔ کیا تم لوگ کم سے کم عملے سے کام چلانے کی کوشش کرتے ہو؟''

بریڈ مسکرانے لگا۔ ''کچھ ایسی ہی بات ہے۔ اصل میں ہمارے پاس زیادہ فنڈز نہیں ہوتے ہیں۔''

www.pkdigest.com

''اس کے باوجود تم ایک نئے آنے والے آدمی کو تقریباً ڈھائی لاکھ ڈالرز سالانہ دے سکتے ہو!'' لیری نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''ہاں... کیونکہ ہم عملہ کم سے کم رکھتے ہیں اس لیے زیادہ تنخواہ دے سکتے ہیں۔'' بریڈ نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ''آؤ اب میں تمہیں کچن دکھاؤں، یہ بہت اہم جگہ ہے کیونکہ ہمیں کھانا خود بنانا ہوگا۔''

رات کا وقت ہو گیا تھا۔ اگرچہ باہر روشنی تھی مگر گرما میں جنوبی کرّے میں تقریباً ہر وقت روشنی رہتی تھی اور بالکل جنوب میں ہر وقت سورج نکلا رہتا تھا۔ اس لیے کام، سونے اور کھانے کے اوقات طے تھے۔ ہر کام گھڑی دیکھ کر کیا جاتا تھا۔ بریڈ نے رات کا کھانا تیار کیا تو لیری نے تسلیم کیا کہ وہ ماہر کک ہے۔ اس نے بہت مزے کی چکن کری اور مٹن پائی بنائی تھی۔ اس کے علاوہ ایک قسم کی مٹھائی بھی تیار کی تھی۔ اس نے کہا۔

''یہاں میٹھا زیادہ استعمال کرنا پڑتا ہے کیونکہ اس سے بہت توانائی مل جاتی ہے۔ اور ہاں... رات سونے سے پہلے اضافی منرلز اور وٹامنز بھی لینا۔ اس موسم میں صحت برقرار رکھنے کے لیے یہ بہت ضروری ہیں۔''

کھانے کے بعد بریڈ نے کافی تیار کی۔ کچھ دیر الاؤ کے پاس بیٹھ کر لیری اپنے کمرے میں آگیا۔ اس نے سب سے پہلے میلینا کو میل کرکے اپنے خیریت سے پہنچ جانے کی اطلاع دی اور اس کے بعد سو گیا کیونکہ بریڈ کے دیے ٹائم ٹیبل کے مطابق اسے دس گھنٹے بعد اپنی ڈیوٹی پر ہونا تھا۔ انہیں دن میں دس گھنٹے کام کرنا ہوتا تھا اور باقی وقت وہ آرام اور کھانے پینے میں صرف کرتے۔ کام میں آٹھ گھنٹے لیب کے لیے مخصوص تھے اور دو گھنٹے دوسرے کام کرنے کے تھے۔

لیری کو وہاں کے معمولات سے ہم آہنگ ہونے میں ایک ہفتہ لگا تھا۔ اس دوران میں اس نے جان لیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے اور اپنا کام جان کر اسے حیرت ہوئی تھی۔ یہ کوئی خاص کام نہیں تھا اور اس کے لیے اسے ڈھائی لاکھ ڈالرز سالانہ کی تنخواہ پر لایا گیا تھا۔ اس کی واحد وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ اس ویرانے میں کوئی رکنے اور کام کرنے کو تیار نہیں تھا اسی لیے اسے اتنی پرکشش تنخواہ دی گئی تھی کہ وہ بھاگنے کی کوشش نہ کرے۔ وہ روز صبح اٹھ کر اپنے کام میں لگ جاتے تھے۔ وہ جزیرے سے تین طرح کے نمونے حاصل کرکے ان کا تجزیہ کرتے تھے۔ یہ نمونے ہوا، برف اور پانی سے حاصل کیے جاتے تھے۔ ہر ہفتے نیا نمونہ لے کر اس کا تجزیہ کیا جاتا اور اس کی رپورٹ ادارے کے صدر دفتر بھیج دی جاتی تھی۔ بریڈ فوسٹر تجزیاتی سائنس کا ماہر تھا اور لیری اس سے بہت کچھ سیکھ رہا تھا۔

آنے والے دنوں میں موسم کسی قدر بہتر ہوا تھا اور یہاں آنے کے بعد لیری نے پہلی بار درجۂ حرارت صفر سے اوپر دیکھا تھا۔ ورنہ یہ عام طور سے صفر سے نیچے ہی رہتا تھا اور رات کو تو یہ گر کر دس درجے منفی سے بھی نیچے چلا جاتا تھا۔ دن میں موسم صاف ہوا تو وہ باہر بھی نکلنے لگے تھے۔ ورنہ دن میں بھی دھند اور بادل رہا کرتے تھے۔ لیری نے بریڈ سے کہا۔

''میں جزیرے پر گھوم کر دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''یہاں کوئی خاص چیز نہیں ہے۔'' اس نے ٹالنے کے انداز میں کہا۔ ''بس برف ہے اور چھوٹی موٹی پہاڑیاں ہیں۔''

''تو بھی دیکھ لوں گا۔'' لیری نے اصرار کیا۔ ''میرا مقصد اس جزیرے کے محل وقوع سے واقفیت حاصل کرنا ہے۔''

''او کے ہم کسی دن چلیں گے۔'' بریڈ بولا مگر اس نے کوئی واضح نہیں کیا تھا کہ وہ کس دن چلیں گے۔ لیری نے دل میں سوچا۔ اگر وہ اسے لے کر نہیں نکلا تو آنے والے اتوار کو وہ خود ہی جزیرے کی سیر کو نکل جائے گا۔ جزیرہ اتنا بڑا نہیں تھا کہ اسے کھو جانے کا خطرہ ہو۔ وہ ہفتے کے چھ دن کام کرتے تھے اور اتوار والے دن چھٹی کرتے تھے۔ اس دن وہ بہت سارے ذاتی کام نمٹاتے تھے جیسے کپڑے دھونا اور نہانا۔ یہاں یہ دونوں کام بہت مشکل تھے۔ خاص طور سے کپڑے دھو کر سکھانا... کیونکہ یہاں دھوپ شاذ ہی نکلتی تھی۔ جنریٹرز والے کمرے کے ساتھ ایک چھوٹا سا شیشے سے بنا کمرا تھا وہ اس میں کپڑے خشک کرتے تھے۔ بریڈ تو اتوار والے دن مصروف ہی رہتا تھا اور بہت آہستہ آہستہ کام کرتا تھا۔ لیکن لیری اپنا کام بہت تیزی سے نمٹا لیتا تھا اور اس کے بعد بہت وقت بچ جاتا تھا۔ اس دوران میں وہ جزیرے کی سیر کر سکتا تھا۔

بریڈ کا تعلق اصل میں کینیڈا سے تھا اور وہ یہاں تیس سال پہلے آیا تھا۔ تب سے وہ یہیں تھا۔ لیری نے اس سے پوچھا۔ ''تم تیس سال سے یہیں ہو؟''

''ارے نہیں۔'' وہ ہنسنے لگا۔ ''میں ہر سال چھٹیوں میں جاتا ہوں۔ وہاں میرے بیوی بچے ہیں بلکہ اب تو بچے ہی ہیں، بیوی کا دو سال پہلے انتقال ہو گیا۔''

''تم بور نہیں ہوتے اس ویران اور تنہا جگہ رہتے رہتے؟''

''شروع میں ہوتا تھا مگر اب عادی ہو گیا ہوں۔ دراصل جب کوئی کام انسان کا مشن بن جائے تو وہ اس سے بور نہیں ہوتا۔''

''یہ تمہارا مشن ہے؟''

''ہاں، یہ کام میرا مشن ہے۔''

بریڈ سے پہلے اسمی یہاں کا انچارج تھا۔ لیری ایک بار پھر حیران ہوا تھا۔ ''میں نے اسے دیکھا ہے وہ اتنا بوڑھا تو نہیں ہے۔''

''اس کی عمر ستر برس ہے اور تیس سال پہلے جب میں یہاں آیا تو وہ واپس گیا تھا۔ یہ ادارہ اسی کی کوششوں سے قائم ہوا ہے۔''

''وہ اس کا سربراہ ہے؟''

''ہاں، اب وہ ادارے اور مشن کا سربراہ ہے۔''

''یہ مشن کہاں سے ہو گیا، یہ تو سادہ سا کام ہے۔'' اس نے اعتراض کیا۔

''نہیں، یہ بھی مشن ہے۔ تم بھی نہ بھی جان جاؤ گے۔'' بریڈ نے جواب دیا۔ ''ابھی تمہیں آئے ہوئے صرف چند دن ہی تو ہوئے ہیں۔''

لیری کو یہاں بوریت تو نہیں ہو رہی تھی مگر وہ مایوس تھا کیونکہ اس کا مقصد تو شہرت حاصل کرنا تھا اور یہ بتا رہا تھا کہ گزشتہ تیس سال سے وہ یہاں کام کر رہا تھا اور اب تک ایسا کوئی کام نہیں کیا تھا کہ دنیا میں اس کا شہرہ نہ سہی لیکن لوگ اسے جان تو جاتے۔ مگر لیری نے اس کے بارے میں نہ تو سنا تھا اور نہ ہی کبھی کہیں پڑھا تھا۔ اس کا ایک مطلب تھا کہ یہاں ایسا کوئی کام نہیں ہوتا تھا کہ وہ شہرت حاصل کر سکے۔ اس نے ابھی یہ نوکری جاری رکھنے یا نہ رکھنے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ یہاں تنخواہ اتنی اچھی تھی کہ وہ دو تین سال میں بہت اچھا پس انداز کر سکتا تھا اور اس کے بعد وہ اس قابل ہو جاتا کہ کوئی اچھا وکیل کرکے ان لوگوں سے چھٹکارا حاصل کر سکتا تھا۔ پھر اسے سیکھنے کا موقع مل رہا تھا۔

مارچ تک موسم خراب ہونے لگا تھا اور اسے ابھی تک مصروفیات کی وجہ سے جزیرہ دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ وہ صبح سے شام تک لیب میں مصروف رہتا تھا اور اس کے بعد دوسرے کاموں کی وجہ سے اسے صرف سونے کا موقع ملتا تھا۔ وہ انٹرنیٹ پر میلینا سے بھی زیادہ بات نہیں کر پاتا تھا۔ اتوار والے دن بھی کسی نہ کسی وجہ سے اس کا باہر جانا ٹلتا رہتا پھر موسم خراب ہو گیا۔ دن میں بھی درجۂ حرارت منفی سے نیچے رہنے لگا تھا۔ ایسے موسم میں حفاظتی انتظامات کے بغیر باہر جانا مناسب نہیں تھا کیونکہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ جنوب کی طرف سے سردی کی لہر آتی تھی اور کچھ وقت کے لیے درجۂ حرارت منفی تیس تک گر جاتا تھا اور اس میں فراسٹ بائٹ کا خطرہ ہوتا تھا۔ انہیں ایسے موسم میں باہر جانے کے لیے خاص لباس، جوتوں اور دستانوں کے ساتھ کنٹوپس کی ضرورت ہوتی تھی۔ بریڈ نے اسے اس معاملے میں پوری تربیت دی تھی اور اس نے بھی پوری سنجیدگی سے سب سیکھا تھا کیونکہ یہ زندگی و موت کا معاملہ تھا۔ ذرا سی غفلت سے زندگی یا کسی عضو سے ہاتھ دھونے پڑ سکتے تھے۔

اس روز اتوار تھا اور موسم بھی اچھا ہو رہا تھا۔ وہ اٹھا تو اس نے چمکتا سورج دیکھا۔ زمین سے ہلکی ہلکی کہر اٹھ رہی تھی۔ لیکن یہ بہت کم تھی۔ اس کا مطلب تھا، وہ باہر جا سکتا ہے۔ اس نے بریڈ سے کہا تو وہ حسب معمول اسے ٹالنے لگا۔

''آج مجھے بہت کام ہے۔''

''تو تم کام کرو۔'' لیری نے بے پروائی سے کہا۔ ''میں خود چلا جاتا ہوں۔''

بریڈ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہاں اکیلے گھومنا خطرناک ہو سکتا ہے۔ کم از کم دو آدمیوں کا ہونا ضروری ہے۔''

لیری نے اسے طنزیہ نظروں سے دیکھا۔ ''میرا خیال ہے تم تیس سال سے یہاں اکیلے ہو... کیا تم نے ایک بار بھی اس جزیرے کو پورا دیکھا؟''

''نہیں، میں نے آج تک پورا جزیرہ نہیں دیکھا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

لیری حیران ہوا۔ ''لیکن میں ضرور دیکھوں گا۔''

''مرضی ہے تمہاری۔'' بریڈ نے شانے اچکائے۔ ''میرا مشورہ ہے کہ جنوبی حصے کی طرف جانے سے گریز کرنا۔ وہاں برف میں چھپے غار ہیں۔''

''تم فکر مت کرو، میں واکی ٹاکی لے کر جا رہا ہوں اگر ایسی کوئی بات ہوئی تو میں تمہیں کال کر دوں گا۔''

''خطرہ مول لینے سے بہتر ہے کہ تم جنوبی حصے کی طرف مت جاؤ۔'' بریڈ نے نرم لہجے میں کہا۔

''وہاں کیا ہے؟''

''میں نے بتایا نا، ایسے چھپے غار ہیں جن پر برف جم گئی ہے اور کوئی بے خبری میں گر جائے تو اسے وہاں سے نکالنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔''

''یہاں اس قسم کا کوئی حادثہ ہو چکا ہے؟''

"یہاں تو نہیں لیکن ارد گرد کے جزائر میں اس قسم کے حادثے عام ہیں، اس لیے احتیاط بہتر ہے۔"

مگر لیری نے سوچ لیا تھا کہ وہ جنوبی حصے کی طرف بھی جائے گا اس لیے اس نے بحث کرنے کے بجائے باہر جانے کی تیاری شروع کر دی۔ اس نے مخصوص لباس پہنا۔ صرف لباس کا وزن تقریباً پندرہ کلوگرام تھا۔ اس کے ساتھ بھاری جوتے اور دستانے بھی تھے۔ پھر اس نے اسکیز اور ان کو چلانے کے لیے چھڑیاں لیں اور باہر نکل آیا۔ اس کا والی ٹاکی اس کی بیلٹ سے بندھا ہوا تھا۔ اس نے احتیاطاً اسے چیک بھی کر لیا تھا۔ بریڈ نے اسے جاتے جاتے بھی نصیحت کی۔

"جلد آجانا، یہاں موسم بدلنے میں چند منٹ لگتے ہیں اگر تم کہیں پھنس جاؤ تو مجھے کال کر لینا۔ میں گاڑی لے کر آجاؤں گا۔"

لیری سر ہلاتا ہوا باہر آگیا۔ موسم بہت شاندار تھا۔ اس نے اسکیز پر پھسلتے ہوئے پہلے ساحل کا ایک چکر لگایا۔ اس طرف برف کم تھی کیونکہ یہاں سمندر میں ایک لہر چلتی تھی جو برف کو پگھلا دیتی تھی۔ البتہ جزیرے کے جنوبی حصے میں برف کے عظیم الشان تودے تھے۔ ان کا اسٹیشن ساحل سے کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ اس نے ایک چکر لگایا اور عموم جنوبی حصے کی طرف جانے والا راستہ تلاش کرنے لگا۔ برفیلی زمین بہت ناہموار تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ یہاں آمد و رفت نہیں تھی۔ زمین پر راستوں کا کوئی نشان نہیں تھا۔ اسے تعجب ہوا... کیا بریڈ درست کہہ رہا تھا کہ وہ اس طرف نہیں آیا تھا؟ اسے معلوم تھا کہ کسی کو یہاں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ برسوں سے یہاں کسی نے قدم نہیں رکھا تھا۔ اسی وجہ سے جزیرے کی اس طرف کی زمین بالکل ناہموار تھی۔

اس نے اسکیز اتار دیے، یہاں یہ بے کار تھے۔ اس نے اپنے جوتوں کے نیچے کیلوں والے تلے لگائے۔ یہ آسانی سے لگ جانے والے تلے تھے۔ ان کی مدد سے برف پر چلنا آسان ہو جاتا تھا۔ یہاں برف سفوف نما اور پھسلواں تھی جس کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ یہاں برف سفوف نما اور پھسلواں تھی جس پر پاؤں صحیح سے نہیں جم رہے تھے۔ وہ کسی نہ کسی طرح ٹیلوں سے گزرتا رہا اور دل ہی دل میں بریڈ کی عقل مندی کی داد دیتا رہا جس نے کبھی اس طرف آنے کی کوشش نہیں کی۔ پتا نہیں ان ٹیلوں کی برف سفوف نما کیوں تھی؟ یہ صحرائی ریت کی طرح پھسلتی تھی اور اس پر قدم جمانا بہت دشوار تھا۔

خدا خدا کر کے وہ ٹیلوں سے نکلا تو اس کے سامنے پہاڑیاں تھیں۔ اگرچہ یہ زیادہ اونچی نہیں تھیں لیکن خاصی ترچھی تھیں اور ان پر چڑھنا دشوار لگ رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ ان پر چڑھنے کا فائدہ بھی نہیں تھا کیونکہ ان کے پیچھے بھی پہاڑیاں تھیں جو وہ طیارے سے دیکھ چکا تھا۔ مگر پھر اس تجسس نے مجبور کیا کہ ممکن ہے ان پہاڑیوں کے عقب میں کوئی چیز ہو کی جو انوکھی ہو اور اس سے پہلے کسی نے نہ دیکھی ہو۔ یہ سوچ کر اس نے اوپر چڑھنا شروع کیا۔ ایک پہاڑی کسی قدر آسان لگ رہی تھی، لیری نے اسی کا انتخاب کیا۔ چھڑیوں اور کیل والے جوتوں کی مدد سے وہ اوپر پہنچنے میں کامیاب رہا تھا۔ چوٹی پر پہنچ کر اس نے سانس درست کیا اور پھر دوسری طرف دیکھا تو اسے خلاف توقع ایک پیالے نما وادی دکھائی دی۔ فضا سے اس وادی کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ اس کے وسط میں ایک چوٹی تھی، اس کی بلندی تقریباً اسی پہاڑی جتنی تھی جس پر وہ کھڑا تھا۔ اس نے وادی کے وسط میں ایستادہ چوٹی کو غور سے دیکھا تو اسے عجیب سا احساس ہوا مگر وہ اپنے احساس کو کوئی نام نہیں دے سکا۔ یہ چوٹی اسے کچھ عجیب سی لگ رہی تھی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے دوسری طرف اترنے کا فیصلہ کیا۔ وہ نرم برف پر تقریباً پھسلتا ہوا نیچے جانے لگا۔ جیسے جیسے وہ نیچے جا رہا تھا چوٹی کی ساخت واضح ہوتی جا رہی تھی۔ یہ بہت بڑی تھی کم سے کم بھی ڈھائی اونچی... اور اتنی ہی لمبی چوڑی بھی تھی۔ مکمل طور پر برف سے ڈھکی ہونے کی وجہ سے یہ نہ تو فضا سے نظر آتی تھی اور نہ ہی اس کی ساخت واضح ہوتی تھی۔ لیکن جیسے جیسے لیری نیچے جا رہا تھا اس کی ساخت واضح ہوتی جا رہی تھی۔ پندرہ منٹ بعد وہ اس کے سامنے کھڑا حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا، یہ چوٹی نہیں بلکہ برف کا ایک اہرام تھا۔ اور یہ قدرتی ہرگز نہیں تھا۔ بھلا مکمل ساخت کا اہرام قدرتی ہو سکتا ہے؟ یہ مکمل مربع صورت میں اور زمین سے چوٹی تک چار تکونی ڈھلانوں میں تقسیم تھا۔ لیکن یہ پورے کا پورا برف سے ڈھکا ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ برف سے اس قسم کی تعمیر ممکن ہی نہیں ہے کیونکہ برف اتنا بوجھ برداشت نہیں کر سکتی اور یہ اہرام اپنے ہی بوجھ سے گھستا اور ٹوٹنا شروع ہو جاتا... جبکہ اس میں کہیں کوئی خرابی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اسے کسی نے بنایا تھا اور شاید پتھر سے بنایا تھا۔ پتھر ہی اتنی وزنی تعمیر کا بوجھ برداشت کر سکتا ہے۔ اچانک اسے خیال آیا۔

"کیا بریڈ کو اس کا علم نہیں ہے؟"

بریڈ نے اس سے کہا تھا کہ وہ کبھی اس طرف نہیں آیا اور اس نے پورا جزیرہ نہیں دیکھا ہے۔ کیا واقعی وہ اس اہرام سے بے خبر ہے؟ مگر لیری کا ذہن یہ تسلیم کرنے سے انکار کر رہا تھا کہ بریڈ اتنی عظیم الشان چیز کی موجودگی سے بے خبر ہے۔ اسے ضرور علم تھا اور نہ وہ اسے یہاں آنے سے کیوں منع کرتا۔ سوال یہ تھا کہ اسے علم تھا تو وہ اس سے چھپانے کی کوشش کیوں کر رہا تھا؟ اس سے بھی زیادہ اہم سوال تھا کہ اسے اس اہرام کا علم تھا تو اس نے اب تک دنیا کو اس سے کیوں بے خبر رکھا؟ ان تمام سوالات کے جوابات بریڈ کے پاس تھے اور لیری اس سے جا کر ضرور پوچھتا مگر فی الحال وہ اس اہرام کو نزدیک سے جا کر دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کا اندازہ تھا کہ نزدیک دکھائی دینے کے باوجود اہرام اس سے کم سے کم ایک میل کے فاصلے پر ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ اہرام کی طرف قدم بڑھاتا، اسے عقب سے بریڈ کی آواز آئی۔

"خدا کا شکر ہے تم زندہ ہو، ورنہ میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم کسی حادثے کا شکار ہو گئے ہو۔"

اس نے مڑ کر دیکھا۔ بریڈ کسی وقت خاموشی سے اس کے پیچھے آگیا تھا۔ وہ تیز قدموں سے اس کے پاس آیا اور شکایتی لہجے میں بولا۔ "تم نے والی ٹاکی کیوں بند کر رکھا تھا؟"

لیری نے بے ساختہ والی ٹاکی کی طرف دیکھا۔ اس کا بٹن کسی وجہ سے بند ہو گیا تھا۔ پھر اس نے بریڈ کو دیکھا جو پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھا۔ اس نے اہرام کو یوں نظر انداز کر رکھا تھا جیسے اس کا وہاں کوئی وجود ہی نہ ہو۔ اس نے پھر کہا۔ "چلو... موسم خراب ہونے والا ہے۔" اس نے جنوب کی طرف اشارہ کیا جہاں سے سیاہ بادل آ رہے تھے۔ لیری نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور اہرام کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"موسم کو مارو گولی... یہ بتاؤ کہ یہ کیا ہے؟"

"یہ... یہ ایک چوٹی ہے۔" بریڈ نے یوں کہا جیسے اسے بے وقوف بنانے کی کوشش کی ہو۔

لیری غصے سے بولا۔ "مجھے احمق مت سمجھو... تم اسی لیے مجھے یہاں آنے سے روک رہے تھے؟"

"کس لیے؟" بریڈ نے معصومیت سے پوچھا۔

"اس لیے کہ میں یہ اہرام نہ دیکھ لوں۔ تم مجھ سے کیوں چھپا رہے تھے؟"

"میں نے نہیں چھپایا۔ میں خود اسے پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔"

"جھوٹ... تم نہ صرف اس کی موجودگی سے واقف تھے بلکہ مجھ سے بھی چھپاتے رہے تھے۔" لیری کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ "میرے خدا! دنیا کو پتا ہی نہیں ہے کہ یہاں ایک اتنا بڑا اہرام بھی ہے۔"

"اہرام تو مصر میں بھی ہیں۔" بریڈ نے جیسے الزام کی تردید کی۔

"ہاں مگر ان کا دنیا کو علم ہے اور پھر اس اہرام کو دیکھو... یہ کتنا بڑا ہے۔ مصر کا سب سے بڑا اہرام بھی اس کے مقابلے میں بچہ ہے۔"

"ہاں، یہ کچھ بڑا ہے۔"

"کچھ!" لیری چلایا۔ "کچھ نہیں یہ بہت بڑا ہے۔ اس کی بلندی دیکھو۔ یہ کم سے کم بھی ہزار فٹ اونچا ہے جبکہ مصر کا سب سے اونچا اہرام بھی ساڑھے چار سو فٹ سے زیادہ اونچا نہیں ہے۔ اور شاید یہ ان سب سے زیادہ پرانا ہے۔"

"نہیں یہ زیادہ پرانا نہیں لگتا۔" بریڈ نے تردید کی۔

"نہیں میرا خیال ہے یہ بہت پرانا ہے۔ مصریوں نے اسے دیکھ کر ہی اپنے اہرام بنائے ہوں گے۔"

"مصری یہاں کہاں سے آ گئے؟" بریڈ نے زیرلب کہا۔

"مصری بہت ترقی یافتہ تھے۔ وہ یہاں آ سکتے تھے اور انہوں نے یہ اہرام دیکھ کر واپس جا کر اس کی نقل بنا لی ہو گی اور انہوں نے اس راز کو چھپائے رکھا کہ انہوں نے اصل میں اہرام کہاں دیکھ کر اس کی نقل تیار کی۔"

"تم پاگل ہو کہ اتنی جلدی اتنے سارے مفروضات قائم کر لیے۔"

"تب تم بتاؤ کہ دنیا کا سب سے بڑا اہرام یہاں ہے اور کوئی نہیں جانتا۔ اگر یہ مصری اہراموں کے بعد بنتا تو اس کا شہرہ ہو چکا ہوتا۔" لیری نے دلیل سے کہا۔ فریڈ بھی قائل نظر آنے لگا۔

"چلو مان لیا کہ یہ سب سے پہلا اہرام ہے... پھر ہم کیا کریں؟"

"کیا کریں۔" لیری پھر چلایا۔ "ہم اسے دنیا کے سامنے پیش کریں گے اور کیا کریں۔"

"میرا خیال ہے کہ یہ بالکل فضول ہے۔"

"شاید تم مجھے اس کی طرف جانے سے روکنے کی کوشش کر رہے ہو۔" لیری نے اس کی طرف دیکھا۔ "لیکن میں تمہیں بتا دوں کہ دنیا کی کوئی طاقت مجھے اس کی طرف جانے سے نہیں روک سکتی۔"

www.pkdigest.com

"اس کی طرف جانا بے کار ہے۔" بریڈ نے بے دلی سے کہا۔ شاید اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ لیری کسی صورت نہیں رکے گا۔

"نہیں، میں ضرور جاؤں گا... چلو میرے ساتھ۔"

"میں نہیں جا سکتا۔ میں تو یہاں آتے آتے تھک گیا ہوں۔" اس نے عذر پیش کیا۔ واقعی اس کی حالت بری لگ رہی تھی۔

"زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ مشکل سے ایک میل دور تو ہے۔"

"یہ ایک میل دور نظر آتا ہے۔" بریڈ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "حقیقت میں یہ خاصے فاصلے پر ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم اس کے بارے میں جانتے تھے اور تم اس کو قریب سے یا اندر سے بھی دیکھ چکے ہو۔" لیری نے فوراً کہا تو بریڈ کا چہرہ خفت سے سرخ ہو گیا۔ اس نے سر ہلایا۔

"ہاں، میں پہلے سے واقف تھا۔"

"تب تم نے اسے چھپایا کیوں؟" لیری پھر چلا اٹھا۔

"تم نے دنیا والوں کو اس کے بارے میں بتایا کیوں نہیں؟"

"یہ بے کار ہے۔" وہ آہستہ سے بولا۔ "میرا خیال ہے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔"

"کیوں، تم پاگل ہو۔ اگر ہم اس کے بارے میں دنیا کو بتائیں تو ہم سے زیادہ مشہور کون ہو گا۔" لیری نے کہا۔

"اس صدی میں اس سے بڑی دریافت کیا ہو گی۔"

"میں نے کہا نا، یہ بے کار ہے۔" بریڈ اپنی بات پر قائم رہا۔

"تم سے تو بات کرنا ہی بے کار ہے۔" لیری نے اہرام کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ بریڈ بھی اس کے ساتھ چلنے لگا۔ وہ اسے سمجھا رہا تھا۔

"احمق مت بنو، تمہیں اس کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔"

"وہ کیسے؟" لیری رکے بغیر بولا۔

"ابھی تم خود دیکھ لو گے۔" وہ اہرام کی طرف چلتے رہے۔ لیری کا خیال غلط ثابت ہوا تھا کہ اہرام صرف ایک میل کے فاصلے پر ہے۔ انہیں چلتے ہوئے کم سے کم آدھا گھنٹا گزر چکا تھا اور اہرام ابھی بھی اتنے ہی فاصلے پر نظر آ رہا تھا۔ بریڈ کی حالت ٹھیک نہیں تھی اور لیری بھی تھکن محسوس کرنے لگا تھا۔ اس نے بریڈ کی طرف دیکھا۔

"سچ سچ بتاؤ، یہ اہرام اور کتنی دور ہے؟"

"ابھی اتنا ہی اور چلنا پڑے گا۔"

لیری کے اندازے کے مطابق وہ دو میل چل چکے تھے اور ابھی اتنا ہی اور چلنا تھا۔ یعنی اہرام چار میل دور تھا۔ لیری حیران تھا کہ دیکھنے میں تو وہ بالکل پاس لگتا تھا۔ بریڈ بالکل خاموشی سے چل رہا تھا۔ لیری نے دو تین بار اس سے بات کرنے کی کوشش کی مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تنگ آ کر لیری بھی چپ ہو گیا۔ ویسے وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا کہ بریڈ نے اسے اتنی اہم چیز سے بے خبر رکھنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ادارے کے سربراہ اسی سے اس کی شکایت کرے گا کہ اس نے اتنی اہم دریافت چھپا کر ادارے کا بھی نقصان کیا ہے۔ اگر یہ اہرام ادارے کے توسط سے دنیا کے سامنے آتا تو ادارہ ساری دنیا میں مشہور ہو چکا ہوتا اور اسے بے شمار فنڈز مل چکے ہوتے اور وہ یوں کسمپرسی کی حالت میں تحقیق نہ کر رہے ہوتے۔ مگر اس سے پہلے وہ اس اہرام کو دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ واقعی کوئی اہرام تھا یا محض اہرام نما شکل تھی۔ وہ سر جھکائے چلا جا رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اہرام اب بھی اتنا ہی دور ہو گا۔ لیکن اس نے ایک بار پھر سر اٹھا کر دیکھا تو دنگ رہ گیا..... اہرام اس سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ وہ کب آ گیا تھا۔

عقب سے بریڈ نے کہا۔

"میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔"

"کیا مطلب؟" وہ پلٹا۔

بریڈ شرارت سے مسکرا رہا تھا۔ "جب میں نے اس کی طرف دیکھنا بند کیا تو یہ اچانک ہی آ گیا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے، تم اس کے بارے میں سب جانتے ہو۔" لیری نے الزام لگایا۔

"ہاں، تم کہہ سکتے ہو۔" اس نے تسلیم کیا۔ "لیکن اسے میں نے دریافت نہیں کیا ہے۔"

"پھر کس نے دریافت کیا ہے؟"

"ابھی نے... وہ اس جگہ آنے والا اولین شخص تھا۔"

"ابھی نے؟ اس کا مطلب ہے یہ بہت پہلے دریافت ہو گیا تھا۔" لیری چلا اٹھا۔ "تم لوگ پاگل ہو، اسے دنیا سے کیوں چھپا رہے ہو؟ کیا اس میں تم لوگوں کا کوئی ذاتی مفاد ہے؟"

"نہیں... خدا کی قسم ہم نے اس سے ایک سینٹ کا بھی فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ ہمارے لاکھوں ڈالرز اس پر خرچ ہو چکے ہیں۔"

"پھر کیا بات ہے؟"

"ذرا صبر کرو۔ میں تمہیں ایک کہانی سناتا ہوں۔ تم

دلایا۔ "اس لیے جب تک ان کا سیارہ دوبارہ نہیں آتا تو انہیں یہیں رہنا تھا۔"

"تو اس لیے انہوں نے یہ اہرام بنایا۔" لیری پرجوش ہو گیا۔ "ان کا خیال ہو گا کہ کوئی اس جگہ کو تلاش نہیں کر سکے گا۔"

"نہیں، وہ اتنی بے وقوف مخلوق نہیں تھی۔ وہ ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے منزل تک پہنچے تھے اس لیے انہیں معلوم ہو گا کہ کوئی دوسری مخلوق بھی ترقی کر کے اس درجے تک آ سکتی ہے اس لیے انہوں نے اہرام بناتے ہوئے اس پہلو کو بھی مدنظر رکھا تھا کہ کوئی انہیں تلاش نہ کر سکے۔"

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ جب انسان اس اہرام کو تلاش کر سکتا ہے تو ان لوگوں کو تلاش کرنا کون سا مسئلہ ہو گا۔ ویسے کیا وہ اس اہرام میں رہتے ہیں؟"

"ہاں، مگر اس طرح نہیں جس طرح تم سوچ رہے ہو۔"

"پھر کس طرح رہ رہے ہیں؟"

"فرض کرو کہ انسان اسی طرح مریخ پر جا کر پھنس جائیں اور انہیں پتا ہو کہ ان کو اگلی بار مدد ہزاروں برس بعد ملے گی تو وہ کیا کریں گے؟"

لیری نے سوچا۔ "وہ زندہ رہنے کے اسباب تلاش کریں گے۔"

"ہم جانتے ہیں کہ مریخ پر ہمارے لیے زندگی کے لوازمات بہت محدود ہیں۔ اس صورت میں ہم کیا کریں گے؟"

"اس صورت میں اگر ان کے پاس تکنیک ہو گی تو وہ طویل مدت کے لیے سو جائیں گے اور اپنی ضروریات محدود کر لیں گے۔"

"بالکل... انہوں نے بھی یہی کیا ہو گا۔"

لیری نے غور سے اسے دیکھا۔ "لگتا ہے تم اس بارے میں بہت کچھ جانتے ہو۔"

"آؤ میں تمہیں اندر سے یہ اہرام دکھاتا ہوں۔ اس کا دروازہ جنوب کی طرف ہے اور کسی قدر زمین میں چلا گیا ہے۔ مجھے خاصی برف صاف کرنی پڑی تھی۔"

وہ گھوم کر اہرام کے جنوب کی طرف آئے۔ اندر جانے کا راستہ ابھی بھی برف تلے ہی تھا۔ انہیں خاصی محنت کرنا پڑی، تب کہیں جا کر دروازہ سامنے آیا تھا۔ تب لیری نے پہلی بار دیکھا۔ اہرام کسی پیلے رنگ کے پتھر کے بڑے بلاکس سے بنا تھا۔ اور سامنے جو بلاکس نظر آ رہے تھے ان کا

"تب تم نے ایک سیارے کے بارے میں سنا ہو گا جو سورج کے گرد بہت غیر متوازن مدار میں گردش کرتا ہے۔ بالکل کسی دُم دار ستارے کی طرح جو ہزاروں سال بعد کبھی آتے ہیں اور سورج کے پاس سے ہو کر واپس چلے جاتے ہیں۔ اس کا ثبوت نیپچون اور پلوٹو کے غیر متوازن مدار ہیں۔ کیونکہ جب یہ سیارہ آتا ہے تو اس کا کشش ان دونوں سیاروں سے ہوتا ہے۔"

"میں نے سن رکھا ہے۔" لیری نے سر ہلایا۔

"گڈ... اس کا مطلب ہے تم میری بات سمجھ سکتے ہو..."

"لیکن اس معاملے سے اس سیارے کا کیا تعلق ہے؟"

"فرض کرو کہ وہ سیارہ ایک بہت طویل عرصے بعد نظام شمسی کا ایک چکر لگاتا ہے... اور یہ وقفہ اتنا طویل ہے کہ ہم انسان ایک بار بھی اس کی آمد نوٹ نہیں کر سکے۔"

لیری نے اس کی بات پر غور کیا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ یہ اہرام انہوں نے بنایا ہے... مگر کیوں؟"

"صبر کرو..." بریڈ نے اہرام کی دیوار سے ٹیک لگا کر کہا۔ "ابھی ہم مفروضوں پر بات کر رہے ہیں۔ سب سے پہلے ہمیں ایک ایسے سیارے کی موجودگی فرض کرنی ہے۔"

"چلو میں نے مان لیا کہ ایسا کوئی سیارہ ہے۔"

"اب ہم فرض کرتے ہیں کہ اس سیارے پر ایک ذہین مخلوق بھی ہے اور وہ آج سے ہزاروں سال پہلے بھی اتنی ترقی یافتہ تھی کہ خلائی سفر کر سکتی تھی۔ انہوں نے اپنے سیارے کے نظام شمسی میں داخل ہونے پر ایک ٹیم ہماری زمین پر بھیجی ہو گی کہ وہ یہاں ان کے لحاظ سے زندگی کے حالات کا جائزہ لے۔ جیسا کہ آج کل ہم انسان مریخ اور دوسرے سیاروں پر آباد ہونے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔"

لیری نے سر ہلایا۔ "بات سمجھ میں آتی ہے لیکن وہ ٹیم اس جگہ آئی تھی؟"

"میرا ابھی خیال ہے کہ وہ غلطی سے اس جگہ اتر گئے اور یہ جگہ بالکل بے آباد ہے۔" بریڈ نے کہا۔ "فرض کرو، ان کی جگہ انسان ہوتے تو کیا کرتے؟"

"واپس چلے جاتے اپنے سیارے پر۔" لیری نے جواب دیا۔

"لیکن ان کا سیارہ تو جا چکا تھا۔" بریڈ نے اسے یاد

www.pkdigest.com

سائز کم سے کم بھی چار بائی چھ تھا اور کسی پتھر کا وزن پندرہ ٹن سے کم نہیں تھا۔ اتنے وزنی پتھر آپس میں اتنی صفائی سے جڑے تھے کہ ان کو جوڑنے والا مسالا بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ لیری کے منہ سے بے اختیار تحسین نکل گئی۔ اس نے کہا۔

''کتنی صفائی سے بنایا ہے۔''

''یہ تو آغاز ہے، اندر سے دیکھو گے تو حیران رہ جاؤ گے۔'' بریڈ نے کہا اور سرنگ میں داخل ہو گیا۔ یہ خاصی کشادہ سرنگ تھی جس میں طویل قامت آدمی بھی بغیر جھکے چل سکتا تھا۔ سرنگ بھی انہی پتھروں کی بنی تھی اور اس میں کہیں کہیں سنگ مرمر جیسا کوئی پتھر بھی لگا تھا۔ ''یہ پورا اہرام اسی قسم کے بلاکس سے بنا ہے اور بلاکس یہیں سے حاصل کیے گئے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ اس مخلوق کے پاس تعمیرات کے لیے جدید ترین مشینری تھی اور اس نے بنا مزدوروں کے اتنا بڑا اہرام بنا لیا۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔ اگر آج کے دور میں ہم یہ اہرام بنانا چاہیں تو ہمیں تمام تر وسائل اور ہنرمند افرادی قوت کے باوجود بہت دشواری پیش آئے گی۔''

بریڈ نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ ''یہی میں تمہیں سمجھانا چاہ رہا ہوں کہ وہ مخلوق بہت ترقی یافتہ تھی۔''

''مجھے کیوں سمجھا رہے ہو؟'' لیری کو کسی قدر تعجب ہوا۔

''ابھی تم جان جاؤ گے۔'' بریڈ نے جواب دیا۔

وہ سرنگ کے راستے ایک بڑے سے ہال میں داخل ہوئے۔ لیری کے اندازے کے مطابق وہ اہرام کے وسط میں تھے اور ایسا ہی مصری اہراموں میں بھی ہوتا ہے کہ ان کے وسط میں ایک بڑا ہال ہوتا ہے اور اس سے چاروں طرف بلکہ چھ اطراف راستے نکلتے ہیں۔ ان میں سے بعض راستے ظاہر ہوتے ہیں اور بعض خفیہ۔ اس اہرام میں بھی ظاہری اور خفیہ راستوں کی موجودگی ممکن تھی۔ یہ ہال بالکل صاف اور خالی تھا۔ عجیب بات تھی کہ وہاں ایک انوکھی سی روشنی تھی جس کا مخرج سمجھ میں نہیں آرہا تھا لیکن وہ پورے ہال میں یکساں طور پر پھیلی تھی۔ لیری نے بریڈ سے روشنی کے بارے میں پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''مجھے خود نہیں معلوم۔ یہ روشنی اس اہرام کے اسراروں میں سے ایک ہے۔''

''لیکن یہاں تو کچھ نہیں ہے۔'' لیری نے چاروں طرف دیکھا۔

''نہیں، یہاں ہے۔'' بریڈ بولا اور ایک طرف کی دیوار ٹٹولنے لگا۔ پھر اس نے دیوار کا کوئی حصہ دبایا تو ایک ہلکی گڑگڑاہٹ کے ساتھ ہال کے وسط سے ایک پلیٹ فارم نمودار ہونے لگا۔ لیری نے دیکھا کہ اس پر پہلو بہ پہلو چھ لاشیں پڑی تھیں۔ اور وقت کے ہاتھوں بالکل خاک ہو چکی تھیں۔ سرد موسم نے ان کو سڑنے سے بچا لیا تھا مگر ان کے جسم سوکھ کر بالکل مسخ ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود یہ صاف لگ رہا تھا کہ وہ انسانی لاشیں ہیں۔ لیری نے حیرت سے بریڈ کی طرف دیکھا۔

''یہ تو انسان ہیں۔''

''ہاں، یہ انسان ہیں۔'' اس نے تسلیم کیا۔

''مگر تم تو مجھے کسی خلائی مخلوق کی کہانی سنا رہے تھے۔'' لیری نے اس کی طرف دیکھا۔

''وہ بھی ٹھیک ہے۔ یہ اہرام بنانے والے اور اس میں خود کو محفوظ کرنے والے کسی اور سیارے سے آئے ہیں۔''

''تب یہ کیا ہے۔'' لیری نے لاشوں کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ دھوکا ہے تاکہ باہر سے کوئی آئے اور اہرام کے اندر آنے کا راستہ تلاش کر بھی لے تو ان لاشوں کو دیکھ کر مطمئن ہو جائے اور اس کے اندرونی حصوں کی کھوج نہ کرے۔ اس لیے پہلے پہل جن انسانوں نے اس اہرام کو دیکھا اور اندر آئے تو وہ یہ لاشیں دیکھ کر واپس چلے گئے۔ انہوں نے اہرام کے اندرونی حصوں کی کھوج لگانے کی کوشش نہیں کی۔''

''یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے پھر مصر میں جا کر اہرام بنائے تھے؟''

بریڈ نے سر ہلایا۔ ''بالکل... وہ اتنے ہوشیار نہیں تھے۔ وہ آسانی سے دھوکا کھا گئے۔''

''اور تم نے دھوکا نہیں کھایا؟'' لیری نے طنز کیا۔ ''تم نے اہرام کے چھپے حصے دریافت کر لیے۔''

''ہاں، ایسا ہی ہوا تھا۔ میں نے جب اس معاملے پر غور کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ یہ دھوکا ہے۔ یہ اہرام کم سے کم بھی پندرہ ہزار سال پرانا ہے۔ اور اس وقت انسان نے اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ اس قسم کی تعمیرات کر سکتا۔ وہ تو آج سے پانچ ہزار سال پہلے بھی بہ مشکل ہی اہرام بنا سکا تھا۔ اس لیے میں نے محسوس کیا کہ اس اہرام میں کہیں کچھ خفیہ ہے۔ میں بہت عرصے تک اسی کھوج میں لگا رہا اور بالآخر میں نے جان لیا۔''

''تم نے ان لوگوں کو دریافت کر لیا؟'' لیری کے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ ''وہ کیسے لگتے ہیں؟''

[illegible] اور حیرت کے ساتھ۔

بریڈ اسے لے کر ایک دیوار کی طرف بڑھا۔ اس نے دیوار کا ایک حصہ دبایا اور پھر چند لمحے بعد اسے پھر دبایا۔ جب اس نے تیسری بار یہ عمل کیا تو دیوار بے آواز طریقے سے ایک طرف سرک گئی۔ اندر نیچے جانے کے لیے ایک ڈھلانی راستہ نمودار ہوا تھا اور اس سے عجیب سی نیلی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ لیری نے نیچے جھانکا۔ راستہ ایک ہال میں جا رہا تھا۔ بریڈ نے اس پر قدم رکھا تو لیری اس کے پیچھے جانے لگا۔ وہ ہال میں پہنچے تو یہاں چاروں طرف عجیب سی مشینیں لگی تھیں اور ان سے نیلی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ مگر اسے یہاں کوئی غیر ارضی مخلوق نظر نہیں آئی تھی۔ اس نے سوالیہ نظروں سے بریڈ کی طرف دیکھا تو اس نے سر ہلایا۔

''صبر کرو ابھی دکھاتا ہوں۔'' وہ ایک الماری نما مشین کی طرف بڑھا اور اس پر لگے بڑے سائز کے بٹن دبانے لگا۔ ایک خاص ترتیب سے بٹن دبانے سے الماری کسی ٹرے کی طرح باہر نکل آئی اور اس میں رکھے ہوئے شیشے کے تابوت ظاہر ہونے لگے۔ ان تابوتوں سے ہلکی سی نیلگوں روشنی پھوٹ رہی تھی۔ لیری بے تابی سے آگے جھک گیا۔ اس کے سامنے اپنی زندگی کا سب سے حیرت انگیز منظر تھا۔ تابوتوں میں چھ عدد ایسی مخلوق تھی جس کے جسم طویل قامت اور کسی قدر چوڑے تھے۔ ان کی موٹائی اسی مناسبت سے کم تھی۔ ان کے جسم زردی مائل، ہاتھ اور پیروں میں بھی چھ چھ انگلیاں تھیں۔ ان کے چہرے انسانوں جیسے تھے مگر ان میں بھی تبدیلی تھی۔ خاص طور سے ہونٹ غائب تھے اور ناک کسی قدر پھیلی سی تھی۔ وہ بلاشبہ غیر ارضی مخلوق تھی۔ ان کے جسموں کی بناوٹ بتاتی تھی کہ وہ طاقت ور تھے اور ان میں تین مرد اور تین عورتیں تھیں۔ وہ سب کسی زردی مائل شفاف محلول میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے گہری نیند میں ہوں۔ غور سے دیکھنے پر ان کا جسم کسی قدر حرکت کرتا دکھائی دیتا تھا۔

''یہ زندہ ہیں اور انہوں نے اپنے اوپر ایک ایسی نیند طاری کر لی ہے جس کی وجہ سے ان کا میٹابولزم سست ہو گیا ہے یا اس نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اس لیے ان پر وقت کا اثر نہیں ہو رہا اور یہ آج بھی ویسے ہی تر و تازہ ہیں جیسے آج سے پندرہ ہزار سال پہلے تھے۔''

لیری کے جسم میں سنسنی دوڑ رہی تھی۔ اس نے بریڈ کی طرف دیکھا۔ ''جس چیز کے بارے میں نہ جانے کتنا فکشن لکھا جا چکا ہے آج وہ ہمارے سامنے ہے۔ یہ تاریخ انسانی کی سب سے بڑی دریافت ہوگی۔''

ہر شمارہ خاص شمارہ
سچی کہانیوں آپ بیتیوں جگ بیتیوں کا بے مثال مجموعہ
ماہنامہ سرگزشت

فتح مبین
جنگ ستمبر کا وہ معرکہ جس نے تاریخ بدل دی
روشنک
دنیا کو فتح کرنے والے کو فتح کر لینے والی کا قصہ
چال
تاریخ مغل بادشاہان سے ایک انوکھا قصہ
باد سموم
وہ اپنے بچوں کے باپ سے نفرت کرتی ہے
حیرت کدہ
میاں صاحب کے تجربے سے ایک اور انوکھی داستان
اس کے علاوہ
ایک گمشدہ شہر کا قصہ، فلمی الف لیلہ، بھولی بسری فلمی یادیں، شکاریات، بھارت کے ایک بدقماش سر کی داستان، سراب، بیت بازی، علمی آزمائش اور انتہائی دلچسپ سچ بیانیاں
شمارہ ستمبر 2009ء کی ایک جھلک
نیا شمارہ ہر بک اسٹال پر موجود ہے
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 5895313 فیکس: 5802551

www.pkdigest.com

www.pkdigest.com

عالمی طاقتیں جب کسی پہ مہربان ہوتی ہیں تو دولتِ بے بہا اور نوازشات سے نوازتی چلی جاتی ہیں... اور یہ بڑی سرکار جب کسی سے ناراض ہوجائے تو بھی ان کی کرم نوازیاں انسان کو ابدی مقام تک پہنچا دیتی ہیں۔ عظیم الشان عالمی طاقتوں کی جھلک دکھاتی سفاک تحریر۔

متبادل

محمد عمر نعمان

ایک بڑے پیمانے پر کھیلی جانے والی بازی جس کے مہرے شکست کے قریب تھے

واحد سپر پاور کے صدر کے خصوصی ایلچی کا طیارہ ایک ترقی پذیر ملک کے دارالحکومت کے ائرپورٹ کے رن وے پر اترا تو شہر کے حالات اچھے نہیں لگ رہے تھے۔ جگہ جگہ سے دھواں اٹھ رہا تھا اور بعض جگہوں سے اٹھنے والے شعلے طیارے سے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ خصوصی ایلچی نے سر ہلایا اور اپنی سیکریٹری سے کہا۔ ''یہاں کے حالات ہمارے اندازے سے بھی زیادہ خراب ہیں۔''

''تب ہمیں کیا کرنا ہوگا سر؟'' سیکریٹری نے بہت احتیاط سے پوچھا۔ وہ پہلے بھی کئی خصوصی ایلچیوں کے ساتھ کام کرچکی تھی مگر اس شخص میں جس مزاج نام کو نہیں تھی اور اس کے چہرے پر ایک قسم کی کرختگی اور کھردرا پن تھا ایسا لگتا تھا جیسے وہ دل ہی دل میں دوسروں کے خلاف منصوبے بناتا رہتا تھا اور حقیقت میں بھی ایسا ہی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سیکریٹری بھی اس سے ڈرتی تھی اور اس سے بات کرتے ہوئے یا اس کے سامنے محتاط رہتی تھی۔ سیکریٹری خاصی خوب صورت اور نوعمر نظر آنے والی لڑکی تھی۔ حالاں کہ وہ تیس سال سے زیادہ کی تھی مگر چہرے مہرے سے وہ پچیس برس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ دلکش اور متناسب جسامت کی تھی۔ کام کرتے ہوئے وہ

''نہیں، یہ کبھی دریافت نہیں ہوں گے۔'' بریڈ نے نفی میں سر ہلایا۔

''تم ضرور اس معاملے میں بھٹکے ہوئے ہو مگر میں نہیں۔'' لیری نے بھڑک کر کہا۔ ''میں ضرور ان کو دنیا کے سامنے لاؤں گا اور پھر میں دنیا کا مشہور ترین انسان بن جاؤں گا۔''

بریڈ نے اس کی بات نظر انداز کی اور بولا۔ ''یہاں کچھ معلومات بھی ہیں جو انہوں نے اپنے سیارے کے بارے میں رکھی ہیں۔ ان کے مطابق ان کا سیارہ ہر سولہ یا سترہ ہزار سال بعد نظام شمسی کا چکر لگاتا ہے۔ اس اہرام کی تعمیر کو کم سے کم پندرہ ہزار سال گزر چکے ہیں اس لیے وہ سیارہ ایک بار پھر یہاں آنے والا ہے۔''

''اگر ایسا بھی ہے تو ہمیں کیا؟''

''اگر ہم نے ان لوگوں کو دنیا کے سامنے پیش کردیا تو ہمارے سائنس داں لازمی طور پر ان پر تحقیق کرنا چاہیں گے۔''

''ظاہری بات ہے، ورنہ اس دریافت کا فائدہ؟''

''اور اس میں امکان ہے کہ ان لوگوں کے جسم ضائع ہوجائیں گے کیونکہ ہمارے سائنس دانوں کے پاس وہ ٹیکنالوجی نہیں ہے جس کے تحت زندہ اجسام کو محفوظ کیا جاتا ہے۔''

''یہ بھی ہے۔ ممکن ہے یہ ضائع ہوجائیں مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟'' لیری نے سوال کیا۔

''فرق پڑتا ہے۔'' بریڈ نے بٹن دبا کر الماری کو واپس اپنی جگہ کردیا۔ ''میرے ساتھ آؤ، میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔''

وہ واپس مرکزی ہال میں آئے اور بریڈ نے خفیہ راستہ بند کردیا۔ پھر اس نے ہال کے وسط میں پڑی انسانی لاشوں کو بھی واپس زیرِ زمین کردیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے یہاں کے معاملات پر مکمل عبور ہو۔ پھر وہ واپس باہر آئے۔ اہرام کے اندر درجہ حرارت خوشگوار تھا جبکہ باہر آتے ہی انہیں شدید سردی کا احساس ہوا تھا۔

''لگتا ہے اہرام میں کوئی سینٹرل ہیٹنگ سسٹم ہے۔'' لیری نے کانپ کر کہا۔

''ممکن ہے... وہاں پر سردی نہیں ہوتی ہے۔'' بریڈ نے سر ہلایا۔

''ہاں، تم مجھے کچھ بتانا چاہ رہے تھے۔''

بریڈ بہت سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ ''تمہارے خیال میں جو لوگ آج سے پندرہ ہزار پہلے اتنے ترقی یافتہ تھے تو کیا ہم انسان ان کا مقابلہ کرسکتے ہیں؟''

لیری نے اس سوال پر غور کیا اور نفی میں سر ہلایا۔ ''میرا خیال ہے کہ نہیں کرسکتے۔ اب تک وہ ترقی کے نہ جانے کتنے مدارج تک پہنچ چکے ہوں گے۔''

''شکر ہے تم میری بات سمجھ رہے ہو۔'' بریڈ نے گہری سانس لی۔ ''اب ذرا غور کرو اگر ہم ان کو اپنے تجربات کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں اور جب وہ دوبارہ آتے ہیں اور اپنے لوگوں کو یہاں نہیں پاتے تو تم سوچ سکتے ہو کہ ان کا جذبہ انتقام کیا کرسکتا ہے۔ کیا وہ ہماری زمین کو تباہ نہیں کردیں گے؟''

لیری نے اس کی بات پر پھر غور کیا اور فوراً اس سے متفق ہوگیا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ وہ ہماری زمین کو تباہ کردیں گے۔''

''بس اسی وجہ سے میں نے اور ایچی نے اس اہرام کو چھپانے کی کوشش کی ہے۔ ورنہ اس معاملے میں ہمارا اور کوئی مقصد نہیں ہے۔ ہم صرف بنی نوع انسان کو بچانا چاہتے ہیں۔''

''تم نے بالکل ٹھیک فیصلہ کیا ہے۔'' لیری نے اس سے اتفاق کیا۔ ''اب میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔''

''شکریہ!'' بریڈ خوش ہوکر بولا۔

''ہمیں جانے سے پہلے اس اہرام کے دروازے کو چھپا دینا چاہیے۔'' لیری نے تجویز پیش کی اور انہوں نے برف ڈال کر دروازہ بند کردیا۔ جب وہ جانے لگے تو لیری کو ایک خیال آیا۔ ''اگر انہوں نے خود کو انسانوں سے چھپانا تھا تو اتنا بڑا اہرام بنانے کی کیا ضرورت تھی؟''

''میرا خیال ہے کہ یہ اہرام انہوں نے اپنے لوگوں کی رہنمائی کے لیے بنایا ہے تاکہ وہ جب آئیں تو انہیں تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔''

''تم نے ٹھیک کہا۔'' لیری مطمئن ہوگیا مگر جب وہ واپس اپنے کیمپ پہنچے تو اسے ایک خیال اور آیا۔ اس نے بریڈ سے پوچھا۔

''مجھ سے پہلے جو دو لوگ آئے تھے، وہ کہاں گئے؟''

''انہوں نے بھی اہرام دیکھ لیا تھا۔'' بریڈ نے واضح جواب دینے سے گریز کیا۔ ''جب ایچی نے مجھے اس کام کے لیے چنا تو اس سے پہلے وہ بھی تین افراد کو آزما چکا تھا۔''

لیری سمجھ گیا۔ اس لیے اس نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ جان گیا تھا کہ ایک طویل عرصے بعد اسے بھی اسی طرح اپنا نائب مقرر کرنا پڑے گا۔

ایک نازک سی عینک لگا لیتی تھی جو اس کی دل کشی میں اور بھی اضافہ کر دیتی تھی۔ وہ اب تک جتنے لوگوں کے ساتھ کام کر چکی تھی، ان میں یہ واحد شخص تھا جس نے کبھی اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ ورنہ اکثر اس سے ہنسی مذاق کر لیتے تھے اور بعض تو ہلکا پھلکا رومانس بھی کر چکے تھے مگر ایک حد میں رہ کر کیونکہ سیکریٹری شادی شدہ تھی اور اپنے شوہر کی وفادار تھی۔

''میرے پاس متبادل آپشن ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔'' اینچی نے کافی کا گھونٹ لیا اور اپنا لیپ ٹاپ بند کر دیا۔ اس نے سیکریٹری سے کہا۔ ''سینٹرل کمانڈ سے کال ملاؤ۔''

سیکریٹری نے کال ملا کر فون اسے پکڑا دیا۔ اینچی نے کمانڈر سے کہا۔ ''یہاں حالات خراب نظر آ رہے ہیں۔ تم لوگوں نے ہماری حفاظت کے لیے کیا کیا ہے... کیا صرف دو بکتر بند گاڑیاں... تمہارا دماغ خراب ہے۔ کرنل کیا تم ہمیں مروانا چاہتے ہو... مجھے فول پروف سیکیورٹی درکار ہے... جب تک میں طیارے میں ہوں تم یہ کام کر لو۔''

ائرپورٹ کو ملک کی فوج نے گھیر رکھا تھا اور فی الحال وہاں کسی کو پر مارنے کی اجازت نہیں تھی، عام پروازیں ویسے ہی معطل تھیں یا اینچی کے طیارے کی آمد پر روک دی گئی تھیں۔ طیارہ اترا اور سید حادی وی آئی پی ٹرمینل کے لاؤنج کے سامنے جا رکا۔ فوراً ہی اسے سپر پاور کے خصوصی حفاظتی دستے نے گھیر لیا۔ مقامی سیکیورٹی والے دور سے طیارے کی حفاظت کر رہے تھے مگر ان کو پاس آنے کی اجازت نہیں تھی۔ اینچی نے اترنے کی کوشش نہیں کی تھی جب تک اسے سینٹرل کمانڈ کی جانب سے پوری حفاظت فراہم نہ کی جاتی۔ اس کا اترنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ کوئی پندرہ منٹ بعد فون کا بزر بجا اور سیکریٹری نے اس کی طرف فون بڑھا دیا۔

''کرنل کی کال ہے سر۔''

اینچی نے فون لیا اور دوسری طرف سے کی جانے والی بات سننے لگا۔ پھر اس نے مطمئن ہو کر سر ہلایا اور فون رکھ کر بولا۔ ''چلو نیچے اترنا ہے۔''

طیارے کے عملے نے سیڑھیاں لگائیں اور اینچی سیکریٹری کے ہمراہ نیچے اتر گیا۔ زمین پر قدم رکھتے ہی ایک میرین کیپٹن نے اسے سیلیوٹ کیا۔

''سر! میں کیپٹن ایگرڈ آپ کے حفاظتی دستے کا سربراہ ہوں، میرے ذمے آپ کو ایوانِ صدر تک لے جانا اور پھر وہاں سے واپس طیارے تک لانا ہے۔ میں نے درست کہا سر؟''

اینچی نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے۔ اب چلنا چاہیے۔''

کیپٹن نے مڑ کر اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا اور فوراً نصف درجن بکتر بند گاڑیاں ائرپورٹ کی حدود میں داخل ہوئیں اور آ کر طیارے کے چاروں طرف پھیل گئیں۔ ان میں سے ایک خاص بکتر بند تھی جس میں وی آئی پی حضرات سفر کرتے تھے اور اس میں حفاظت کا خاص بندوبست تھا۔ اینچی اور اس کی سیکریٹری اس بکتر بند میں سوار ہو گئے اور یہ بکتر بند درمیان میں رہ کر آگے روانہ ہو گئی۔ اس کے آگے ایک بکتر بند تھی، دو دائیں بائیں تھیں اور دو عقب میں تھیں۔ اب یہ کسی بھی طرف سے کیے جانے والے حملے سے محفوظ تھی۔ اس کی فولادی چادر اتنی مضبوط تھی کہ اس پر عام بم یا راکٹ کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور جب تک کوئی بہت بڑا بم نہ استعمال کیا جائے اس کے اندر موجود افراد کا کچھ نہیں بگاڑا جا سکتا تھا۔

ائرپورٹ سے باہر آتے ہی وہ سب چوکنا ہو گئے تھے۔ جا بہ جا جلی ہوئی گاڑیاں اور عمارتیں نظر آ رہی تھیں۔ کئی جگہ ان کو سڑکوں پر لاشیں بھی دکھائی دیں جن کو اٹھانے والا کوئی نہیں تھا۔ سیکریٹری کی صورت سے لگ رہا تھا کہ یہ مناظر اس کی طبیعت پر گراں گزر رہے تھے۔ اینچی نے ایک نظر اسے دیکھا اور بولا۔ ''ہم نے اس ملک میں استحکام کے لیے ہر ممکن کوشش کی مگر یہاں موجود سیاسی پارٹیوں کو ہم سے نفرت ہے۔''

''یس سر۔'' سیکریٹری نے کہا۔

''موجودہ صدر دو برس سے اقتدار میں ہے۔ ہم نے اسے دل کھول کر امداد دی تاکہ وہ اپنے لوگوں کی حالت بدل سکے۔''

''لیکن سر! سننے میں یہ آیا ہے کہ اس امداد کا بیشتر حصہ خورد برد کر دیا گیا تھا اور عوام تک بہت کم پہنچا۔'' سیکریٹری نے دبے الفاظ میں کہا۔

''ممکن ہے ایسا ہی ہوا ہو۔'' اینچی نے بے نیازی سے کہا۔ ''اب اس میں ہمارا قصور تو نہیں ہے۔ ہم نے اپنا فرض پورا کر دیا۔''

ایک جگہ کچھ لوگ لوٹ مار کر رہے تھے۔ انہوں نے جیسے بکتر بند گاڑیوں کو دیکھا تو بھاگ نکلے۔ وہیں سڑک پر ایک شخص پڑا تھا جسے چند اور لوگ بے دردی سے مار رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ڈنڈے تھے اور ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اسے ختم کر کے دم لیں گے۔ سیکریٹری نے منہ پھیر لیا۔

''ایسا لگتا ہے اس ملک میں قانون نام کی کوئی چیز نہیں رہی ہے۔'' اینچی نے عام سے انداز میں کہا جیسے اس ساری صورتِ حال سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔

''سر! کیا ہم جنابِ صدر سے پوچھنے کے مجاز نہیں ہیں کہ وہ ذاتی اقتدار کے لیے پورے ملک کو کیوں داؤ پر لگا رہے ہیں؟''

اینچی نے فوراً انکار کر دیا۔ ''یہ ان کے ملک کا اندرونی معاملہ ہے جس میں مداخلت کے ہم مجاز نہیں ہیں۔ ہم اس سے صرف اپنے معاملات پر بات کر سکتے ہیں۔''

''مگر سر! ہم اس ملک سے دوستی کا دعویٰ کرتے ہیں۔'' سیکریٹری نے اسے یاد دلایا۔

''ہم نے کبھی اس ملک سے دوستی کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ ہماری دوستی تو صدر سے تھی۔'' اینچی نے سرد لہجے میں کہا۔

سیکریٹری چپ ہو گئی، وہ جتنا بول گئی تھی اتنا بھی کافی تھا۔ اس کا بس زیادہ بات کرنا پسند نہیں کرتا تھا اس لیے وہ کام کی بات کی طرف آئی۔

''سر! آج کی ملاقات کا کیا ایجنڈا ہے اور مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''آج کی ملاقات کا کوئی ایجنڈا نہیں ہے ہم صرف خیر سگالی کے جذبات صدر تک پہنچانے آئے ہیں۔'' اینچی نے بکتر بند سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اس وقت ایک پوش علاقے سے گزر رہے تھے مگر یہاں بھی ویرانی اور لوٹ مار کے آثار نمایاں تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے سیکریٹری نے ائرپورٹ پر بے شمار افراد کو دیکھا تھا جو اس ملک سے نکلنے کے لیے نہ جانے کب سے ائرپورٹ پر بیٹھے تھے۔ ان میں بیشتر افراد ایسے ہی پوش علاقوں کے رہنے والے تھے۔ مگر وہ اپنی ساری دولت اور اثر رسوخ کے باوجود اپنے لیے ایک ٹکٹ نہیں لے پا رہے تھے کیونکہ کوئی پرواز نہیں جا رہی تھی۔

کچھ دیر بعد سرکاری علاقہ شروع ہو گیا جس میں جا بہ جا فوج نے اپنی چیک پوسٹس قائم کر رکھی تھیں۔ وہ آنے جانے والی ہر گاڑی کو چیک کر رہے تھے کیونکہ باران کو بھی روکا لیکن جیسے ہی فوجیوں کو پتا چلتا تھا کہ گاڑی میں سپر پاور کا اینچی ہے وہ انہیں جانے دیتے تھے۔ چند منٹ بعد وہ صدارتی علاقے میں تھے جہاں زندگی اتنی پُرسکون تھی کہ باہر ہونے والے ہنگاموں کا اندازہ کرنا بھی دشوار تھا۔ وہ جب ایوانِ صدر کے سامنے پہنچے تو ان کی آمد کی اطلاع پر مین گیٹ پہلے ہی کھول دیا گیا تھا۔ اینچی کی بکتر بند جب پورچ میں پہنچی تو اس نے جنابِ صدر کو خود وہاں اپنے استقبال کے لیے موجود پایا۔ اینچی کی گردن غرور سے تن گئی تھی۔

''مجھے اسی کی توقع تھی۔'' اس نے سیکریٹری سے کہا اور بکتر بند رکنے کے بعد بھی بیٹھا رہا۔ وہ منتظر تھا کہ کوئی دروازہ کھولے تو وہ اترے۔ آخر ایوانِ صدر کے پروٹوکول افسر نے دروازہ کھولا تو وہ نیچے اترا۔ صدر چہرے پر ایک خوشامدانہ سی مسکراہٹ سجائے اس کے استقبال کے لیے آگے بڑھا..... ان دنوں اسے سپر پاور کی حمایت کی اشد ضرورت تھی۔ ویسے تو وہ اقتدار میں آیا ہی سپر پاور کی مدد اور حمایت سے تھا۔ مگر شروع کے دنوں میں دنیا دکھاوے کے لیے سپر پاور نے اس کے اقتدار پر قبضے کی مذمت کی تھی۔ مگر جیسے ہی اس نے ان کی حمایت کی سپر پاور نے بھی چولا بدلا اور اس کی مدد کرنے لگی۔

''خوش آمدید معزز اینچی۔'' صدر نے اس سے ہاتھ ملایا۔

پہلے انہوں نے لان میں سلامی لی اور دونوں ملکوں کا قومی ترانہ بجایا گیا۔ اس کے بعد ایک مختصر سی تقریر میں صدر نے سپر پاور کی حمایت اور مدد کا شکریہ ادا کیا..... اس کا کہنا تھا کہ وہ بہت جلد اس بحران پر قابو پا لے گا اور سب پہلے کی طرح ٹھیک ہو جائے گا کیونکہ ملک کے عوام اس کے ساتھ تھے۔ اس کے اینچی نے بھی اس ملک کی ترقی اور استحکام کے لیے اپنے ملک کی نیک تمناؤں کا اظہار کیا اور دونوں ٹی وی کیمرے کے سامنے کچھ دیر مسکرانے کے بعد اندر چلے گئے۔

جیسے ہی وہ دونوں ایوانِ صدر کے وسیع و عریض ہال میں داخل ہوئے، ان کے چہرے سنجیدہ ہو گئے۔ اینچی نے نظریں جما کر جنابِ صدر سے پوچھا۔ ''میں بہت تھوڑے وقت کے لیے آیا ہوں۔ اس لیے اگر کام کی بات کر لی جائے تو بہتر ہوگا۔''

صدر نے سر ہلایا۔ ''میرا خیال ہے میرا ذاتی سوئٹ بہتر رہے گا۔''

''جیسے جنابِ صدر کی مرضی۔'' اینچی نے کہا اور اپنی سیکریٹری کے ساتھ آگے بڑھا مگر صدر نے سیکریٹری کو روک دیا۔

''میرا خیال ہے ون ٹو ون ملاقات بہتر رہے گی۔''

''جنابِ صدر اسے ون ٹو ون ملاقات ہی سمجھیں۔ اس سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے۔ ہمارے درمیان ہونے والی ساری گفتگو آگے یہی پہنچائے گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' صدر نے بادلِ ناخواستہ کہا۔

یہ ایوانِ صدر اپنی شان و شوکت کے لحاظ سے سپر پاور کے ایوانِ صدر سے کسی طرح کم نہیں تھا بلکہ کچھ بڑھ کر ہی تھا۔ یہاں صرف صدر کا ذاتی عملہ کوئی ایک ہزار افراد پر مشتمل تھا جب کہ سپر پاور کے صدر کو ایوانِ صدر میں کوئی ذاتی ملازم نہیں ملا تھا۔ اندر بے شمار کمروں پر مشتمل ایوانِ صدر مکمل طور پر صدر کے استعمال میں تھا اور یہاں اس کی مرضی چلتی تھی۔

www.pkdigest.com

اس کا ذاتی سوئٹ جس میں اس کے چار بیڈ روم، ایک لاؤنج اور ایک ذاتی میٹنگ روم بھی تھا۔ دنیا جہاں کی آسائشوں سے سجا ہوا تھا۔ وہ ایلچی کو لے کر میٹنگ روم میں آیا جہاں دونوں ایک میز پر آمنے سامنے آ گئے تھے، پہل ایلچی نے کی۔

''جناب صدر! حالات بہت خراب جا رہے ہیں اور ہمارے لیے آپ کی حمایت جاری رکھنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔''

''حالات خراب نہیں ہیں بلکہ خراب کیے جا رہے ہیں اور میں بہت جلد حالات پر قابو پا لوں گا۔''

''ہماری رپورٹس اس کے برعکس ہیں۔ ملک میں آپ کی مقبولیت کا گراف نہایت گر چکا ہے اور دس فی صد لوگ بھی آپ کے حامی نہیں رہے ہیں۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ طاقت میرے پاس ہے۔ فوج میرے ساتھ ہے۔ میں جلد سب ٹھیک کر دوں گا۔''

''سب ٹھیک کرنے کے لیے آپ نے جو پلان تشکیل دیا ہے فوج بھی اس کی مخالفت کر رہی ہے۔''

''اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ میں سپریم کمانڈر ہوں اور فوج وہی کرے گی جو میں اسے کہوں گا۔'' صدر کے لہجے میں برہمی آ گئی تھی۔

''اس کے باوجود یہ شک برقرار ہے کہ فوج آپ کے احکامات ماننے سے انکار کر دے۔''

''ایسا نہیں ہو سکتا۔'' صدر کے انداز میں اعتماد تھا۔

''فرض کریں ایسا نہیں ہوا اور فوج نے آپ کا حکم ماننے سے انکار کر دیا تو آپ کے پاس کیا آپشن رہ جائے گا؟''

''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟'' صدر کے لہجے میں جھنجلاہٹ آ گئی۔

''ہم چاہتے ہیں کہ آپ جو کرنے جا رہے ہیں اس سے باز رہیں اور معاملات کو افہام و تفہیم سے سلجھانے کی کوشش کریں۔''

''افہام و تفہیم کا وقت گزر چکا ہے۔'' صدر نے نفی میں سر ہلایا۔

''بے شک حالات بہت خراب ہیں لیکن طاقت کا استعمال ان کو مزید خرابی کی طرف لے جائے گا۔''

''ایک زمانے میں آپ لوگ ہی آ کر مجھے طاقت کے استعمال کا مشورہ دیتے تھے۔'' صدر نے یاد دلایا۔

''بے شک، لیکن ہمارے ان مشوروں سے آپ کو فائدہ ہوا تھا اب ہم اس کے برخلاف مشورہ دے رہے ہیں تو اس میں بھی آپ کا فائدہ ہے۔'' ایلچی نے سنجیدگی سے کہا۔

''نہیں، اب میرے پاس سوائے طاقت کے استعمال کے اور کوئی چارہ نہیں رہا ہے۔''

''اس سے بہت خون خرابا ہوگا۔ ہزاروں لوگ مارے جائیں گے اور آپ کا مزید نقصان... ہو جائے گا۔''

''اس ملک میں ہزاروں لوگ پہلے بھی مارے جا چکے ہیں۔ اس سے کوئی حالات خراب نہیں ہوئے تھے۔''

''وہ وقت اور تھا۔ اب لوگ مارے گئے تو اس خطے میں ہمارے مفادات خطرے میں پڑ جائیں گے۔''

''آپ کے مفادات کا مجھ سے بہتر تحفظ کون کر سکتا ہے۔'' صدر نے خم ٹھونک کر کہا۔ ''اب بھی میں آپ کے مفادات کے لیے سب کر رہا ہوں۔''

''آپ جو کرنے جا رہے ہیں، اس میں ہمارا مفاد نہیں ہے۔'' ایلچی کا لہجہ سپاٹ ہو گیا تھا۔ ''ہم اپنا مفاد سب سے بہتر سمجھتے ہیں اور اس کے مطابق دوسروں کو گائیڈ لائن دیتے ہیں۔ اس لیے یہ دعویٰ مت کریں کہ آپ ہمارا مفاد ہم سے بہتر سمجھتے ہیں۔''

''میں نے برسوں آپ کی خدمت کی ہے۔'' صدر کا حوصلہ آہستہ آہستہ جواب دیتا جا رہا تھا۔

''آپ کو اس کا صلہ بھی خوب ملا ہے۔''

''میں نے دو پڑوسی ملکوں میں آپ کی ناپسندیدہ حکومتوں کا تختہ الٹنے میں براہ راست کردار ادا کیا۔''

''بیرون ملک آپ کے دو بینک اکاؤنٹس میں اس کا معاوضہ جمع کرا دیا گیا تھا۔'' ایلچی نے کہا۔

''میں نے ہر اس ملک میں اپنی فوج بھیجی جہاں آپ لوگوں نے فوج بھیجنے کو کہا۔''

''اس کے صلے میں آج آپ کے ملک کی فوج سب سے اچھی ہے۔ اس خطے میں کسی ملک کی فوج آپ کی فوج کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہے۔ اس کے پاس دنیا کا جدید ترین اسلحہ اور تربیت ہے۔ یہ سب ہم نے اسے مہیا کیا ہے۔''

''وہ فوج آج میرے کام نہیں آ رہی ہے۔'' صدر نے مایوسی کے عالم میں اعتراف کر لیا۔

''اپنے ملک کے خلاف کوئی بھی فوج ہمیشہ کے لیے نہیں لڑ سکتی ہے۔'' ایلچی نے کہا۔ ''آپ کے لیے یہی بہتر ہے کہ اس معاملے میں فوج کو ملوث کرنے کی کوشش نہ کریں۔''

''تو کیا ان لوگوں کے سامنے ہتھیار ڈال دوں جو میرے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں؟'' صدر کے لہجے میں تلخی آ گئی۔

''نہیں، مذاکرات کریں اور کوشش کریں کہ کوئی ایسا حل نکل آئے جس میں آپ بھی باعزت طریقے سے رہ سکیں۔''

صدر ایک لمحے کے لیے گنگ ہو گیا۔ اس نے بہ مشکل کہا۔ ''کیا آپ مجھے اقتدار سے الگ ہونے کا کہہ رہے ہیں؟''

''ہاں ایسا ہی سمجھ لیں کیونکہ آپ جتنی دیر سے یہ بات سمجھیں گے آپ کے لیے آنے والے حالات اتنے ہی سخت ہوتے جائیں گے۔''

''میں اقتدار سے الگ نہیں ہو سکتا۔ وہ لوگ مجھے جان سے مارنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کریں گے... جن سے میں نے اقتدار چھینا تھا۔''

''ہر کام ہو سکتا ہے اگر آدمی کرنے کا تہیہ کر لے تو۔''

''آپ میری حمایت کرنے آئے ہیں یا ان لوگوں کا ساتھ دینے جو عوام کو فساد پر اکسا رہے ہیں۔''

''ہم اب بھی آپ کے لیے نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ مگر سیاست کی اپنی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں۔''

''آپ کے خیال میں اب میں پہلے کی طرح آپ کے لیے کارآمد نہیں رہا ہوں۔'' صدر کے لہجے میں تلخی آ گئی۔ ''ایک زمانہ تھا آپ میرے ہر صحیح غلط اقدام کی حمایت کرتے تھے۔''

''یہ درست ہے مگر اس وقت ہم اکیلے نہیں تھے بلکہ اس ملک کے لوگ اور سیاست دان بھی آپ کے ساتھ تھے۔ اب یہ آپ کا ساتھ چھوڑ چکے ہیں جناب صدر۔ اس بات کو جتنی جلدی تسلیم کر لیں آپ کے لیے بہتر ہوگا۔''

صدر کا چہرہ رفتہ رفتہ سخت ہوتا جا رہا تھا۔ ''تو آپ لوگوں نے میری حمایت واپس لینے کا فیصلہ کر لیا ہے؟''

''اسے یوں سمجھ لیں کہ ہم آپ کو ایک مناسب راستہ دکھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ خاص طور سے اس صورت میں جب کہ آپ زیادہ عرصے اقتدار پر قابض نہیں رہ سکتے ہیں۔''

''میرے اقتدار کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔'' صدر نے غرور سے کہا۔

ایلچی پہلی بار مسکرایا۔ ''یہاں سے دو کلومیٹرز تک واقعی کوئی خطرہ نہیں ہے مگر اس کے بعد شہر اور پورا ملک جل رہا ہے۔''

''بھاڑ میں جائے یہ ملک اور اس کے لوگ۔ اگر میرا اقتدار نہیں رہتا تو مجھے بھی کسی کی پروا نہیں ہے۔''

ایلچی نے افسوس سے سر ہلایا۔ ''لگتا ہے آپ بھی اسی انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں جس کا شکار آپ سے پہلے بہت سارے حکمران ہو چکے ہیں۔''

''ان کو اس انجام تک پہنچانے میں تم لوگوں کا اصل کردار رہا ہے۔'' صدر نے بھی خوشامد کا چولا اتار پھینکا تھا۔ ''جب تک تم لوگوں کا مفاد ہوتا ہے ہمارا ساتھ دیتے ہو اور جب کام نکل جاتا ہے تو آنکھیں پھیرنے میں ایک لمحے کی دیر نہیں کرتے۔''

''اسے سیاست کہتے ہیں اور جہاں تک آپ کا ساتھ دینے کی بات ہے تو ہم نے ہمیشہ کا معاہدہ نہیں کیا تھا۔ اس قسم کے تعلقات کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ آپ نے ہمارا ساتھ دیا اور ہم نے بھی آپ کے نوازنے میں کوئی کمی نہیں کی۔ مگر اب آپ ہمیں کچھ نہیں دے سکتے اس لیے آپ کا ساتھ دینا ہماری مجبوری نہیں ہے۔''

''یعنی اب میں ایک ٹشو پیپر ہوں۔'' صدر برافروختہ ہو کر بولا۔

''پھر بھی آپ کی پرانی خدمات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے آپ کو محفوظ راستہ دینے کی کوشش کی ہے۔''

''مجھے محفوظ راستہ نہیں چاہیے۔ میں اپنے حالات سے نمٹنا جانتا ہوں۔'' صدر کا لہجہ سخت ہو گیا۔

گزشتہ دس برس سے عوام کے سر پر مسلط صدر کے معاملے میں اب لوگوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ وہ احتجاج پر اتر آئے تھے۔ پورے ملک میں ہڑتالوں اور ہنگاموں کا سلسلہ جاری تھا اور صدر نے اپنے حامیوں کے ساتھ مل کر اس احتجاج کو کچلنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس منصوبے کے مطابق پورے ملک میں ایمرجنسی لگا کر ہر قسم کے مظاہروں پر پابندی لگا دی جاتی اور احتجاج کرنے والوں کو موقعے پر گولی مار دی جاتی۔ تمام سیاسی رہنماؤں کو گرفتار کر لیا جاتا اور ان کے کارکنوں کو بھی جیل میں ڈال دیا جاتا، عدالتیں معطل کر دی جاتیں اور سزائیں سنانے کے لیے ایک خاص ٹریبونل تشکیل دیا جاتا۔ صدر کا خیال تھا کہ اس طرح وہ دو سے تین مہینے میں حالات پر قابو پا لے گا مگر ایلچی کا خیال اس سے مختلف تھا۔

''یہ ہنگامے صرف ایک صورت میں رک سکتے ہیں کہ آپ اقتدار سے الگ ہو جائیں۔''

''میں اقتدار سے الگ نہیں ہوں گا۔'' صدر نے صاف انکار کر دیا۔

''اس صورت میں آپ جو کریں گے، ہماری حکومت اس کی حمایت نہیں کرے گی۔''

''کیا آپ کا ملک میری مخالفت کرے گا؟''

''نہیں مگر ہم کسی بھی قسم کے تشدد اور ہنگامے کی مذمت کریں گے۔''

صدر کا منہ بن گیا پھر اس نے تجویز دی۔ ''کیا ایسا نہیں ہوسکتا ہے کہ آپ کا ملک اس معاملے میں غیر جانبدار رہے؟''

''یہ ممکن نہیں ہے۔ گزشتہ سالوں میں ہمارے بہت سارے مفادات اس ملک سے وابستہ ہو چکے ہیں اور ہم ان کو تباہ نہیں کرسکتے۔''

''یہ مفادات میری وجہ سے ہیں۔''

ایلچی ایک بار پھر مسکرایا۔ ''جناب صدر! یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ اب یہاں ہمارے اور بھی اتحادی ہیں۔''

''یعنی آپ کو میری ضرورت نہیں ہے؟''

''ایسا بھی نہیں ہے، ہمارے لیے اب بھی سب سے بہتر آدمی آپ ہی ہیں لیکن اب آپ کا اقتدار میں رہنا ممکن نہیں ہے۔''

''کیوں ممکن نہیں ہے؟ اس ملک میں سب ممکن ہے۔''

''حالات بدل چکے ہیں۔ بدقسمتی سے آپ کی ساری پالیسیاں ناکام ہو چکی ہیں اور اصل میں ملک کی اقتصادی حالت بہت خراب ہے۔ آپ کے اکنامک منیجر بدعنوان ہیں اور اگر ہم نے آپ کے ساتھ کام کیا تو ساری امداد کا وہی حشر ہوگا جو پچھلی امداد کا ہوا تھا۔''

''واقعی۔'' صدر کے لہجے میں طنز آگیا۔ ''کیا پچھلی امداد آپ نے اسی مقصد کے لیے دی تھی؟''

''ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ اس معاملے میں اتنی زیادہ بدعنوانی ہوگی۔''

''واقعی آپ کو اندازہ نہیں تھا؟'' صدر کا لہجہ اور بھی طنزیہ ہوگیا۔

''جناب صدر۔'' ایلچی کے لہجے میں بھی جھنجلاہٹ آگئی۔ ''میں آپ سے بحث کرنے نہیں آیا ہوں۔''

''میں جانتا ہوں آپ مجھے ایک طے شدہ فیصلہ سنانے آئے ہیں کہ آپ کا ملک میرا مزید ساتھ نہیں دے سکتا۔''

''مجھے افسوس ہے لیکن حقیقت یہی ہے۔''

''کیونکہ آپ کے خیال میں، میں زوال پذیر ہو رہا ہوں۔''

''آپ زوال پذیر ہو نہیں رہے ہیں۔ آپ زوال پذیر ہو چکے ہیں۔ اس بات کو آپ جتنا جلدی سمجھ جائیں آپ کے اور ہمارے لیے اتنا ہی بہتر ہوگا۔''

''اور اگر میں نہ سمجھوں تو؟''

''اس صورت میں سب سے پہلے آپ کے ملک کی امداد مکمل طور پر بند کردی جائے گی۔ پہلے معاشی امداد اور اس کے بعد فوجی امداد بھی بند کردی جائے گی۔''

''اس صورت میں مجھے پڑوسی ملکوں کی سرحدوں سے فوج واپس بلوانی پڑے گی۔''

''اب ہمیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے کیونکہ ان ملکوں سے ہمارے تعلقات بہتر ہو رہے ہیں۔''

''یہ تعلقات خراب بھی ہوسکتے ہیں۔'' صدر کا لہجہ دھمکی آمیز ہوگیا۔

''جناب صدر! آپ اپنی حیثیت کے مطابق بات کریں۔'' ایلچی نے اسے مشورہ دیا۔ ''آپ سے اپنا ملک ہی نہیں سنبھالا جا رہا اور آپ بین الاقوامی معاملات میں مداخلت کی بات کر رہے ہیں۔''

''یہ بھی ممکن ہے مجھے اس ملک میں ہونے والی ساری سرمایہ کاری کو قومی تحویل میں لینا پڑے۔'' صدر نے پہلی دھمکی رائگاں جانے کے بعد دوسری دھمکی دی۔

''اس صورت میں آپ پر پابندیاں لگ جائیں گی اور آپ کے بیرون ملک تمام اکاؤنٹس بند کردیے جائیں گے۔''

ایلچی نے اس کے نہلے پہ دہلا مارا تو اس کے ہوش اڑ گئے۔

''میں تو صرف ایک خیال ظاہر کر رہا تھا۔'' اس نے جلدی سے کہا۔

''میں بھی ایک خیال ہی پیش کر رہا تھا کہ آپ کے کس اقدام کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔''

''اگر آپ کی حکومت میری حمایت کرے اور مجھے اس بحران پر قابو پانے میں مدد دے تو میں اب بھی آپ کے کام آسکتا ہوں۔''

''وہ کیسے جناب صدر؟'' ایلچی کا لہجہ کسی قدر استہزائیہ ہوگیا۔

''آپ جانتے ہیں ہم ہمسائے ملک سے ایک بندرگاہ بنانے کا معاہدہ کر رہے ہیں۔ آپ اس معاہدے کے مخالف ہیں۔ میں یہ معاہدہ منسوخ کرسکتا ہوں۔''

''اب ہمیں اس معاہدے سے بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

صدر نے اپنی مایوسی چھپانے کی کوشش کی۔ ''تب آپ کیوں آئے ہیں؟''

ایلچی اپنی نشست سے کھڑا ہوگیا۔ ''میں دو مقاصد کے لیے آیا تھا ایک تو آپ کو الوداع کہنے کیونکہ اب آپ ہمارے لیے بے مقصد ہو چکے ہیں۔ دوسرے آپ کو یہ مخلصانہ مشورہ دینے کہ جتنی جلدی اس ملک کے اقتدار سے الگ ہو جائیں آپ کے لیے اتنا ہی بہتر ہوگا۔''

''میں آپ کے لیے ضرور بے کار ہو چکا ہوں لیکن میں اب بھی اپنے ملک کا صدر ہوں۔ دوسرے اگر آپ کے پاس میرے لیے یہی مشورہ رہ گیا ہے تو مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

''میرا بھی یہی اندازہ تھا۔'' اس نے مصافحے کے لیے صدر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ''مگر مجھے تو اپنا فرض ادا کرنا ہے۔''

صدر نے بادل ناخواستہ اس سے ہاتھ ملایا اور ایک لمحے کو چونکا۔ جیسے اس کے ہاتھ میں کوئی چیز چبھی ہو۔ اس نے ہاتھ کسی قدر تیزی سے پیچھے کھینچ لیا اور اسے مسلنے لگا۔ ''آپ کو میرا پروٹوکول افسر باہر چھوڑ دے گا۔''

''جی جناب صدر۔'' ایلچی کا لہجہ طنزیہ ہوگیا۔ ''اب آپ آرام کریں۔''

وہ باہر آئے اور بکتر بند گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوگئے۔ سیکریٹری حیران تھی کہ اس ملاقات میں تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ اس نے ایلچی سے کہا۔

''ایسا لگتا ہے صرف ہمارا وقت ضائع ہوا ہے۔''

''نہیں، ہمارا وقت کبھی ضائع نہیں ہوتا ہے اور جو ایسا کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ خود ضائع ہو جاتا ہے۔''

''یہ شخص کسی صورت اقتدار نہیں چھوڑے گا۔'' سیکریٹری نے یقین سے کہا۔

''تیسری دنیا میں چور دروازوں سے اقتدار میں آنے والے اس لیے نہیں آتے ہیں کہ وقت آنے پر شرافت سے رخصت ہو جائیں گے، وہ بہت ذلیل اور عبرت ناک طریقے سے رخصت ہوتے ہیں۔''

''تعجب ہے سر! آنے والے اپنے پچھلوں کے حشر سے سبق حاصل نہیں کرتے ہیں۔''

''اقتدار کا نشہ چیز ہی ایسی ہوتی ہے کہ اس کے زیر اثر آنے کے بعد آدمی مرنا قبول کرسکتا ہے مگر اقتدار نہیں چھوڑ سکتا۔''

''یعنی آپ کو پہلے سے پتا تھا کہ یہ نہیں مانے گا۔'' سیکریٹری نے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں معلوم تھا۔'' اس نے بکتر بند کے باہر دیکھا۔

''آپ پھر بھی یہاں آئے؟''

''ہاں کیونکہ ہمارے پاس متبادل پلان ہمیشہ موجود ہوتے ہیں۔''

''سر! اس معاملے میں مجھے کوئی متبادل پلان نظر نہیں آیا۔''

''کچھ متبادل پلان ایسے ہوتے ہیں جو نظر نہیں آتے ہیں۔''

...ان کا قافلہ شہر کے مختلف حصوں سے گزرتا ہوا ائرپورٹ کی طرف رواں تھا۔ دو ہفتے سے پورا شہر مفلوج پڑا تھا اور صرف شہر ہی نہیں پورے ملک کا یہی حال تھا۔ ایک جگہ چند نوجوان نعرے بازی کرتے دکھائی دیے تھے، ان کے قافلے کو دیکھ کر انہوں نے پتھراؤ شروع کر دیا اور وہ تیزی سے وہاں سے نکل گئے۔

''یہ ہم سے نفرت کرتے ہیں سر۔''

''ہر ملک جو ہماری امداد سے چل رہا ہے اس کے عوام ہم سے نفرت کرتے ہیں۔'' ایلچی نے حقیقت بیان کی۔

''مگر کیوں سر؟''

''کیونکہ وہ اپنے مصائب کا ذمے دار ہمیں سمجھتے ہیں۔ حالانکہ جدی پشتی حکمرانوں کو یہ لوگ خود منتخب کرتے ہیں۔ چور راستوں سے آنے والے آمروں کا استقبال یہ خود کرتے ہیں اور گالیاں ہمیں دیتے ہیں کہ ہم ان حکمرانوں کی حمایت کرتے ہیں۔''

وہ درست کہہ رہا تھا یہ تیسری دنیا کے حکمرانوں اور عوام کا مسئلہ تھا۔ وہ کچھ دیر بعد ائرپورٹ پر تھے جہاں ایلچی کا خصوصی طیارہ اپنے انجن چلا کر پرواز کے لیے بالکل تیار تھا۔ وہ جیسے ہی طیارے میں داخل ہوئے اس کا دروازہ بند کر دیا گیا اور طیارہ رن وے پر ٹیکسی کرنے لگا۔ اپنی سیٹ بیلٹ باندھتے ہوئے سیکریٹری نے اس سے پوچھا۔

''سر! ہمارا متبادل پلان کیا ہے؟''

''ابھی ہمارا متبادل پلان کام شروع کر رہا ہے۔'' ایلچی نے گھڑی کی طرف دیکھا اور دل میں سوچا۔ بہت سارے سابق حکمران اقتدار سے الگ ہو کر ساری دنیا میں ان کی رسوائی کا باعث بنتے تھے اس لیے اب ایسے حکمرانوں کے لیے ایک متبادل پلان تیار کیا گیا تھا اور وہ پہلی بار اسی پر عمل کرنے کے لیے آیا تھا۔

جس وقت ایلچی کا طیارہ پرواز کے لیے فضا میں بلند ہوا تھا عین اسی وقت ایوان صدر کے خاص سوٹ میں صدر کی حالت اچانک بگڑنے لگی تھی۔ اسے لگا جیسے کوئی اس کا دل مسل رہا ہے۔ لمحوں میں وہاں ڈاکٹرز اور طبی عملہ آگیا تھا مگر چند منٹ کے اندر صدر مر چکا تھا۔ ڈاکٹروں نے تشخیص کیا کہ اسے دل کا شدید دورہ پڑا تھا اور وہ اس سے جانبر نہیں ہوسکا تھا۔ متبادل پلان نے کام کر دیا تھا۔

www.pkdigest.com

اسما قادری

گرداب

تیسری قسط

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے لیکن اس کی باگ ڈور جب بااثر سماج کے روایتی نظام میں پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں۔ مختلف طبقات میں تقسیم اس نظامِ قانون کے بھی کئی رخ ہیں۔ بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے اور یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے..... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے۔ جہاں طاقتور مچھلی جال کو تو ڑکر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے۔ پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو۔ محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کرکے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہوجاتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے، زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے ... سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں ... کبھی بازی پلٹ بھی جاتی ہے۔ گزرا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے ..... اُس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا ہوتا ہے۔ جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی سلسلہ در سلسلہ۔

لمحے بہت تیزی سے بیت رہے تھے۔ چودھری افتخار کسی بھی لمحے یہاں پہنچ سکتا تھا۔ وہ پہنچ جاتا تو ماہ بانو کے لیے بہت برا ہوتا۔ وہ اپنے بچاؤ کی آخری امید کے طور پر اس نئے اے سی تک پہنچی تھی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اے سی براہِ راست چودھری سے اس کے لیے ٹکر نہیں لے سکتا۔ بہتر یہی تھا کہ اس کا چودھری سے سامنا نہ ہو مگر کوئی جائے فرار بھی نظر نہیں آرہی تھی۔

''پلیز سر! کچھ کریں اگر چودھری نے مجھے یہاں دیکھ لیا تو بہت برا ہوگا۔'' ماہ بانو کو اور کچھ بھائی نہیں دیا تو شہریار سے ہی مدد مانگنے لگی مگر شہریار خود اچھی طرح پورے کمرے کا جائزہ لے چکا تھا۔ یہاں کوئی بھی ایسی شے موجود نہیں تھی جس کے پیچھے ماہ بانو کو چھپایا جاسکتا۔

''آپ اِدھر آجائیں۔'' ماسٹر آفتاب جو چودھری افتخار کے آنے کی اطلاع دینے کے بعد خاموش کھڑا ہوا تھا، ماہ بانو کا جملہ سن کر فوراً ہی مستعد ہوگیا۔ اس نے تختہ سیاہ کے قریب جاکر اس کو نچلے سرے سے پکڑ کر اٹھایا۔ تختہ سیاہ دیوار میں مکمل طور پر فکس نہیں تھا۔ اس کے صرف اوپری حصے کو اسکرو کی مدد سے دیوار میں فٹ کیا گیا تھا۔ اس لیے جب ماسٹر آفتاب نے نچلے سرے کو اٹھایا تو وہ اچھا خاصا اوپر اٹھ گیا۔ اس اٹھے ہوئے حصے سے دیوار میں موجود کھڑکی صاف نظر آرہی تھی۔ اس کھڑکی کو دیکھ کر ماہ بانو کے چہرے پر زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ شہریار بھی کھڑکی کو دیکھ کر تیزی سے آگے بڑھا اور اس کا پٹ کھول دیا۔ دوسری طرف ایک رہائشی کمرا نظر آرہا تھا جو یقینی طور پر ماسٹر آفتاب اور اس کے ساتھی ٹیچر کے تصرف میں تھا۔ کھڑکی زمین سے قدرے بلندی پر تھی۔ شہریار نے ماہ بانو کو سہارا دیا اور وہ اس کے سہارے سے دوسری طرف کود گئی۔ شہریار نے پھرتی سے کھڑکی دوبارہ بند کردی۔ اس کے کانوں

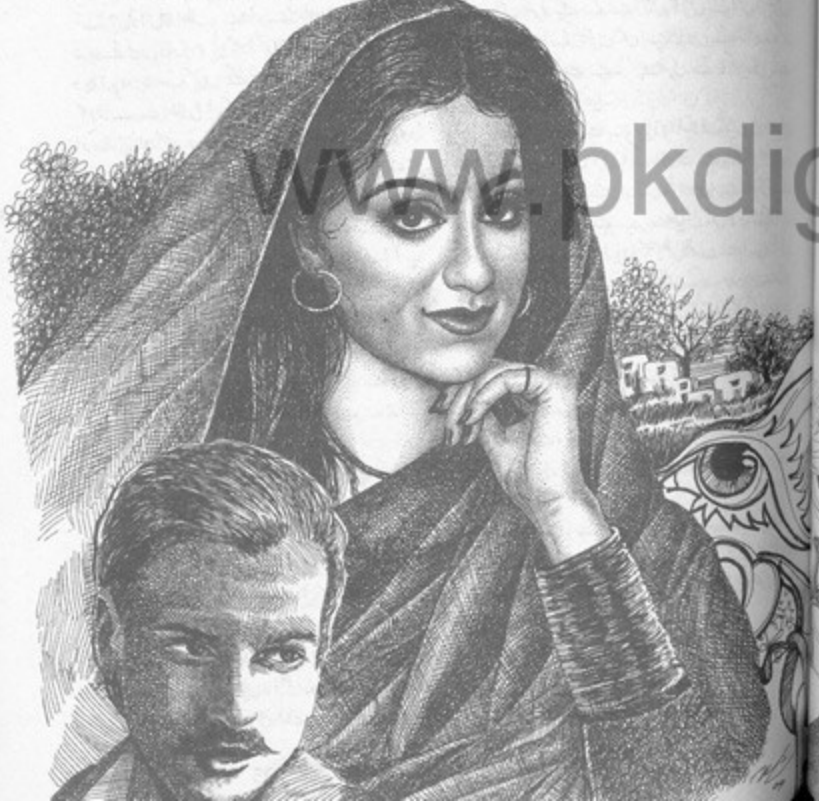

www.pkdigest.com

نے باہر جیپ رکنے کی آواز سن لی تھی۔ ماسٹر آفتاب نے تختہ سیاہ کے نچلے سرے کو احتیاط سے دوبارہ دیوار پر لگا دیا۔ ماہ بانو کو فرار کا راستہ فراہم کرنے والی کھڑکی غائب ہو گئی۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ ماسٹر آفتاب نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے ہی چودھری افتخار اپنے منشی اللہ رکھا کے ساتھ کھڑا تھا۔

”السلام علیکم چودھری صاحب!“ ماسٹر آفتاب نے چودھری کو سلام کیا جسے اَن سنی کر کے وہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ ماسٹر آفتاب نے مناسب سمجھا کہ وہ خود باہر چلا جائے۔

”آیئے آیئے چودھری صاحب! آپ نے کیوں زحمت کی، میں خود یہاں سے فارغ ہونے کے بعد آپ کی حویلی پر ملاقات کے لیے آتا۔“ شہریار نے تپاک سے چودھری افتخار کا استقبال کیا۔

”اصولاً تو آپ کو پہلے وہیں آنا چاہیے تھا۔ آپ پیر آباد آئے ہیں تو اس کا مطلب ہے ہمارے مہمان ہیں مگر آپ نے نہ جانے کیوں ہماری حویلی چھوڑ کر اس پھٹیچر اسکول کو عزت دینا زیادہ مناسب سمجھا۔ مجھے تو ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک کارندے سے اطلاع ملی کہ اے سی صاحب پیر آباد آئے ہوئے ہیں اور مسجد سے اپنی آمد کا اعلان کروایا ہے۔ میں فوراً دوڑا ہوا آیا کہ جانے ہم سے آپ کو کیا شکایت ہو گئی ہے جو آپ نے پیر آباد آنے کے باوجود ہماری طرف آنا پسند نہیں کیا۔“ چودھری نے خفگی آمیز انداز میں تفصیلی جواب دیا۔

”ایسی تو کوئی بات نہیں ہے چودھری صاحب! آپ سے بھلا کیسی شکایت؟ میں نے تو صرف اس لیے حویلی کا رخ نہیں کیا کہ پہلے گاؤں والوں سے مل کر ان کی شکایات سن لوں پھر بعد میں اطمینان سے آپ سے ملاقات کروں گا لیکن یہ آپ کا خلوص ہے کہ گاؤں کے کسی فرد کے پہنچنے سے پہلے ہی آپ یہاں پہنچ گئے۔“ چودھری افتخار کی شکایت کے جواب میں شہریار نے خوش گوار لہجے میں وضاحت کی۔

”گاؤں کا کوئی بندہ اپنی شکایت لے کر آپ کے پاس آئے، یہ تو ذرا مشکل ہی ہے۔ ان لوگوں کو برسوں سے عادت ہے کہ یہ اپنے مسئلے مسائل لے کر حویلی آتے ہیں اور وہاں ان کے مسئلے حل بھی ہو جاتے ہیں لیکن یہ ماسٹر آفتاب باہر سے آیا ہوا بندہ ہے اس لیے حویلی کا رخ نہیں کرتا۔ پڑھے لکھے بندوں کے ساتھ یہ بڑا مسئلہ ہوتا ہے کہ وہ کسی علاقے اور ماحول کی روایات کو سمجھے بغیر اپنی عقل کے مطابق کام کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ابھی بند کمرے میں بھی وہ یقیناً آپ سے میرے خلاف ہی شکایت کر رہا ہوگا۔“ ماسٹر آفتاب کے لیے چودھری افتخار کے لہجے میں واضح ناراضگی محسوس ہو رہی تھی۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے چودھری صاحب! ماسٹر آفتاب کو میں نے خود یہاں روکا تھا۔ اصل میں، میں اس ساتھ والی زمین پر اسکول کے لیے مزید کمرے تعمیر کروانا شروع کر رہا ہوں۔ میں نے سوچا کہ پہلے ماسٹر آفتاب سے اسکول میں بچوں کا اعداد و شمار معلوم کر لوں پھر کام شروع کرواؤں۔ بس اسی سلسلے میں میری اس سے گفتگو ہو رہی تھی۔“ شہریار نے نرمی سے ماسٹر آفتاب کی صفائی پیش کی۔

”میرے خیال میں تو اسکول کے لیے مزید کمروں کی کوئی ضرورت نہیں۔ گاؤں میں بچوں کو تعلیم دلوانے کا رجحان نہیں ہے۔ میں خود بھی سمجھتا ہوں کہ ان لوگوں کے لیے تعلیم کی اتنی ضرورت نہیں۔ یہ لوگ نسلوں سے کھیتی باڑی کرتے آ رہے ہیں۔ ان کی روزی اور روزگار کھیتی باڑی سے وابستہ ہے اور اس ہنر کو سیکھنے کے لیے انہیں گاؤں کے اس اسکول میں آنے کے بجائے کھیتوں میں اپنے بڑوں کے ساتھ رہ کر کام سیکھنے کی ضرورت ہے۔“ چودھری نے ناگواری سے شہریار کی بات کا جواب دیا۔

”مجھے آپ کی بات سے زیادہ اختلاف نہیں چودھری صاحب! لیکن تعلیم کی اپنی ایک اہمیت ہے۔ تعلیم صرف روزگار کے حصول کے لیے ہی نہیں، شعور کی بیداری کے لیے بھی حاصل کی جاتی ہے۔ میرے خیال میں تو یہ بچے اگر تعلیم حاصل کر لیں گے تو زیادہ بہتر طریقوں سے اپنے آبا و اجداد کی زمینوں کو آباد کرنے کی سوچیں گے۔ جدید دور کے تقاضے نبھانے کے لیے ہمارے کاشت کاروں کا بھی جدید تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو زرعی یونیورسٹیوں کا قیام کیوں عمل میں آتا؟ حکومت نے زرعی یونیورسٹیاں اسی لیے تو بنائی ہیں کہ لوگ وہاں سے پڑھ لکھ کر اپنی زمینوں سے زیادہ سے زیادہ اور بہترین پیداوار حاصل کریں۔“ شہریار نے چودھری افتخار کو دلائل سے قائل کرنے کی کوشش کی۔

”آپ اس بات کو نہیں سمجھتے اے سی صاحب! پڑھ لکھ کر یہ لڑکے اپنی زمینوں پر کام کرنا پسند نہیں کرتے بلکہ معمولی سی نوکری کی تلاش میں شہر چلے جاتے ہیں۔“ چودھری نے شہریار کی مخالفت کی۔

”میرا نہیں خیال کہ گاؤں کے تمام کے تمام لڑکے تعلیم حاصل کرنے کے بعد یہاں سے شہروں کا رخ کر لیں گے۔ شہر اتنی بڑی تعداد میں دیہاتوں سے آنے والے تمام افراد کو

روزگار فراہم نہیں کر سکتے۔ ان لوگوں کو اپنی جگہ پر رہ کر اپنی ہی زمینوں سے روزی حاصل کرنی ہوگی۔ اگر چند فیصد لوگ شہروں میں منتقل ہو بھی جاتے ہیں تو اس سے کوئی اتنا زیادہ فرق نہیں پڑے گا۔“

”میں جانتا ہوں، آپ میری بات نہیں سمجھ سکیں گے کیونکہ آپ اس ماحول کو ہی نہیں سمجھتے ہیں۔ بہرحال، میں آپ سے اسکول کے مسئلے پر بحث کرنے آیا بھی نہیں ہوں مگر بات نکل ہی آئی ہے تو میں آپ کو یہ اطلاع دے دوں کہ اسکول کے ساتھ والی زمین پر میں نے موبائل کمپنی والوں کو اپنا ٹاور نصب کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ وہ جلد یہاں آ کر اپنا کام شروع کر دیں گے۔“ چودھری افتخار کی بات سن کر شہریار کو احساس ہوا کہ اس نے کتنی گہری چال چلی تھی۔ وہ شہریار پر یہ احسان پہلے ہی جتا چکا تھا کہ وہ اس کے کہنے پر اپنے علاقے کی بہتری اور ترقی کے لیے یہاں موبائل سروس شروع کروانے والا ہے۔ اب اس نے اپنا دوسرا کارڈ بھی شو کر دیا تھا۔ وہ اسکول کے ساتھ والی زمین پر موبائل کمپنی کا ٹاور نصب کروا کر اس مسئلے کا مستقل حل نکالنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسکول میں توسیع کی دوبارہ کوشش ہی نہ کی جا سکے۔ چودھری افتخار کی اس عیاری پر شہریار کے لیے اپنے غصے پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔

”دیکھیں چودھری صاحب! اسکول کے سلسلے میں، میں اوپر سے منظوری لے چکا ہوں۔ یہ زمین گورنمنٹ کی ملکیت ہے اس لیے اسے کس کام میں لایا جائے، یہ فیصلہ کرنا گورنمنٹ کا کام ہے۔ اور فیصلہ ہو چکا ہے البتہ میں آپ کو یہ آفر ضرور کر سکتا ہوں کہ اسکول کے لیے کمرے تعمیر ہونے کے بعد جو جگہ باقی بچ جائے آپ وہاں موبائل کمپنی والوں کو کام کرنے کی اجازت دے سکتے ہیں۔“

”چلیں جیسا آپ کہیں ویسا ہی ہو جائے گا۔ آخر دونوں ہی کام میرے گاؤں کی بھلائی کے لیے ہو رہے ہیں۔ مجھے دونوں میں سے کسی پر بھی کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟“ شہریار کا خیال تھا کہ اس کا لہجہ چودھری افتخار کو ناگوار گزرے گا لیکن اس نے تو فوراً ہی پینترا بدل لیا تھا اور یوں مسکرا کر شہریار کی بات کی تائید کر رہا تھا جیسے اسے کبھی بھی اسکول کے معاملے میں کوئی اختلاف نہ رہا ہو۔ اس کے انداز کی اس تبدیلی کے بعد شہریار کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنے انداز کو بدستور سخت رکھتا، چنانچہ وہ بھی ایک جوابی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر چودھری افتخار کا شکریہ ادا کرنے لگا۔

”چلیں پھر یہ معاملہ تو طے ہو گیا۔ اب آپ میرے ساتھ حویلی چلیں۔ اتنی دیر میں آپ یہ اندازہ تو کر ہی چکے ہوں گے کہ گاؤں کا کوئی فرد اپنی شکایت سنانے آپ کے پاس نہیں آئے گا۔“

وہ اتنی دیر میں واقعی اندازہ کر چکا تھا کہ گاؤں کا کوئی فرد اس طرف کا رخ نہیں کرے گا۔ یقیناً ایسا چودھری کے دبدبے کی وجہ سے تھا۔ لوگ اس سے اتنا ڈرتے تھے کہ شہریار کے پاس آ کر اپنی کوئی شکایت نوٹ کروانے کی ہمت نہیں رکھتے تھے لیکن برابر والے کمرے میں ایک لڑکی موجود تھی جو نہ صرف یہاں آئی تھی بلکہ صاف طور پر یہ بھی کہا تھا کہ اسے چودھری سے خطرہ ہے۔ شہریار کے لیے اس لڑکی کی شکایت سننا ضروری تھا لیکن وہ چودھری کو بھی نہیں ٹال سکتا تھا۔ یک دم ہی اسے ایک درمیانی راہ سوجھ گئی۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”آپ کا حکم سر آنکھوں پر چودھری صاحب! لیکن آپ کو اگر میری میزبانی کرنی ہے تو ذرا زیادہ زحمت اٹھانی پڑے گی۔ اصل میں، میں یہاں مختصر سے دورے پر آیا تھا۔ دفتر میں اس وقت کئی کام ایسے ہیں جنہیں فوری توجہ کی ضرورت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے یہاں رکنے کی صورت میں میرا پی اے عبدالمنان دفتر جا کر وہ کام دیکھ لے۔ اب ظاہر ہے عبدالمنان یہاں سے جائے گا تو میں اپنی گاڑی اور ڈرائیور سے محروم ہو جاؤں گا اس لیے آپ کو یہ زحمت کرنی ہوگی کہ مجھے اپنی گاڑی سے میرے دفتر واپس چھڑوا دیں۔“

”یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ آپ بے شک اپنی گاڑی واپس بھجوا دیں۔ یہاں ہم موجود ہیں نا آپ کی خدمت کے لیے۔“ چودھری افتخار کا جواب حسب توقع تھا۔ اس جواب کے بعد شہریار نے مزید وہاں رکنا غیر ضروری سمجھا اور باہر آ کر عبدالمنان کو سرگوشی میں ہدایات دینے کے بعد چودھری کے ساتھ اس کی حویلی روانہ ہو گیا۔ حویلی پہنچ کر روایتی خاطر مدارات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

چودھری افتخار شہریار کو اپنے آبا و اجداد کی برتری، بہادری اور تعلقات سے متعلق قصے سناتا رہا۔ آدھے گھنٹے بعد انہیں کھانا لگنے کی اطلاع دی گئی۔ شہریار چودھری افتخار کے ساتھ اس کے شان دار ڈائننگ روم میں آیا۔ صرف عرس والے دن حویلی میں مہمانوں کو فرشی دستر خوان لگا کر کھانا کھلانے کا اہتمام کیا گیا تھا اور ایسا شاید مہمانوں کی بڑی تعداد اور موقعے کی مناسبت کے اعتبار سے ہوا تھا ورنہ حویلی کا ڈائننگ روم کافی دیدہ زیب اور جدید انداز میں آراستہ تھا۔ اس سے پہلے شکار پر جانے کے موقعے پر بھی وہ اس ڈائننگ

www.pkdigest.com

روم میں آچکا تھا۔ آج بھی ڈائننگ ٹیبل پر لذت کام و دہن کے لیے بہت سے لوازمات موجود تھے۔ چودھری کے اصرار پر وہ اس من و سلویٰ سے لطف اندوز ہونے لگا۔ کھانا ابھی اختتام کو نہیں پہنچا تھا کہ منشی اللہ رکھا کچھ پریشان سا ڈائننگ روم میں داخل ہوا۔

''کیا بات ہے منشی؟'' چودھری نے ناگواری سے منشی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''چودھری صاحب! غیاث محمد آیا ہے۔'' منشی اللہ رکھا نے آہستہ سے بتایا۔

''کیوں؟ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو وہ اور اس کی گھر والی یہاں سے گئے تھے۔ اگر کوئی مسئلہ ہے، انہیں کوئی کمی لگ رہی ہے تو تم اس معاملے کو نمٹا دو۔ مجھے کیوں ڈسٹرب کر رہے ہو؟'' چودھری کا لہجہ کچھ اور بھی سخت ہو گیا۔

''مسئلہ کچھ اور ہے چودھری صاحب۔'' منشی سہمے ہوئے لہجے میں بولا اور پھر چودھری افتخار کے بالکل قریب جا کر اسے سرگوشی میں کچھ بتایا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تم سب طرف اپنے بندے دوڑا دو۔ بس کے اڈے سے معلوم کرو اور اگر کچھ معلوم نہ ہو تو غیاث محمد سے فیصل آباد کا پتا لے کر ادھر آدمی بھجواؤ۔ اسے اگر یہاں سے نکلنے میں کامیابی ہو بھی گئی تو زیادہ سے زیادہ فیصل آباد تک ہی جا سکتی ہے۔'' منشی کی سرگوشی کے جواب میں چودھری افتخار غضب ناک ہو کر ہدایات دینے لگا۔ منشی اس کی ہدایات پر سر ہلاتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔ خود چودھری افتخار کا یہ عالم تھا کہ پورا چہرہ ٹماٹر کی طرح سرخ ہو رہا تھا اور وہ اپنے سامنے رکھے کھانے سے بے نیاز ہو گیا تھا۔

''خیریت تو ہے چودھری صاحب! آپ کچھ پریشان نظر آ رہے ہیں؟'' شہریار جو کچھ کچھ معاملے کی نوعیت سمجھ رہا تھا، لہجے میں تشویش سمو کر اس سے پوچھنے لگا۔

''خیریت ہی ہو گی۔ چودھری افتخار کو دھوکا دے کر نکل جانا اتنا آسان نہیں ہے۔'' اس کا لہجہ کسی سانپ کی پھنکار سے مشابہ تھا۔

''اگر آپ کو میری مدد کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔'' شہریار نے پیشکش کی۔

''شکریہ اے سی صاحب! معاملہ ذرا ذاتی نوعیت کا ہے۔ بہرحال، میں اس سے نمٹ لوں گا۔'' اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ مشکل سے خود پر ضبط کر کے بیٹھا ہے۔ شہریار نے مزید کوئی سوال نہیں کیا اور اپنی پلیٹ میں باقی رہ جانے والا کھانا جلدی جلدی ختم کر کے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ ڈائننگ روم سے باہر نکلنے کے بعد اس نے چودھری افتخار سے واپسی کی درخواست کی۔ چودھری شاید خود بھی یکسو ہونا چاہتا تھا اس لیے اس نے شہریار کے مزید رکنے پر اصرار نہیں کیا اور فوری طور پر اس کی واپسی کے لیے گاڑی مہیا کر دی۔

☆☆☆

''ہاں عبدالمنان! کیا بتایا اس لڑکی نے اپنے بارے میں؟'' شہریار نے واپس پہنچنے کے بعد عبدالمنان سے سب سے پہلے ماہ بانو کے متعلق ہی استفسار کیا۔

''اس نے مجھے زیادہ تفصیلات نہیں بتائیں سر! اس نے صرف اتنا بتایا ہے کہ اسے چودھری افتخار کی طرف سے شدید خطرہ درپیش ہے اور وہ ہمارے پاس اس لیے آئی ہے کہ ہم گاؤں سے نکلنے میں اس کی مدد کریں۔ وہ اپنا سفری بیگ بھی ساتھ لے کر آئی تھی۔ میں نے مناسب سمجھا کہ زیادہ دیر پیر آباد میں نہ رکوں اس لیے میں اس لڑکی کو اپنے ساتھ یہاں لے کر آ گیا ہوں۔ اس کا اصرار تھا کہ میں اسے فیصل آباد جانے والی کسی بس میں سوار کروا دوں لیکن میں آپ کی مرضی جانے بغیر اس کی یہ فرمائش پوری نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے میں نے اسے روک لیا ہے۔'' عبدالمنان نے شہریار کو بتایا۔

''تم نے بہت اچھا کیا۔ چودھری کو اچھی طرح اندازہ تھا کہ یہ لڑکی پیر آباد سے نکلنے کے بعد فیصل آباد کا ہی رخ کرنے کی کوشش کرے گی۔ کچھ دیر پہلے اس نے میرے سامنے ہی اپنے بندوں کو فیصل آباد جانے کا حکم دیا ہے۔'' شہریار نے پُرسوچ انداز میں عبدالمنان سے کہا۔ چودھری افتخار کی دعوت پر حویلی جانے سے اسے کم از کم یہ فائدہ ضرور ہوا تھا کہ اتفاقاً ہی سہی، چودھری افتخار کے خلاف مدد مانگنے آنے والی لڑکی کی اس بات کی تصدیق ضرور ہو گئی تھی کہ وہ چودھری کی طرف سے خطرے کا شکار ہے۔

''لڑکی کہاں ہے عبدالمنان؟ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ اور ہاں، یہ بتاؤ کہ اسے تمہارے ساتھ یہاں آتے ہوئے تو کسی نے نہیں دیکھا؟''

''نو سر! پیر آباد میں ماسٹر آفتاب اور یہاں میرے اور مشاہد خان کے علاوہ کسی کو لڑکی کے بارے میں علم نہیں۔ گیٹ پر چوکیدار نے اگر دیکھا بھی ہو گا تو یہ اندازہ نہیں کر پایا ہو گا کہ ہمارے ساتھ آنے والی لڑکی کون ہے۔'' شہریار کے سوال پر عبدالمنان نے اسے تسلی دی اور خود باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو ماہ بانو اس کے ساتھ تھی۔ وہ اب بھی سہمی ہوئی لگ رہی تھی اور اس نے چادر کو بہت مضبوطی سے اپنے گرد لپیٹا ہوا تھا۔

''بیٹھو۔'' شہریار نے نرمی سے اسے اپنے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ وہ جھجکتی ہوئی اس انداز سے کرسی پر ٹک گئی کہ لگتا تھا اگلے ہی لمحے اٹھ کر باہر نکل جائے گی۔

''آرام سے بیٹھو اور مجھے تفصیل سے اپنا مسئلہ بتاؤ۔ تم جو کچھ بتاؤ گی، وہ میرے علاوہ کسی اور کے علم میں نہیں آئے گا اور میں کوشش کروں گا کہ تمہاری ہر ممکن مدد کی جائے۔'' شہریار نے اس کا انداز دیکھتے ہوئے نرمی سے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ شہریار کی بات سے اشارہ پاتے ہوئے عبدالمنان کمرے سے باہر نکل گیا۔

''ہاں، اب بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟'' شہریار نے ایک بار پھر اصرار کیا۔

''چودھری افتخار بہت بری فطرت کا آدمی ہے۔ میں آپ سے بس اتنا چاہتی ہوں کہ آپ اس سے بچا کر مجھے فیصل آباد میرے گھر پہنچا دیں۔ یہ آپ کا مجھ پر بڑا احسان ہو گا۔''

''تو کیا تم پیر آباد کی رہنے والی نہیں ہو؟'' شہریار، ماہ بانو کی بات سن کر چونکا۔

''نہیں۔'' ماہ بانو نے نفی میں سر ہلایا اور بولی۔ ''میں فیصل آباد میں رہتی ہوں۔ پیر آباد میں اپنی بہن کی شادی میں شرکت کے لیے آئی تھی۔ میرے ابا نے شادی کے بعد زبردستی مجھے روک لیا کہ دو چار دن رک کر یہاں کا ہاتھ بٹا دو پھر میں خود تمہیں فیصل آباد واپس چھوڑ آؤں گا۔ میں چودھری افتخار کے خوف سے رکنا نہیں چاہتی تھی لیکن سب کے اصرار پر رکنا پڑا اور میرا خوف سچ تھا۔ چودھری نے موقع دیکھ کر مجھے پانے کی کوشش شروع کر دی اور اب تو میرے اپنے ماں باپ بھی مجھے اس بدنیت انسان کے حوالے کرنے پر تیار ہو گئے ہیں۔ آپ بس مجھے فیصل آباد پہنچا دیں۔ وہاں بے بے اور ابا میرے ساتھ یہ ظلم نہیں ہونے دیں گے۔'' رندھی ہوئی آواز میں اپنا مسئلہ بتاتے ہوئے ماہ بانو نے ایک بار پھر شہریار سے اصرار کیا۔

''دیکھو، تم بالکل شروع سے اور ذرا تفصیل سے مجھے ساری بات بتاؤ۔ تمہاری باتوں سے میں پوری طرح سمجھ نہیں پا رہا ہوں کہ فیصل آباد اور پیر آباد میں سے اصل میں کون سی جگہ تمہارے ماں باپ رہتے ہیں اور تم پہلے سے ہی چودھری افتخار سے کیوں خوف زدہ تھیں؟'' شہریار نے ماہ بانو کے جواب پر کچھ الجھ کر اس سے دریافت کیا۔

''پوری طرح میری بات سمجھنے کے لیے آپ کو میرا بیک گراؤنڈ سمجھنا پڑے گا۔'' ماہ بانو نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ اسے سارے حالات سے آگاہ کر دیا۔

''آج چودھری نے میرے ماں باپ کو حویلی بلوایا ہوا تھا۔ وہ لوگ میری بہن زہرہ کو میری نگرانی پر چھوڑ کر گئے تھے۔ زہرہ نے میری حالت دیکھی تو رو پڑی اور کہنے لگی کہ تم مجھے غسل خانے میں بند کر کے یہاں سے نکل جاؤ۔ میں کہہ دوں گی کہ میں نہانے گئی تھی، مجھے معلوم نہیں ہوا کہ کب ماہ بانو باہر سے غسل خانے کی کنڈی لگا کر گھر سے نکل گئی۔ میں نے بہن کے کہنے پر عمل کیا۔ ابھی میں گھر سے نکلی ہی تھی کہ مسجد سے اعلان ہوتا سنا کہ اے سی صاحب گاؤں میں موجود ہیں، اگر گاؤں کے کسی فرد کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے تو وہ اسکول آ کر اے سی صاحب سے مل سکتا ہے۔ اس اعلان کو سن کر مجھے خیال آیا کہ جو اے سی از خود گاؤں آ کر گاؤں والوں کے مسائل سننے میں دلچسپی رکھتا ہے وہ یقیناً اچھا انسان ہو گا۔ بس اسی لیے میں اسکول پہنچ گئی۔ مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں بس کے اڈے پر پہنچنے سے پہلے ہی کوئی مجھے راستے میں ہی نہ دھر لے، اس لیے آپ کی مدد لینا مناسب معلوم ہوا۔ میں نے آپ کے پی اے سے درخواست کی تھی کہ وہ مجھے فیصل آباد جانے والی بس میں بٹھا دیں لیکن جانے کیوں انہوں نے میری بات نہیں سنی اور مجھے یہاں لے آئے۔'' ماہ بانو نے شہریار کے کہنے پر ذرا تفصیل سے سارا معاملہ بیان کرتے ہوئے آخر میں شکوہ کیا۔

''میرا پی اے ایک عقل مند اور تجربہ کار آدمی ہے۔ اس نے بہت اچھا کیا کہ تمہیں بس اڈے پر نہیں لے گیا۔ چودھری افتخار نے سب سے پہلے اپنے بندوں کو اسی طرف دوڑایا تھا۔ اس نے فیصل آباد بھی اپنے بندے روانہ کر دیے ہیں تاکہ تم جیسے ہی وہاں پہنچو، ان کی گرفت میں آ جاؤ۔''

''آپ کو یہ سب کیسے معلوم ہوا؟'' ماہ بانو نے شہریار کی فراہم کردہ معلومات پر متوحش ہو کر پوچھا۔

''اتفاق سے چودھری افتخار نے یہ سارے احکامات میرے سامنے ہی دیے تھے۔ اس کے منشی نے میری وہاں موجودگی کے دوران کسی غیاث محمد نامی شخص کے آنے کی اطلاع دے کر چپکے سے چودھری کو کچھ بتایا تھا۔ یقیناً اس نے تمہارے غائب ہونے کی اطلاع ہی دی تھی کیونکہ چودھری ایک دم بہت غصے میں آ گیا تھا اور پھر اس نے منشی کو بس اڈے اور فیصل آباد کی طرف بندے دوڑانے کا حکم دیا تھا۔ میں نے اس وقت ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ سارے احکامات تمہارے سلسلے میں دیے جا رہے ہیں۔ اب تم سے بات کرنے کے بعد تو مجھے ایک فیصد بھی اپنے اندازے کی درستی پر شک نہیں رہا ہے۔'' شہریار نے ماہ بانو کو جواب دیا۔

''اف خدا! میں اب کہاں جاؤں گی؟ فیصل آباد کے سوا تو میرا دوسرا کوئی ٹھکانا بھی نہیں۔'' ماہ بانو نے پریشان ہو کر اپنا سر تھام لیا۔ وہ اپنے اس پریشان روپ میں بھی بہت دلکش لگ رہی تھی۔ شہریار نے اسے پہلی بار چودھری افتخار کے دادا کے عرس کے موقعے پر دیکھا تھا۔ اس وقت اس کے چہرے پر قدرے بے زاری کے باوجود تروتازگی اور شادابی تھی۔ وہ تروتازگی اور شادابی آج کچھ ماند نظر آتی تھی۔ شاید مسلسل ڈپریشن اور خوف کی وجہ سے ایسا ہوا تھا اس کے باوجود شہریار خود سے اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکا کہ وہ اب بھی بے حد قابل توجہ ہے۔ چودھری افتخار یوں بلاوجہ ہی تو اس کے لیے پاگل نہیں ہوا تھا کہ اپنی ابتدائی کوششوں کی ناکامی کے بعد سیدھے سیدھے شادی کی بات پر آ گیا تھا۔ حیثیت کے اعتبار سے تو ماہ بانو چودھری کے پاسنگ بھی نہیں معلوم ہوتی تھی لیکن اس کا حسن اتنا بھرپور تھا کہ چودھری نے اپنے سے بے حد نچلی حیثیت کے خاندان میں رشتہ جوڑنا منظور کر لیا تھا۔ اس کیس نے چودھری کی شخصیت کا ایک اور رنگ شہریار پر ظاہر کر دیا تھا۔ وہ شخص اپنے محکوموں کے معاشی اور معاشرتی استحصال کے ساتھ ساتھ ان کی عزتوں کا بھی دشمن تھا۔ حکمرانی کے زعم، دولت کے نشے اور ہوس نے اسے اس بری طرح جکڑ رکھا تھا کہ وہ دو بیویاں رکھنے کے باوجود اس پر خود سے بے حد چھوٹی اس لڑکی کو حاصل کرنے کا جنون سوار ہو گیا تھا۔ شہریار ان سارے خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ ماہ بانو نے اس کی خاموشی پر گھبرا کر باقاعدہ سسکنا شروع کر دیا۔ اس کی سسکیوں کی آواز سن کر شہریار اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''مت رو۔ تم تو بہت بہادر لڑکی ہو۔ اب تک تم نے سارے حالات کو بہت بہادری سے فیس کیا ہے، اب بھی ہمت سے کام لو۔ مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے انسان کو آنسوؤں کی نہیں بلکہ ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔'' شہریار کو اس کا رونا بے چین کر رہا تھا اس لیے وہ اسے تسلیاں دینے لگا۔

اس کی تسلیوں پر ماہ بانو نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی اور چادر کے پلو سے رخساروں پر ڈھلک آنے والے آنسو صاف کرنے لگی۔ شہریار نے اپنی ٹیبل پر رکھا ہوا پانی کا گلاس اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔ ماہ بانو نے گلاس تھام لیا اور دو گھونٹ پانی پینے کے بعد گلاس واپس میز پر رکھ دیا۔ اب وہ خود کو سنبھال چکی تھی لیکن نم نم سی آنکھوں میں اتر آنے والے سرخ ڈوروں نے اس کی آنکھوں کو اور بھی پرکشش بنا دیا تھا۔ شہریار نے اس کی آنکھوں کی کشش سے نظریں چراتے ہوئے انٹرکام پر عبدالمنان کو اندر آنے کا حکم دیا۔

''عبدالمنان! فوری طور پر اس لڑکی کے کسی محفوظ جگہ رہنے کا بندوبست کرنا ہے۔ کسی ایسی جگہ جہاں یہ چند دن خاموشی سے رہ سکے پھر میں دیکھوں گا کہ اس سلسلے میں کیا کیا جا سکتا ہے۔ فی الحال ہمارے سامنے سب سے اہم مسئلہ اس کے لیے کسی محفوظ مقام کی فراہمی ہے۔'' عبدالمنان کے اندر آتے ہی شہریار نے اس سے کہا۔

''میں خود بھی اس معاملے پر سوچ رہا ہوں سر! اگر اس کیس میں چودھری افتخار ملوث نہیں ہوتا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن چودھری کی وجہ سے ہمیں بہت احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ میرے خیال میں تو ہمارے علاقے میں کوئی بھی جگہ ان محترمہ کے لیے مناسب نہیں رہے گی۔ اس پورے ضلع میں چودھری کا اچھا خاصا اثر رسوخ ہے۔ اس کے بندے آرام سے ان صاحبہ کو تلاش کر لیں گے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ ہم انہیں فوری طور پر لاہور کے کسی دارالامان میں منتقل کر دیں۔ بعد میں کسی این جی او وغیرہ کی مدد سے اس معاملے کو اٹھایا جا سکتا ہے۔'' عبدالمنان نے شہریار کو مشورہ دیا جو اسے مناسب معلوم ہوا۔

''ٹھیک ہے عبدالمنان! ایسا ہی کر لیتے ہیں لیکن اسے لاہور کس کے ساتھ بھجواؤ گے؟ اس کام کے لیے بھی تو کسی اعتماد کے بندے کا انتخاب کرنا ہوگا۔''

''مشتاق برمحافظ ہے نا سر! اس پر آپ آنکھیں بند کر کے اعتماد کر سکتے ہیں۔ میں اس کو صورت حال اچھی طرح سمجھا دوں گا۔ ساتھ ہی دارالامان کی انتظامیہ کے نام ایک خط بھی لکھ دوں گا تاکہ وہ لوگ ان محترمہ کی موجودگی کو مکمل طور پر صیغۂ راز میں رکھیں۔'' شہریار کی تشویش کے جواب میں عبدالمنان نے اسے تسلی دی۔

''ٹھیک ہے۔ تم جس طرح مناسب سمجھو اس کیس کو ہینڈل کر لو۔'' شہریار نے عبدالمنان کو جواب دیا۔

''آیئے محترمہ۔'' عبدالمنان نے ماہ بانو کو پکارا۔ وہ جھجکتی ہوئی اس کے پیچھے کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے باہر نکلتے ہی شہریار کو کمرے کے بے حد خالی ہونے کا احساس ہوا لیکن اس نے فوراً ہی اس احساس کو اپنے دماغ سے جھٹکتے ہوئے ایک فائل کی طرف اپنی توجہ مبذول کر لی۔

☆☆☆

غیاث محمد، چودھری افتخار کے سامنے کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ چودھری کے چہرے اور آنکھوں سے جھلکتا غضب اس کے اوسان خطا کیے دے رہا تھا۔

''قسم لے لیں سرکار! میرا کوئی قصور نہیں۔ میں اور نوراں تو اسے گھر چھوڑ کر آپ کے حکم پر حویلی آئے تھے۔ وہ پیچھے سے کیسے نکل بھاگی، ہمیں خبر نہیں۔ ہمیں تو گھر جا کر ہی معلوم ہوا اور میں سب سے پہلے آپ کو اطلاع کرنے دوڑا ہوا آیا۔'' کپکپاتی آواز میں اس نے بڑی مشکل سے اپنی صفائی پیش کی۔

''زیادہ معصوم نہ بن غیاث محمد! تیرا کام تھا کہ تو اپنی دھی کو قابو میں رکھتا۔ میں دو ملاقاتوں میں اس کی فطرت پہچان گیا تھا تو تو اس کا باپ ہو کر کیسے نہیں جان سکا کہ تیری دھی کسی اتھری گھوڑی کی طرح ہے جسے لگام ڈال کر رکھنا ضروری ہے۔ تو نے اپنی ذمے داری پہچانی ہی نہیں۔ بجائے اس کے کہ حویلی آتے ہوئے اس کا کچھ بندوبست کر کے آتا تو الٹا مجھ پر احسان جتانے بیٹھ گیا ہے کہ میرے بلاوے پر تو اور تیری گھر والی یہاں آئے تھے اور پیچھے جو کچھ ہو گزرا تو اس کا ذمے دار نہیں۔'' غیاث محمد کی بات پر چودھری غضب ناک ہو کر چنگھاڑا۔

''معاف کر دیں سرکار! میری نسلیں آپ پر قربان ہو جائیں۔ میں بھلا یہ گستاخی کیسے کر سکتا ہوں کہ آپ پر کوئی الزام دھروں۔'' غیاث محمد فوراً ہی چودھری کے قدموں میں گر گیا۔

''تیرا جرم معاف کرنے کے لائق نہیں غیاث محمد! ماہ بانو تیرے پاس ہماری امانت تھی۔ تو نے ہماری امانت کی حفاظت نہیں کی۔ کیسے اس نے تیرے گھر کی دہلیز پار کی؟ تو اسے گھر میں چھوڑ کر آتے وقت کوئی بندوبست کر کے کیوں نہیں آیا؟'' چودھری، ماہ بانو کے اس طرح ہاتھ سے نکل جانے پر بری طرح تلملایا ہوا تھا۔ اس تلملاہٹ کا اظہار کرنے کے لیے فی الحال اسے غیاث محمد ہی میسر تھا۔

''میں اسے بہن کی نگرانی پر چھوڑ کر آیا تھا سرکار! وہ بے چاری ہمارے کہنے پر اس کے پاس رکی ہوئی تھی، پر ماہ بانو نے اسے دھوکا دیا۔ زہرہ بتا رہی تھی کہ وہ ماہ بانو کو سوتا سمجھ کر غسل خانے میں گئی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ ماہ بانو سونے کا مکر کر رہی ہے اور اسے غسل خانے میں بند کر کے چلتی بنے گی۔ اس بے چاری کو تو خود خبر نہیں ہوئی کہ کب ماہ بانو نے باہر سے غسل خانے کی کنڈی چڑھا دی۔ وہ تو جب اس نے باہر نکلنے کے لیے دروازہ کھولنا چاہا تو پتا چلا کہ دروازہ باہر سے بند ہے۔ ہمارے گھر پہنچنے تک وہ خود غسل خانے کا دروازہ اندر سے پیٹ پیٹ کر ہلکان ہو گئی تھی۔'' غیاث محمد نے ایک بار پھر اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

''بند کر یہ ساری بکواس۔ مجھے تیرے یہ دکھڑے نہیں سننے ہیں۔ تیرا کیا ہے، تیری کون سی کوئی عزت ہے جو بیٹی کے اس طرح سے بھاگ جانے سے خراب ہوگی۔ پگ تو میری اچھلے گی نا کہ چودھری افتخار کی ہونے والی بیوی نکاح سے پہلے ہی گھر چھوڑ کر بھاگ گئی۔'' چودھری نے غیاث محمد کو لتاڑا۔

''نہ سرکار! پگ اچھلے آپ کے دشمنوں کی۔ ہم نے تو ابھی تک کسی کو یہ بات بتائی بھی نہیں تھی۔ ارادہ تھا کہ آپ کی طرف سے بیاہ کا جوڑا اور زیورات لے کر جائیں گے تو سارے گاؤں کو اکٹھے خبر کریں گے۔ ابھی تو بات صرف میری بیٹیوں اور دامادوں تک گئی۔ ابھی تو میں نے حوراں اور صفدر کو بھی خبر نہیں بھجوائی تھی۔ آپ بے فکر رہیں سرکار! ہم میں سے جس جس کو یہ بات معلوم ہے، وہ بھولے سے بھی اپنی زبان نہیں کھولے گا۔ آپ کی عزت ہمیں اپنی جان سے بڑھ کر عزیز ہے۔ آپ پر تو ہم اپنا سب کچھ لٹانے کو تیار ہیں۔ ماہ بانو یہاں سے نکل بھی گئی تو آپ کی پہنچ سے باہر کہاں جائے گی؟ آپ اس کے ہاتھ آ جانے پر اگر اس کی کھال بھی کھنچوا لیں گے تو اپنے اس نمک خوار کی زبان سے ''اف'' تک نہیں سنیں گے۔ میں نے دھی آپ کو دینے کی ہامی بھر لی تھی، اب میرا اس پر سے حق ختم ہو گیا۔ وہ آپ کی چیز ہے، آپ جو چاہیں اس کے ساتھ وہ سلوک کیجیے گا۔'' غیاث محمد اپنی چاپلوسیوں سے اس بات کا پکا انتظام کر رہا تھا کہ ماہ بانو کے اٹھائے ہوئے قدم کا نتیجہ اسے خود نہ بھگتنا پڑے اور وہ چودھری کے عتاب سے محفوظ رہے۔

''بس اڈے پر جانے والے آدمی واپس آ گئے ہیں چودھری صاحب! انہوں نے اچھی طرح معلوم کیا ہے۔ دو گھنٹے پہلے جو بس وہاں سے نکلی تھی، اس میں کوئی تنہا لڑکی نہیں تھی۔ ابھی جو بس فیصل آباد جانے کے لیے تیار کھڑی ہے، اس کی بہت اچھی طرح تلاشی لی گئی ہے۔ اس میں بھی غیاث محمد کی دھی نہیں ہے۔'' اسی وقت منشی اللہ رکھا وہاں آ گیا اور چودھری افتخار کو اطلاع دی۔

''پھر کہاں جا سکتی ہے وہ؟ تم اسے گاؤں میں تلاش کرو، ہو سکتا ہے کسی رشتے دار کے گھر چھپی بیٹھی ہو۔'' منشی کی اطلاع پر حیران ہوتے ہوئے چودھری نے اسے ہدایت دی۔

''میں نے یہ کام پہلے ہی شروع کروا دیا ہے۔ غیاث محمد کی دونوں بیٹیوں کے گھر کی تلاشی لی جا چکی ہے۔ اب میں اس کی زنانی کے ساتھ اپنے اعتبار کی دو ایک عورتوں کو لگا کر بہانے سے ان سارے گھروں کی تلاشی کروا رہا ہوں جن پر

www.pkdigest.com

شک کیا جاسکتا ہے۔ آپ بے فکر رہیں، اگر اس کی دھی گاؤں میں ہی ہے تو یہاں سے نکل کر کہیں نہیں جاسکے گی۔ دوسری صورت میں، میں نے فیصل آباد کی طرف تو بندے دوڑا ہی دیے ہیں۔ یہاں سے نہ سہی، وہاں سے اس کا پتا چل جائے گا۔'' منشی اللہ رکھا نے چودھری افتخار کو اپنی کارکردگی سے آگاہ کرتے ہوئے تسلی دی۔

''یہ اچھا کام کیا تو نے۔ پر میری سمجھ نہیں آرہا کہ اگر وہ بس میں سوار نہیں ہوئی تو پھر فیصل آباد کیسے پہنچے گی؟'' چودھری افتخار ماہ بانو کو پانے کے لیے جتنا بے چین تھا، اس کے غائب ہونے سے اتنا ہی باؤلا ہو رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح گھڑی کی چوتھائی میں ماہ بانو کو تلاش کر کے اس کے سامنے حاضر کردیا جائے۔

''ہوسکتا ہے وہ کسی خاندان کے ساتھ مل کر بیٹھ گئی ہو اس لیے کسی کو اندازہ نہ ہوسکا ہو۔ دوسری صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس نے بس میں جانے کے بجائے سڑک پر سے گزرنے والی کسی پرائیویٹ گاڑی یا لوڈر وغیرہ سے لفٹ لے لی ہو۔ بہرحال، جو بھی صورت بنی ہو، آپ اس بات کی تسلی رکھیں کہ ہمارے بندے اسے ڈھونڈ کر آپ کی خدمت میں حاضر کر دیں گے۔'' منشی اللہ رکھا نے ایک بار پھر چاپلوسانہ انداز میں چودھری افتخار کو دلاسا دیا۔ چودھری افتخار فی الحال اس کی بات پر ہی بھروسا کرسکتا تھا، چنانچہ منشی کی بات پر ایک ہنکارا بھر کر رہ گیا۔

''میرے لیے کیا حکم ہے سرکار؟'' غیاث محمد نے ہاتھ جوڑتے ہوئے چودھری افتخار سے پوچھا۔

''تو جا اور جا کر کہیں سے اپنی دھی کو تلاش کر۔ اگر وہ نہیں ملی تو سمجھ لینا کہ تیرا انجام اچھا نہیں ہوگا۔'' چودھری افتخار نے قہرناک لہجے میں فیصلہ سنایا۔ غیاث محمد اس فیصلے کو سن کر کانپ اٹھا اور لرزتا ہوا چودھری افتخار کے قدموں میں گر گیا۔

''رحم سرکار رحم! میں آپ کا نمک خوار ہوں۔ میری بدبخت اولاد کی کرنی کی سزا مجھے نہ دیں۔ وہ بدنصیب تھی جو آپ کی بخشی عزت کی قدر نہیں کرسکی۔ میں اور اس کی ماں تو بڑے شوق سے آپ کے دیے ہوئے کپڑے اور زیور لے کر گھر گئے تھے کہ وہ اتنی قیمتی چیزیں دیکھے گی تو اپنے نصیبوں پر ناز کرے گی لیکن اس کرموں جلی نے تو اپنے نصیب کو ٹھوکر مارنے کے ساتھ ساتھ ہمارے بخت پر بھی سیاہی پھیر دی۔ پر آپ تو مجھ پر رحم کریں سرکار! اگر آپ کا ہاتھ میرے سر سے اٹھ گیا تو میں کہاں جاؤں گا۔'' غیاث محمد عورتوں کی طرح دہائیوں پر دہائیاں دے رہا تھا لیکن چودھری افتخار نے کان نہ دھرے اور غیاث محمد کو وہیں خاک چاٹتا چھوڑ کر خود اٹھ کر حویلی کے اندرونی حصے کی طرف چلا گیا۔

☆☆☆

''جانے کیا بات ہے؟ بھاغیاث نے ماہ بانو کو واپس لا کر نہیں چھوڑا۔ میں نے اس سے کہا بھی تھا کہ دو دن سے زیادہ میری دھی کو مت روکنا، پر دیکھو آج تیسرا دن بھی گزر گیا ہے اور بھاغیاث کا کوئی نام و نشان نہیں۔'' فیصل آباد میں اپنے گھر بیٹھی حوراں نے صفدر سے پریشانی کا اظہار کیا۔

''تیرے کہنے سے کیا ہوتا ہے؟ اپنے بھاغیاث کا مزاج جانتی نہیں ہے۔ جب اس کا من کرے گا، تب ہی ماہ بانو کو لا کر چھوڑے گا۔''

''پر مجھے تو ماہ بانو کی فکر ہو رہی ہے۔ کتنی بددلی سے وہ وہاں رکنے کے لیے تیار ہوئی تھی۔ اس کی شکل دیکھ کر میرا اپنا جی نہیں مان رہا تھا کہ میں اسے وہاں چھوڑ کر آؤں۔ اتنی سی صورت نکل آئی تھی میری دھی کی۔'' حوراں کا دل حقیقتاً ماہ بانو میں اٹکا ہوا تھا۔

''جی تو میرا بھی نہیں مان رہا تھا پر میں خود پر جبر کر گیا۔ اگر ماہ بانو کو واپس لانے پر ضد کرتا تو بھاغیاث اپنی اصلیت پر اتر آتا اور خوامخواہ کی بدمزگی ہو جاتی۔ خوشی کے موقعے پر بدمزگی پھیلانا مجھے اچھا نہیں لگا۔'' اس بار صفدر نے بھی اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

''ایسا کرنا کہ کل تم آپ پیر آباد جا کر ماہ بانو کو واپس لے آنا۔ پتا نہیں کیوں میرا جی اس کی طرف سے بڑا پریشان ہو رہا ہے۔ پچھلی بار بھی جب وہاں رکنے گئی تھی تو بیمار ہو کر واپس آئی تھی۔ آنے کے بعد بھی کئی دن تک مجھے کچھ پریشان پریشان سی لگی۔ اصل میں گاؤں کا ماحول اس کے جی کو بھاتا نہیں ہے۔ زہرہ کے بیاہ میں شرکت کے لیے جانے پر بھی بڑی مشکل سے راضی ہوئی تھی۔ حالانکہ کہنے کو زہرہ اس کی بہن ہے، پر مجھے لگتا ہے وہاں گاؤں میں کوئی میری دھی کے ساتھ محبت سے پیش نہیں آتا اس لیے وہ گاؤں جا کر رہنے کے نام پر بدکتی ہے۔''

''اچھا چل، زیادہ اپنا دل میلا نہ کر۔ آخر وہ لوگ کیوں اسے پیار نہیں کریں گے؟ کچھ بھی سہی، ماہ بانو ان کی سگی ہے۔'' حوراں کی تشویش پر صفدر نے اسے سمجھایا۔

''ان لوگوں نے اسے کبھی اپنا سمجھا ہی کب ہے؟ پیدائش پر بوجھ سمجھا، اب تک ویسا ہی سلوک کرتے ہیں۔ اتنے سالوں میں کبھی ایک بار بھی توفیق نہیں ہوئی کہ کبھی برات کے موقعے پر اسے ایک جوڑا ہی بنا کر دے دیں۔'' حوراں ویسے ماہ بانو کو سمجھاتی رہتی تھی لیکن آج خود سارے شکوے لے کر بیٹھی ہوئی تھی۔

''چل جانے بھی دے۔ ان لوگوں کے حالات ہی کہاں ہیں ایسے کہ وہ کچھ کرسکیں۔ اللہ کا کرم ہے کہ میری دھی کے نصیب سے اس نے مجھے اتنا دے رکھا ہے کہ میں خود اس کے سارے شوق پورے کر دیتا ہوں۔ اب بھی بس یہ فکر لگی ہے کہ اتنے روپے جوڑ لوں کہ اس کو ڈاکٹری پڑھانے کا انتظام ہو جائے۔'' صفدر نے حوراں کو ٹوکتے ہوئے بات کا رخ بدلا۔

''ہاں، پڑھنے کا تو اسے بڑا شوق ہے۔ میں نے اس کے لیے جو گہنے بنوائے تھے، وہ اسے دیے تو مجھ سے خفا ہونے لگی کہ بے بے یہ گہنے کیوں بنوائے؟ میرے داخلے کے لیے روپے سنبھال کر رکھ لیتیں۔ میں نے بھی صاف کہہ دیا کہ یہ تیرا اور تیرے ابا کا معاملہ ہے۔ داخلے واخلے کا انتظام وہ خود کرے گا، میرے ذمے تو تیرا جہیز بنانا ہے۔'' حوراں کا دھیان بٹ گیا اور وہ ہنس کر صفدر کو بتانے لگی۔

''انشاء اللہ میں اس کی یہ خواہش ضرور پوری کروں گا۔ میرے لیے تو ماہ بانو ہی بیٹی بھی ہے اور بیٹا بھی۔ میرے بس میں جتنا ہوا میں اس کے لیے اتنے ارمان تو ضرور ہی پورے کروں گا۔''

''اللہ تمہیں ہمت دے۔'' صفدر کی محبت کو محسوس کر کے حوراں مسکرائی پھر چونک کر پوچھنے لگی۔ ''تم نے ماہ بانو کے کالج میں اس کی چھٹی کی درخواست نہیں دی تھی کیا؟ آج شام کے وقت ایک لڑکی آئی تھی ماہ بانو سے ملنے کے لیے۔ میں نے بتایا کہ ابھی ماہ بانو گاؤں سے واپس نہیں آئی تو حیران ہو کر کہنے لگی کہ اچھا! میں تو سمجھی تھی ماہ بانو آج واپس آگئی ہے۔ تھوڑی دیر اندر آ کر بیٹھی اور سارے میں یوں نظر گھما کر دیکھنے لگی جیسے میں نے ماہ بانو کو کہیں چھپا رکھا ہے۔ مجھے اس کی بے تابی پر ہنسی آنے لگی۔ یہ لڑکیاں بالیاں بھی عجیب ہی ہوتی ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ ایسے من لگا لیتی ہیں کہ پھر دو چار دن بھی ایک دوسرے کے بغیر گزارنا مشکل ہو جاتا ہے۔'' حوراں اپنی بات کے اختتام پر ہولے سے ہنسی۔

''میری دھی ہے ہی ایسی کہ سب اس سے پیار کریں۔ ایسے یہ کون سی سہیلی تھی اس کی جو بے تاب ہو کر گھر تک چلی آئی ورنہ میں نے تو کالج میں اطلاع کر دی تھی کہ شاید ماہ بانو ابھی ایک دو دن اور نہ آئے۔''

''کوئی نئی سہیلی لگ رہی تھی۔ اس سے پہلے تو میں نے کبھی اسے نہیں دیکھا تھا۔ کوثر نام بتا رہی تھی۔'' صفدر کے پوچھنے پر حوراں نے اسے بتایا۔

''چل ہوگی کوئی۔ کل میں ماہ بانو کو واپس لے کر آؤں گا تو اسے بتانا، وہ آپ ہی پہچان لے گی۔ بس اب بتی بند کر دے مجھے نیند آنے لگی ہے۔ سویرے اٹھ کر پہلے منڈی سے پھل لے کر آؤں گا پھر ماہ بانو کو لینے کے لیے گاؤں جاؤں گا تاکہ گاؤں سے واپس آکر شام کے وقت اپنا ٹھیلا لگا سکوں۔ میری اصل بکری کا وقت تو شام کو ہی ہوتا ہے۔'' صفدر حوراں کو گفتگو کا سلسلہ ختم کرنے کا اشارہ دیتے ہوئے بستر پر لیٹ گیا۔ اسی وقت کسی نے دروازے پر دستک دی۔

''الٰہی خیر! یہ اس وقت کون آگیا۔'' حوراں گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے گھبرائی۔

''تو تو بس ہر وقت اسی طرح ہولتی رہا کر۔ میں جا کر دیکھتا ہوں۔ ہوسکتا ہے پاس پڑوس میں کسی کو کوئی کام پڑ گیا ہو۔'' صفدر نے حوراں کو ٹوکا اور خود بستر سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس محلے میں اس کا ایک زمانے سے قیام تھا۔ اردگرد سب اعتبار کے لوگ بستے تھے اور امن و امان کی صورت حال بھی تشویشناک نہیں تھی۔ اس لیے بنا کوئی تحقیق کیے کھٹ سے دروازہ کھول دیا۔ دروازے کی دوسری طرف موجود لوگ تو بالکل تیار کھڑے تھے، دروازہ کھلتے ہی وہ صفدر کو دھکا دیتے ہوئے اندر گھس آئے۔

''کک... کون ہو تم؟'' صفدر نے ان کے اس انداز پر گھبرا کر پوچھا۔

''کہاں ہے تیری دھی؟ کہاں چھپایا ہے تو نے اسے؟'' صفدر کے سوال کو نظر انداز کر کے آنے والوں میں سے ایک نے سخت لہجے میں اس سے پوچھا۔

''تم کون ہو جو میری دھی کے بارے میں پوچھ رہے ہو؟'' ایک اجنبی کی زبان سے بیٹی کا ذکر سن کر صفدر کے خون نے جوش مارا اور اس نے بجائے جواب دینے کے کڑے تیوروں سے پوچھا۔ جواباً اس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ آ کر لگا۔ حوراں جو اس طرح اجنبیوں کے اچانک گھر میں آگھسنے سے دم بخود کھڑی رہ گئی تھی، صفدر کو تھپڑ لگتے ہی زور سے چیخی۔

''اس کی آواز بند کرو۔ یہاں گھروں کی دیوار سے دیوار جڑی ہے، کہیں آس پاس والے آوازیں سن کر ادھر نہ آجائیں۔'' وہ شخص جو شروع سے سوال جواب کر رہا تھا، اپنے ایک ساتھی سے بولا تو اس نے آگے بڑھ کر حوراں کا

www.pkdigest.com

دوپٹا گھسیٹا اور اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔

''آخر تم لوگ کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟'' صورتِ حال کی سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے صفدر نے اس بار قدرے بے بسی سے سوال کیا۔

''ہم یہاں تیری دمی کا پتا معلوم کرنے آئے ہیں۔ اسے ہمارے حوالے کر دے اور اپنی جان چھڑا لے۔'' اس شخص نے ایک بار پھر اپنا مطالبہ دہرایا۔

''وہ یہاں نہیں ہے۔ اپنے گاؤں گئی ہوئی ہے لیکن تم لوگ کون ہو اور تمہارا میری دمی سے کیا تعلق ہے؟'' صفدر نے اس شخص کے کڑے تیور دیکھتے ہوئے اس کے سوال کا جواب تو ضرور دیا لیکن خود کو استفسار کرنے سے بھی نہیں روک سکا۔

''جھوٹ بولتا ہے۔ گاؤں سے تو وہ آج دوپہر کو ہی بھاگ نکلی تھی۔ وہاں سے بھاگنے کے بعد وہ تیرے علاوہ اور کس کے پاس جا سکتی ہے؟ یقیناً وہ یہیں آئی ہوگی۔ تو سیدھی طرح ہمیں بتا دے کہ اسے کہاں چھپایا ہے؟'' اس دفعہ اس شخص نے صفدر کے پیٹ میں زوردار لات رسید کرتے ہوئے اس سے ماہ بانو کا پتا معلوم کرنے کی کوشش کی تھی۔

صفدر پیٹ میں لگنے والی اس لات کی تکلیف سے دہرا ہو گیا۔ خوراں جس کے منہ میں کپڑا ٹھونسنے کے ساتھ ساتھ ہاتھ پیر بھی باندھ دیے گئے تھے، صفدر کو تکلیف میں دیکھ کر بے چین ہونے لگی۔

''بول، پتا اگلتا ہے اپنی بیٹی کا یا نہیں؟ اگر تو نے سیدھی طرح سے میرے سوال کا جواب نہیں دیا تو میں تیرے حلق میں ہاتھ ڈال کر پیٹ سے انتڑیاں کھینچ لوں گا۔'' صفدر کی تکلیف کی پروا کیے بغیر اس شخص نے پے در پے اسے کئی مکے اور لاتیں رسید کیں اور اپنا سوال دہرایا۔

''میں سچ سچ نہیں جانتا کہ میری دمی کہاں ہے۔ میں اسے گاؤں میں چھوڑ کر آیا تھا۔ تم لوگ کہتے ہو کہ وہ گاؤں سے بھاگ گئی ہے، یقیناً اس نے ایسا تمہاری وجہ سے ہی کیا ہو گا۔ اب کان کھول کر میرا جواب سن لو۔ اول تو مجھے معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہے لیکن اگر مجھے معلوم بھی ہوتا تو میں ہرگز تم جیسے ظالموں کو اس کا پتا نہیں بتاتا۔'' صفدر جو ابتدا میں ذرا خوف زدہ ہو گیا تھا، اس بار بے جگری سے بولا۔

''تو میری نرمی کی وجہ سے اتنا زور دکھا رہا ہے تو ٹھیک ہے پھر میں بھی دیکھتا ہوں کہ تجھ میں کتنا زور ہے اور تو کب تک میرے سامنے جم سکتا ہے؟'' اس شخص کا لہجہ اچانک ہی بہت بھیانک ہو گیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا تو انہوں نے صفدر کو دبوچ لیا اور ایک چارپائی دیوار کے ساتھ کھڑی کر کے صفدر کو اس کے ساتھ باندھ دیا۔

''اس کا منہ بھی کپڑا ٹھونس کر بند کر دو۔ یہ اگر زبان بند رکھنا چاہتا ہے تو مجھے بھی شوق نہیں اس کی چیخوں سے کٹے والوں کو جمع کرنے کا۔'' صفدر کو چارپائی کے ساتھ باندھنے والوں نے اس حکم کی بھی پیروی کی۔ اب کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔ اس خاموشی کو چاقو کھلنے کی کڑکڑاہٹ نے توڑا۔ یہ چاقو اس شخص نے اپنی جیب سے برآمد کیا تھا اور اب آنکھوں میں حد درجے سفاکی لیے صفدر کی طرف بڑھ رہا تھا۔

صفدر ایک عام سا آدمی تھا، یہ منظر دیکھ کر اس کے جسم سے پسینا چھوٹ پڑا۔ خوراں بھی رحم طلب نظروں سے اس شخص کی طرف دیکھنے لگی لیکن وہ تو جیسے اپنا کوئی من پسند کھیل شروع کرنے جا رہا تھا چنانچہ ان دونوں کی کیفیت کو نظر انداز کر کے صفدر کے قریب پہنچا اور چاقو والا ہاتھ بلند کر کے پوری قوت سے چاقو صفدر کے بازو میں گھونپ دیا۔ تکلیف کی شدت کے باعث صفدر کا جسم بری طرح تڑپا اور بازو میں سے پھوٹنے خون کے دھارے کے ساتھ ساتھ آنکھوں سے آنسو بھی نکل آئے۔ اگر اس کے منہ میں کپڑا نہ ٹھنسا ہوتا تو یقیناً اس کے حلق سے بہت کرب ناک چیخ بلند ہوتی۔ چیخ کا راستہ تو بند تھا لیکن چہرے پر چھائے تاثرات اس کے کرب کی داستان بیان کر رہے تھے۔ صفدر کی یہ حالت دیکھ کر خوراں کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو گئے۔

''اس بڈھیا کا منہ کھولو۔ اگر یہ اپنے شوہر کو تکلیف سے بچانا چاہتی ہے تو پھر اسے اپنی دمی کا پتا بتانا ہوگا۔'' خوراں کی کیفیت نے اس کی صفدر سے محبت کو عیاں کر دیا تھا اس لیے اس سفاک انسان نے اپنے سوال کے جواب کے لیے اب اسے استعمال کرنے کی کوشش کی۔ اس کی ہدایت پر خوراں کے سر پر کھڑا آدمی اس کے منہ میں ٹھونسا دوپٹا نکالنے لگا۔

''خبردار جو منہ کھلنے کے بعد اپنی آواز ذرا بھی بلند کی تو... اگر تمہاری آواز نکلی تو میں اس کی جان نکال دوں گا۔'' خوراں کا منہ کھلنے سے پہلے اسے دھمکی دی گئی۔

''یہ سچ کہہ رہا ہے، ہمیں نہیں معلوم کہ ماہ بانو کہاں ہے۔ ہم اسے گاؤں میں ہی چھوڑ کر آئے تھے۔'' منہ میں کپڑا ٹھونسے جانے کے باعث خوراں کا حلق بری طرح خشک ہو گیا تھا پھر بھی اس نے ہمت کر کے آواز نکالی اور اس شخص کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ردِعمل میں اس شخص نے اپنا ہاتھ ایک بار پھر بلند کیا۔ اس بار صفدر کا دوسرا بازو اس کا نشانہ بنا تھا۔ صفدر اس دوسرے وار پر اس بری طرح تڑپا کہ چارپائی اس کا بوجھ سہار کر کھڑی نہ رہ سکی۔ نتیجتاً صفدر اس حالت میں زمین

پر گرا کہ چارپائی کا پورا بوجھ اس کے اوپر تھا۔

''اللہ کے واسطے رحم کرو۔ میں اللہ اور اس کے رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ ہم لوگوں کو ماہ بانو کے بارے میں کچھ خبر نہیں۔'' حوراں نے صفدر کی حالت دیکھ کر بلک بلک کر روتے ہوئے یقین دلانے کی کوشش کی۔ اس بار اس کی کوشش کسی حد تک کامیاب رہی۔ وہ شخص فرش پر چارپائی کے نیچے پڑے صفدر پر مشقِ ستم کرنے کے بجائے حوراں کی طرف متوجہ ہوا اور اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''اگر وہ تمہارے پاس نہیں آئی تو اس جگہ کا پتا بتاؤ جہاں وہ جا سکتی ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم۔ ہماری ساری برادری گاؤں میں ہی رہتی ہے۔ یہاں اس اور صفدر رہتا ہیں۔ اس گھر کے سوا وہ کہیں نہیں جا سکتی۔'' حوراں نے پوری سچائی سے جواب دیا تھا جس پر یقین نہیں کیا گیا۔

''بڈھیا ہمیں چلانے کی کوشش کر رہی ہے۔ چارپائی سیدھی کر کے کھڑی کرو۔ یہ لوگ خود اپنا بھلا نہیں چاہتے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔'' اس شخص نے دھیمی آواز میں غرا کر حکم دیا۔ اس کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ چارپائی سے بندھے ہوئے صفدر کی گردن ڈھلکی ہوئی تھی اور سر پر ایک بڑا سا کومڑ نظر آ رہا تھا۔ یہ کومڑ یقیناً چارپائی سمیت منہ کے بل گرنے سے آیا تھا۔ وہ نہ تو کوئی عادی مجرم تھا اور نہ ہی مجرموں سے مقابلہ کرنے کی استطاعت رکھنے والا آدمی... چنانچہ ذرا دیر کے اس بدترین تشدد نے اس کی حالت تباہ کر دی تھی۔ خون کے بے تحاشا اخراج اور تکلیف کی شدت نے اس پر کشی طاری کر دی تھی۔

''رحم کرو اس پر۔ تمہارا ظلم اس کی جان لے لے گا۔'' صفدر کی حالت دیکھ کر حوراں بلبلا گئی۔

''اگر میں تم لوگوں کی زبان کھلوا کر تمہاری دھی کا پتا نہیں معلوم کر سکا تو چودھری صاحب ہماری جان لے لیں گے۔'' حوراں کی التجا کا بے حد رکھائی سے جواب دیا گیا۔

''کون چودھری صاحب... کیا چودھری افتخار عالم شاہ؟'' حوراں چونکی۔

''ہاں وہی۔ تیری دھی نے گاؤں سے بھاگ کر ان کے غضب کو للکارا ہے۔'' حوراں کے سوال کا جواب اثبات میں آیا۔

''ماہ بانو کا کیا تعلق چودھری افتخار عالم شاہ سے؟'' حوراں حیرت سے بڑبڑائی۔

''چودھری صاحب کا دل آ گیا تھا اس پر لیکن وہ تو خود کو کوئی اونچی شے سمجھتی ہے۔ اب اپنے ماں بیو کا حال دیکھے گی تو تیر کی طرح سیدھی ہو جائے گی۔''

''ماں بیو قربان اپنی دھی پر۔ اس کی عزت کے بدلے اگر ہمارے جسم کے ٹوٹے ٹوٹے بھی ہو جائیں تو ہمیں دکھ نہیں ہوگا۔'' حوراں نے بے ساختہ ہی جواب دیا جو یقینی طور پر سننے والے کو پسند نہیں آیا۔ وہ غرا کر بولا۔

''تو ٹھیک ہے، میں تمہاری خواہش پر تمہارے جسم کے ٹوٹے ٹوٹے کر ہی ڈالتا ہوں۔'' وہ حوراں کے قریب آیا اور اس کا منہ اپنے ہاتھ سے اچھی طرح دبوچنے کے بعد چاقو اس کے دائیں کان پر رکھ کر ہاتھ کو جنبش دی۔ تیز دھاری چاقو نے لمحہ بھر میں حوراں کے کان کا پنا اڑا دیا۔ منہ اچھی طرح گرفت میں ہونے کے باوجود اس کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخیں برآمد ہوئیں۔

''اسے ہوش میں لاؤ۔ اب بڈھیا دھی سے محبت کا ثبوت دے گی اور یہ ہمارے سوالوں کا جواب دے گی۔'' صفدر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے اپنے ساتھی کو حکم دیا اور خود حوراں کا دوپٹا دوبارہ سے اس کے حلق میں ٹھونس دیا۔ کٹے ہوئے کان کی تکلیف سے حوراں کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ کان سے بہہ کر آنے والا خون اس کی گردن پر سے گزرتا ہوا گریبان میں جذب ہو کر اسے بھگو رہا تھا۔

''ہاں بھئی بڈھے! بول کچھ بتائے گا یا میں اس بڈھیا کا بھی تیری طرح حال کروں۔'' صفدر کے منہ پر پانی ڈال کر اسے ہوش میں لانے کے بعد پوچھا گیا۔ صفدر جو خود پر کیے گئے تشدد کی وجہ سے ہی تباہ حال ہو رہا تھا، حوراں کی حالت دیکھ کر بالکل ہی ڈھے گیا۔

''مت کرو اتنا ظلم۔ ہمیں سچ مچ تمہارے سوال کا جواب نہیں معلوم۔'' صفدر باقاعدہ آنسوؤں کے ساتھ رو پڑا۔

''بالے! مجھے لگتا ہے ان لوگوں کو سچ مچ کچھ معلوم نہیں۔ تو ایسا کر کہ اس سے لڑکی کی سہیلیوں وغیرہ کے پتے معلوم کر... ہو سکتا ہے وہ ڈر کر یہاں آنے کے بجائے اپنی کسی سہیلی کے گھر چلی گئی ہو۔'' اب تک کی ساری کارروائی کے دوران بالے نامی شخص کے احکامات کی پیروی کرنے والے دونوں افراد میں سے ایک نے اپنی خاموشی کو توڑتے ہوئے تجویز پیش کی۔ اس تجویز کو قبول کرتے ہوئے بالے نے یہی سوال صفدر کے سامنے دہرایا۔

''ماہ بانو کی ایک سہیلی تو اسی گلی کے آخری مکان میں رہتی ہے۔ باقی کے پتے مجھے زبانی یاد نہیں۔ ماہ بانو کی ڈائری

سے مل جائیں گے لیکن میرے خیال میں تو ماہ بانو اپنی کسی سہیلی کے گھر نہیں جا سکتی اس کی اپنی کسی سہیلی سے اتنی بے تکلفی نہیں کہ وہ زیادہ دیر کسی کے گھر رک سکے۔'' صفدر حوراں کی حالت دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا تھا۔ دوسرے اسے واقعی یقین تھا کہ ماہ بانو اپنی کسی سہیلی کے گھر نہیں جا سکتی اس لیے اس نے شرافت سے بالے کے سوال کا جواب دے دیا لیکن جواب کے ساتھ جو اظہارِ خیال کیا تھا، اس نے بالے کو ایک بار پھر مشتعل کر دیا۔ وہ صفدر کے سر ہو گیا کہ اگر ماہ بانو اپنی کسی سہیلی کے گھر نہیں گئی ہو گی تو پھر ایسی کسی جگہ کا پتا بتاؤ جہاں وہ مل سکے۔ صفدر کے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا۔ نتیجتاً بالا اس پر اور حوراں پر مسلسل تشدد کرتا گیا۔ حوراں اس تشدد کی تاب نہ لا کر دم توڑ گئی۔ نیم جان صفدر سے بھی جب کچھ ملنے کی امید نہیں رہی تو بالے نے اس کی شہ رگ پر چاقو چلا کر اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔ ان دونوں حرماں نصیب میاں بیوی کی لاشیں اگلی صبح محلے والوں نے دریافت کر کے پولیس کو خبر کر دی۔

☆☆☆

''مجھے اور ناہید کو آج لاہور بھجوانے کا انتظام کر دیں چودھری صاحب!''

''وہ کس لیے؟'' چودھری افتخار اپنی سوچوں میں گم تھا۔ بڑی چودھرائن نے آ کر یہ مطالبہ کیا تو بے خیالی میں پوچھ بیٹھا۔

''صنوبر کو آج اسپتال میں داخل ہونا ہے۔ اس موقعے پر میرا اور ناہید کا وہاں ہونا ضروری ہے۔ اب کشور لڑکی ذات ہو کر تو یہ معاملات سنبھال نہیں سکتی۔'' بڑی چودھرائن نے ذرا تک کر چودھری کے سوال کا جواب دیا۔

''اچھا اچھا... میرے ذہن سے نکل گیا تھا۔ تم مجھے پہلے یاد دلا دیتیں، اب بالکل عین موقعے پر وہاں پہنچو گی۔''

''آپ کو فرصت ہی کہاں ہے جو آپ سے کوئی گل کی جائے۔ ویسے بھی میں نے سوچا تھا کہ اب آپ کے نکاح میں شرکت کر کے ہی لاہور روانہ ہوں گی۔ نئی چودھرائن کے استقبال کے لیے بھی تو یہاں کسی کو ہونا چاہیے تھا، پر افسوس کڑی بھاگ نکلی۔''

بڑی چودھرائن کے لہجے میں بڑی کاٹ اور استہزا تھا، چودھری افتخار تلملا اٹھا اور دہاڑ کر بولا۔ ''منہ بند رکھ اپنا۔''

''ہمیشہ منہ بند ہی رکھا ہے چودھری صاحب! آپ مجھ پر سوتن لا کر بٹھاتے رہے لیکن میں نے کبھی زبان سے اف نہیں کہا۔ میں جانتی تھی آپ ایک عورت پر گزارہ کرنے والے آدمی نہیں پھر میری بڑی عمر کی وجہ سے بھی آپ کا دل میرے ساتھ نہیں لگا۔ اس لیے جب آپ نے ناہید سے بیاہ کیا تو میں خود خوشی خوشی اسے بیاہ کر حویلی لائی۔ عصمت کی بار بھی میں نے زبان نہیں کھولی۔ ناہید اور عصمت سوتنیں تھیں لیکن ان کے آنے سے کم از کم یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ آپ نے کسی کم تر عورت کو سوتن بنا کر مجھ پر لا بٹھایا ہے۔ عصمت کے میکے والے زیادہ اونچی حیثیت کے نہیں تھے لیکن عزت دار لوگ تو تھے، پر اس بار آپ نے جو فیصلہ کیا اس نے بڑا جی کو ماٹھا کیا۔ دنیا میں عورتوں کی کمی ہو گئی تھی جو آپ نے کمی کمینوں کی اولاد کو حویلی کی مالکن بنانے کی کوشش کی۔ اگر جی آ بھی گیا تھا اس لڑکی پر تو یہ نکاح کا کھڑاگ پالنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا میں نہیں جانتی کہ آپ اس سے پہلے بھی بغیر نکاح کے ہی بہت کچھ کرتے رہے ہیں، اس بار بھی وہی کچھ کرتے۔ میری زبان پر کوئی شکوہ نہیں آتا۔ اب آپ نے دیکھ لیا نا کہ وہ کم ذات کیسے آپ کی عزت رول کر جانے کس کے ساتھ بھاگ نکلی؟ کوئی تو ہو گا اس کا ایسا عاشق جو اسے آپ کے نکاح میں آنے سے پہلے ہی لے کر بھاگ نکلا۔''

بڑی چودھرائن کو آج شاید زندگی میں پہلی بار اپنے دل کا غبار نکالنے کا موقع ملا تھا، چنانچہ وہ چودھری افتخار کے غصے کو خاطر میں لائے بغیر بولتی چلی گئی۔

''جا... جا کر سفر کی تیاری کر۔ میں ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کے لیے کہلواتا ہوں۔'' بڑی چودھرائن کی کسی بھی بات کا جواب دیے بغیر چودھری افتخار نے قدرے نرمی سے اسے حکم دیا۔ اس بار بڑی چودھرائن نے اس کی حکم عدولی نہیں کی اور واپس پلٹ گئی۔ اس کے جانے کے بعد چودھری افتخار اس کی کہی باتوں کو سوچنے لگا۔ بڑی چودھرائن نے کچھ بھی غلط نہیں کہا تھا۔ وہ اس اعتراض کو کرنے میں بھی حق بہ جانب تھی کہ چودھری افتخار نے ایک مزارعے کی بیٹی کو اس کی سوتن بنانے کا فیصلہ کر کے اس کی توہین کی تھی۔ خود چودھری افتخار نے بھی کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ اتنی معمولی حیثیت کی لڑکی کو اپنی بیوی کا درجہ دے گا لیکن اس روز ڈیرے پر ماہ بانو کی خود پر تیل چھڑک کر آنے اور آگ لگا لینے کی دھمکی دینے والی ادا چودھری افتخار کے دل کو بھا گئی۔ وہ جسے ایک کمزور لڑکی سمجھ کر اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا، وہ اتنی جی دار نکلی تھی کہ بلا خوف وخطر جان دینے پر تل گئی تھی۔ چودھری کا اس سے قبل ایسی کسی لڑکی سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ نکاحی بیویوں کے علاوہ اس کی خلوت میں آنے والی عورتیں یا تو بکاؤ مال ہوتی تھیں یا وہ خوف زدہ اور بے بس عورتیں جو چودھری کے سامنے ڈھنگ

www.pkdigest.com

سے احتجاج بھی نہیں کر پاتی تھیں۔ زیادہ سے زیادہ وہ چودھری کے سامنے گڑگڑا کر اس سے رحم کی درخواست کرتی تھیں۔ چودھری ایسی کسی درخواست پر کبھی کان نہیں دھرتا تھا اور آخر کار عورت ہار مان لیتی تھی۔ پہلی بار اسے ماہ بانو بھی ان ہی عورتوں میں سے ایک محسوس ہوئی تھی لیکن دوبارہ ڈیرے پر اس نے جس جرأت مندی کا مظاہرہ کیا تھا، اس پر چودھری حیران رہ گیا تھا۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ حویلی میں ماہ بانو کا تقریباً ہتھیار ڈال دینا فوری صدمے کے باعث تھا۔

اس رات وہ بہت گہری نیند سے جگائی گئی تھی اس لیے چودھری افتخار کے سامنے ڈٹ کر کھڑی نہیں ہو سکی تھی لیکن تب بھی موقع ملتے ہی اس نے جرأت مندی کا مظاہرہ کیا تھا اور چودھری افتخار کے منہ پر تھپڑ دے مارا تھا۔ دوسری بار وہ چودھری کی طرف سے ہوشیار تھی اور اس بات کا بندوبست کر کے آئی تھی کہ چودھری اس کے قریب بھی نہ آسکے۔ چودھری اگلی بار کوشش کرتا تو وہ پھر کوئی ترکیب لڑاتی لیکن چودھری نے اگلی بار ایسی کوئی کوشش کرنے کے بجائے ایسا طریقہ اختیار کرنے کی کوشش کی تھی کہ ماہ بانو کے پاس احتجاج کی گنجائش ہی نہیں رہے۔ دراصل چودھری کا دل مچل گیا تھا کہ یہ کم عمر، حسین اور جی دار لڑکی ہمیشہ اس کے تصرف میں رہے۔ ہمیشہ کے اس ساتھ کے لیے شادی کا جال سب سے موزوں تھا لیکن ماہ بانو بہت تیز نکلی تھی اور اس جال میں پھنسنے سے پہلے ہی پھر سے اڑ گئی تھی۔ اب چودھری ایک غضب ناک شکاری کی طرح اسے کھوج نکالنے کے لیے باؤلا ہوا جا رہا تھا لیکن ابھی تک اسے اپنی کسی کوشش میں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

"چودھری صاحب! فیصل آباد سے بالا واپس آ گیا ہے۔ اگر آپ کہیں تو اسے آپ کی خدمت میں حاضر کروں؟" چودھری افتخار اپنی سوچوں میں ہی گھرا بیٹھا تھا کہ منشی اللہ رکھا دستک دے کر اندر آیا اور اسے بالے کے آنے کی اطلاع دیتے ہوئے ادب سے پوچھا۔

چودھری، منشی اللہ رکھا کے انداز سے ہی جان چکا تھا کہ بالا ناکام واپس آیا ہے پھر بھی وہ بالے کی کوششوں سے متعلق تفصیلات جاننے کا خواہش مند تھا چنانچہ منشی کو بالے کو اندر بھیجنے کی اجازت دے دی۔

"اور ہاں سن منشی! ذرا لالا لاہور کے لیے گڈی تیار کروا دے۔ ابھی تھوڑی دیر میں وڈی اور چھوٹی چودھرائن لاہور کے لیے روانہ ہوں گی۔" چودھری افتخار کی طرف سے اجازت ملتے پر منشی تیزی سے پلٹ کر باہر جا رہا تھا کہ چودھری نے اسے روک کر حکم دیا۔

منشی "جی اچھا سرکار" کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بالے کے ساتھ اندر تھا۔ بالے نے ہاتھ جوڑ کر چودھری کو سلام کیا اور چپ چاپ نظر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے اس قدر مؤدبانہ انداز کو دیکھ کر کوئی شخص اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ یہ وہی بالا ہے جو منٹوں میں لوگوں کی کھال اتار کر رکھ دیتا ہے۔ چودھری کے سامنے کھڑے ہو کر اس کی ساری سفاکی عاجزی میں ڈھل گئی تھی۔ شاید یہ بھی قدرت کا کوئی اصول ہے کہ ہر زور آور اور ظالم اپنے سے زیادہ زور آور شخص کے سامنے سر اٹھانے کی جرأت نہیں کرتا۔

"ہاں بول بالے! کیا کیا تو نے فیصل آباد میں؟" چودھری افتخار نے ترش لہجے میں بالے سے دریافت کیا۔

"میں نے اپنی پوری کوشش کر کے دیکھ لی سرکار! منشی اللہ رکھا کی طرف سے حکم ملتے ہی میں اپنے چار بندوں کے ساتھ فوراً فیصل آباد پہنچ گیا تھا۔ دو بندے میں نے بس کے اڈے پر بٹھائے کہ اگر غیاث محمد کی وڈی کسی بس سے اترے تو وہ اسے قابو کر کے واپس گاؤں پہنچا دیں۔ دو بندوں کے ساتھ میں خود صفدر کے گھر کی نگرانی کرتا رہا لیکن پورے دن کوئی نہیں آیا۔ شام کے وقت میں نے چاند بائی کے گھر سے ایک لڑکی بلوا کر سیدھے سادے کپڑوں میں اسے صفدر کے گھر کے اندر بھجوایا کہ وہ بہانے سے اندر کی سن گن لے کر آئے۔ لڑکی غیاث محمد کی وڈی کی بیٹی ہونے کا بہانہ کر کے اندر چلی گئی۔ واپس لوٹ کر اس نے بتایا کہ اندر ایک عورت کے سوا کوئی نہیں۔ رات کو صفدر کے گھر لوٹنے کے بعد اندھیرے میں، میں خود اپنے بندوں کو لے کر اندر جا گھسا۔ گھر کی اچھی طرح تلاشی لی اور صفدر اور حوراں کا بھی ریشہ ریشہ الگ کر کے دیکھ لیا لیکن لڑکی کا کچھ معلوم نہیں ہوا۔ صفدر سے میں نے اس لڑکی کی سہیلیوں کے پتے لے لیے تھے، آج سارا دن چاند بائی کے کوٹھے کی لڑکیاں بہانے بہانے سے ان کے گھروں میں جا کر کھوج لگاتی رہیں لیکن کہیں سے ذرا سی بھی سن گن نہیں ملی۔ اب بھی میں اپنے بندے فیصل آباد چھوڑ کر آیا ہوں کہ کڑی کی سہیلیوں پر نظر رکھیں اور جیسے ہی کچھ معلوم ہو فوراً حرکت میں آ جائیں۔" بالے نے اپنی ساری کارگزاری سنائی۔

"اور صفدر اور حوراں کا کیا کیا... ان پر بندے نہیں لگائے؟" چودھری افتخار نے پوچھا۔

"بڈھا ذرا سی مار پر ہی جان سے گزر گئی تھی، مجبوراً مجھے بعد میں صفدر کا بھی کام تمام کرنا پڑا ورنہ وہ بیوی کی موت پر

بعد میں شور مچا کر سب کے سامنے آپ کا اور میرا نام لے دیتا۔ پر آپ فکر نہ کریں جی چودھری صاحب! میں نے بہت اچھی طرح دونوں کو چھان پھٹک کر دیکھ لیا تھا، انہیں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔" بالے نے چودھری کے سوال کا جواب دیتے ہوئے اسے تسلی دی۔

"انہیں کچھ معلوم نہیں تھا... تو کچھ معلوم نہیں کر سکا تو اب کیا میں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر صبر کر کے بیٹھ جاؤں؟ تم مسٹنڈوں کی اتنی بڑی فوج میں نے اس لیے پال رکھی ہے کہ کام دکھانے کے وقت تم لوگ منہ لٹکا کر اپنی ناکامی کی رپورٹ سنانے میرے پاس چلے آؤ۔" چودھری افتخار بالے کی تسلی پر غصے سے دہاڑا۔

"نہیں جی چودھری صاحب! ہم نے ابھی اپنی ہار نہیں مانی ہے۔ میرے بندے اپنی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ میں بس اس لیے آ گیا تھا کہ آپ کو اب تک کی رپورٹ دے دوں۔ ساتھ یہ فوٹو بھی لے کر آیا ہوں۔ صفدر کے گھر کی تلاشی میں ملے تھے۔ میں نے سوچا یہ فوٹو تلاش کے کام میں مدد دے سکتے ہیں۔" بالے نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر کاغذ کا ایک لفافہ باہر نکالا اور ادب سے چودھری افتخار کو پیش کیا۔

چودھری افتخار نے لفافے میں سے تصویریں نکالیں۔ یہ کل چار عدد پاسپورٹ سائز تصویریں تھیں۔ دو تصویریں کسی فوٹو اسٹوڈیو میں جا کر کھنچوائی گئی تھیں۔ ان میں ماہ بانو، صفدر اور حوراں کے ساتھ نظر آ رہی تھی۔ ایک تصویر کسی شادی کے موقعے پر لی گئی تھی۔ ماہ بانو بیش قیمت کپڑوں میں ڈھولک بجاتے ہوئے بڑی پرجوش سی نظر آ رہی تھی۔ ایک پاسپورٹ سائز تصویر نیلے بیک گراؤنڈ کے ساتھ صرف چہرے کی تھی۔ اس تصویر میں ماہ بانو نے سر اور گردن کے گرد سفید اسکارف خوب اچھی طرح لپیٹ رکھا تھا۔ شاید یہ تصویر کالج کے فارم وغیرہ کے ساتھ منسلک کرنے کے لیے کھنچوائی گئی تھی۔ آخری تصویر میں بھی ماہ بانو کالج یونیفارم میں ہی تھی۔ یہ تصویر کالج کے لان میں لی گئی تھی۔ پس منظر میں کالج کی عمارت اور نام صاف نظر آ رہا تھا۔ سبزے کے درمیان سفید لباس میں کھڑی کھلکھلا کر ہنستی ہوئی ماہ بانو نے قدرے بے پروائی سے دوپٹا اوڑھ رکھا تھا۔ کالج کے آزادانہ ماحول میں بے فکری کے تاثرات والی ماہ بانو کی یہ تصویر سب سے زیادہ خوب صورت تھی۔ اس تصویر کو دیکھ کر چودھری افتخار کے سینے میں نئے سرے سے آگ بھڑک اٹھی۔

"وہاں اور تصویریں بھی تھیں سرکار! لیکن وہ ساری اتنی صاف نہیں تھیں۔ میں چن چن کر کام کی تصویریں لے آیا ہوں۔" بالے کی آواز نے چودھری افتخار کو تصویر پر سے نظر اٹھانے پر مجبور کیا۔

"ٹھیک ہے۔ تم جاؤ اور اپنی کوشش جاری رکھو۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان تصویروں سے کیا کام لیا جا سکتا ہے۔" چودھری افتخار نے بالے کو حکم سنایا۔ بالا ہاتھ جوڑ کر سلام کرتا ہوا الٹے قدموں واپس پلٹ گیا۔ منشی اللہ رکھا نے بھی اس کی پیروی کی۔ اب چودھری اپنے کمرے میں تنہا تھا۔ اسے جی بہلانے کے لیے ماہ بانو کی تصویر میسر آ گئی تھی لیکن سچ یہ تھا کہ تصویر دل کو بہلانے کے بجائے اُکسانے کا کام زیادہ کر رہی تھی۔

☆☆☆

"ایک بری خبر ہے سر!"

"خیریت، کیا ہوا ہے؟" عبدالمنان کے پُرتفکر چہرے کو دیکھتے ہوئے شہریار نے تشویش سے پوچھا۔

"وہ... جس لڑکی کو چودھری افتخار سے بچانے کے لیے ہم نے دارالامان میں پناہ دلوائی ہے، اس کے ماں باپ کو قتل کر دیا گیا ہے۔"

"کس نے اطلاع دی ہے؟ کیا پیر آباد سے کوئی آیا ہے؟" عبدالمنان کی دی ہوئی اطلاع پر شہریار چونکا۔

"نور... قتل پیر آباد والے ماں باپ کا نہیں، فیصل آباد میں مقیم لڑکی کی پرورش کرنے والے ماں باپ کا ہوا ہے۔ اصل میں لڑکی کو بہت فکر تھی کہ اس کے اس طرح غائب ہو جانے سے اس کے ماں باپ بہت پریشان ہوں گے۔ اس نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ فیصل آباد میں اطلاع کروا دی جائے کہ وہ خیریت سے ہے اور چودھری افتخار سے بچنے کے لیے لاہور کے ایک دارالامان میں پناہ گزین ہے۔ میں نے لڑکی سے وعدہ کر لیا تھا کہ یہ کام کروا دوں گا لیکن فوری طور پر عمل نہیں کر سکا۔ اصل میں معاملہ ایسا ہے کہ اس کام کو کروانے کے لیے ہر ایک پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ مشابرم خان اس سارے معاملے سے واقف بھی ہے اور آدمی بھی اعتماد کا ہے، اس لیے اسی سے فیصل آباد پیغام پہنچانے کا کام لوں گا۔ مشابرم خان یہاں بھی بہت مصروف رہتا ہے اس لیے اسے میں فوری طور پر فیصل آباد نہیں بھیج سکا۔ آج صبح میں نے اسے اس کام کے لیے بھیجا تھا، اب وہ واپس آیا ہے تو اس اطلاع کے ساتھ کہ اس لڑکی کے والدین حوراں اور صفدر قتل کیے جا چکے ہیں۔" عبدالمنان نے بتایا۔

www.pkdigest.com

"قتل کا محرک کیا تھا؟"

"واضح طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ البتہ یہ ضرور معلوم ہوا ہے کہ قتل سے پہلے دونوں میاں بیوی پر بے تحاشا تشدد کیا گیا تھا۔ کارروائی رات کے وقت کی گئی تھی۔ صبح اہل محلہ میں سے کسی نے لاشیں دیکھ کر پولیس کو اطلاع دی۔ مقتولین کے آس پڑوس والے شدید حیرت کا شکار ہیں کہ اتنی سنگین کارروائی کا انہیں ذرا بھی علم نہیں ہوسکا۔ نہ تو کھٹ پٹ کی آوازیں سنائی دیں اور نہ ہی تشدد کے نتیجے میں میاں بیوی کی چیخیں ان تک پہنچیں۔ پولیس کا اندازہ ہے کہ قاتل کوئی بہت منجھے ہوئے مجرم تھے جنہوں نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ اس گنجان آبادی والے محلے میں کسی کو ان کی کارروائی کا علم نہ ہوسکے۔ عورت کی لاش اس حالت میں ملی ہے کہ اس کے منہ میں حلق تک کپڑا ٹھنسا ہوا تھا، یعنی مجرموں نے تشدد کرنے سے پہلے ہی چیخوں کی روک تھام کا انتظام کرلیا تھا۔ محلے کی ایک عورت نے بتایا ہے کہ مقتولہ حوراں کی کچھ عرصے پہلے ایک لاکھ کی کمیٹی نکلی تھی۔ حوراں نے کمیٹی کی اس رقم میں اپنی طرف سے کچھ اور رقم ملا کر اپنی بیٹی ماہ بانو کے لیے زیور خریدا تھا۔ محلے دار عورت کو یہ بات اس لیے معلوم ہے کہ کمیٹی اسی کے گھر ڈالی گئی تھی اور حوراں نے زیور کی خریداری بھی اسی کے ساتھ جاکر کی تھی۔ عورت کے اس بیان کے بعد پولیس نے رائے قائم کی ہے کہ یہ ڈاکا زنی کی واردات تھی۔ ڈاکوؤں کو کہیں سے اطلاع مل گئی تھی کہ اس گھر میں زیور اور روپیا ہے اس لیے انہوں نے موقع دیکھ کر واردات کر دی۔" عبدالمنان نے تفصیل بتائی۔

"مجھے تو پولیس کا یہ اندازہ درست نہیں لگ رہا۔ زیور اتنی بڑی مالیت کا نہیں تھا کہ اس کے لیے اتنی منظم کارروائی کی جاتی۔ پھر جس طرح کے تشدد کا ذکر کیا جارہا ہے، ذرا سے زیور کو بچانے کے لیے ایسا تشدد کوئی نہیں برداشت کرتا۔ لوگ اپنی جان بچانے کے لیے عموماً فوری طور پر خود ہی سب کچھ ڈاکوؤں کے حوالے کر دیتے ہیں۔" عبدالمنان کی بتائی ہوئی تفصیلات سن کر شہریار نے خیال آرائی کی۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر لیکن پولیس کی رائے کو اس وجہ سے تقویت مل رہی ہے کہ جائے واردات سے کسی قسم کا زیور اور روپیا پیسا برآمد نہیں ہوا ہے اور گھر کی حالت بھی ایسی ہے جیسے کسی نے وہاں کی تلاشی لی ہو۔ اس صورت حال سے یہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دونوں میاں بیوی کو قتل کرنے والے واقعی ڈاکو تھے۔ ہوسکتا ہے میاں بیوی نے زیور اور روپیا ان کے حوالے کرنے میں مزاحمت سے کام لیا ہو جس کے جواب میں ڈاکوؤں نے ان پر تشدد کیا اور آخر میں دونوں کو قتل کرنے کے بعد روپیا اور زیور لے کر فرار ہوگئے۔"

"پولیس کی رائے ٹھیک بھی ہوسکتی ہے لیکن میں اس کیس میں چودھری کی انوالمنٹ کا خدشہ محسوس کر رہا ہوں۔ خاص طور پر منظم طریقے سے کیا جانے والا تشدد مجھے شک میں ڈال رہا ہے۔ واردات کا انداز ایسا ہے جیسے مجرم پہلے سے یہ سوچ کر آئے ہوں کہ انہیں دونوں میاں بیوی سے کچھ اگلوانا ہے اور اس طرح سے اگلوانا ہے کہ شور بھی نہ ہو۔ انہوں نے اپنے تشدد کے جواب میں پیدا ہونے والی چیخوں کے روکنے کا خصوصی انتظام کیا۔ ڈاکوؤں کو عموماً اتنا تشدد سے کام نہیں لینا پڑتا۔ وہ تشدد کرتے بھی ہیں تو اس میں فوری اشتعال کا دخل ہوتا ہے اور اس اشتعال کے اظہار میں یقیناً احتیاطی تدابیر اختیار کرنا مشکل ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ اگر حوراں اور صفدر نے زیورات کا پتا بتانے میں مزاحمت سے کام لیا تھا تو ڈاکوؤں کے لیے سب سے آسان حل یہ تھا کہ دونوں میاں بیوی کو باندھ کر ڈالتے اور گھر کی تلاشی لے لیتے۔ آخر ایک پھل فروش کا گھر کتنا بڑا ہوسکتا ہے اور اس میں کتنے خفیہ مقامات ہوسکتے ہیں جنہیں ڈھونڈنا ڈاکوؤں کے لیے مشکل ہو۔ میرے خیال میں تو اس بے پناہ تشدد کے پیچھے کوئی اور بات ہے۔ مجرم ان دونوں میاں بیوی سے کوئی ایسی بات معلوم کرنا چاہتے تھے جس کا جواب وہ نہیں دے سکے اور شدید ترین تشدد کو سہتے رہے۔ وہ بات کیا ہوسکتی ہے، موجودہ حالات میں آسانی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ شاید تمہیں یاد ہو کہ میں نے بتایا تھا کہ چودھری افتخار نے ماہ بانو کی تلاش میں اپنے بندوں کو فیصل آباد بھی روانہ کیا تھا۔ ان لوگوں کو یقین ہوگا کہ پیر آباد سے نکل کر ماہ بانو فیصل آباد ہی جاسکتی ہے۔ پہلے انہوں نے گھر میں اسے تلاش کیا ہوگا اور جب وہ انہیں وہاں نہیں ملی ہوگی تو انہیں لگا ہوگا کہ حوراں اور صفدر نے اسے کسی دوسری جگہ چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ اس دوسری جگہ کا پتا معلوم کرنے کے لیے ہی انہوں نے دونوں پر اتنا ظلم کیا ہوگا۔"

"لیکن ظاہر ہے وہ بے چارے کچھ جانتے ہی نہیں تھے تو انہیں کیا بتا سکتے تھے۔ میں اس سلسلے میں اس لیے بھی شک، شبے کا اظہار کر رہا ہوں کہ ڈاکو عموماً بلاوجہ قتل کرنے سے اجتناب کرتے ہیں۔ ان سے کسی واردات کے دوران اگر قتل ہوتا ہے تو اس کا محرک فوری اشتعال، اپنا بچاؤ یا پھر واردات کے بعد اپنے پہچان لیے جانے کا ڈر ہوتا ہے۔ فوری اشتعال تو اس واردات میں کہیں نظر ہی نہیں آرہا۔ بچاؤ والا نظریہ اس لیے غلط ہے کہ دو ادھیڑ عمر میاں بیوی میں سے کسی کی بھی ہمت

نہیں ہوسکتی تھی کہ وہ ڈاکوؤں کے لیے کوئی خطرہ پیدا کریں۔ آخری بات کا امکان ہے کہ مجرموں نے اپنی شناخت پر پردہ ڈالنے کے لیے میاں بیوی کو قتل کیا ہو لیکن یہاں ہم یہ بھی تو سوچ سکتے ہیں کہ مجرموں نے یہ قتل اس لیے کیا کہ مقتولین اگر زندہ رہ جاتے تو وہ پولیس کو اپنے ساتھ ہونے والی واردات کی اصلیت سے آگاہ کرسکتے تھے۔" شہریار نے بہت گہرائی میں جاکر پوری واردات کا تجزیہ کیا تھا۔ اس کے تجزیے کے بعد عبدالمنان کو بھی یقین ہوگیا کہ واقعی، ہو نہ ہو حوراں اور صفدر کے بہیمانہ قتل کے پیچھے چودھری افتخار کا ہاتھ ہے اور اس ہاتھ کو پوشیدہ رکھنے کے لیے واردات کو ڈاکے کا رنگ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

"میں آپ کے خیال سے اتفاق کرتا ہوں سر... لیکن بات وہی ہے کہ صرف تھیوری کی بنیاد پر ہم چودھری افتخار پر الزام عائد نہیں کرسکتے۔ ہمیں اس کے خلاف ثبوت بھی درکار ہیں۔"

"یہی تو مسئلہ ہے۔ چودھری افتخار جیسے لوگ بہت چالاک ہوتے ہیں۔ ہم اگر کوشش کرکے کوئی ثبوت تلاش بھی کرلیں تو زیادہ سے زیادہ چودھری کے کسی بندے تک ہی پہنچ سکیں گے اور وہ بندہ اتنا نمک خوار ہوگا کہ اپنی جان کے بدلے بھی چودھری کا نام کسی عدالت میں نہیں لے گا۔ اب ہمارے پاس یہی صورت بچتی ہے کہ ماہ بانو کو سامنے لے آئیں اور کم از کم چودھری کے ان کرتوتوں کو تو سامنے لے کر آئیں کہ کیسے وہ اپنے محکوم افراد کی عورتوں کی عزت کو تماشا بنانے کی کوشش کرتا ہے۔" عبدالمنان کی بات کا جواب دیتے ہوئے شہریار کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔

"اس سلسلے میں، میں نے ایک این جی او کو اپروچ کیا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کیس کے سامنے آنے سے چودھری افتخار کو بہت زیادہ فرق نہیں پڑے گا۔ زیادہ سے زیادہ میڈیا پر کچھ دن شور رہے گا پھر خاموشی چھا جائے گی۔ چودھری صاف کہہ دے گا کہ اس پر بے بنیاد الزامات لگائے جارہے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ وہ تسلیم کرے گا تو اتنا کہ اس نے ماہ بانو کے لیے شادی کا پیغام بھیجا تھا۔ ظاہر ہے، اس قسم کا پیغام بھیجنا کوئی جرم نہیں۔ اگر عمر کے تفاوت کو بنیاد بنا کر چودھری کو لعن طعن کیا جائے تو بھی وہ کہہ دے گا کہ میں نے تو صرف رشتہ بھیجا تھا، کوئی زور زبردستی نہیں کی تھی۔ لڑکی کو اگر کوئی اعتراض تھا تو اپنے والدین کے سامنے احتجاج کرتی۔" عبدالمنان نے شہریار کو معاملے کا ایک اور رخ دکھایا۔

"میں اس بات کو سمجھتا ہوں عبدالمنان! ہم ماہ بانو کے کیس میں چودھری افتخار کو کسی طرح مجرم ثابت نہیں کرسکتے لیکن میری خواہش ہے کہ چودھری کے ایگو پر ایک ضرب تو ضرور لگائی جائے۔ دوسرے میرے سامنے ماہ بانو کے تحفظ کا بھی مسئلہ ہے۔ میں نے ابتدا میں اسے فیصل آباد اسی لیے نہیں جانے دیا تھا کہ مجھے معلوم تھا کہ چودھری افتخار وہاں پہنچ کر اسے آسانی سے دوبارہ ٹریپ کرلے گا۔ میں اس لڑکی کی بیک مضبوط کرنا چاہتا تھا۔ اگر کوئی بڑی این جی او اس کے پیچھے کھڑی ہوجاتی تو چودھری افتخار کو مجبوراً پیچھے ہٹنا پڑتا لیکن افسوس کہ اب تو اس بے چاری سے اس کا ٹھکانا ہی چھن گیا ہے۔ دارالامان میں وہ کب تک رہ سکتی ہے؟ خیر، جو ہوگیا سو ہوگیا لیکن اب ہمیں اس مظلوم لڑکی کے مستقبل کے بارے میں سوچنا ہوگا۔ اسے کسی ایسے شخص یا ادارے کی سرپرستی مل جائے جو چودھری افتخار کے مقابل ڈٹ کر کھڑا ہوسکے تو اس لڑکی کے حق میں بہتر ہوگا۔ کسی این جی او کے ذریعے میڈیا کی انوالمنٹ کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ چودھری افتخار براہ راست لڑکی پر ہاتھ ڈالنے سے گریز کرے گا۔ وہ سمجھ جائے گا کہ اگر اس نے ایسی کوئی کوشش کی تو الزام اس کے سر پر ہی آئے گا۔" شہریار کو خود اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ ماہ بانو کے کیس میں کیوں اتنی گہری دلچسپی لے رہا ہے اور کیوں اس کے تحفظ کے لیے اتنا پریشان ہے؟

"میں کسی حد تک آپ کا مقصد سمجھ رہا ہوں سر! آپ بے فکر رہیں، میں جلد از جلد اس سلسلے میں کارروائی شروع کرواتا ہوں۔" شہریار کی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے عبدالمنان نے اسے یقین دلایا۔

"پلیز! تم اس معاملے کو تیزی سے نمٹاؤ۔ ان دارالامانوں کا بھی کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ وہاں پر حفاظت کے خیال سے بھیجی جانے والی خواتین محفوظ رہتی بھی ہیں یا نہیں۔" شہریار نے ایک اور نکتے کی طرف عبدالمنان کی توجہ دلوائی۔

"اس طرف سے آپ بالکل بے فکر رہیں۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر بہت اچھی ساکھ رکھنے والے دارالامان کا انتخاب کیا ہے۔ اول تو وہاں لڑکی کو کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی، اگر کوئی مسئلہ ہوتا بھی ہے تو وہاں کا ایک چوکیدار خیال رکھے گا۔ وہ چوکیدار مشابرم خان کے علاقے سے تعلق رکھتا ہے۔ مشابرم خان کی اس سے دوستی ہے۔ وہ خاص طور پر اپنے دوست کو لڑکی کا خیال رکھنے کی تلقین کرکے آیا ہے۔" عبدالمنان نے اطلاع دی تو شہریار نے کافی حد تک خود کو پرسکون محسوس کیا۔ یہ سکون ماہ بانو کے محفوظ ہونے کے خیال

www.pkdigest.com

سے تھا... مگر سوال وہی تھا کہ آخر اسے ہی شہریار عادل ایک اجنبی لڑکی کے تحفظ کے لیے اتنا پریشان تھا ہی کیوں؟

☆☆☆

"کیا سوچا ہے چاچا! اب کیا کرو گے؟ ماہ بانو کا تو کہیں سے کوئی اتا پتا نہیں ملا۔ وہ مل جاتی تو اس کے چودھری کے ساتھ دو بول پڑھوا کر تمہاری جان چھوٹ جاتی، پر اب تو ساری برادری مشکل میں ہے۔ کچھ معلوم نہیں کہ کب چودھری کا ضبط جواب دے جائے اور وہ ہم پر قہر بن کر ٹوٹ پڑے۔" غیاث محمد کے دونوں داماد اور بیٹیاں اس کے گھر پر جمع تھے۔ وہ سب ہی اپنی اپنی جگہ پریشان تھے۔ اس وقت بھی غیاث محمد کے بڑے داماد انور نے سوال اٹھاتے ہوئے اسے حالات کی نزاکت کا احساس دلایا۔

"کیا کروں پُتر... کچھ پتے نہیں پڑ رہا کہ کیا کروں اور کہاں سے اس بدبخت کو ڈھونڈوں؟ اپنے طور پر کوشش کی تھی کہ فیصل آباد میں صفدر اور حوراں کے جان پہچان والوں سے ماہ بانو کا پتا معلوم کر سکوں، پر اُدھر بھی کچھ معلوم نہیں ہوا۔ میری جان تو دہری مشکل میں پڑ گئی ہے۔ ادھر چودھری کا خوف ہے تو دوسری طرف لڑکی ذات کے غائب ہونے سے عزت پر بن آئی ہے۔ ساری برادری میں کہیں سر اٹھا کر بات کرنے کے لائق نہیں رہا۔ حوراں اور صفدر کے جنازے سے سب ہی پوچھ رہے تھے کہ ماہ بانو کہاں ہے؟ میرے پاس کوئی جواب ہوتا تو دیتا۔ سر نیہوڑائے بیٹھا رہا، پر اس طرح کوئی لوگوں کی زبانیں بند ہوتی ہیں۔ لوگ طرح طرح کی باتیں بنا رہے تھے۔ ایک دو کو تو میں نے یہ تک کہتے سنا کہ ماہ بانو سارا روپیا اور زیور لے کر اپنے کسی یار کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ جاتے جاتے اس نے اپنے یار کے ساتھ مل کر صفدر اور حوراں کو قتل کر دیا ہے۔ اب بتاؤ، یہ سب سن کر میں کیا کرتا؟ جی تو یہی چاہ رہا تھا کہ کسی طرح وہ بدبخت میرے سامنے آجائے تو اپنے ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹ دوں۔ کیا فائدہ ایسی اولاد کا جو جان بھی مشکل میں ڈالے اور عزت بھی مٹی میں رول دے۔" غیاث محمد خود اچھا خاصا بھرا بیٹھا تھا، داماد کے چھیڑتے ہی پھٹ پڑا۔

"تم اپنی جان کو رو رہے ہو چاچا! مجھے تو ساروں کی فکر پڑی ہے۔ چودھری کی خاموشی کو معمولی نہ جانو۔ اس کی خاموشی کسی بھی وقت طوفان بن کر ہمیں تباہ کر سکتی ہے بلکہ مجھے تو لگتا ہے کہ ماسی حوراں اور خالو صفدر کے قتل کے پیچھے بھی کوئی اور بات ہے۔ اگر زیور وغیرہ کے چکر میں ڈاکا پڑنا تھا تو پہلے کیوں نہیں پڑا؟ وہ جس عورت نے کمیٹی اور زیور کی کہانی سنائی تھی، اس نے یہ بھی تو بتایا تھا کہ ماسی حوراں نے زہرہ کے بیاہ سے پہلے ماہ بانو کے لیے زیور خریدا تھا، پر ڈاکا پڑا ماہ بانو کے یہاں سے بھاگنے کے بعد۔ کوئی میری مانے یا نہ مانے پر میں تو کہوں گا کہ گل کچھ ہور ہی ہے۔" انور نے ایک بار پھر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

"پر ماسی کے گھر سے زیور اور روپیا غائب تو تھا، اگر ماسی اور خالو صفدر کو قتل کرنے والے ڈاکو نہیں تھے تو انہوں نے زیور وغیرہ کیوں ہتھیالیا؟" انور کی بات پر زہرہ نے اعتراض کیا۔ اس حادثے نے اسے اندر سے ہلا دیا تھا۔ بے شک اس نے سب کے سامنے یہ کہانی بنا دی تھی کہ ماہ بانو اسے دھوکے سے غسل خانے میں بند کر کے فرار ہو گئی ہے لیکن حقیقت تو وہ جانتی تھی کہ ماہ بانو کو فرار کروانے میں اس نے خود مدد کی تھی۔ وہ بہن کی حالت دیکھ کر پسیج گئی تھی مگر اب جو حالات تھے، ان کو دیکھتے ہوئے لگتا تھا کہ شاید اس سے کوئی غلطی ہو گئی ہے۔ خاص طور پر حوراں اور صفدر کے قتل کا بوجھ وہ اپنے شانوں پر محسوس کر رہی تھی اور اس الزام سے خود کو بری رکھنے کے لیے صفدر اور حوراں کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کو ڈاکازنی کی واردات ہی قرار دینا چاہتی تھی۔

"تو چپ کر۔ تجھے کیا معلوم کہ دنیا میں کیا کیا ہوتا ہے۔ کیا بھروسا کہ ماسی اور خالو صفدر کو قتل کرنے کے بعد زیور اور روپیا اسی لیے غائب کر دیا گیا ہو کہ کسی دوسری طرف شک نہ جائے اور کیا معلوم کہ جس محلے دار نے دونوں کی لاشیں دیکھیں، پہلے اس نے ہی سب کچھ اڑا لیا ہو پھر بعد میں پولیس کو خبر دی ہو۔" رب نواز نے زہرہ کو ڈپٹ کر اپنا خیال پیش کیا۔

"میرے خیال میں تو ڈاکا واکا کچھ نہیں پڑا۔ زیور میں نے زہرہ کے بیاہ کے موقعے پر ماہ بانو کے پاس دیکھا تھا۔ برات والے روز اس نے کانوں میں سونے کے بُندے پہنے بھی تھے۔ ہو سکتا ہے کہ حوراں واپس جاتے وقت اپنے ساتھ زیور لے کر ہی نہ گئی ہو۔ ویسے بھی ماہ بانو اپنے بیگ کو بڑی حفاظت سے تالا لگا کر رکھتی تھی۔ سامان میں کوئی قیمتی چیز ہو گی، تب ہی تو وہ حفاظت کرتی تھی۔ نصیبوں جلی جاتے جاتے وہ بیگ بھی اپنے سینے سے لگا کر لے گئی۔" اب تک خاموش بیٹھی نوراں نے ایک حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہوئے دہائی دی اور سر پکڑ کر رونا شروع کر دیا۔

"خیر، جو بھی معاملہ ہے اور ماہ بانو نے جو بھی کچھ کیا، میں صاف بتا رہا ہوں کہ مجھ پر اور میرے گھر والوں پر اس بات کی کوئی ذمے داری نہیں۔ میں دبئی واپس جا کر زہرہ کو

"یہ تم نے اس کی گاڑی میں کون سی گیس ڈال دی ہے؟"

بھی تھوڑے عرصے میں وہیں بلوا لوں گا۔ یہاں تو بیاہ کے بعد چار دن بھی سکھ کے دیکھنے کو نہیں ملے۔ پہلے سے خبر ہوتی تو میں اماں ابا کو منع کر دیتا کہ کوئی ضرورت نہیں ہے یہاں رشتہ جوڑنے کی۔ اب دبئی واپس جاؤں گا بھی تو سارا وقت یہی فکر لگی رہے گی کہ پیچھے سے کچھ ہو نہ جائے۔" رب نواز نے بگڑے تیوروں کے ساتھ نہایت بدلحاظی سے اعلان کرتے ہوئے کہا۔

"رب نواز ٹھیک کہہ رہا ہے چاچا! اس مصیبت کو تم اکیلے ہی بھگتنا۔ ہم میں ہمت نہیں ہے چودھری صاحب کے غضب کو برداشت کرنے کی۔ اگر چودھری صاحب نے تمہارے لیے خفگی دکھائی تو میں تو صاف اعلان کر دوں گا کہ میرا اور میرے گھر والوں کا تمہارے گھر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" رب نواز نے سگا بھتیجا ہوتے ہوئے بری جھنڈی دکھا دی تھی تو انور کس بات کا لحاظ کرتا؟ اس نے بھی صاف بتا دیا کہ مشکل وقت میں وہ نوراں اور غیاث محمد کا ساتھ دینے والوں میں سے نہیں ہوگا۔

"یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ لوگ۔ اماں ابا کوئی ہم سے الگ تو نہیں ہیں جو مشکل وقت میں ہم انہیں اکیلے چھوڑ دیں گے۔" زہرہ نے شوہر اور بہنوئی دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے احتجاج کیا۔

"جو کچھ تھا وہ میں نے بتا دیا۔ اگر نگار کو شوق ہو تو بے شک یہاں رک جائے، پر میں تو اب دوبارہ یہاں نہیں آنے والا۔" انور نے اپنی بات کہہ کر فوراً ہی جگہ چھوڑ دی۔ رب نواز بھی اس کی تقلید میں کھڑا ہو گیا۔ زہرہ اور نگار دونوں ہراساں و پریشان اپنے اپنے شوہروں کو دیکھنے لگیں۔ ان دونوں کے تیور صاف بتا رہے تھے کہ وہ اپنی جان بچانے کے لیے اپنی بیویوں سے قطع تعلق کرنے میں ذرا لحاظ نہ کریں گے۔

"نی کُڑیوں! جاؤ، اپنے اپنے میاؤں کے ساتھ اپنے گھر جاؤ۔ ہم اپنے سر پڑی بھگتیں گے یا تم دونوں کا بوجھ سنبھالیں گے۔" نوراں نے جو دامادوں کے تیور دیکھے تو جلدی سے بیٹیوں سے بولی۔ ماں کا رویہ دیکھ کر نگار اور زہرہ نے جلدی سے اپنی اوڑھنیاں اچھی طرح لپیٹیں اور اپنے شوہروں کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئیں۔ انور اور رب نواز باہر نکلے تو وہ دونوں ان کے پیچھے پیچھے تھیں۔ اس میکے کی محبت میں رکتیں بھی کیسے جہاں انہیں صرف اور صرف بوجھ ہی سمجھا گیا تھا۔

☆☆☆

"شہریار! تمہارا فون ہے۔" وہ ڈائننگ ٹیبل سے اٹھا ہی تھا کہ اس کی ممانی مسز آفرین رانا نے اسے اطلاع دی۔ شہریار جو کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کے خیال سے اپنے بیڈ روم کی طرف جانے کا ارادہ رکھتا تھا، اس اطلاع پر ٹیلی فون کی طرف بڑھ گیا۔

"موتی والا بات کر رہا ہوں شہریار صاحب!" شہریار کی "ہیلو" کے جواب میں دوسری طرف سے تعارف کروایا گیا۔

"جی موتی والا صاحب! فرمائیے کیسے مزاج ہیں؟" موتی والا کی کال پر تھوڑا سا حیران ہونے کے باوجود شہریار نے خوش دلی سے دریافت کیا۔

"ٹھیک ہی سمجھ لیں۔" موتی والا نے اداس سے لہجے میں جواب دیا پھر فوراً ہی سنبھل کر بولا۔

"بے وقت زحمت دینے کے لیے معذرت چاہتا ہوں۔ اصل میں تو میں نے آپ کے دفتر ہی فون کیا تھا، وہاں سے معلوم ہوا کہ آپ لاہور آئے ہوئے ہیں اس لیے میں نے سوچا رانا ہاؤس کے نمبر پر ٹرائی کر لوں، ممکن ہے یہاں پر آپ سے بات ہو جائے۔ خوش قسمتی سے میرا خیال درست ہی ثابت ہوا اور آپ یہاں مل گئے۔"

"اصل میں بہت دن ہو گئے تھے گھر والوں سے ملاقات ہوئے۔ جب سے پوسٹنگ ہوئی تھی لاہور آنا ہی نہیں ہوا تھا۔ آج بڑی مشکل سے فرصت نکالی ہے یہاں آنے کے لیے۔ آپ بتائیے، آپ نے کس سلسلے میں مجھے یاد کرنے کی زحمت فرمائی ہے؟" شہریار آج عبدالمنان کی اپروچ کی ہوئی این جی او کے نمائندے سے ملاقات کے لیے خاص طور پر لاہور آیا تھا۔ لیکن موتی والا کے سامنے اس نے یہی ظاہر کیا کہ اس کا لاہور کا یہ دورہ قطعی نجی نوعیت کا ہے۔ موتی والا کو اس کی بات ماننے میں یوں تامل نہیں ہو سکتا تھا کہ ظاہر ہے لاہور میں شہریار کا ایک مستقل گھر موجود تھا۔ اے سی کی حیثیت سے وہ کتنے ہی گھاٹوں کا پانی چکھتا لیکن لوٹ کر ہر بار

اسے لاہور ہی آنا تھا۔ البتہ شہریار تجسس میں مبتلا ہو گیا تھا کہ موتی والا کو آخر اس سے ایسا کون سا کام آپڑا ہے جو وہ جگہ جگہ فون کھما کر اسے تلاش کرتا پھر رہا ہے۔

''مجھے احساس ہے شہریار صاحب کہ آپ کو کافی عرصے بعد گھر آنے کا موقع ملا ہے اور آپ کی خواہش ہو گی کہ اس مختصر وقت کو مکمل طور پر فیملی کے افراد کے ساتھ ہی گزاریں... لیکن مجھے آپ سے کچھ اہم باتیں کرنی ہیں جن کے لیے میں آپ سے ملاقات کا خواہش مند ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ سے ملاقات کے لیے رانا ہاؤس آجاؤں؟ اصل میں، میں چاہ رہا ہوں کہ آپ لاہور میں موجود ہیں تو اس موقعے کا فائدہ اٹھا لیا جائے ورنہ دوسری صورت میں بھی میں آپ سے یہی درخواست کرتا کہ آپ کا جب بھی لاہور آنا ہو پہلی فرصت میں مجھے ملاقات کا وقت دے دیں۔ آنے کو تو میں وہاں آپ کے دفتر میں بھی آ کر آپ سے ملاقات کر لیتا لیکن میری وہاں آمد کچھ لوگوں کو چونکا دے گی اس لیے میں وہاں ملاقات سے گریز کرنا چاہتا ہوں۔''

موتی والا کے انداز گفتگو نے شہریار کے تجسس کو مزید بھڑکا دیا۔ اب اس کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ موتی والا سے ملاقات کے لیے انکار کرتا چنانچہ خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اتنے تکلف سے کیوں کام لے رہے ہیں موتی والا صاحب... آپ کے لیے بس اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ آپ مجھ سے ملاقات کے لیے آنا چاہتے ہیں۔''

''عزت افزائی کے لیے شکریہ۔ یہ فرمایئے کہ کتنے بجے تک حاضر ہو جاؤں؟'' شہریار کا جواب سن کر موتی والا نے پوچھا۔

''اگر فوری طور پر آسکتے ہیں تو مناسب رہے گا۔ اصل میں شام سے پہلے ہی میرا واپسی کے لیے روانہ ہونے کا ارادہ ہے۔''

''بس تو پھر ٹھیک ہے میں بیس پچیس منٹ میں حاضر ہوتا ہوں۔'' شہریار کے بتانے پر موتی والا جھٹ بولا۔ شہریار ظاہر ہے جواباً ''چشم ما روشن دل ما شاد'' ہی کہہ سکتا تھا سو اس نے بہ زبان انگریزی ''یو آر موسٹ ویلکم'' کہا اور فون بند کر کے اپنے سابقہ ارادے کے مطابق آرام کے لیے اپنے بیڈ روم میں جانے کے بجائے موتی والا کے انتظار میں اپنی ممانی سے گپ شپ لگانے لگا۔ ٹھیک بائیس منٹ بعد ملازم نے اسے موتی والا کے آنے کی اطلاع دی۔ اس اطلاع پر شہریار، ممانی سے گفتگو کا سلسلہ منقطع کر کے ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔ موتی والا عام سے شلوار قمیص میں ملبوس ایک صوفے پر بیٹھا تھا۔ شہریار کے ڈرائنگ روم میں داخل ہونے پر اس نے اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر شہریار سے ہاتھ ملایا۔

''پلیز تشریف رکھیے۔'' شہریار نے خود بھی ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس سے کہا۔ موتی والا پر ایک نظر ڈالنے کے بعد ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ پہلے کے مقابلے میں بہت کمزور ہو گیا ہے۔ شہریار نے آخری بار اسے اس کے بیٹے کی موت کے ایک دن بعد دیکھا تھا اور اس کے بعد آج دیکھ رہا تھا۔ اس مختصر سے عرصے میں ہی موتی والا کی صحت پر نمایاں فرق پڑا تھا۔ یقیناً اکلوتے بیٹے کی موت کا غم اس نے اپنی جان سے لگا لیا تھا۔

''کیا لینا پسند فرمائیں گے آپ... ٹھنڈا یا گرم؟ ویسے میرے خیال میں موسم کی مناسبت سے کافی یا چائے مناسب رہے گی۔'' رسمی علیک سلیک اور حال احوال کے بعد شہریار نے موتی والا سے دریافت کیا۔

''کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔ میں بس آپ سے ایک ضروری بات کرنے آیا تھا۔ آپ میری وہ بات توجہ سے سن لیں، باقی مجھے کسی شے کی خواہش نہیں۔''

''باتیں بھی ہوتی رہیں گی موتی والا صاحب لیکن ساتھ میں کچھ لے لیا جائے تو کیا حرج ہے۔ میرے خیال میں، میں کافی منگوا لیتا ہوں۔'' موتی والا کا جواب سن کر شہریار نے اصرار کیا۔

''میں تکلف نہیں کر رہا شہریار صاحب! واقعی مجھے کسی شے کی خواہش نہیں۔ اب خواہش ہوتی ہی نہیں ہے، بس سانسوں کے سلسلے کو جاری رکھنے کے لیے ضرورتاً تھوڑا بہت زہر مار کر لیتا ہوں۔'' بے بسی سے کہتے ہوئے موتی والا کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی چمکنے لگی تھی۔ اس نمی کو لہجے میں گھلنے سے بچانے کے لیے وہ کچھ دیر بالکل خاموش بیٹھا رہا۔ شہریار نے بھی اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا اور چپ چاپ اس کے سنبھلنے کا انتظار کرتا رہا۔ اسے اندازہ تھا کہ اکلوتے جوان بیٹے کو گنوانے والا باپ اپنی زندگی کے کس انتہائی تکلیف دہ دور سے گزر رہا ہو گا۔

''یہ دنیا عجیب جگہ ہے شہریار صاحب! آدمی جانتا ہے کہ ایک روز اس دنیا کو چھوڑ کر جانا ہے پھر بھی اس کی ہوس میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ خاص طور پر اپنی اولاد کے لیے آدمی کا بس نہیں چلتا کہ کون کون سے خزانے جمع کر دے۔ میں بھی برسوں سے اسی ہوس میں مبتلا تھا لیکن اب یہ حال ہے کہ دولت کے انبار لگے ہیں لیکن جس کے لیے یہ سب کچھ جمع کیا تھا، وہ دنیا سے جا چکا ہے۔ اس کے جانے کے بعد مجھے

احساس ہوا ہے کہ میں اپنی غلطیوں کو سدھار لوں۔ اسی سلسلے میں، میں نے آج آپ کو ملاقات کی زحمت دی ہے۔'' موتی والا نے افسردہ سے لہجے میں اتنا کہا اور ایک بار پھر چپ سادھ لی۔

''میں آپ کی بات پوری توجہ سے سن رہا ہوں موتی والا صاحب! آپ کو جو کچھ کہنا ہے بلا تکلف کہتے جائیں۔'' شہریار نے اسے چپ ہوتے دیکھ کر بولنے پر اکسایا تو وہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے دوبارہ گویا ہوا۔

''آپ جانتے ہوں گے کہ میرے اور چودھری افتخار عالم کے درمیان کاروباری شراکت ہے۔ میرے بزنس کی نوعیت اور وسعت سے بھی آپ ناواقف نہیں ہوں گے۔ پہلے میں ایک چھوٹا سا بزنس مین تھا لیکن جب چودھری افتخار کے ساتھ پارٹنر شپ کی تو دیکھتے ہی دیکھتے کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ میرے بزنس کی یہ ترقی چودھری افتخار کی بھاری سرمایہ کاری کی مرہونِ منت ہے لیکن حقیقت سے مجھ سمیت چند ہی لوگ واقف ہیں۔ چودھری افتخار نے میرے ساتھ پارٹنر شپ کرنے کے بعد سرمائے سے زیادہ لکڑی فراہم کی۔ پیر آباد کے ساتھ جو جنگل لگتا ہے اس جنگل میں بڑی تعداد میں شیشم کے درخت پائے جاتے ہیں۔ ان درختوں سے حاصل ہونے والی لکڑی بہت اعلیٰ پائے کی ہوتی ہے اور فرنیچر سازی میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ چودھری افتخار اور اقبال باجوہ کے گٹھ جوڑ کے نتیجے میں مرنے سے مجھے یہ لکڑی تقریباً مفت مل رہی ہے۔ بس مجھے برائے میں سے ان دونوں کو حصہ دینا پڑتا ہے۔ حصہ بھی آپ سمجھیں کہ چودھری افتخار لیتا ہے، اقبال باجوہ کو تو ہم اس کی خاموشی اور چشم پوشی کی قیمت ادا کرتے ہیں۔''

''آپ یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہیں؟'' شہریار نے موتی والا کو یہ غور دیکھتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے پوچھا۔

''میں چاہتا ہوں کہ اس بار جب جنگل سے لکڑی چرا کر منتقل کی جا رہی ہو تو آپ اپنی ٹیم کے ساتھ چھاپا ماریں اور اس جرم میں ملوث افراد کو بے نقاب کریں۔''

''اس صورت میں تو آپ بھی زد میں آئیں گے۔ جب بات نکلے گی تو ظاہر ہے پھر دور تک جائے گی۔'' موتی والا کے جواب پر شہریار نے اسے تولتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

''میں جانتا ہوں اور مجھے اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں۔'' موتی والا کا جواب حیران کن تھا۔

''کیا ایسا آپ چودھری افتخار سے انتقام لینے کے چکر میں کر رہے ہیں؟ چودھری صاحب شکوہ کرتے رہے ہیں کہ آپ کا اُن کے ساتھ ایسا رویہ ہے جیسے انہوں نے آپ کے بیٹے کو قتل کیا ہو۔''

''میں جانتا ہوں کہ چودھری افتخار نے میرے بیٹے کو قتل نہیں کیا۔ کم از کم براہِ راست تو اس نے ایسا کچھ نہیں کیا کہ میں اسے اپنے بیٹے کا قاتل ٹھہرا سکوں لیکن میں حالات پر غور کرتا ہوں تو مجھے اپنے بیٹے کی موت میں اسی کا ہاتھ نظر آتا ہے۔ جب تک میری چودھری افتخار سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، میں ایک ایمان دار آدمی تھا۔ میرا کاروبار چھوٹا تھا لیکن اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ گھر میں خوش حالی تھی۔ میں بیوی اور بچے کو اچھا خاصا وقت دیتا تھا۔ میرا بیٹا بہت ذہین تھا۔ اس کی ذہانت کو دیکھتے ہوئے میرے اباجی نے خواہش ظاہر کی تھی کہ میں اسے حافظ قرآن بناؤں۔ اباجی کے مرنے کے بعد بھی میں ان کی اس خواہش پر عمل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن پھر میری چودھری افتخار سے ملاقات ہو گئی۔ بس پھر تو میں دولت جمع کرنے کی دھن میں مبتلا ہو گیا۔ نہ مجھے اباجی کی خواہش یاد رہی نہ بیٹے کو دینے کے لیے وقت بچا۔ ایک باپ کی حیثیت سے اپنے بچے کی تربیت اور نگرانی کی جو ذمے داری مجھ پر عائد ہوتی تھی، اس کو میں اپنے طور پر نوٹوں کی گڈیاں لٹا لٹا کر ادا کرتا رہا۔ پیسے کی فراوانی اور تربیت کے فقدان نے اثر دکھایا۔ میرا بیٹا اپنے دادا کی خواہش کے مطابق حافظ قرآن بننے کے بجائے ایک بگڑا ہوا رئیس زادہ بن گیا۔ اس کے کرتوتوں سے متعلق خبریں میرے کان میں پڑتی رہتی تھیں۔ ایک بار وہ شراب پی کر غل غپاڑا کرنے کے جرم میں گرفتار بھی ہوا تھا۔ میں نے تھانے دار کو رشوت دے کر اسے چھڑا لیا۔ اس وقت میرے ذہن میں تھا کہ میرے بیٹے کو میری دولت پر یہ سارے عیش کرنے کی آزادی ہے لیکن جب وہ مرا تو مجھے احساس ہوا کہ اس بے جا آزادی کا یہی نتیجہ نکل سکتا تھا۔ میں نے اپنے بیٹے کی پوسٹ مارٹم رپورٹ دیکھی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ کن حالات میں مرا مگر میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ یہ حالات چودھری افتخار کی وجہ سے پیدا ہوئے۔ اگر وہ مجھے حرام ذرائع سے دولت کمانے کی دھن میں نہیں لگاتا تو میں وہی ایک چھوٹا سا بزنس مین ہوتا جس کے پاس اپنے بیٹے کی تربیت کرنے کی فرصت ہوتی۔ جس کی کمائی میں حرام کی اس قدر آمیزش نہیں ہوتی کہ اس کی اولاد حرام و حلال کی تمیز کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھتی۔ آپ یہ مت سمجھیے گا کہ میں ہر برائی کی ذمے داری چودھری افتخار کے سر ڈال کر خود کو بری الذمہ قرار دینا چاہتا ہوں۔ ایسا ہرگز نہیں

www.pkdigest.com

ہے، میں اپنا جرم تسلیم کرتا ہوں اور اس کی سزا بھگتنے کو تیار ہوں۔ اگر میری درخواست پر غور کرتے ہوئے آپ کوئی کارروائی کرتے ہیں تو میں از خود اعترافِ جرم کرلوں گا لیکن فی الحال میرا منظر پر رہنا ضروری ہے۔ میں سیٹ اپ میں موجود رہوں گا، تب ہی آپ کو بتا سکوں گا کہ اگلی کیپ کب اسمگل کی جائے گی۔ اس مقصد کو سامنے رکھ کر میں نے ابتدائی جذباتی پن کو چھوڑ کر چودھری افتخار سے اپنے مراسم دوبارہ استوار کرلیے ہیں۔ اب وہ دوبارہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ میں اس کا کاروباری حلیف ہوں لیکن جو سچ ہے وہ میں نے آپ کو بتا دیا۔'' شہریار کے سوال کے جواب میں موتی والا نے ایک جذباتی اور تفصیلی بیان دیا۔ شہریار سمجھ رہا تھا کہ موتی والا کی یہ کایا پلٹ بیٹے کی موت کے شدید صدمے کا نتیجہ ہے۔ قدرت کے کارخانے میں ایسے واقعات کا جنم لینا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اولاد کے صدمے سے بڑے بڑوں کو ٹوٹتا ہوا دیکھا گیا ہے۔ ہاں، کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ایسے کاری زخم کھا کر بھی اپنی غلط روش پر ڈٹے رہتے ہیں۔ شاید وہ لوگوں کی اس قسم سے تعلق رکھتے ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہو۔ موتی والا کی کایا اس لیے پلٹ گئی تھی کہ وہ بنیادی طور پر ایک شریف انسان تھا جس نے اپنی زندگی کا اچھا خاصا حصہ ایمان داری سے کام کرتے ہوئے گزارا تھا۔ بعد میں دولت کی چمک نے اس کی آنکھوں کو چکا چوند کر دیا ورنہ جو شخص اپنے باپ کی خواہش پر اپنے بیٹے کو حافظِ قرآن بنانے کا ارادہ رکھتا ہو، وہ فطرتاً بے ایمان اور برا نہیں ہوسکتا۔

''میں آپ کے تعاون کے لیے شکر گزار ہوں گا موتی والا صاحب! آپ مجھ سے مسلسل رابطے میں رہیے گا آپ کی فراہم کردہ اطلاعات کے مطابق میں لکڑی کے ان اسمگلرز کو چھاپے کی بھرپور کوشش کروں گا۔ میری کوشش ہوگی کہ آپ کے تعاون کے صلے میں آپ پر دوسرے لوگوں کے مقابلے میں نسبتاً ہلکی فردِ جرم عائد کی جائے۔'' شہریار خوش تھا کہ ایک ایسے موقعے پر جبکہ وہ چودھری افتخار کی شخصیت کا ایک بھیانک روپ لوگوں کے سامنے لانے والا تھا، قدرت نے اسے موقع فراہم کردیا تھا کہ وہ چودھری افتخار کا ایک دوسرا روپ بھی سامنے لاسکے۔ ماہ بانو والے معاملے کے ساتھ ساتھ یہ معاملہ بھی سامنے آجاتا تو چودھری افتخار کے لیے آسانی سے اپنی جان چھڑانا ممکن نہیں رہتا۔ اسے یہ موقع موتی والا فراہم کرنے والا تھا اس لیے جواباً اسے بھی کوئی ریلیف ملنا چاہیے تھا مگر موتی والا کے جواب نے اسے حیران کردیا۔ اس نے کہا۔

''آپ کا شکریہ شہریار صاحب لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں کسی نرمی کا خواہش مند نہیں۔ میں جو کچھ کررہا ہوں، اپنے جرم کا کفارہ سمجھ کر کررہا ہوں اور کفارہ ادا کرنے کے خواہش مند نرمی اور آسانی تلاش نہیں کرتے۔'' اپنی اس بات کو کہنے کے بعد موتی والا مزید وہاں رکا نہیں اور شہریار سے ہاتھ ملا کر رخصت ہوگیا۔ اس کے جانے کے بعد شہریار بڑی دیر تک بیٹھا سوچتا رہا کہ اللہ تعالیٰ آدمی کا دماغ ٹھکانے پر لانے کے لیے کیا کچھ نہیں دکھاتا مگر کم ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو دوسروں کو دیکھ کر نصیحت پکڑیں۔ عموماً لوگوں کو عقل اسی وقت آتی ہے جب وہ خود ٹھوکر کھاتے ہیں اور بعض بدنصیب تو ٹھوکر کھا کر بھی نہیں سنبھلتے۔

☆☆☆

''تم سوئیں نہیں ابھی تک؟'' سرد اور نیم روشن برآمدے میں نمودار ہوتی ماہ بانو اپنے خیالات میں اتنی غرق تھی کہ اسے خبر نہیں ہوسکی کہ کب دارالامان کی منتظمہ اس برآمدے میں داخل ہوکر اس کے قریب آپہنچی۔ منتظمہ یقیناً اپنے معمول کے مطابق رات کو سونے سے قبل دارالامان کا آخری چکر لگا رہی تھی۔ وہ ادھیڑ عمر کی ایک عام سی شکل وصورت کی عورت تھی جو مزاجاً ہمدرد ہونے کے باوجود کافی اصول پرست تھی اور اس اصول پرستی کی وجہ سے اسے اکثر سختی سے بھی کام لینا پڑتا تھا مگر اس وقت ماہ بانو سے سوال کرتے ہوئے اس کے لہجے میں نرمی تھی۔

''نیند نہیں آرہی۔ طبیعت بہت بے چین ہے۔'' ماہ بانو نے جھکی نظروں کے ساتھ منتظمہ کے سوال کا جواب دیا۔ آج شام ہی تو اسے منتظمہ سے سخت ڈانٹ سننے کو ملی تھی۔

''میں سمجھ سکتی ہوں کہ تم بہت پریشان ہو۔ اپنے گھر سے الگ کسی دارالامان جیسی جگہ پر رہنا واقعی بہت مشکل ہوتا ہے۔ خاص طور پر اس صورت میں جب بندہ جانتا ہو کہ اس کے گھر میں اس سے محبت کرنے والے لوگ اس کے منتظر ہیں۔ مجھے تمہارے حالات کے بارے میں مکمل علم نہیں مگر مجھے تمہارے سلسلے میں بہت سختی سے یہ ہدایت دی گئی ہے کہ کسی کو بھی تمہاری یہاں موجودگی کے بارے میں خبر نہ ہو سکے۔ آج شام تم نے جو حرکت کی تھی، وہ بہت خطرناک تھی۔ جانتی ہو شام سے میرے پاس کئی دفعہ مختلف نمبروں سے فون آچکے ہیں کہ ہماری ماہ بانو سے بات کروادیں۔ میں نے سختی سے کہہ دیا کہ یہاں کوئی ماہ بانو نہیں رہتی۔ یہ کسی کی رہائش گاہ نہیں بلکہ ایک اسپتال ہے۔ ایک لڑکی نے تو مجھ سے اچھی خاصی بحث کی کہ آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔ ماہ بانو یہاں

www.pkdigest.com

موجود ہے اس نے خود مجھے اس نمبر سے فون کیا تھا۔ میں نے کہہ دیا کہ بی بی! یہ پبلک پلیس ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ماہ بانو نام کی کسی خاتون نے اسپتال کے فون سے آپ کو فون کیا ہو۔ وہ کسی کام سے یہاں آئی ہوں گی تو آپ کو فون کرلیا ہوگا لیکن اب وہ یہاں نہیں ہیں... تو میں ان سے کس طرح آپ کی بات کرواؤں۔ بڑی مشکل سے اس لڑکی نے میری بات پر یقین کیا۔'' لہجہ نرم ہونے کے باوجود ماہ بانو محسوس کرسکتی تھی کہ منتظمہ اس کی حرکت پر ناراض ہے۔ منتظمہ مجموعی طور پر ایک اچھی عورت تھی اور ماہ بانو کو اس کی ناراضگی اتنی غلط بھی نہیں لگ رہی تھی۔ چنانچہ شرمندگی کے گہرے احساس کے ساتھ وہ بولی۔

''سوری میڈم! مجھے احساس ہے کہ میں نے غلطی کی ہے۔ اصل میں میری طبیعت دو تین دن سے اتنی بے چین تھی کہ میں رہ نہیں سکی۔''

''مجھے خود بھی تمہاری کیفیت کا اندازہ ہے۔ اس وقت میں تمہیں سختی سے ڈانٹ کر اندر سونے کے لیے بھیجنے کے بجائے میں تمہارے پاس رکی ہی اس لیے ہوں کہ تمہیں سمجھا سکوں۔ میں برسوں سے اس دارالامان میں ملازمت کررہی ہوں۔ یہاں رہنے والی عورتیں کسی نہ کسی مجبوری یا مشکل کا شکار ہوتی ہیں لیکن تم دیکھو کہ ان سب نے کس طرح حالات کے ساتھ سمجھوتا کررکھا ہے۔ وہ آپس میں ہنستی بولتی بھی ہیں اور لڑتی جھگڑتی بھی ہیں، ساتھ ساتھ روٹین کے کام بھی چلتے رہتے ہیں۔ تم بھی اپنی کسی مشکل کی وجہ سے یہاں آئی ہو۔ امید رکھو کہ تمہاری مشکل جلد دور ہوجائے گی اور تم یہاں سے واپس اپنے گھر چلی جاؤ گی لیکن جب تک یہاں ہو، تب تک تو تمہیں ہمت اور برداشت سے کام لینا ہی ہوگا۔ اس طرح راتوں کو جاگ کر ٹہلنے سے کیا حاصل ہوگا؟ چلو جاؤ شاباش! جاکر سوجاؤ۔''

ماہ بانو کی معذرت کے جواب میں منتظمہ نے اسے سمجھاتے ہوئے نرمی سے حکم دیا تو وہ اس حکم کی پیروی میں اس کمرے کی طرف بڑھ گئی جہاں اس کا قیام تھا۔ اس کمرے میں اس کے ساتھ چند دوسری عورتیں بھی مقیم تھیں۔ ماہ بانو نے دیکھا کہ وہ تمام عورتیں سکون سے گہری نیند سورہی ہیں۔ اسے ان عورتوں کی اس قدر پرسکون نیند پر حیرت ہوئی۔ دارالامان میں اپنے چند روزہ قیام کے عرصے میں ہی وہ اپنی ساتھی عورتوں کے حالات سے اچھی خاصی واقف ہوگئی تھی۔ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ ہی کوئی نہ کوئی افسوس ناک واقعہ پیش آیا تھا۔ ایک عورت پچھلے پندرہ سال سے یہاں رہ رہی تھی۔ اس عورت کے ماں باپ مرچکے تھے۔ کسی عزیز نے کچھ عرصے اپنے گھر پناہ دی اور پھر جان چھڑانے کے لیے بغیر دیکھے بھالے شادی کردی۔ سسرال والے نہایت جاہل لوگ تھے جو بغیر جہیز کے آنے والی لاوارث بہو پر ہر طرح کا ظلم کرنا اپنا حق سمجھتے تھے۔ وہ بے چاری روزانہ کی مار پیٹ اور گالی گلوچ خاموشی سے سہتی رہتی۔ شکایت کرتی بھی تو کس سے؟ میکے کے نام پر کوئی آسرا نہیں تھا اور شوہر بھی اپنے گھر والوں کا ہم نوا تھا۔ اس عورت نے سمجھ لیا تھا کہ اب اس کا مرنا جینا اسی ظالم سسرال میں ہے لیکن مرنا کتنا مشکل ہوتا ہے، یہ اسے اس وقت پتا چلا جب اس کی ساس اور نندوں نے مل کر اسے جلانے کی کوشش کی۔ وہ کسی طرح ان سے جان بچا کر گھر سے بھاگ نکلی اور ایسی نکلی کہ پھر پلٹ کر بھی واپس جانے کی ہمت نہیں کی۔ اب وہ پندرہ سال سے اس دارالامان میں تھی اور اپنے سسرال کے مقابلے میں یہاں بہت خوش تھی۔ غرض ہر عورت کے پیچھے اسی طرح کی کہانی تھی جو وہ ہر نئے آنے والے کو شاید اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے سنادیتی تھی۔ ماہ بانو سے بھی ان لوگوں نے اس کے حالات کے بارے میں جاننے کی کوشش کی تھی لیکن ماہ بانو کو پی اے عبدالمنان کی ہدایات یاد تھیں۔ اسے یہاں بھجوانے سے قبل اس نے سختی سے ہدایت کی تھی کہ اپنے بارے میں کسی کو کچھ بھی بتانے کی ضرورت نہیں۔ ماہ بانو پوری طرح سے اس کی ہدایت پر عمل کررہی تھی۔ لیکن وہ دارالامان میں دوسری عورتوں کی طرح یہاں رہتے بستے میں ناکام تھی۔ اسے ہر وقت بے بے اور ابا کی یاد آتی رہتی تھی اور آج کل تو کچھ زیادہ ہی بے قراری تھی۔ اس بے قراری کے ہاتھوں ہی مجبور ہوکر اس سے ایک غلطی ہوگئی تھی۔ یوں تو اس نے عبدالمنان سے وعدہ لیا تھا کہ وہ فیصل آباد میں اس کی بے بے اور ابا کو اس کے بارے میں مطلع کردے گا لیکن پھر بھی اس کی خواہش تھی کہ وہ خود ان دونوں سے بات کرلے۔ منتظمہ سے اس سلسلے میں اس نے ایک بار اجازت بھی مانگی تھی لیکن اس نے صاف انکار کردیا تھا۔ آج ماہ بانو بہت بے چین ہوئی تو اس نے دارالامان کی ایک ملازمہ کو چند روپے دے کر اس بات پر راضی کرلیا کہ وہ اسے موقع دیکھ کر فون پر گھر بات کروا دے گی۔ ماہ بانو کے اپنے گھر میں تو فون نہیں تھا۔ اس نے اپنے پڑوسیوں کے گھر فون کیا کہ بے بے کو وہاں بلوا کر بات کرے گی لیکن ہوا یہ کہ ابھی اس نے لائن ملنے کے بعد صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ میں ماہ بانو بول رہی ہوں تو اچانک منتظمہ وہاں پہنچ گئی۔ اس نے ماہ بانو کے ہاتھ سے ریسیور چھین کر لائن کاٹی اور پھر اسے ٹھیک ٹھاک باتیں بھی سنادیں۔ ماہ بانو کا ساتھ دینے والی ملازمہ کی تو اس سے کئی گنا بڑھ کر شامت آئی تھی۔ ابھی برآمدے میں ہونے والی ملاقات میں منتظمہ نے اسی فون کال کے حوالے سے اسے دوبارہ سمجھایا تھا۔ ماہ بانو کافی حد تک اس کی بات سمجھ گئی تھی لیکن دل کی بے قراری اپنی جگہ تھی۔ وہ کمرے میں موجود دوسری عورتوں کی طرح بے فکری سے سونے میں ناکام تھی۔ اسے رہ رہ کر اے سی شہریار عادل اور اس کے پی اے پر بھی غصہ آرہا تھا جو اسے اس دارالامان میں پہنچانے کے بعد بھول ہی گئے تھے۔ لیکن ظاہر ہے، اس وقت وہ ان پر آئے غصے کو کسی صورت نہیں نکال سکتی تھی چنانچہ بے بس سی ہوکر منتظمہ کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے بستر پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

بہت دیر کی کوشش کے بعد بھی اسے صرف اتنی کامیابی ہوئی کہ ذہن کچھ کچھ غنودگی میں چلا گیا۔ غنودگی کی اس کیفیت میں اس نے باہر برآمدے میں قدموں کی آوازیں سنیں۔ قدموں کی یہ آوازیں اسی کمرے کے دروازے پر آکر رکیں جس میں ماہ بانو موجود تھی۔ یک دم دروازہ زوردار آواز کے ساتھ کھلا۔ ماہ بانو ہڑبڑا کر اپنے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کھلے دروازے سے دو ڈھاٹا پوش اندر داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ دارالامان کی خوف زدہ منتظمہ بھی تھی۔ منتظمہ کو ایک ڈھاٹا پوش نے اسلحے کی نوک پر [illegible] رکھا تھا۔ ماہ بانو کو یہ سمجھنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگا کہ آنے والے ڈھاٹا پوش چودھری افتخار کے کارندے ہیں جو اس کی تلاش میں یہاں تک آپہنچے ہیں۔ ماہ بانو تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھی کہ کسی طرح ان لوگوں کی گرفت میں آنے سے پہلے کہیں بھاگ جائے لیکن اس کمرے میں فرار کا واحد راستہ وہ دروازہ تھا جس پر دونوں ڈھاٹا پوش ڈٹے ہوئے تھے۔

☆☆☆

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ شہریار اپنے بیڈروم میں گہری نیند سورہا تھا کہ اسے دروازے پر ہونے والی دستک سنائی دی۔ شہریار نے چونک کر سرہانے رکھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا اور پھر مزید حیران ہوتے ہوئے ''لیس کم اِن'' کہا۔ اگلے لمحے اس کا بٹلر سامنے موجود تھا۔

''سوری سر! اس وقت آپ کی نیند خراب کرنے پر معذرت چاہتا ہوں۔ اصل میں عبدالمنان صاحب آئے ہوئے ہیں اور آپ سے فوری ملاقات کے خواہش مند ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ معاملہ بہت سنجیدہ اور فوری نوعیت کا ہے۔'' بٹلر نے شہریار سے معذرت کرتے ہوئے رات کے اس پہر اسے ڈسٹرب کرنے کی وجہ بتائی۔ وجہ سن کر شہریار پریشان ہوگیا۔ عبدالمنان ایک سمجھ دار اور ذمے دار آدمی تھا جو بلاوجہ اس وقت اسے ڈسٹرب نہیں کرسکتا تھا۔

''ٹھیک ہے، تم چلو میں آرہا ہوں۔'' عبدالمنان کی آمد کی وجہ کے بارے میں اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہوئے شہریار نے بٹلر کو حکم دیا اور پھر خود سلیپنگ سوٹ پر گاؤن پہننے کے بعد ہاتھوں سے بال سنوارتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ عبدالمنان نیچے لاؤنج میں ہی اس کا منتظر تھا۔

''سوری سر! معاملہ بہت اہم تھا ورنہ میں اس وقت آپ کو ڈسٹرب نہیں کرتا۔'' شہریار کو دیکھتے ہی عبدالمنان نے اس سے معذرت کی۔ خود اس کے چہرے سے بھی اندازہ ہورہا تھا کہ وہ خود بھی گہری نیند سے جگایا گیا ہے۔

''کیا پرابلم ہے؟'' عبدالمنان کی معذرت کو نظرانداز کرتے ہوئے شہریار نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''لاہور کے دارالامان کی منتظمہ کا فون آیا تھا سر! اس نے بتایا ہے کہ کچھ لوگوں نے ماہ بانو کو وہاں سے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ کوشش تو ناکام ہوگئی لیکن ماہ بانو اس وقت علاقے کے تھانے میں ہے جہاں ایس ایچ او اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کررہا ہے۔'' عبدالمنان کی دی ہوئی اطلاع نے شہریار کو یک دم ہی مضطرب کردیا لیکن اس نے کمال ضبط سے کام لیتے ہوئے اپنے اضطراب کو قابو میں رکھا اور سپاٹ لہجے میں عبدالمنان سے بولا۔

''یہ سب کیسے ہوا... ذرا تفصیل سے بتاؤ؟''

''زیادہ تفصیلات تو مجھے خود بھی نہیں معلوم سر! منتظمہ کے مطابق رات کے وقت دارالامان کے گیٹ پر دو چوکیدار موجود ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک چوکیدار ضرورت کے تحت باتھ روم گیا ہوا تھا، اس وقت کچھ لوگ دیوار پھلانگ کر دارالامان میں داخل ہوگئے۔ انہوں نے گیٹ پر موجود چوکیدار کو بے ہوش کیا اور پھر منتظمہ کے کمرے میں گھس کر اسے اسلحے کے زور پر مجبور کیا کہ اسے ماہ بانو تک پہنچایا جائے۔ ظاہر ہے، منتظمہ کو اپنی جان بچانے کے لیے ان کا حکم ماننا پڑا۔ وہ لوگ ماہ بانو کو زبردستی اٹھا کر لے جارہے تھے کہ وہ چوکیدار جو باتھ روم گیا ہوا تھا، واپس لوٹ آیا۔ اس نے دور سے ہی صورت حال بھانپ لی اور اپنی رائفل کے زور پر حملہ آوروں سے مقابلہ کرنے کھڑا ہوگیا۔ وہ لوگ تعداد میں زیادہ تھے لیکن اس اچانک حملے کی وجہ سے سنبھل نہیں سکے۔ چوکیدار نے سب سے پہلے اس شخص کی ٹانگ میں گولی ماری جس نے ماہ بانو کو اٹھایا ہوا تھا۔ ایک اور شخص بھی زخمی ہوا۔

مجبوراً باقی بچ جانے والے افراد کو اپنے دونوں زخمی ساتھیوں کو لے کر راہِ فرار اختیار کرنی پڑی۔ افراتفری میں وہ ماہ بانو کو بھی اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب نہیں ہو سکے لیکن ان کی جوابی فائرنگ نے بے چارے چوکیدار کو اچھا خاصا زخمی کر دیا ہے۔ اس کے جسم میں تین گولیاں لگی ہیں اور منتظمہ کے مطابق اس کی حالت نازک ہے۔ اگر چوکیدار کے زخمی ہونے کا معاملہ نہیں ہوتا تو منتظمہ شاید اس واقعے کو چھپا لیتی لیکن فائرنگ اور زخمی چوکیدار کی وجہ سے قریبی تھانے میں اطلاع پہنچ گئی۔ ایس ایچ او کو منتظمہ نے یہی بتایا کہ حملہ آور نامعلوم تھے اور انہوں نے زبردستی دارالامان میں گھس کر عورتوں کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ منتظمہ نے ایس ایچ او پر ظاہر نہیں کیا تھا کہ حملہ آور ماہ بانو کے لیے وہاں آئے تھے لیکن ایس ایچ او بہت کائیاں آدمی ہے۔ اس نے ماہ بانو کے ساتھ موجود دوسری عورتوں کا بھی بیان لیا اور ان عورتوں میں سے کسی نے بتا دیا کہ آنے والوں نے صرف ماہ بانو کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اب ایس ایچ او ماہ بانو کو اپنے ساتھ تھانے لے گیا ہے کہ اس سے اصل صورتِ حال کے بارے میں معلومات حاصل کرے گا۔ منتظمہ نے پریشان ہو کر مجھے یہاں فون کیا اور میں آپ کے پاس چلا آیا کہ آپ سے صورتِ حال کو ڈسکس کر کے کوئی قدم اٹھایا جائے۔''

عبدالمنان نے شہریار کو تفصیل سنائی تو اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ قدرتی طور پر وہ سوچ رہا تھا کہ ماہ بانو کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والے چودھری افتخار کے ہی بندے ہو سکتے ہیں۔ انہیں ماہ بانو کے لاہور کے ایک دارالامان میں ہونے کی خبر کس طرح ملی تھی، یہ سوال اپنی جگہ اہم ہونے کے باوجود اس وقت سب سے پہلی ضرورت یہ تھی کہ ماہ بانو کو تھانے سے نکال کر کسی محفوظ مقام پر منتقل کیا جائے، ورنہ چودھری افتخار کے لیے اسے وہاں بھی ڈھونڈ نکالنا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوتا۔ ماہ بانو کی تھانے سے رہائی کا کام بھی بہت رازداری سے ہونا چاہیے تھا۔ اس کام کے لیے سجاد رانا سب سے موزوں تھا۔ وہ ایک فون کرتا تو ایس ایچ او بے چون و چرا نہ صرف ماہ بانو کو چھوڑ دیتا بلکہ اس بارے میں بھی زبان بند رکھتا کہ ماہ بانو کی رہائی کس کے حکم پر عمل میں آئی ہے۔ عبدالمنان سے متعلقہ تھانے کے بارے میں معلوم کرنے کے بعد شہریار نے سجاد رانا کا نمبر ڈائل کیا۔ وہاں سے تین چار گھنٹیوں کے بعد کال ریسیو کی گئی۔

''السلام علیکم سجاد بھائی! میں شہریار بات کر رہا ہوں۔'' دوسری طرف سے سجاد رانا کی ''ہیلو'' سنتے ہی شہریار نے جلدی سے کہا۔

''وعلیکم السلام! لیکن برادر عزیز... فون کرنے کے لیے یہ وقت کچھ نامناسب نہیں؟ کہاں تو آپ دن کے وقت بھی یہ زحمت نہیں فرماتے، کہاں رات کے اس آخری پہر فون کھڑکا دیا۔ پہلے ہی شہر میں ہر وقت ہونے والے حادثات کی وجہ سے مشکل سے ہی سونا نصیب ہوتا ہے۔ ویسے مجھے تمہارا فون کرنا بھی کچھ مشکوک لگ رہا ہے، سب خیریت تو ہے؟'' سجاد رانا شہریار سے عمر میں کافی بڑا تھا اور اس سے بہت محبت کرتا تھا، چنانچہ اپنی بے تکلفانہ محبت کی وجہ سے پہلے تو جو جی میں آیا بولتا چلا گیا لیکن پھر اسے احساس ہوا کہ یوں رات کے اس پہر شہریار جیسے بندے کا فون بلاوجہ نہیں آ سکتا... چنانچہ تشویش میں مبتلا ہو گیا۔

''جی ہاں سب خیریت ہے۔ میں نے ایک اہم کام کے سلسلے میں آپ کو فون کیا ہے۔ لاہور کے ایک تھانے سے ماہ بانو نام کی لڑکی کو اتنی خاموشی سے چھڑوانا ہے کہ کسی کو اس بات کا علم نہ ہو سکے کہ لڑکی کو کس نے چھڑوایا اور وہ کہاں گئی۔'' شہریار نے اپنا مدعا بیان کیا۔

''خیریت... کون ہے یہ لڑکی اور تمہیں اپنے علاقے میں بیٹھے بیٹھے لاہور کے کسی تھانے کا احوال کہاں سے معلوم ہوا؟'' سجاد رانا شہریار کا مطالبہ سن کر چونکا۔

''یہ ساری تفصیلات میں بعد میں بتا دوں گا۔ فی الحال لڑکی کی فوری رہائی ضروری ہے۔ آپ اسے رہا کروا کر کسی محفوظ مقام پر منتقل کریں۔ میں اس دوران لڑکی کے لیے کسی دوسری جگہ کا انتظام کرتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے برادر! تم مجھے تھانے کے بارے میں بتاؤ، میں ابھی تمہارا یہ کام کرتا ہوں۔'' شہریار کا جواب سن کر سجاد رانا نے اس سے پوچھا۔ شہریار نے اسے تھانے کے بارے میں بتایا اور فون بند کر دیا۔ ''یہ کام تو ہو گیا۔ تم یہ بتاؤ کہ تمہارے پاس موتی والا کا فون نمبر ہے؟ میرے خیال میں اگر ہم موتی والا سے درخواست کریں تو وہ ماہ بانو کو اپنے گھر میں پناہ دے سکتا ہے۔'' شہریار کی بات پر کچھ کہے بغیر عبدالمنان نے اپنے بریف کیس میں سے ایک ننھی فون ڈائری نکالی اور اسے موتی والا کا فون نمبر نوٹ کروانے لگا۔ عبدالمنان بیوروکریسی کا ایک ایسا تربیت یافتہ شخص تھا جس نے رات کے اس پہر بہت ایمرجنسی میں ہونے کے باوجود اس بات کا خیال رکھا تھا کہ اپنا بریف کیس ساتھ لے کر نکلے۔ شہریار کی کال پر موتی والا بھی حیران ہوا کہ اس وقت شہریار نے کیسے زحمت کی۔ شہریار نے اسے زیادہ تفصیل میں کچھ بتانے کے بجائے براہِ راست ماہ بانو کو اپنے گھر میں پناہ فراہم کرنے کی بات کی۔ موتی والا بھی بغیر کسی حیل و حجت کے فوراً راضی ہو گیا۔ شہریار کے اگلے تین سے پینتیس منٹ فون پر ادھر اُدھر بات کرتے ہوئے ہی گزرے۔ کبھی وہ سجاد رانا سے بات کرتا اور کبھی موتی والا کو ہدایات دیتا۔ بالآخر جب اسے اطمینان ہو گیا کہ ماہ بانو تھانے سے موتی والا کے گھر بخیریت منتقل ہو چکی ہے تو اسے سکون ملا اور وہ عبدالمنان کی طرف متوجہ ہوا۔

''سمجھ نہیں آ رہا کہ چودھری افتخار کو اچانک کیسے ماہ بانو کے لاہور والے دارالامان میں ہونے کی خبر مل گئی۔ ہم نے تو یہ سارا معاملہ بہت راز میں رکھا تھا۔''

''فی الحال کیا کہا جا سکتا ہے سر! ہمیں اس سلسلے میں تحقیق کرنی پڑے گی۔'' عبدالمنان کے پاس بھی اس سوال کا جواب نہیں تھا۔

''کہیں اس این جی او کے نمائندے نے تو مخبری نہیں کر دی جس سے میں نے لاہور جا کر ماہ بانو کے کیس کے سلسلے میں ملاقات کی تھی؟ وہی ایک ایسا بندہ ہے جو ابھی اس کیس میں انوالو ہوا ہے اور جسے معلوم ہے کہ ماہ بانو کو کہاں رکھا گیا ہے۔'' شہریار نے اپنی سوچ کے گھوڑے دوڑائے۔

''ذاتی طور پر تو مجھے اس پر شک نہیں لیکن کسی شخص کے بارے میں کوئی حتمی رائے دینا مشکل ہوتا ہے۔'' عبدالمنان کا جواب محتاط تھا۔

''چلو جو بھی معاملہ ہے سامنے آ جائے گا۔ فی الحال تو یہ اطمینان کافی ہے کہ ماہ بانو کو محفوظ مقام پر شفٹ کر دیا گیا ہے۔ تم اب جا کر آرام کرو۔ صبح دیکھیں گے کہ آگے کیا کرنا ہے۔'' شہریار نے یک دم ہی بات ختم کر دی تو عبدالمنان بھی وہاں سے رخصت ہو گیا۔ خود شہریار البتہ اس کے جانے کے بعد بھی بہت دیر وہیں لاؤنج میں بیٹھا فکرمندی سے اس معاملے کے بارے میں سوچتا رہا۔

☆☆☆

''یہ اچھا ہے، اماں سے یہ کہہ کر گئی تھیں کہ ابھی منے کو دل بھر کر نہیں دیکھا۔ کچھ دن اس کے ساتھ گزار لوں پھر حویلی واپس آؤں گی... اور اب یہ حالم ہے کہ سارا وقت کتاب آنکھوں کے سامنے رکھ کر اس میں گم بیٹھی رہتی ہو۔ منے کو تو دیکھنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔'' کشور حسبِ عادت کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھی کہ تاجور نے آ کر اسے ٹوکا۔

''منے کے لیے رکنے کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں سارا وقت اس پر ہی نظریں جما کر بیٹھی رہوں۔ ویسے آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں ابھی صنوبر آپا کے کمرے سے ہی آ رہی ہوں۔ وہ اور ان کے ولی عہد دونوں مزے سے سو رہے ہیں۔ میں نے سوچا انہیں ڈسٹرب کرنے کے بجائے تھوڑی دیر بیٹھ کر کچھ پڑھ ہی لوں۔'' کشور نے مسکرا کر بڑی بہن کی بات کا جواب دیا۔ ویسے تاجور غلط نہیں کہہ رہی تھی، بچے کی پیدائش کے بعد جب صنوبر گاؤں واپس لوٹی تھی تو کشور بچے کے بہانے سے ہی اپنے ماموں کے گھر رک گئی تھی البتہ اس رکنے کے پیچھے اس کے دل میں اصل خواہش کیا تھی، وہ تو کسی کو نہیں معلوم تھا۔

''تو تھکتی نہیں ہے کشور... سارا وقت ان کتابوں میں سر دے کر بیٹھے رہنے سے تیرا دل نہیں بھرتا؟'' تاجور نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کچھ حیرت سے پوچھا۔

''تھک تو میں اس زندگی سے بھی جاتی ہوں آپا... تو کیا سانس لینا چھوڑ دوں؟ بس آپ یہ سمجھ لیں کہ یہ کتابیں بھی زندگی کی طرح کی کوئی چیز ہیں۔ جیسے اس ایک جیسی زندگی میں بھی بھی نئے موڑ اور چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں آ کر اس میں جی لگانے کا سامان پیدا کر دیتی ہیں، ویسے ہی ان کتابوں میں بھی بندے کو کچھ نہ کچھ ایسا مل جاتا ہے جو اس کا جی اچاٹ نہیں ہونے دیتا۔'' کشور نے رسانیت سے بہن کی بات کا جواب دیا۔

''تو پہ! تو تو بات بھی کتاب کی زبان میں کرتی ہے۔ کسی بھی بات کا آسان لفظوں میں جواب نہیں دیا جاتا تجھ سے۔'' تاجور نے ناک چڑھائی تو کشور ہنس پڑی اور ہنس کر بولی۔

''آدمی بھی کتاب کی زبان میں بات نہیں کرتا، اصل میں کتاب آدمی کی زبان میں بات کرتی ہے۔''

''چل چھوڑ اس کتاب کے قصے کو۔ یہ بتا تجھے معلوم ہوا کہ اباجی آج کل ایک اور بیاہ رچانے کے چکر میں ہیں؟'' تاجور نے بور ہو کر موضوع بدل دیا۔

''بھئی جیسے لوگوں کو شوق ہوتا ہے گاڑیوں کے نئے نئے ماڈل جمع کرنے کا، ویسے ہی ہمارے اباجی کو شوق ہے ہر تھوڑے عرصے بعد ایک نئے ماڈل کی عورت ان کے پاس آئے۔ اس بار تو انہوں نے کافی وقت لے لیا ورنہ پہلی تینوں تو بڑے کم وقفے سے ان کی زندگی میں آئی تھیں۔'' تاجور کی دی ہوئی اطلاع پر کشور نے بے نیازی سے تبصرہ کیا۔

''تو بھی نہ کسی بات کو سنجیدگی سے نہیں لیتی۔ اب بھی دیکھ، یہ تک نہیں پوچھا کہ کون ہے وہ جس سے اباجی بیاہ کرنے کے چکر میں ہیں؟'' کشور کی بے نیازی پر تاجور نے خفگی ظاہر کی۔

''چلیں، میں نے نہیں پوچھا تو آپ بتا دیں۔ ویسے بھی

www.pkdigest.com

مجھے معلوم ہے کہ آپ سے بغیر بتائے رہا نہیں جائے گا۔"

"وہ جو کڑی نہیں تھی ماہ بانو... جس سے ہم نے عرس پر مہندی لگوائی تھی۔ اس چھٹانک بھر کی لڑکی پر اباجی کا دل آ گیا ہے۔" تاجور نے قدرے ناگواری سے اطلاع دی۔

"ماہ بانو... وہ نوراں کی بیٹی نا؟ وہ تو بہت کم عمر ہے۔ اس کا اور اباجی کا بھلا کیا میل؟" کشور حیران ہوئی۔

"میل تو کوئی نہیں ہے۔ اماں کو تو سارا غصہ ہی اس بات کا ہے کہ اباجی کی کمینوں کی اولاد کو ان کی سوتن بنا کر برابری پر لانے پر تلے ہیں۔" ماہ بانو اور چودھری افتخار کے مابین فرق کا تاجور کو بھی احساس تھا لیکن اس کی سوچ مختلف تھی۔

"ماہ بانو تو شہر کی رہنے والی پڑھی لکھی لڑکی ہے... وہ راضی ہو گئی اس بیاہ پر؟" تاجور کی بات پر کوئی تبصرہ کیے بغیر کشور نے دوسرا سوال پوچھا۔

"کہاں...؟ دیکھا نہیں تھا تو نے اسے کہ کیسی نخریلی سی تھی۔ بھاگ نکلی ساروں کو جل دے کر۔ آج کل اباجی اس کی تلاش میں بولائے ہوئے ہیں۔" تاجور کو کچھ خبریں تو بڑی چودھرائن نے دی تھیں اور کچھ ان ملازموں کی مرہون منت تھیں جو چودھری افتخار کی حویلی میں رہ کر یہاں والوں کے لیے باقاعدہ جاسوسی کا فریضہ انجام دیتے تھے۔

"اباجی کو یہ ظلم نہیں کرنا چاہیے تھا۔ بھلا ان کا اور ماہ بانو کا کیا میل تھا؟ اب ان سے بچنے کے لیے بے چاری لڑکی جانے کہاں کہاں بھٹکتی پھر رہی ہوگی؟" کشور کو شدید افسوس تھا۔

"تجھے ماہ بانو کی فکر کھائے جا رہی ہے، ادھر میں اور صنوبر پریشان ہیں کہ اباجی کی ان حرکتوں کا ہمارے گھر پر کیا اثر پڑے گا؟ کل کو ہمارے شوہر بھی کھڑے ہو جائیں گے دوسرا بیاہ کرنے۔ تمہارا بھائی اشرف تو ویسے ہی آج کل ہر وقت مجھے طعنے مارتا رہتا ہے کہ کیسی موٹی بھدی عورت ہو تم؟ انڈین فلموں کی چھیل چھبیلی، بالشت بھر کپڑا پہن کر نمائش کرنے والی ہیروئنوں کو دیکھ دیکھ کر دماغ خراب ہوا جا رہا ہے اس کا۔" تاجور کی اپنی پریشانیاں تھیں، اسے ماہ بانو کا غم کیا خاک ستاتا۔

"اس بات کے لیے تو آپ کو ہمیشہ تیار ہی رہنا چاہیے۔ ہمارے ہاں کے مردوں کے بہت سے مشاغل میں سے ایک مشغلہ یہ بھی تو ہے۔"

"تو اتنے آرام سے اس لیے کہہ رہی ہے کہ تجھے معلوم نہیں کہ سوتن کا جلاپا کیا ہوتا ہے۔ اپنے شوہر کو کسی دوسری عورت سے بانٹنے کا خیال ہی عورت کو آدھا کر دیتا ہے۔"

کشور کی بات کے جواب میں تاجور نے اس قدر جلبلا کر کہا کہ کشور کے سارے چہرے پر کرب کے آثار چھا گئے۔ تاجور کو اپنی بات کی سنگینی کا احساس ہوا مگر اب تو تیر کمان سے نکل ہی چکا تھا۔ اس نے شرمندہ ہو کر کشور کے سامنے سے ہٹ جانا ہی مناسب سمجھا اور اپنی جگہ سے کھڑی ہوتے ہوئے بولی۔

"ذرا جا کر دیکھوں تو کہ کسی نے منور کو تیار بھی کیا ہے کہ نہیں۔ وہ ماسٹر اسے پڑھانے کے لیے آنے ہی والا ہوگا۔"

"منور تیار ہو گیا ہو آپا تو اسے میرے پاس بھیجنا۔ مجھے ایک کتاب منگوانی ہے۔ ماسٹر صاحب شہر جاتے رہتے ہیں، انہیں نام لکھ کر دوں گی تو وہ لا دیں گے۔" کشور نے فوراً ہی خود پر قابو پالیا تھا اور اب بہت عام سے لہجے میں تاجور سے کہہ رہی تھی۔

"توبہ ہے کشور! پھر وہی کتاب۔ ابھی تو تُو شہر سے اتنی ڈھیر کتابیں خرید کر لائی ہے۔" تاجور نہ چاہتے ہوئے بھی بے ساختہ اسے ٹوک بیٹھی۔

"یہ کتاب جو مجھے منگوانی ہے اس وقت ملی نہیں تھی اس لیے اب ماسٹر صاحب سے منگوانے کی سوچ رہی ہوں۔" کشور نے بہت تحمل سے تاجور کے اعتراض کا جواب دیا تو وہ شانے اچکاتے ہوئے باہر نکل گئی۔

ذرا دیر بعد بنک سک سے تیار منور کشور کے سامنے کھڑا تھا۔ کشور نے ایک صاف ستھرے کاغذ پر کچھ لکھ کر اس کے حوالے کیا۔ اسی وقت ایک ملازمہ نے ماسٹر آفتاب کے پہنچنے کی اطلاع دی۔ منور کاغذ ہاتھ میں پکڑے بھاگتا ہوا وہاں سے اس کمرے کی طرف چلا گیا جہاں ماسٹر آفتاب اس کا منتظر تھا۔ جاتے ہی اس نے کاغذ ماسٹر آفتاب کے ہاتھ میں پکڑایا اور بولا۔ "یہ چھوٹی خالہ نے دیا ہے۔ کہتی ہیں شہر سے ان کے لیے یہ کتاب لا دیجیے گا۔"

منور کا پیغام سن کر ماسٹر آفتاب سمجھ گیا کہ وہ کس کا ذکر کر رہا ہے۔ شہر میں زبردستی اسے اپنی گاڑی میں لفٹ دینے والی چودھرائن کے برابر نشست پر رکھی ڈھیروں کتابیں اس نے خود اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کی تھیں۔ کتابوں کی رسیا اس ضدی چودھرائن نے اس سے کون سی کتاب منگوائی ہے، یہ دیکھنے کے لیے ماسٹر آفتاب نے تہ کیا ہوا کاغذ کھولا۔

خاک اڑتی ہے رات بھر مجھ میں
کون پھرتا ہے دربدر مجھ میں
مجھ کو مجھ میں جگہ نہیں ملتی
تُو ہے موجود اس قدر مجھ میں

کاغذ پر کسی کتاب کے نام کے بجائے بہت صاف ستھری لکھائی میں یہ چند اشعار لکھے تھے۔ ماسٹر آفتاب کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ چودھری افتخار کی صاحب زادی نے جو پیغام بھیجا تھا، وہ اسے مستقبل کا بہت خطرناک نقشہ دکھا رہا تھا۔ فی الحال ماسٹر آفتاب نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا اور کاغذ دوبارہ تہ کر کے اپنی جیب میں رکھتے ہوئے منور کی طرف متوجہ ہو گیا لیکن منور کو پڑھانے کے دوران بھی اس کا ذہن مسلسل الجھا رہا۔ اس نے شہر میں ہونے والی مختصر ملاقات میں کشور کی ضدی فطرت کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ اپنی روایات اور ماسٹر آفتاب کے انکار کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے وہ اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے ماسٹر آفتاب کو اپنی گاڑی میں لفٹ دے کر رہی تھی۔ ایسی ضدی طبیعت کی لڑکی اپنے جذبات کے اظہار پر اتر آئی تھی تو ماسٹر آفتاب کے خاموش رہنے کی حکمتِ عملی نہ جانے کس حد تک کامیاب ہو پاتی؟

☆☆☆

"کچھ معلوم ہوا عبدالمنان کہ کل کا واقعہ کیسے پیش آیا؟"

"یس سر! میں نے ساری معلومات حاصل کر لی ہیں۔ میرا خیال صحیح تھا، اس معاملے میں این جی او کے نمائندے کی کوئی غلطی نہیں تھی، جو کچھ ہوا وہ ماہ بانو کی اپنی ایک چھوٹی سی غلطی کی وجہ سے ہوا۔"

"کیسی غلطی؟" عبدالمنان کا جواب سن کر شہریار چونکا۔

"دارالامان کی منتظمہ نے بتایا ہے کہ کل شام ماہ بانو نے اس کی اجازت کے بغیر ایک ملازمہ کی مدد سے فون پر فیصل آباد اپنے والدین سے بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ اتفاق سے منتظمہ عین موقعے پر وہاں پہنچ گئی اور اس نے لائن ڈس کنیکٹ کر دی لیکن اتنی دیر میں ماہ بانو اپنا نام تو بتا ہی چکی تھی۔ فون اس نے اپنے پڑوسیوں کے نمبر پر کیا تھا۔ منتظمہ نے لائن منقطع کی تو تھوڑی دیر بعد اسی نمبر سے ایک لڑکی کا فون آ گیا کہ ماہ بانو سے بات کرنی ہے۔ منتظمہ نے صاف کہہ دیا کہ اس نمبر پر کوئی ماہ بانو نہیں ہوتی۔ ساتھ اس نے یہ بہانہ بھی کر دیا کہ یہ فون نمبر ایک اسپتال کا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس نمبر سے کسی وزیٹر خاتون نے جس کا نام ماہ بانو ہو کال کی ہو لیکن اب ایسی کوئی خاتون یہاں موجود نہیں۔ منتظمہ کے اس انکار کے باوجود ایک دو فون اور آئے پھر سلسلہ رک گیا۔ فون چونکہ ہر بار کسی لڑکی نے کیا تھا، اس لیے منتظمہ زیادہ تشویش میں مبتلا نہیں ہوئی اور نہ ہی اس نے ہمیں اس واقعے کی اطلاع دینا ضروری سمجھا لیکن رات کو جب ماہ بانو کو اغوا کرنے کی کوشش کی گئی تو اسے احساس ہوا کہ فون نمبر کے ذریعے دارالامان کا پتا معلوم کر کے ساری کارروائی کی گئی تھی۔"

"اس کا مطلب ہے ماہ بانو کے پڑوسیوں نے چودھری افتخار کے لیے مخبری کا کام انجام دیا۔" عبدالمنان کی بتائی ہوئی تفصیلات سن کر شہریار نے خیال ظاہر کیا۔

"نو سر! ایسا نہیں ہے۔ میں نے اپنے بندوں کے ذریعے پوری تحقیقات کروائی ہیں۔ چودھری افتخار کو ماہ بانو کی لاہور میں موجودگی کی خبر تو بے شک اس کے پڑوسیوں کی وجہ سے ہوئی لیکن ایسا نادانستگی میں ہوا۔ وہ لوگ بے چارے ماہ بانو کے غائب ہونے کی وجہ سے پریشان تھے۔ جب ماہ بانو نے فون کیا تو اس کی آواز سن کر جذباتی ہو گئے۔ ادھر منتظمہ نے کوئی بات ہونے سے قبل ہی لائن ڈس کنیکٹ کر دی تھی۔ کال ریسیو کرنے والی خاتون نے سی ایل آئی پر آنے والا نمبر دیکھ کر خود کال ملائی۔ پرانے پڑوسی ہونے کی وجہ سے انہیں ماہ بانو کی فکر تھی اور وہ اس سے بات کر کے اس کا حال احوال معلوم کرنا چاہتی تھیں لیکن ظاہر ہے، منتظمہ نے سرے سے ماہ بانو کی موجودگی سے ہی انکار کر دیا تو وہ مایوس ہو گئیں۔ اب جیسا کہ چھوٹے علاقوں کے محلوں کا رواج ہوتا ہے کہ کوئی بھی بات خود تک محدود رکھنے کے بجائے سارے محلے کو اس بارے میں اطلاع دینا ضروری سمجھا جاتا ہے، ویسا ہی ان خاتون نے کیا۔ جوش میں انہوں نے اپنے دروازے پر کھڑے کھڑے ہی سامنے والے گھر کی خاتون کو اس کال کے بارے میں بتایا پھر محلے کی دو چار اور خواتین کو بھی اطلاع دی۔ یوں سمجھیں کہ ماہ بانو کی کال نے سارے محلے میں ہلچل سی مچا دی۔ جہاں تک میں نے اندازہ لگایا ہے کہ چودھری افتخار کے بندے ابھی تک ماہ بانو کے بارے میں سن گن لینے کے لیے اس کے محلے کے چکر کاٹ رہے تھے، چنانچہ انہیں بھی اس کال کی خبر ہو گئی۔ پڑوسی خاتون سے پوچھ گچھ کے نتیجے میں معلوم ہوا ہے کہ ماہ بانو کی کال کے ایک گھنٹے بعد ہی ایک لڑکی ان کے گھر آئی تھی اور خود کو ماہ بانو کی دوست اور کلاس فیلو ظاہر کر کے اس سے رابطے کا کوئی ذریعہ دریافت کیا تھا۔ اب جیسا کہ عموماً خواتین کی عادت ہوتی ہے کہ وہ ہر بات ہر ایک کو بتانا ضروری سمجھتی ہیں، چنانچہ پڑوسن صاحبہ نے بھی اپنے گھر آنے والی لڑکی کو ماہ بانو کی سہیلی جان کر اس کے سامنے ماہ بانو کے سلسلے میں کافی فکرمندی کا اظہار کیا۔ اس کے غائب ہونے کے سلسلے میں اپنے قائم کردہ مفروضوں کو ڈسکس کیا اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ آج ماہ بانو نے کہیں سے انہیں کال کی تھی لیکن بات نہیں ہو سکی۔ انہوں نے خود

www.pkdigest.com

بات کرنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ نمبر کسی اسپتال کا ہے اور وہاں کوئی ماہ بانو کو جاننے والا نہیں۔ لڑکی نے ان سے کہا کہ آپ مجھے وہ نمبر دے دیں۔ میں معلوم کرنے کی کوشش کروں گی کہ انہیں جو کچھ بتایا گیا ہے، وہ صحیح ہے یا غلط۔ لڑکی نے ان خاتون پر یہ رعب بھی ڈالا کہ اس کا ایک کزن پولیس میں اچھے عہدے پر ہے اور وہ اپنے کزن کے ذریعے اس کال کے بارے میں مکمل تحقیقات کروا سکتی ہے۔ خاتون نے لڑکی کو نمبر دے دیا اور اب اس انتظار میں ہیں کہ ماہ بانو کی سہیلی جلد انہیں ماہ بانو کے بارے میں کوئی خبر دے گی لیکن رات دارالامان میں جو کچھ ہوا، اس کے بعد تو صاف ظاہر ہے کہ وہ لڑکی ماہ بانو کی کوئی دوست نہیں بلکہ چودھری افتخار کی کوئی آلۂ کار تھی جو بہت چالاکی سے ماہ بانو کے بارے میں ایک اہم سراغ حاصل کر کے لے گئی اور اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ہم سب ہی جانتے ہیں۔"

عبدالنان کی حاصل کردہ معلومات بہت ٹھوس تھیں۔ وہ ایک تجربہ کار آدمی تھا جو وقتِ ضرورت اپنے تعلقات استعمال کرنا خوب جانتا تھا۔ رات اگر وہ ماہ بانو کو تھانے سے نکلوانا چاہتا تو خود بھی تھوڑے بہت ہاتھ پیر چلا کر یہ کام کر سکتا تھا لیکن شہریار کی اس کیس میں ذاتی دلچسپی محسوس کرتے ہوئے اس نے خود سے کوئی اقدام اٹھانے کے بجائے اسے اطلاع دینا مناسب سمجھا تھا اور جس طرح شہریار نے اس کی رات گئے آمد پر بنا کوئی اعتراض کیے بہت تیزی سے ماہ بانو کے تحفظ کے لیے اقدامات کیے تھے، اس سے عبدالنان کو اپنے فیصلے کی درستگی کا اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا۔

"یہ تو واقعی ماہ بانو سے بہت بڑی غلطی ہو گئی تھی۔ اگر دارالامان کا چوکیدار جرأت مندی سے کام نہ لیتا تو چودھری افتخار راہ ماہ بانو کو وہاں سے اغوا کروانے میں کامیاب ہو جاتا۔ تم نے بتایا تھا کہ اس چوکیدار کو گولیاں لگی ہیں۔ کیا خبر ہے اس چوکیدار کے بارے میں؟ اس کی حالت اب کیسی ہے؟" عبدالنان کی بات پر تبصرہ کرتے ہوئے شہریار کو اچانک چوکیدار کے بارے میں خیال آیا تو اس نے اس کی بابت دریافت کیا۔

"وہ بے چارہ تو صبح کے قریب چل بسا۔ اصل میں ایک گولی دل کے قریب لگی تھی۔ اس نے کام دکھایا اور اس کے علاوہ خون بھی بہت زیادہ بہہ گیا تھا اس لیے ڈاکٹرز اسے بچانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔" عبدالنان نے قدرے افسوس سے جواب دیا۔

"کہیں یہ چوکیدار وہی تو نہیں تھا جس کے بارے میں تم نے بتایا تھا کہ وہ مشابرم خان کا دوست ہے۔"

"یس سر! یہ وہی تھا۔ مشابرم خان خود بھی بہت بہادر اور وفادار آدمی ہے۔ اس کا دوست بھی اسی کی طرح ثابت ہوا۔" عبدالنان نے شہریار کے اندازے کی تصدیق کی۔

"یہ تو بہت بُرا ہوا۔ چودھری افتخار کی ہوس نے ایک بے گناہ کی جان لے لی۔ چودھری افتخار کو بچنا نہیں چاہیے عبدالنان! ہمیں اس قصے کو ختم کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔ تم موتی والا سے رابطہ کر کے معلوم کرو کہ جنگل سے لکڑی کی ڈیلیوری کب ہو رہی ہے۔ اس کام میں شامل بندوں کو گرفتار کر کے ان سے چودھری افتخار کا نام اگلوانا ہے۔ چودھری کے جرائم تو جانے کتنے ہوں گے لیکن ہم کسی نہ کسی مقام پر تو اس کی پکڑ کریں تاکہ کچھ تو اس کی زور آوری کم ہو سکے۔" چوکیدار کی ناحق موت نے شہریار کو بہت افسردہ کر دیا تھا، چنانچہ اس نے شدید غم و غصے کی کیفیت میں عبدالنان کو حکم دیا۔ عبدالنان نے اس کے مزاج کی اس برہمی کو محسوس کیا اور مستعدی سے "یس سر" کہتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

چودھری افتخار اِدھر سے اُدھر ٹہلتا بری طرح پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس کے سامنے مؤدب کھڑے بالے میں ہمت نہیں تھی کہ اپنے جھکے ہوئے سر کو اٹھا کر چودھری کی طرف دیکھ سکے۔ خود چودھری بھی فی الحال بالے کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی حالت کسی چوٹ کھائے ہوئے سانپ کی طرح ہو رہی تھی جس کا بس نہ چلتا تھا کہ کیا کرے۔ آخر ٹہلتے ٹہلتے وہ مخملیں چادر بچھے تخت پر بیٹھا اور گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر اپنے دائیں ہاتھ کو پھیلایا۔ پشت پر موجود مزاج آشنا ملازم نے مستعدی سے حقے کی نے اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ چودھری افتخار نے پھنکارنے کے انداز میں ذرا دیر حقہ گڑگڑایا اور پھر ناک اور منہ سے دھواں خارج کرنے لگا۔ اس کی حالت کو دیکھ کر یہ کہنا مشکل تھا کہ یہ سارا کا سارا دھواں حقے کے کش کے نتیجے میں خارج ہو رہا ہے یا پھر اس کے اندر دہکتی غصے کی آگ نے اس دھوئیں کو اگلا ہے۔

"کیسے نکل گئی وہ تم لوگوں کے ہاتھ سے؟ تم اتنے مسٹنڈے مل کر بھی ایک معمولی سی لڑکی کو اٹھا کر لانے میں ناکام رہے۔ اس کارکردگی کے لیے میں تم لوگوں پر اپنا روپیہ لٹاتا ہوں؟" آخرکار چودھری افتخار نے بالے کی طرف دیکھتے ہوئے غضب ناک لہجے میں اس سے پوچھا۔

"ہم نے سب کام بڑے طریقے سے کیا تھا سرکار! فون نمبر حاصل کر کے اس دارالامان کا پتا معلوم کرنے اور پھر لڑکی تک پہنچنے میں ہم سے کہیں کوئی چوک نہیں ہوئی تھی۔ بس واپسی میں اچانک وہ بندہ نہ جانے کہاں سے ٹپک پڑا۔ اس کے پاس رائفل تھی جس سے فائر کر کے اس نے دو بندوں کو زخمی کر دیا۔ اس اچانک حملے سے ہم لوگ ہڑبڑا گئے اور مجبوراً زخمی ساتھیوں کو لے کر فرار ہونا پڑا۔" بالے نے اپنی صفائی پیش کی۔

"بہت شان دار! کیا مردانگی دکھائی تم لوگوں نے۔ ایک اکیلا آدمی رائفل لے کر آ گیا تو تم سے اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ میں پوچھتا ہوں اس کے پاس رائفل تھی تو تم کیا ہاتھوں میں چوڑیاں پہن کر گئے تھے۔ تمہارے پاس اس اکیلے بندے سے مقابلہ کرنے کے لیے اسلحہ نہیں تھا؟" بالے کی وضاحت نے چودھری افتخار کو مزید چراغ پا کر دیا۔

"ایسی بات نہیں ہے سرکار! ہم بھی اپنا اسلحہ ساتھ لے کر گئے تھے لیکن بدقسمتی سے ہمیں اندازہ نہیں ہوا کہ گیٹ پر موجود چوکیدار کے علاوہ بھی وہاں کوئی مسلح بندہ موجود ہے۔ اس بندے نے سب سے پہلے تاک کر قادرے پر فائر کیا۔ قادرے نے ہی لڑکی کو اٹھایا ہوا تھا۔ گولی کھا کر وہ خود کو سنبھال نہیں سکا اور لڑکی اس کی گرفت سے آزاد ہو کر اندر کی طرف بھاگ گئی۔ ہم پر فائر کرنے والا بندہ محفوظ پوزیشن میں تھا۔ ہم سنبھلتے، اس سے پہلے اس کے فائر نے مولا بخش کو اپنی نشانہ بنا لیا۔ ہم نے بھی جوابی فائر کیے لیکن اس بندے کا کچھ نہیں بگڑا۔ علاقے کا تھانہ دارالامان سے قریب ہی تھا۔ فائرنگ کی خبر سن کر وہاں سے فوراً ہی پارٹی پہنچ سکتی تھی۔ ہمارے پاس موقع نہیں تھا کہ ہم اندر جا کر دوبارہ سے لڑکی کو پکڑنے کی کوشش کرتے۔ اس چکر میں ہم پھنس بھی سکتے تھے۔ اپنے پھنسنے کی تو خیر ہمیں پروا نہیں تھی لیکن اس بات کا خیال تھا کہ کہیں ہمارے پیچھے پولیس آپ تک نہ پہنچ جائے۔ ہم نے یہی بہتر سمجھا کہ اپنے زخمی بندوں کو اٹھا کر بھاگ نکلیں۔ رائفل والا بندہ الگ پیچھے پڑا تھا۔ ہم وہاں سے نکلنے لگے تو جوش میں آ کر وہ اپنی پوزیشن سے نکل کر ہمارے پیچھے بھاگا۔ اس وقت میں نے اس کو نشانہ بنایا۔ اس بندے کے بارے میں اطلاع ملی ہے کہ وہ اسپتال میں گزر گیا ہے۔" بالے نے ایک بار پھر ذرا تفصیل سے سارا واقعہ بتاتے ہوئے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

"تو بس بندے پکڑ کا خرچ ہوتا رہا کر۔ اصل کام تجھ سے نہیں ہوتا ہے۔" بالے کی سنائی تفصیل سے متاثر ہونے کے بجائے چودھری افتخار دہاڑا۔ اس بار بالے نے چپ رہنا مناسب سمجھا۔

"آگے کچھ معلوم کیا تُو نے... کڑی کے بارے میں کیا خبر ہے... کہاں ہے وہ؟" چودھری نے خود ہی پوچھا۔

"میں نے دارالامان سے معلومات حاصل کی ہیں۔ لڑکی اب وہاں نہیں ہے۔ علاقے کے تھانے میں بھی اس واقعے کو غنڈا گردی کی ایک واردات قرار دے کر رپورٹ لکھی گئی ہے یہ رپورٹ میں ظاہر کیا گیا ہے کہ کچھ غنڈے دارالامان میں گھس کر وہاں سے عورتوں کو اغوا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دارالامان کے چوکیدار کی مداخلت کی وجہ سے انہیں ناکامی ہوئی۔ رپورٹ میں خاص طور پر ماہ بانو کا کوئی ذکر نہیں۔ مجھے ایک کانسٹیبل سے معلوم ہوا ہے کہ فائرنگ کے بعد تھانے کا ایس ایچ او پولیس پارٹی لے کر دارالامان گیا تھا اور واپسی میں اپنے ساتھ ایک لڑکی کو لے کر آیا تھا۔ ابھی وہ لڑکی سے پوچھ تاچھ کر ہی رہا تھا کہ کہیں اوپر سے فون پر حکم دیا گیا کہ لڑکی کو چھوڑ دو۔ پھر باہر سے کوئی بندہ آ کر لڑکی کو اپنے ساتھ لے گیا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ لڑکی ماہ بانو ہی تھی اور تھانے سے واپس دارالامان آنے کے بجائے کسی دوسری جگہ چلی گئی۔ میں نے اس کانسٹیبل سے اچھی طرح سب معلوم کیا تھا لیکن اس کا کہنا ہے کہ اسے تو کیا خود ایس ایچ او صاحب کو بھی نہیں معلوم کہ لڑکی کو کہاں لے جایا گیا ہے۔"

"آخر ایسا کون ہمدرد پیدا ہو گیا ہے خیاٹے کی دھی کا؟ وہ یہاں سے بھاگ کر فیصل آباد کے بجائے لاہور کے ایک دارالامان میں پہنچ گئی ہے۔ میں نے یہ سنا تو حیرت نہیں ہوئی بلکہ یہی سوچا کہ کڑی ہوشیار تھی اس لیے عقل مندی سے کام لیتے ہوئے فیصل آباد میں اپنے گھر کا رخ کرنے کے بجائے لاہور کے ایک دارالامان میں جا چھپی لیکن جس طرح وہ تھانے سے غائب ہوئی ہے، اس سے تو لگتا ہے کہ کوئی پہنچی والا بندہ اس کے پیچھے ہے اور اس کی مدد کر رہا ہے۔" بالے کی بتائی ہوئی تفصیل سن کر چودھری افتخار نے پُرتفکر انداز میں تبصرہ کیا۔

"آپ بالکل ٹھیک فرما رہے ہیں چودھری صاحب! مجھے تو لگتا ہے کہ آپ کا کوئی دشمن ہے جو اس لڑکی کا ساتھ دے رہا ہے۔" بالے نے فوراً ہی چودھری افتخار کے خیال کی تائید کی۔ اس تائید کے پیچھے چودھری کی خوشامد کے علاوہ یہ سوچ بھی کارفرما تھی کہ چودھری کا دھیان اپنے کسی دشمن میں الجھ جائے تو وہ بالے اور اس کے ساتھیوں کی ناقص کارکردگی بھول جائے۔

www.pkdigest.com

"دارالامان سے کچھ معلوم ہوا کہ وہاں کس نے ماہ بانو کو بھجوایا تھا؟" بالے کی توقع کے مطابق اب چودھری افتخار اسی لائن پر سوچ رہا تھا کہ ماہ بانو کے پیچھے اس کے کسی دشمن کا ہاتھ ہے اور اب وہ اس دشمن تک رسائی حاصل کرنے کے لیے بے چین تھا۔

"تھانے میں دارالامان کی منتظمہ نے جو بیان دیا ہے، اس کے مطابق تو ماہ بانو خود سے وہاں آئی تھی۔ اس نے ظاہر کیا تھا کہ وہ اپنے گھر سے بھاگی ہوئی ہے۔ جس کے ساتھ بھاگی تھی، اس نے دھوکا دیا اور اب وہ اپنے گھر واپس نہیں جانا چاہتی اس لیے اس دارالامان میں آگئی ہے۔" بالے نے چودھری افتخار کو بتایا۔

"میرے خیال میں منتظمہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ وہ لڑکی بڑی چالاک اور ذہین ہے۔ اس کے لیے اپنی مرضی کی بات بنانا کچھ مشکل نہیں۔" چودھری افتخار کو وہ رات یاد آگئی تھی جب ماہ بانو اپنے آپ پر مٹی کا تیل چھڑک کر اس کے روبرو پہنچی تھی۔ اس وقت چودھری افتخار اس کی جی داری سے اتنا متاثر ہوا تھا کہ اس سے زبردستی کرنے کے بجائے اسے اپنی عزت بنانے پر تل گیا تھا لیکن اب اسے لگ رہا تھا کہ ماہ بانو نے چالاکی اور منصوبہ بندی سے کام لیا تھا اور اچھی چالاکی کے سہارے وہ کسی کو بھی بے وقوف بنا سکتی تھی۔

"ٹھیک ہے تو جا۔ پر آنکھیں کھلی رکھنا۔ مجھے لگتا ہے کہ ماہ بانو کو ابھی حوراں اور صفدر کی موت کی خبر نہیں ہوئی ہے۔ اپنے ان لاڈلے ماں بیٹوں کی چاہت میں وہ فیصل آباد رابطے کی دوبارہ کوشش ضرور کرے گی، تم اس طرف اپنے بندے لگائے رکھنا تاکہ جیسے ہی کوئی بھنک ملے اسے پکڑ سکو۔ اور ہاں، یاد رکھنا اس بار کوئی غلطی نہیں ہونی چاہیے ورنہ میں تم سب کی کھال ادھڑوا دوں گا۔ مجھے ماہ بانو ہر حال میں چاہیے۔" چودھری افتخار نے بالے کو حکم دیتے ہوئے ساتھ میں دھمکایا بھی۔

"آپ فکر نہ کریں سرکار! اس واری ہم سے کوئی چوک نہیں ہوگی۔" بالے نے چودھری افتخار کو یقین دلایا اور فی الحال اپنی بچت ہو جانے پر دل ہی دل میں شکر کرتا ہوا وہاں سے باہر نکل گیا۔ اس کے باہر نکلنے کے بعد چودھری نے اپنے پیچھے کھڑے ملازم کو بھی ہاتھ سے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ ملازم باہر نکل گیا تو چودھری افتخار نے تخت پوش کے نیچے ہاتھ ڈال کر وہاں سے ایک لفافہ برآمد کیا۔ اس لفافے میں ماہ بانو کی وہ تصویر تھی جس میں وہ کالج یونیفارم میں ملبوس کالج کے لان میں کھڑی تھی۔ چودھری افتخار کچھ دیر تصویر کو دیکھتا رہا اور پھر دانت کچکچا کر بولا۔

"جتنا بھاگ سکتی ہے بھاگ کر دیکھ لے... آخر ایک دن تجھے میرے پاس آنا ہی ہوگا۔ چودھری افتخار اپنی پسند کی کسی چیز کو کبھی اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔" چودھری کی بڑبڑاہٹ اور غصے سے بے خبر ماہ بانو اپنی تصویر میں مسکراتی رہی مگر یہ مسکراہٹ اب صرف تصویر تک ہی محدود رہ گئی تھی۔ وہ خود تو حالات کی زد میں آکر اِدھر اُدھر ڈولتی پھر رہی تھی۔

☆☆☆

"یہ ان مشکوک لوڈرز کے نمبر ہیں تارڑ صاحب جن کے بارے میں مجھے اطلاع ملی ہے کہ آج رات ان کے ذریعے غیر قانونی طور پر کچھ مال علاقے سے باہر لے جایا جائے گا۔ اطلاع بہت قابلِ اعتماد ذریعے سے ملی ہے اس لیے مجھے کوئی شک تو نہیں ہے کہ جن نمبروں کے لوڈرز کی میں نے نشان دہی کی ہے، وہ غلط ثابت ہوں گے لیکن احتیاطاً آپ اتنی سختی سے ناکا بندی کیجیے گا کہ کوئی بھی گاڑی یا لوڈر وغیرہ بغیر چیکنگ کے سڑک سے نہیں گزر سکے۔ اپنے علاقے سے کسی بھی قسم کی غیر قانونی نقل و حمل کو روکنے کے لیے ہمیں بہت سختی سے ایکشن لینا ہوگا ورنہ جرائم پیشہ افراد کے حوصلے بڑھتے جائیں گے۔"

"میں سارا انتظام کرلوں گا سر! بلکہ میں خود اس سارے پراسس کی نگرانی کروں گا مگر آپ یہ تو بتائیں کہ کون سا مال لے جایا جا رہا ہے اور آپ کو کن ذرائع سے اطلاع ملی ہے؟" معظم تارڑ نے شہریار کو بھرپور تعاون کی یقین دہانی کرواتے ہوئے تجسس سے پوچھا۔

"سوری تارڑ صاحب! اپنا سورس آف انفارمیشن تو میں آپ کو نہیں بتا سکتا۔ آپ جانتے ہیں کہ اس قسم کی مخبری کرنے والے شخص کے اپنے بھی کچھ تحفظات ہوتے ہیں۔ میں نے بھی اس شخص سے وعدہ کر رکھا ہے کہ میں اس کا نام لیک آؤٹ نہیں ہونے دوں گا۔ رہی یہ بات کہ کون سی چیز غیر قانونی طور پر علاقے سے باہر لے جانے کی کوشش کی جا رہی ہے تو یہ تو جب آپ ناکا بندی کریں گے تو آپ کو خود بھی معلوم ہو جائے گا۔ آپ کے محکمے کے افراد اتنی اہلیت تو رکھتے ہیں نا کہ قانونی اور غیر قانونی نقل و حمل کے درمیان فرق کر سکیں؟" شہریار نے کچھ بھی بتانے سے صاف انکار کرتے ہوئے آخر میں طنز سے سوال کیا۔

"او کے سر! جو آپ مناسب سمجھیں۔ میں تو صرف اس لیے اسمگل ہونے والے آئٹم کے بارے میں جاننا چاہتا تھا کہ میرے لوگ ایک خاص حوالے کو ذہن میں رکھ کر چیکنگ کا کام کریں لیکن اگر آپ کو ان کی ذہانت کا امتحان ہی لینا مقصود ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں اس حساب سے بھی سارا مینجمنٹ کروا سکتا ہوں۔" شہریار کا جواب معظم تارڑ کو برا لگا تھا لیکن عہدے کا پاس رکھتے ہوئے اس نے برداشت سے کام لیا اور غصے کے باوجود اپنے لہجے کو نرم ہی رکھا۔

"وٹ یو بیسٹ آف لک!" شہریار کو بھی معظم تارڑ کی کیفیت کا اندازہ تھا لیکن وہ اس کے جذبات کو خاطر میں لائے بغیر اطمینان سے بولا۔ یہ جملہ اس بات کی بھی نشان دہی تھا کہ شہریار، معظم تارڑ کے ساتھ اپنی گفتگو مکمل کر چکا ہے۔ معظم تارڑ نے بھی اس اشارے کو سمجھ لیا اور اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

"او کے! میں جا کر اپنے محکمے کے لوگوں کو ہدایات دیتا ہوں۔ آئی ہوپ کہ میرا عملہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں دے گا اور کل صبح آپ کو مکمل رپورٹ مل جائے گی۔" معظم تارڑ، شہریار کے دفتر سے رخصت ہو گیا۔ اس کے رخصت ہونے کے بعد شہریار نے عبدالمنان کو اندر بلایا۔

"کیا خیال ہے تمہارا... معظم تارڑ ٹھیک طرح سے کارروائی کرے گا؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتے سر! معظم تارڑ کے چودھری افتخار سے قریبی مراسم تو ضرور ہیں لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ اس معاملے میں چودھری افتخار کے ساتھ شریک ہے یا نہیں۔ عام طور پر اس قسم کے معاملات بڑے افسران کے بجائے نچلے عملے سے ہی طے کر لیے جاتے ہیں۔" عبدالمنان نے شہریار کے سوال کا محتاط جواب دیا۔

"میرا بھی یہی خیال تھا اس لیے میں نے براہِ راست معظم تارڑ سے اس کارروائی کے لیے بات کی ہے۔ احتیاطاً میں نے اس بات کی نشان دہی نہیں کی کہ ہم اس ناکا بندی کے ذریعے کس چیز کو اسمگل ہونے سے روکنا چاہتے ہیں۔ اس طرح اگر محکمے میں چودھری افتخار کا کوئی مخبر ہے بھی تو وہ اس کارروائی کا مقصد نہیں سمجھ سکے گا۔ ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہم سو فیصد رازداری کے ساتھ یہ کام نہیں کر سکتے۔ جگہ جگہ ناکا بندی کرنے کے لیے ہمیں ہر حال میں پولیس کے محکمے سے مدد لینی ہوگی۔ بس یہ ہو سکتا ہے کہ میں خفیہ طور پر اس ساری کارروائی کو خود مانیٹر کروں... اگر محکمے میں موجود کوئی کالی بھیڑ موقعے پر چشم پوشی سے کام لینا چاہے تو اس کی اسی دانت پکڑ ہو سکے۔"

"یہ آئیڈیا اچھا ہے سر!" عبدالمنان نے شہریار کے فیصلے کی تائید کی اور پھر بولا۔ "میں آپ کے ساتھ رہوں گا سر! آپ بتا دیں کہ آپ کس وقت تک گشت پر نکلنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ میں اسی وقت آپ کی رہائش گاہ پر حاضر ہو جاؤں گا۔"

"موتی والا کی اطلاع کے مطابق لوڈرز آدھی رات کے بعد گزریں گے۔ میرا خیال ہے کہ ہم احتیاطاً آدھی رات سے پہلے ہی نکل پڑیں تاکہ اگر غائم کچھ آگے پیچھے ہو بھی جائے تو ہم وہاں موجود ہوں۔" شہریار نے جواب دیا تو عبدالمنان بولا۔

"او کے سر! میں اسی حساب سے آپ کے پاس آجاؤں گا۔" اس کے بعد شہریار کا سارا دن دفتر میں معمول کے کاموں کو نمٹاتے ہوئے گزرا۔ کام کے دوران اسے رات کو ہونے والی کارروائی کا خیال آتا تو سارے جسم میں سنسنی کی ایک لہری دوڑ جاتی۔ فطرتاً وہ ایک مہم جو شخص تھا اور یہ خیال کہ وہ چودھری افتخار جیسے زور آور اور مطلق العنان شخص کو زک پہنچانے جا رہا ہے، اسے بہت زیادہ ایکسائٹمنٹ میں مبتلا کر رہا تھا۔ شام کو دفتر سے اپنی رہائش گاہ پر لوٹنے کے بعد بھی اس کا ذہن اسی بات میں اٹکا رہا۔ اس نے ایک بار معظم تارڑ کو فون کر کے اس کے انتظامات کے بارے میں بھی معلومات حاصل کیں۔ رازداری کے خیال سے اس بات کا اہتمام کیا گیا تھا کہ پولیس فورس کے افراد اپنی اپنی جگہ تیار رہیں اور پھر رات کے ابتدائی حصے میں انہیں اچانک ان مقامات پر بھیج دیا جائے جہاں چیک پوسٹیں بنانے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ معظم تارڑ نے شہریار کو یقین دہانی کروائی تھی کہ سارے کام اس کی ہدایات کے عین مطابق انجام دیے گئے ہیں۔ معظم تارڑ کی اس یقین دہانی کو صحیح سمجھنا شہریار کی مجبوری تھی۔ وہ جانتا تھا کہ عہدے کے حساب سے اے سی کی پوسٹ بے شک بڑی ہے لیکن ضلع کی اصل حکمرانی ایس پی کے ہاتھ میں ہی ہوتی ہے۔ ایس پی وہ شخص ہوتا ہے جو عملاً ضلع کے سارے اہم معاملات کو دیکھ رہا ہوتا ہے اور اسسٹنٹ کمشنر کا اپنے آفس سے باہر نکل کر ان معاملات میں دخل دینا اسے اپنے اختیارات میں دخل دینے کے برابر محسوس ہوتا ہے۔ شہریار کو معظم تارڑ کے اختیارات میں دخل اندازی کرنے کا کوئی شوق نہیں تھا لیکن وہ اس شخص پر سو فیصد اعتماد بھی نہیں کر سکتا تھا اس لیے آج کی کارروائی کو خود مانیٹر کرنے کے لیے اچانک ان لوگوں کے سروں پر پہنچنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

رات کا ہلکا پھلکا کھانا کھانے کے بعد اس نے اپنی تیاری شروع کر دی۔ اس وقت اس نے کوئی بہت بانکلف لباس پہننے کے بجائے جینز اور ٹی شرٹ کا انتخاب کیا تھا۔ اس عام سی جینز اور ٹی شرٹ میں وہ بہت اسمارٹ لگ رہا تھا۔ اس

www.pkdigest.com

لباس نے اس کے ورزشی جسم اور دراز قامت کو اور بھی نمایاں کر دیا تھا۔ لباس کے ساتھ اس نے جو اضافی شے اپنے ساتھ لی تھی، وہ ایک جدید طرز کا پسٹل تھا۔ یہ پسٹل اس کی ذاتی ملکیت تھا جس کا اس کے پاس لائسنس بھی موجود تھا۔

عبدالمنان اپنے کہے کے مطابق ٹھیک وقت پر پہنچ گیا۔ ڈرائیور کے طور پر تو مشاہرم خان کے سوا کسی کے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کی کارکردگی شروع سے ہی قابل ستائش اور قابل اعتماد تھی۔ اس کے دوست کی ماہ بانو کے تحفظ کے لیے دی جانے والی قربانی نے شہریار کے دل میں اس کی قدر و منزلت اور بھی بڑھا دی تھی۔ جس شخص کی بات کا پاس رکھنے کے لیے اس کا دوست جان سے گزر گیا تھا، خود اس شخص کے اپنے کردار پر تو کسی قسم کا شک کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ مشاہرم خان کی معیت میں شہریار اور عبدالمنان گھر سے روانہ ہوئے۔ منصوبے کے مطابق چیک پوسٹس اس سڑک پر بنائی گئی تھیں جس پر سے ضلع سے باہر جانے والی ہر گاڑی کو لامحالہ گزرنا پڑتا تھا۔ شہریار کی ہدایت پر مشاہرم خان نے جس چیک پوسٹ کی طرف گاڑی کا رخ کیا، اس کے بعد اس سڑک پر بس ایک ہی چیک پوسٹ رہ جاتی تھی۔ یہ آخری چیک پوسٹ اس جگہ قائم کی گئی تھی جہاں ضلع سے جانے والی سڑک کا اختتام ہو جاتا تھا اور مین ہائی وے شروع ہو جاتی تھی۔

''بس یہیں روک دو۔'' اپنی مطلوبہ چیک پوسٹ سے کافی فاصلے پر ہی شہریار نے مشاہرم خان کو حکم دیا تو اس نے گاڑی روک لی اور پھر شہریار کے کہنے پر گاڑی کی لائٹیں بھی بند کر دیں۔ ترقیاتی کاموں کے اعتبار سے یہ علاقہ کافی پیچھے تھا اور ابھی تک ڈھنگ سے اسٹریٹ لائٹس کا بھی انتظام نہیں کیا گیا تھا اس لیے رات کے اس پہر اچھی خاصی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ شہریار اور اس کے ساتھی اپنی گاڑی سمیت اس تاریکی کا حصہ بنے رہے۔ چیک پوسٹ پر البتہ روشنی کا انتظام نظر آ رہا تھا۔ اس روشنی میں وہاں موجود پولیس والوں کی نقل و حرکت بھی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ بہت زیادہ مستعد نہیں تھے۔ اصل میں اس سڑک پر رات کے اس پہر گاڑیوں کا بہت ہی کم گزر ہوتا تھا اس لیے پولیس والوں کو بھی زیادہ سرگرمی دکھانے کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ شہریار نے خود نوٹ کیا تھا کہ پون گھنٹے میں صرف ایک سوزوکی پک اپ گزری تھی اور اس پک اپ کی پولیس والوں نے بہت اچھی طرح تلاشی لینے کے بعد اسے آگے جانے کی اجازت دی تھی۔ اس اعتبار سے ان کی کارکردگی کو ناقص قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد انہیں ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے کوئی بڑی گاڑی آ رہی ہو پھر انہوں نے اس گاڑی کی ہیڈ لائٹس بھی دیکھ لیں۔ وہ ایک بڑا لوڈر تھا۔ شہریار سمیت وہ سب سنبھل کر بیٹھ گئے۔ چیک پوسٹ پر آ کر لوڈر پولیس والوں کے اشارے پر رک گیا۔ لوڈر کو بڑی بڑی ترپالوں سے اس طرح کور کیا گیا تھا کہ باہر سے اس پر لدے ہوئے سامان کے بارے میں اندازہ قائم کرنا مشکل تھا۔ پولیس والے اس لوڈر کے گرد پھیل گئے۔ انہوں نے اسے چیک بھی کیا لیکن جس رخ سے انہوں نے ترپال ہٹا کر لوڈر میں موجود سامان کا جائزہ لیا تھا، شہریار اور اس کے ساتھی اس کی مخالف سمت میں تھے لہٰذا انہیں اندازہ نہیں ہو سکا کہ لوڈر پر کیا سامان لوڈ ہے۔ پولیس والوں میں سے ایک نے لوڈر ڈرائیور سے اس کے کاغذات وغیرہ بھی نکلوا کر چیک کیے تھے۔ یہ ساری کارروائی مشکل سے پانچ منٹ میں انجام پائی اور پھر پولیس والوں نے اوکے کا اشارہ کرتے ہوئے اس لوڈر کو آگے بڑھنے کی اجازت دے دی۔ لوڈر چیک پوسٹ سے آگے نکلا اور یہی وہ وقت تھا جب ایک پولیس والے کے ہاتھ میں موجود سرچ لائٹ کی تیز روشنی اس کی نمبر پلیٹ پر پڑی۔ شہریار فوراً چونک اٹھا۔ یہ نمبر اس کے حافظے میں بہت اچھی طرح محفوظ تھا۔ موٹی والا کی اطلاع کے مطابق اس لوڈر پر بنگل سے غیر قانونی طور پر کاٹے گئے درختوں کے تنے موجود ہونے چاہیے تھے لیکن پولیس والوں نے نہایت آسانی سے اسے آگے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ یعنی شہریار کا خدشہ درست تھا۔ اتنے انتظام کے باوجود بھی بہت آرام سے قیمتی لکڑی اسمگل کی جا رہی تھی۔

''خان! گاڑی اس لوڈر کے پیچھے لو۔'' شہریار نے مشاہرم خان کو حکم دیا۔ وہ تو منتظر ہی بیٹھا تھا، فوراً گاڑی اسٹارٹ کر کے سڑک پر ڈال دی۔ چیک پوسٹ پر ان کی گاڑی کو رکنے کا اشارہ کیا گیا۔ مشاہرم خان نے گاڑی روکنے کے بجائے رفتار ذرا کم کی اور یہ آوازِ بلند گاڑی میں اے سی صاحب کی موجودگی کا اعلان کیا۔ اس اطلاع پر پولیس والے فوراً الرٹ ہو گئے اور گاڑی کو آگے جانے کا راستہ دے دیا۔ مگر اس ذرا سی دیر کے فرق میں وہ منظوک لوڈر کافی آگے نکل چکا تھا۔ مشاہرم خان نے اپنی گاڑی کی رفتار مزید تیز کر دی لیکن سڑک اتنی چوڑی نہیں تھی کہ وہ عین درمیان میں چلتے لوڈر کی سائیڈ میں سے اپنی گاڑی آگے نکال لے جاتا۔ مشاہرم خان نے کئی بار انڈی کیٹر دیا لیکن

لوڈر ڈرائیور کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ اب آخری چیک پوسٹ نزدیک تھی۔ شہریار کو اپنی گاڑی کے بیک ویو مرر میں پیچھے سے آتی ایک پولیس جیپ صاف نظر آرہی تھی۔ وہ پولیس جیپ کس کی مدد کے لیے آرہی ہے، اس وقت شہریار اندازہ نہیں کرسکتا تھا۔ اسے تو اس بات پر بھی شک تھا کہ لوڈر کو چیک پوسٹ پر روکا جائے گا مگر اس کا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ چیک پوسٹ پر لوڈر کو رکنے کا اشارہ کیا گیا اور لوڈر ڈرائیور نے اس اشارے پر فوراً بریک لگا دیے۔ مشاہم خان نے اپنی گاڑی بالکل لوڈر کے قریب لے جا کر روکی۔ ان کے پیچھے آنے والی پولیس بھی رک گئی۔ شہریار اور عبدالسنان اپنی گاڑی سے باہر نکلے تو انہوں نے اپنے پیچھے رکنے والی جیپ سے ایس پی معظم تارڑ کو نکلتے ہوئے دیکھا۔

"سر! آپ یہاں؟" شہریار کو دیکھ کر معظم تارڑ نے حیرت کا اظہار کیا۔

"اس لوڈر کی چیکنگ کروائیں۔" معظم تارڑ کے حیرت بھرے سوال کا کوئی جواب دینے کے بجائے شہریار نے اسے حکم دیا۔

"میں اس لوڈر کے پیچھے ہی یہاں آیا ہوں۔ آج میں خود سارا وقت گشت پر رہا ہوں۔ ابھی پچھلی چیک پوسٹ پر جب یہ لوڈر کھڑا تھا تو میں نے اس کی نمبر پلیٹ دیکھی تھی۔ میں کچھ فاصلے پر تھا، میری جیپ پہنچنے سے پہلے ہی یہ لوڈر آگے بڑھ گیا۔ پھر درمیان میں آپ کی گاڑی آگئی۔ بہرحال، آیئے اب دیکھتے ہیں کہ اس لوڈر پر کیا موجود ہے؟" معظم تارڑ نے شہریار کو جلدی جلدی بتاتے ہوئے لوڈر پر پڑے ترپال ہٹانے کا اشارہ کیا۔ فوراً ہی وہاں موجود افراد حرکت میں آگئے۔ لوڈر پر سے ترپال ہٹی تو شہریار کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ لوڈر پر صرف بھوسا لدا ہوا تھا۔

"اس بھوسے کو ہٹا کر دیکھو۔" ایک امید کے سہارے شہریار نے حکم دیا۔ اس کے حکم کی تعمیل کی جانے لگی لیکن لوڈر پر واقعی صرف بھوسا ہی لدا ہوا تھا۔ ناچار انہیں اس لوڈر کو آگے جانے کی اجازت دینی پڑی۔

"اس میں تو کچھ نہیں نکلا سر!" معظم تارڑ نے شہریار سے کہا۔ اس کا لہجہ بہت سنجیدہ تھا پھر بھی شہریار کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ اس پر طنز کر رہا ہے۔

"ممکن ہے دوسرے لوڈر پر ہماری مطلوبہ چیز موجود ہو اور اس لوڈر کو دھوکا دینے کے لیے بھوسے سے بھر کر بھیجا گیا ہو۔ ہمیں دوسرے لوڈر کا انتظار کرنا ہوگا۔" شہریار کی امید اب بھی برقرار تھی۔ اس امید کے سہارے وہ لوگ صبح تک انتظار کرتے رہے لیکن انتظار لاحاصل ثابت ہوا۔

"میرے خیال میں آپ کے مخبر سے کوئی غلطی ہوگئی ہے۔" معظم تارڑ جو مستقل شہریار کے ساتھ ہی موجود رہا تھا، طنز سے بولا۔ اس بار اس نے اپنے لہجے کے طنز کو چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔

"شاید... ویسے یہ بھی ممکن ہے کہ میرے لیے مخبری کرنے والے کے مقابلے میں مجرموں کے لیے مخبری کرنے والے زیادہ مستعد ثابت ہوئے ہوں۔" شہریار نے بھی ایک جوابی طنز کا تیر چلایا اور اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔ حقیقتاً اس ناکامی نے اسے کافی مایوس کیا تھا۔ اس ناکامی سے رات بھر کی بھاگ دوڑ کی محنت پر پانی پھرا تھا وہ الگ، دوسری طرف چودھری افتخار کے جرائم کو منظر عام پر لانے کا منصوبہ بھی خاک میں مل گیا تھا۔

☆☆☆

"اس اے سی کے بچے کو آخر کس نے اطلاع دی تھی ہمارے مال کی سپلائی کی؟ اور اطلاع بھی اتنی پکی کہ اسے ان لوڈرز کے نمبر تک معلوم تھے جن پر مال جانا تھا۔" چودھری افتخار بری طرح پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس کے سامنے بیٹھے اقبال باجوہ اور معظم تارڑ کے چہروں پر بھی فکرمندی کے آثار تھے۔

"اس بات کی کھوج لگانا تو بہت ضروری ہے چودھری صاحب... کیونکہ مخبر جو بھی ہے، وہ بہت قریبی بندہ ہے۔ مال کب سپلائی ہو رہا ہے اور کب نہیں، یہ بات تو عموماً میرے علم میں بھی نہیں ہوتی۔ میرے بندے جانے پہچانے مخصوص ڈرائیوروں کو دیکھ کر خود ہی انہیں کلیرنس دے دیتے ہیں۔ کل سپلائی کے بارے میں تو مجھے خود بھی نہیں معلوم تھا۔ مجھے اے سی صاحب نے بلا کر نا کا بندی کا حکم دیا، تب بھی فوری طور پر میرے ذہن میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ وہ لکڑیوں کی سپلائی کے معاملے سے واقف ہو گئے ہیں۔ وہ تو جب انہوں نے مجھے لوڈرز کے نمبرز نوٹ کروائے تو میرا دھیان گیا اور میں نے سوچا کہ احتیاطاً باجوہ صاحب سے معلوم کرلوں۔ ان سے بات ہوئی تو معلوم ہوا کہ ان نمبرز کے لوڈرز پر تو سپلائی جانے والی ہے اور لوڈرز بالکل تیار کھڑے ہیں۔ میں نے اور باجوہ صاحب نے مل کر صورت حال پر غور کیا۔ پہلے سوچا کہ جانے دیتے ہیں لوڈرز۔ چیکنگ ہو گی بھی تو چیک پوسٹس پر میرے اپنے ہی بندے ہوں گے لیکن پھر خیال آیا کہ ہوسکتا ہے ان میں سے کوئی اے سی صاحب کا مخبر ہو اور آگے کہیں جا کر پکڑ ہو جائے۔ باجوہ صاحب نے ایمرجنسی میں ایک لوڈر کو آن لوڈ کروا کر اس پر بھوسے کی ڈھیریاں لوڈ کروائیں۔ دوسرا لوڈر ویسے ہی کھڑا رہنے دیا کہ پوزیشن دیکھ کر اس کو نکالیں گے۔ بس اس احتیاط نے ہی بچت کروا دی۔ مجھے تو صرف مخبری کا ڈر تھا، ادھر اے سی صاحب خود تاک میں بیٹھے تھے۔ خود اپنے سامنے لوڈر چیک کروایا۔ بھوسا دیکھ کر بڑے مایوس ہوئے پھر بھی صبح تک دوسرے لوڈر کا انتظار کرتے رہے۔ صبح واپس بھی گئے تو اس شک کے ساتھ کہ کسی نے مخبری کر دی تھی اس لیے مال نہیں پکڑا گیا۔ میں نے بہت اگلوانے کی کوشش کی کہ کون سا مال اسمگل ہونے والا تھا لیکن کچھ نہیں بتایا مگر لوڈرز کے نمبرز کی وجہ سے ہم پر تو بات بالکل صاف ظاہر ہے کہ وہ جانتے تھے کہ یہاں سے کیا چیز لے جائی جانے والی ہے۔" معظم تارڑ نے تفصیل سے ساری صورت حال بیان کی۔ اس کے چہرے پر موجود فکرمندی اس کے لہجے سے بھی ٹپک رہی تھی۔

"تم نے اپنے بندوں کو ٹٹولا باجوہ! کہیں ان بندوں میں سے تو کوئی اے سی کا مخبر نہیں بن گیا؟" چودھری افتخار نے روئے سخن اقبال باجوہ کی طرف کیا۔

"سارے بندے بہت اعتبار کے ہیں چودھری صاحب! برسوں سے ہم انہی بندوں سے کام لے رہے ہیں۔ کبھی کسی کی طرف سے شکایت نہیں ملی۔ آپ تو مجھ سے زیادہ جانتے ہیں ان بندوں کے بارے میں... ان میں سے زیادہ تر آپ کے ہی نمک خوار ہیں اور آپ کے نمک خواروں کو میں نے جان سے گزرتے دیکھا ہے، نمک حرامی کرتے نہیں۔" اقبال باجوہ کے جواب پر چودھری افتخار کے ہونٹوں پر فخریہ سی مسکراہٹ پھیل گئی لیکن پھر وہ فوراً ہی سنجیدہ ہوگیا اور سنجیدگی سے بولا۔

"ٹھیک ہے ہمیں اپنے بندوں پر اعتبار ہے لیکن کہیں نہ کہیں سے تو مخبری ہوئی ہے۔ ہمارے درمیان کوئی تو کالی بھیڑ موجود ہے۔ ہمیں اس کالی بھیڑ کو ڈھونڈنا ہے۔ ابھی تو تارڑ کی وجہ سے بچت ہوگئی لیکن ہوسکتا ہے آئندہ وہ اے سی تارڑ کو بھی ہوا نہ لگنے دے اور خود ہی اچانک کارروائی کر ڈالے۔ تارڑ نے بتایا تو ہے کہ وہ شک ظاہر کر گیا ہے کہ کسی نے مخبری کر دی اس وجہ سے مال نہیں پکڑا گیا۔"

"میرے ذہن میں ایک بندے کا نام آرہا ہے چودھری صاحب! میرا خیال بلکہ یقین ہے کہ یہ مخبری اسی بندے نے کی ہے۔" اقبال باجوہ کا انداز پُرسوچ تھا۔

"وہ کون؟" چودھری افتخار نے بے چینی سے پوچھا۔

"موتی والا... میرے اور آپ کے سوا جس تیسرے بندے کو ساری تفصیلات معلوم ہوتی ہیں، وہ موتی والا ہے۔ آپ اور میں تو مخبری کرنے سے رہے اس لیے ایک موتی والا ہی رہ جاتا ہے جس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ اے سی سے مل گیا ہے۔"

"پر اسے بھی کیا ضرورت ہے مخبری کرنے کی؟ وہ تو خود شریک ہے۔" چودھری افتخار الجھا۔

"میرے خیال میں باجوہ صاحب کا اندازہ بالکل درست ہے چودھری صاحب! ذرا سارے حالات پر غور تو کر کے دیکھیں۔ بیٹے کی موت کے بعد پہلے پہل موتی والا آپ سے بالکل بدک گیا تھا۔ اس کے انداز سے لگتا تھا کہ اب وہ آپ سے تعلقات رکھنا ہی نہیں چاہتا لیکن پھر بعد میں اس نے اپنا رویہ ٹھیک کرلیا تو ہم سمجھے کہ صدمے کا اثر کم ہو گیا ہے۔ اس لیے وہ دوبارہ بزنس کی طرف دھیان دے رہا ہے، پر اب سمجھ میں آرہا ہے کہ وہ ساتھی بن کر آپ کو پھنسوانے کے چکر میں تھا۔ ورنہ اسے بزنس سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ میں یہ بات اتنے وثوق سے اس لیے بھی کہہ رہا ہوں کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ موتی والا بہت بڑی رقم لگا کر بیٹے کے نام سے ایک فلاحی اسپتال کھولنے والا ہے۔ یہ ساری باتیں کوئی انوکھی نہیں ہیں۔ بہت ہارڈ سمجھے میں آیا ہے کہ اولاد کی موت ماں باپ کو بالکل بدل کر رکھ دیتی ہے۔ موتی والا کا بیٹا تو تھا بھی اکلوتا۔ اکلوتے بیٹے کے صدمے نے اس کا دماغ بالکل الٹ دیا ہوگا اور اس نے سوچا ہوگا کہ اب اس سارے مال و متاع کا کیا کرنا ہے، جو کچھ ہے وہ فلاحی کاموں میں لگا دے تاکہ بیٹے کے لیے ایصال ثواب کا بھی کچھ بندوبست ہو اور خود اپنے دل کو بھی چین ملے۔ ممکن ہے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے ہی اس نے یہ راہ بھی ڈھونڈی ہو کہ درختوں کی غیر قانونی سپلائی کو رکوانے کا بندوبست کرے۔ اب اسے تو کوئی فکر نہیں ہے کہ آگے بال بچوں کا مستقبل دیکھنا ہے اس لیے وہ تو کچھ بھی کر سکتا ہے۔" اقبال باجوہ کی تائید کرتے ہوئے معظم تارڑ نے دلائل دیے۔

"یہ تو سوچ کے کھا کر بلی کے حج پر جانے کا معاملہ ہے چودھری صاحب! آپ مانیں یا نہ مانیں لیکن مجھے تو پکا یقین ہے کہ اس سب کے پیچھے موتی والا ہی ہے۔" اقبال باجوہ نے ایک بار پھر چودھری افتخار کو قائل کرنے کی کوشش کی۔

"نہ ماننے والی بھلا کیا بات ہے؟ مجھے خود بھی اب یہی سمجھ میں آرہا ہے کہ اس معاملے کے پیچھے موتی والا ہی ہے۔" چودھری افتخار پوری طرح قائل ہو چکا تھا۔

"میں اس معاملے میں اس لیے بھی شیور ہوں کہ موتی

والا کو اس سارے سیٹ اپ میں میری انوالمنٹ کے بارے میں پکا معلوم نہیں ہے۔ وہ شک تو کرسکتا ہے کہ اس علاقے سے مال نکلا ہے تو شاید میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ ہوں گا لیکن کبھی ڈائریکٹ ہماری اس حوالے سے کوئی بات نہیں ہوئی۔ اگر ایسا ہوتا تو اے سی صاحب مجھے رات ہونے والی کارروائی سے الگ رکھنے کا بندوبست کرتے۔ کچھ نہ کچھ شک تو انہیں اب بھی تھا اسی لیے مجھے پورا معاملہ کھل کر نہیں بتایا لیکن شک کے بجائے اگر یقین ہوتا تو وہ کچھ اور ہی انتظام کرتے۔" چودھری افتخار کو قائل ہوتے دیکھ کر معظم تارڑ نے ایک اور دلیل دی۔

"اے سی نے بہت پر پھیلانے شروع کردیے ہیں۔ پہلے اسکول والے معاملے میں مجھ سے اڑا اور اب اس دوسرے معاملے میں بھی اپنی ٹانگ اڑا رہا ہے۔ موتی والا نے مخبری کی ہے تو ساتھ یہ بھی تو بتایا ہوگا کہ میں بھی اس کام میں شریک ہوں۔" چودھری کے لہجے میں غصہ تھا۔

"تو پھر کوئی انتظام کریں نا اس اے سی کا چودھری صاحب... اگر یہ پیچھے پڑ گیا تو ہم کہاں تک بچیں گے۔ ہر دفعہ ہمیں خبر مل جائے یہ ضروری تو نہیں۔" اقبال باجوہ نے چودھری افتخار کو اکسایا۔

"اس اے سی کا انتظام کرنا اتنا آسان نہیں باجوہ صاحب... یہ آپ بھی سمجھ سکتے ہیں۔ اس سے پہلے ہم نے اپنے معاملات میں دخل اندازی کرنے والے جس اے سی کی تبدیلی کروائی تھی اس میں اور اے سی شہریار عادل میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ اے سی مڈل کلاسیا تھا جس کا کوئی آگا پیچھا نہیں تھا۔ شہریار عادل کے پیچھے تو سپورٹ کرنے والوں کی پوری فوج بیٹھی ہے۔ ماموں اس کا ایم این اے، کزن اس کا ڈی آئی جی، کزن کا سالا آئی جی اور اس کے علاوہ بھی جانے کہاں کہاں اس کے خاندان کے افراد بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں جو اس کو اتنا سر چڑھا رہا ہوں تو یہ بلاوجہ ہی نہیں ہے۔ ویسے بھی ابھی تک وہ کھل کر میرے سامنے نہیں آیا ہے۔ ہمیشہ بڑے اچھے طریقے سے ملتا ہے۔ ہوسکتا ہے، جو کچھ کر رہا ہے جوانی کے جوش میں کر رہا ہو اور اسے خیال بھی نہیں ہو کہ اس کے اقدامات سے براہ راست مجھے نقصان پہنچ رہا ہے۔ لیاقت رانا صاحب میرے بڑے اچھے جاننے والوں میں سے ہیں۔ انہوں نے اپنے بھانجے کو میرے بارے میں کچھ نہ کچھ تو سمجھا بجھا کر بھیجا ہوگا۔" چودھری افتخار شہریار کے اقدامات پر ناراض ہونے کے باوجود ابھی تھوڑی بہت خوش فہمی میں مبتلا تھا۔

"میرے خیال میں تو چودھری صاحب آپ کو رانا صاحب سے بات کرنی چاہیے۔ اگر وہ اپنے بھانجے کو کچھ سمجھانا بھول گئے ہیں تو اب سمجھا دیں گے۔" اقبال باجوہ نے چودھری افتخار کو مشورہ دیا۔

"نہیں، ابھی اس کی ضرورت نہیں۔ ابھی معاملات اس حد تک نہیں آئے کہ میرے قابو سے باہر ہوں البتہ ہم ان ڈائریکٹلی شہریار عادل کو سنبھل جانے اور ایک طرف ہوجانے کا پیغام دے سکتے ہیں۔ میرے ذہن میں ایک تدبیر ہے جس کے ذریعے ہم خود سے غداری کرنے والے کو سبق بھی سکھا دیں گے اور شہریار کو بھی پیغام مل جائے گا کہ ہم سے پنگا لینا ٹھیک نہیں۔"

"وہ کیا چودھری صاحب؟" چودھری افتخار کے ذومعنی انداز پر اقبال باجوہ اور معظم تارڑ دونوں چونک اٹھے۔

"بس دیکھتے جاؤ۔ بالا ابھی لاہور میں ہی ہے، وہ ہمارا کام کر دکھائے گا۔" چودھری افتخار کی آنکھوں میں وہی چمک تھی جو اپنے شکار پر گولی چلانے سے پہلے کسی شکاری کی آنکھوں میں اترتی ہے۔

☆☆☆

ماہ بانو بستر پر لیٹی بے چینی سے کروٹیں بدل رہی تھی۔ چودھری افتخار کی نظروں میں آنے کے بعد سے اس کی زندگی سے سکون کی نیند خارج ہوگئی تھی۔ پہلے چودھری نے اپنی حویلی میں اس پر دست درازی کی کوشش کی۔ قسمت سے اس رات وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوگئی۔ اس کے بعد اس کا گاؤں میں جو ایک دن گزرا وہ شدید خوف میں گزرا کہ کہیں چودھری اسے اس کے باپ کے گھر سے نہ اٹھوا لے لیکن اس وقت چودھری کے اپنے معاملات میں الجھے ہونے کی وجہ سے خیر گزری۔ فیصل آباد لوٹ جانے کے بعد بھی ماہ بانو کو یہ اندیشہ ستاتا تھا کہ چودھری کے ہاتھ وہاں بھی پہنچ سکتے ہیں۔ وہ زہرہ کی شادی میں شرکت کے لیے گاؤں آنے سے بھی صرف چودھری کی وجہ سے ہی گریزاں تھی کہ اس کی گاؤں میں موجودگی کی خبر دوبارہ سے چودھری کو اس کی یاد دلا دے گی اور اس کا یہ اندیشہ غلط ثابت نہیں ہوا تھا۔ چودھری نے اسے موقع دیکھتے ہی اٹھوا لیا تھا۔ اگر اس روز ماہ بانو اپنی جان کی بازی نہ لگاتی تو چودھری کے پنجوں سے بچ نکلنا آسان نہیں تھا۔ چودھری کی خود سے شادی کی خواہش نے بھی ماہ بانو کو لرزا کر رکھ دیا تھا۔ وہ رشتہ جو نوراں اور غیاث محمد کے نزدیک ان کی عزت میں اضافے کا باعث بنتا، ماہ بانو کے لیے خودکشی کے مترادف تھا۔ ماہ بانو سمجھ سکتی تھی کہ چودھری

اس کے حصول کی شدید خواہش میں اس سے شادی پر راضی ہوا ہے۔ شادی ہوجاتی اور ماہ بانو اسے حاصل ہوجاتی تو پھر وہ اسے اپنی حویلی کے کسی کونے میں ڈال دیتا۔ چودھری کی اس ہوس کو منانے میں ماہ بانو کے سارے خواب ملیامیٹ ہو جاتے۔ چودھری کی بیوی بن کر نہ تو اس کے دل کو خوشی ملتی اور نہ ہی اس کی ڈاکٹر بننے کی خواہش پوری ہو پاتی۔

ماہ بانو نے اپنی زندگی کے لیے جو خواب دیکھے تھے اس میں ادھیڑ عمر، ظالم اور عیاش چودھری کا تو کوئی گزر ہی نہیں تھا۔ وہ تو ہمیشہ خود کو ایک لیڈی ڈاکٹر کے روپ میں کسی پڑھے لکھے اور نیک فطرت شخص کی معیت میں دیکھتی تھی۔ چنانچہ زہرہ کا تعاون ملتے ہی اس نے چودھری کی قید سے نکل بھاگنے کی کوشش کی۔ قسمت سے اسے شہریار کی مدد مل گئی اور وہ لاہور کے ایک دارالامان پہنچا دی گئی۔ خود کو دارالامان پہنچائے جانے کا فیصلہ کتنا درست تھا، اس کا اندازہ ماہ بانو کو اس رات ہوا تھا جب اسے دارالامان سے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ وہ لوگ جو اتنی دور لاہور کے ایک دارالامان میں پہنچ گئے تھے، ان کے لیے فیصل آباد پہنچنا کیا مشکل تھا۔ دارالامان میں تو چوکیدار کی وجہ سے ماہ بانو کی بچت ہوگئی تھی لیکن فیصل آباد میں اگر ایسی صورت حال پیش آتی تو بے چارے حوراں اور صفدر کیا کر پاتے؟ ماہ بانو تو بڑی آسانی سے دوبارہ چودھری کے چنگل میں جا پھنستی۔ اب بھی وہ اس خوف سے آزاد نہیں ہوئی تھی۔ موتی والا کے بڑے گھر کے آرام دہ بستر پر لیٹنے کے باوجود بھی اسے سکون کی نیند اسی لیے نہیں آپاتی تھی کہ اسے ہر لمحے یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ جانے کب چودھری کے بندے اس کے پیچھے یہاں پہنچ جائیں۔ آج رات بھی وہ اسی بے چینی کی وجہ سے نہیں سو پارہی تھی۔ کروٹیں بدلتے ہوئے یک دم ہی اسے کسی غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔ اس احساس کا سبب نہ جانتے کے باوجود وہ بے چین سی ہو کر اپنے بستر پر اٹھ بیٹھی۔ پھر کچھ اور سمجھ نہیں آیا تو چادر اپنے گرد لپیٹ کر باہر نکل آئی۔ موتی والا نے اسے اپنی کوٹھی کے جس حصے میں ٹھہرایا تھا، وہ کوٹھی کی انیکسی تھی۔ اس انیکسی اور موتی والا کے رہائشی حصے کے درمیان ایک خوب صورت سا لان تھا۔ ماہ بانو انیکسی سے نکل کر باہر لان میں آئی تو چادر اوڑھے ہوئے ہونے کے باوجود اسے ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ سردی کا موسم اپنے اختتام پر تھا لیکن رات کے اس پہر کھلے میں ہونے کی وجہ سے خنکی محسوس ہو رہی تھی۔ ماہ بانو ایک منٹ تک اس کھلی فضا میں ساکت کھڑی رہی پھر یک دم ہی اسے ادراک ہوا کہ اندر لیٹے لیٹے

اس نے کس غیر معمولی پن کو محسوس کیا تھا۔ موتی والا کی کوٹھی میں حفاظت کے لیے تربیت یافتہ کتے رات بھر گھومتے رہتے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے ماہ بانو نے ان کتوں کے بھونکنے کی معمولی سی آوازیں سنی تھیں اور اس کے بعد یک دم ہی خاموشی چھا گئی تھی۔ کتوں کا بھونکنا اور خاموش ہو جانا دونوں ہی باتیں معنی خیز تھیں۔ موتی والا کی بیوی نے ماہ بانو کے خوف کو دیکھتے ہوئے جہاں اسے نگراں کتوں کے حوالے سے تسلی دی تھی، وہاں کتوں کی یہ خصوصیت بھی بتائی تھی کہ یہ کتے کبھی بلاجواز نہیں بھونکتے۔ ماہ بانو نے ان چند دنوں میں موتی والا کی بیوی کی کہی ہوئی بات کی صداقت کو پرکھ لیا تھا۔ کتے واقعی اس عرصے میں ایک بار بھی نہیں بھونکے تھے۔ ابھی تھوڑی دیر قبل ماہ بانو نے جو ان کے بھونکنے کی آوازیں سنی تھی وہ صرف لمحہ بھر کے لیے تھی۔ اس کے بعد پھر خاموشی چھا گئی تھی۔ اگر ماہ بانو جاگ نہ رہی ہوتی تو اسے کتوں کے بھونکنے کا قطعی احساس نہیں ہو پاتا۔ اب بھی وہ فوری طور پر نوٹس نہیں لے پائی تھی لیکن اس کی چھٹی حس نے خطرے کا الارم بجایا تھا۔ اپنے اندر ابھرنے والے خطرے کے اس احساس کو وہ خود کو یہ تسلی دے کر بہلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ ہوسکتا ہے کہ کتوں کے بھونکنے کی جو آواز میں نے سنی ہی، وہ کہیں باہر سے گزرنے والے کسی آوارہ کتے کی آواز ہو۔ اگر کوٹھی میں کوئی خطرہ ہوتا تو کتے ذرا سا بھونک کر چپ ہونے کے بجائے آسمان سر پر اٹھا دیتے لیکن اس دلیل کے باوجود اس کی تسلی نہیں ہو پارہی تھی۔ آخرکار اس نے فیصلہ کیا کہ لان کا ایک چکر لگا کر کتوں پر نظر ڈالے۔

وہ اپنے اس ارادے پر عمل کرنے کے لیے دبے پاؤں لان میں چلنے لگی۔ لان میں نیم تاریکی تھی۔ خود اس نے بھی انیکسی کی لائٹیں روشن نہیں کی تھیں اس لیے اگر کوئی دور سے دیکھ بھی رہا ہوتا تو فوری طور پر اسے لان میں ماہ بانو کی موجودگی کا احساس نہیں ہو پاتا۔ دس قدم چلنے کے بعد ہی ماہ بانو کو ٹھٹک کر رک جانا پڑا۔ اس کے رکنے کا سبب وہ بڑے بڑے سیاہ رنگ کے کتے تھے جن کو پہلی بار دیکھنے والا لازماً دہشت زدہ ہو جاتا لیکن ماہ بانو کے ٹھٹکنے کا سبب کتوں کی دہشت نہیں تھی۔ کتوں سے تو وہ ان دنوں میں مانوس ہو چکی تھی۔ اس وقت وہ اس لیے ٹھٹکی تھی کہ اس نے دونوں کتوں کو ایک دوسرے کے قریب لان کی گھاس پر گرا ہوا دیکھا تھا۔ ماہ بانو نے جھک کر ان دونوں کا جائزہ لیا۔ اسے ان کے وجود میں زندگی کی رمق محسوس نہیں ہوئی۔ کتوں کے قریب ہی ماہ بانو کو گوشت کا ایک بڑا سا ٹکڑا پڑا ہوا نظر آیا۔ یک دم ہی سارا

www.pkdigest.com

معاملہ ماہ بانو کی سمجھ میں آ گیا۔ کسی نے سریع الاثر زہر ملا ہوا یہ گوشت کا ٹکڑا کوٹھی کے لان میں پھینک کر کتوں سے بچنے کا انتظام کیا تھا۔ تربیت یافتہ کتے کوٹھی کے قریب کسی کی موجودگی کو محسوس کر کے ذرا سا بھونکے تو تھے لیکن پھر گوشت کے اس ٹکڑے نے ان کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی تھی۔ گوشت کا لالچ ان کی زندگی کا چراغ گل کر گیا تھا اور ساتھ ہی ان لوگوں کی زندگیاں بھی خطرے میں پڑ گئی تھیں جن کی حفاظت پر وہ مامور تھے۔ ماہ بانو کے علم میں یہ بات تھی کہ ان کتوں کے علاوہ کوٹھی کی حفاظت کے لیے صرف ایک چوکیدار اور تھا، باقی ملازمین رات گیارہ بجے چھٹی کر کے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے تھے۔ صرف باورچی خانے کی ذمے داری سنبھالنے والے ایک میاں بیوی تھے جن کا مستقل کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر میں قیام تھا لیکن وہ بھی دو دن سے اپنے خاندان کی کسی شادی میں شرکت کے لیے چھٹی لے کر اپنے گاؤں گئے ہوئے تھے۔ ماہ بانو اندازہ کر سکتی تھی کہ جن لوگوں نے کتوں کو خاموش کیا ہے، وہ گیٹ پر موجود چوکیدار کو بھی خاموش کر چکے ہوں گے۔ اب یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ خاموشی عارضی تھی یا ابدی!

ماہ بانو کا دل چاہا کہ وہ پلٹ کر بھاگتی ہوئی کوٹھی سے کہیں دور بھاگ جائے لیکن اس بے سروسامانی کے عالم میں وہ بھاگ کر جاتی بھی کہاں؟ اس کا بیگ یتیم خانے میں رہ گیا تھا، فی الحال وہ موتی والا کی بیوی کے فراہم کردہ کپڑوں پر گزارہ کر رہی تھی پھر اس اجنبی شہر میں اس کے پاس کوئی ٹھکانا بھی نہیں تھا۔ رات کے اس پہر وہ کوٹھی سے نکل کر باہر جاتی بھی تو جانے کس مصیبت میں پھنس جاتی۔ ایک دوسرا خیال اسے موتی والا اور اس کی بیوی کے بارے میں تھا۔ اسے یقین تھا کہ جو لوگ موتی والا کی کوٹھی میں داخل ہوئے ہیں، وہ اس کی تلاش میں آئے ہیں۔ وہ اپنی وجہ سے موتی والا اور اس کی بیوی کو مصیبت میں گرفتار چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتی تھی چنانچہ اس نے کوٹھی سے بھاگ نکلنے کا ارادہ ترک کیا اور کوٹھی کے اس مرکزی حصے کی طرف بڑھ گئی جہاں موتی والا اور اس کی بیوی رہائش پذیر تھے۔ انیکسی اس رہائشی حصے کے عقبی جانب تھی۔ ماہ بانو نے سامنے کے حصے میں جانے کے بجائے عقبی سمت موجود اس کھڑکی کا رخ کیا جس کے بارے میں اسے معلوم تھا کہ یہ موتی والا اور اس کی بیوی کے بیڈروم میں کھلتی ہے۔ کھڑکی کے قریب جا کر ماہ بانو کو مایوسی ہوئی۔ کھڑکی بند تھی اور اندر سے اس کے گرد پردے کھنچے ہوئے تھے۔ مایوسی کے اس عالم میں وہ پلٹنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ کھڑکی کی ایک جانب سے پردہ ذرا سا ہٹا ہوا ہے۔ ماہ بانو اس حصے پر اپنی ناک چپکا کر اندر کا منظر دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ کمرے میں روشنی ہو رہی تھی اور اس روشنی میں ماہ بانو بہت واضح طور پر اس شخص کو دیکھ سکتی تھی جو پورے انہماک سے کھلی تجوری میں سے زیور اور روپے سمیٹ کر اپنے بیگ میں بھر رہا تھا۔ اس شخص کی حرکت دیکھ کر ماہ بانو مخمصے میں پڑ گئی۔ اگر وہ ماہ بانو کی تلاش میں یہاں تک آنے والا چودھری افتخار کا کوئی بندہ تھا تو اسے مال سمیٹنے کے بجائے ماہ بانو کو تلاش کرنے کی کوشش کرنی چاہیے تھی لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ یہ شخص اکیلا لوٹ مار میں لگا ہو اور اس نے اپنے باقی ساتھیوں کو ماہ بانو کی تلاش پر مامور کر رکھا ہو اور وہ لوگ کوٹھی کے مختلف کمروں میں ماہ بانو کو تلاش کرتے پھر رہے ہوں۔ اس خیال نے ماہ بانو کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑا دی۔ اس نے ایک جھرجھری لے کر مال سمیٹنے میں مصروف شخص پر سے نظریں ہٹا کر موتی والا اور اس کی بیوی کو دیکھنے کی سعی کی لیکن وہ جس زاویے سے اندر جھانک رہی تھی اس زاویے سے اسے پورا کمرا نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کی نظر کی حد بیڈ کے ایک حصے پر جا کر ختم ہو جاتی تھی اور وہاں اسے موتی والا اور اس کی بیوی کے وجود نظر نہیں آ رہے تھے لیکن پھر بھی اسے جو نظر آیا۔ بیڈ کی چادر پر جگہ جگہ پھیلا ہوا اور وضاحت سے واضح طور پر سرخ رنگ کا تھا اور ایسی سرخی صرف انسانی خون کی ہی ہو سکتی تھی۔ وہ خون کس کا ہو سکتا تھا، یہ سمجھنے میں ماہ بانو کو ایک لمحہ بھی نہیں لگا۔ بیڈ کی چادر یقیناً ان دو شخصوں کے خون سے ہی رنگی ہوئی تھی جو ہر رات اس بیڈ پر محو خواب ہوتے تھے۔ آج شاید انہیں اپنے ہی بستر پر ابدی نیند سلا دیا گیا تھا۔ اس منظر کو دیکھنے کے بعد ماہ بانو کے لیے مزید وہاں کھڑے رہنا ممکن نہیں تھا۔ وہ خیال جس نے تھوڑی دیر پہلے اس کے قدم کوٹھی سے باہر جانے سے روک لیے تھے، یک دم ہی اس کے ذہن سے نکل گیا تھا اور اب وہ ہر حال میں یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ اپنے نکل بھاگنے کی اس خواہش پر عمل کرنے کے لیے اس نے کھڑکی کے شیشے پر چپکا اپنا چہرہ ہٹا کر جیسے ہی پلٹنا چاہا، کسی نے یک دم اس کے وجود کو مضبوطی سے اپنے بازوؤں میں دبوچ لیا۔ ماہ بانو نے اضطراری طور پر چیخنے کی کوشش کی لیکن اسے دبوچنے والے نے اس کے کھلے ہوئے منہ پر ہاتھ رکھ کر اس کی کوشش کو ناکام بنا دیا۔ دھان پان سی ماہ بانو ایک مضبوط مردانہ گرفت میں جکڑی سوائے پھڑکنے کے اور کیا کر سکتی تھی؟

حادثات و سانحات کی شکار۔ پناہ کی تلاش میں سرگرداں
ماہ بانو کی داستان حیات کے واقعات اگلے ماہ پڑھیے

جب مجھے یہ خبر ملی کہ میرا بہنوئی لائل اگلے روز ایک ہفتے کے لیے شکاگو جا رہا ہے تو مجھے اپنی بہن مارتھا کی فکر دامن گیر ہو گئی۔ اس کے لیے یہ وقت گھر پر تنہا گزارنا خاصا مشکل تھا۔ بالخصوص ان حالات میں جبکہ شہر میں ایک جنونی قاتل دندناتا پھر رہا تھا۔ وہ صرف حسین عورتوں کو شکار کرتا تھا مگر عجیب طریقے سے... وہ ان پر مجرمانہ حملے نہیں کرتا تھا بلکہ حسین عورتوں کی، نائیلون کی لمبی جرابوں سے ان کے گلے گھونٹ دیا کرتا تھا اور واپس جاتے ہوئے ایک جراب ساتھ لے جاتا تھا۔

''لائل! میرا خیال ہے کہ تمہارا ان حالات میں مارتھا کو اکیلے چھوڑ کر جانا مناسب نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''مگر میں دفتر کی طرف سے جا رہا ہوں۔ یہ میری ملازمت کا حصہ ہے۔'' لائل نے جواب دیا تو مارتھا بھی اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگی۔

''میرے ساتھ ٹوڈ بھی تو ہے۔'' مارتھا نے مجھ سے کہا۔

''وہ ڈھائی سال کا ہے، تمہاری حفاظت کیسے کر سکتا ہے؟'' میں نے برہمی سے کہا۔ ''خیر... جب تک لائل واپس نہیں آ جاتا، میں یہیں رہوں گا... تمہارے پاس۔''

''یہ ٹھیک ہے۔'' لائل اور مارتھا نے ایک ساتھ کہا۔

میرا ڈر بے وجہ نہیں تھا۔ حسین عورتوں کو ان کی لمبی

جاسوسیت اور پراسراریت میں ڈوبتی ابھرتی چونکا دینے والے انجام کی روداد

محمد عفان

عافیت

زندگی میں کچھ باتیں واقعات کی صورت میں اس طرح جنم لیتی ہیں ...کہ آپ انہیں نظر انداز بھی نہیں کر سکتے ... اور پس پردہ رکھنے پر بھی مجبور ہو جاتے ہیں ... ضرورت اور مجبوری کے سانچے میں ڈھلی ایک جرم پرور کتھا ... جس کے کردار ایک دوسرے کے ساتھ بری طرح جڑے ہوئے تھے

www.pkdigest.com

جرابوں سے ہلاک کرنے والے جنونی قاتل نے اب تک اس شہر سینٹ لوئس میں چھ عورتوں کو شکار کیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک کو کنساس سٹی اور ایک عورت کو شکاگو میں بھی ہلاک کیا تھا۔ بھی عورتیں حسین، خوبرو اور شادی شدہ تھیں اور ہلاکت کے وقت گھر میں اکیلی تھیں۔ ان کی جرابوں کے جوڑے میں سے ایک ایک جراب غائب تھی۔ کسی بھی لاش پر انگلیوں کے نشان نہیں ملے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ قاتل دستانے استعمال کرتا تھا۔

قاتل کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ صرف ایک عورت کا کہنا تھا کہ اس نے ایک شخص کو گلی کے کونے پر غائب ہوتے دیکھا۔ اس کے بعد اس گلی کے ایک گھر سے ایک عورت کی لاش ملی تھی جس سے یہ گمان ہوا کہ وہی شخص قاتل تھا مگر وہ عورت مبینہ قاتل کی صرف ایک جھلک دیکھ سکی تھی۔ وہ بھی پیچھے سے...

میری بہن مارتھا ایک تربیت یافتہ نرس تھی۔ پہلے وہ ایک اسپتال میں ملازمت کرتی تھی لیکن ٹوڈ کی پیدائش کے بعد اس نے ملازمت چھوڑ دی تھی اور کبھی کبھار بلانے پر چلی جاتی تھی۔ وہ بھی صرف رات میں... رات کو ٹوڈ کے پاس لائل ہوتا تھا۔

''تم ایسا کرنا کہ کل ہی اسٹور سے وہ حفاظتی بولٹ مزید لے آنا اور دروازے میں لگا دینا۔'' لائل نے کہا تو میں نے فوراً ہامی بھرلی۔

لائل ایک الیکٹرونک کمپنی میں ملازم تھا اور اس کی مصنوعات کی فروخت کے لیے باہر جاتا رہتا تھا۔ ٹوڈ کی ولادت کے بعد اپنی آمدنی بڑھانے کے لیے اس نے... ٹی وی کی مرمت کا کام بھی شروع کر دیا تھا۔ یہ اس کا پارٹ ٹائم کام تھا۔ تہ خانے میں اس نے اپنی ایک چھوٹی سی ورکشاپ بنالی تھی۔ وہ لوگوں کے خراب ٹی وی سیٹ گھر لاکر ٹھیک کرتا تھا اور واپس پہنچا دیتا تھا۔ اس طرح اسے اچھی خاصی آمدنی ہورہی تھی۔

میری بہن مارتھا کوئی حسین عورت نہیں تھی۔ وہ قبول صورت تھی۔ اس میں نسوانی حسن کی کوئی خاص نشانی نہیں تھی۔ اس کا جسم سوکھا اور سپاٹ تھا۔ البتہ وہ بہت اچھی عادت اور عمدہ اطوار کی مالک تھی۔ شاید اسی لیے لائل جیسا اسمارٹ اور وجیہہ مرد اس کا گرویدہ تھا۔ کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ آخر لائل کو میری بہن میں ایسی کیا بات نظر آگئی جو اس نے اسے اپنا جیون ساتھی بنالیا؟ ورنہ لائل کو تو ایک سے بڑھ کر ایک حسین اور پرکشش عورت مل سکتی تھی۔ وہ مردانہ وجاہت کا شاہکار تھا۔ یہ شادی کیسے ہوئی، اس کے بارے میں تھوڑی بہت تفصیل میں بتاتا ہوں۔

مارتھا ایک آرمی اسپتال میں نفسیاتی شعبے کی نرس کے طور پر کام کررہی تھی کہ وہاں لائل کو لایا گیا۔ اس کی حالت عجیب تھی۔ وہ بے حد تھکا ہوا اور بےزار لگ رہا تھا۔ کوریا کی جنگ میں اس کی حالت بگڑ گئی تھی۔ وہ زخمی بھی تھا۔ اس کے زخم تو جلد بھر گئے تھے مگر اس کی روح پر لگے ہوئے زخم نہیں بھر سکے جنہیں مندمل کرنے میں مارتھا نے اس کی بڑی مدد کی۔ دن رات محنت کی۔ اس پر اتنی زیادہ توجہ دی کہ آخرکار وہ اس کی محبت میں مبتلا ہوگیا۔ یہی وہ وقت تھا جب ان دونوں نے شادی کا فیصلہ کرلیا۔ چنانچہ جب لائل کو اسپتال سے فارغ کیا گیا تو وہ مارتھا کے ساتھ ہی چلا آیا اور دونوں کی شادی ہوگئی۔

اس شادی پر میرے ساتھ ساتھ میرے دوستوں کو بھی حیرانی ہوئی۔ لائل کے ماں باپ مرچکے تھے البتہ اس کے انکل اور آنٹی تھے۔ انہوں نے ہی لائل کی پرورش کی تھی۔ وہ کبھی کبھار ان سے ملنے چلا جاتا تھا ورنہ وہ مارتھا کی رفاقت میں خوش اور مطمئن تھا۔ وہ زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا اسی لیے پہلے اس نے ایک تربیتی کورس کیا۔ اس کے بعد اسے ایک الیکٹرونکس فرم میں ملازمت مل گئی۔ ان دونوں کا گزارہ اچھی طرح ہونے لگا۔ ملازمت بھی تھی اور پارٹ ٹائم میں ٹی وی کی مرمت کا کام بھی تھا۔

میں محسوس کرتا تھا کہ لائل بہت زیادہ حساس اور نازک طبع تھا۔ ذرا سی بات اسے بری لگ جاتی تھی۔ اسے اکثر جذباتی دورے بھی پڑتے تھے اور بعض اوقات وہ بے حد اداس، چڑچڑا اور بےزار بھی دکھائی دیتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کوریا کی جنگ کی تباہ کاری ابھی تک اس کے ذہن سے نہیں نکلی تھی۔ اس سب کے باوجود مارتھا اس کے ساتھ بہت خوش اور مطمئن تھی۔ لائل کی نفسیاتی کیفیت قابل تشویش نہیں تھی۔

جس روز لائل گھر سے گیا تھا، یہ اسی روز کی بات ہے۔ ٹوڈ سو چکا تھا۔ میں اور مارتھا لاؤنج میں بیٹھے باتیں کررہے تھے کہ اس دوران مارتھا کی زبان سے وہ سچ نکل گیا جو اس نے پہلے کبھی مجھے نہیں بتایا تھا۔ اس نے بتایا کہ فوج میں جانے سے پہلے ہی لائل نفسیاتی مرض میں مبتلا تھا۔

''یہ بات تم کیسے کہہ سکتی ہو؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''آرمی اسپتال میں، میں نے اس کی میڈیکل ہسٹری دیکھی تھی۔'' مارتھا نے بتایا۔ ''آرمی جوائن کرنے سے پہلے ایک نفسیاتی اسپتال میں داخل بھی رہا تھا مگر ٹریٹمنٹ کے دوران اس نے یہ بات آرمی کے ڈاکٹرز سے چھپالی تھی۔ ڈاکٹرز بھی اس کے مرض کو نہیں پکڑ سکا تھا اور اس طرح وہ آرمی کے لیے منتخب ہوگیا تھا۔''

''آخر وہ کس طرح کی بیماری میں مبتلا رہا تھا؟'' میں نے مارتھا سے پوچھا تو اس نے سرد آہ بھری۔

''وہ شیزوفرینیا کا مریض تھا۔'' وہ بولی۔ ''اس پر یادداشت گم ہوجانے کے دورے پڑتے تھے۔''

''کیا؟'' میں اچھل پڑا۔ ''مگر اس بیماری میں مبتلا شخص آرمی میں بھی نہیں جاسکتا... اس نے یہ بات چھپا کر جرم کیا تھا... یہ غلط ہے...''

''یہ غلط ہے یا صحیح... بہرحال وہ فوج میں ملازم ہوکر کوریا چلا گیا تھا... اس کی واپسی پر یہ راز کھلا... مگر اب کیا ہوسکتا تھا...؟ آرمی نے اسے انعامات اور اعزازات بھی دیے اور اسے پورا فوجی اعزاز دیا گیا۔ عزت و وقار کے ساتھ ریٹائر ہوا ہے وہ۔''

''مگر مارتھا... ایسا مریض خطرناک بھی ہوسکتا ہے۔'' میں نے الجھتے ہوئے کہا۔

''ایسی کوئی بات نہیں۔'' مارتھا نے غصے سے کہا۔ ''وہ بہت پیارا اور محبت کرنے والا انسان ہے... وہ شیزوفرینیا کا مریض ضرور ہے مگر معمولی درجے کا... دنیا میں جانے اس طرح کے کتنے لوگ نارمل زندگی گزار رہے ہیں۔''

''اگر وہ کبھی خطرناک ہوگیا تو؟'' میں نے کہا۔

''ایسا کبھی نہیں ہوگا۔'' مارتھا بولی۔ ''اس کے صحیح ہونے کے امکانات زیادہ ہیں اور وہ صحیح ہورہا ہے۔''

''میں تو صرف...''

''کوئی بحث نہیں... وہ میرا شوہر اور ٹوڈ کا باپ ہے۔'' مارتھا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''اور میں اس کے خلاف کچھ نہیں سنوں گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم لائل سے محبت کرتی ہو... وہ بھی تم سے محبت کرتا ہے۔ میں خود اسے بے حد پسند کرتا ہوں لہٰذا ہم آئندہ اس موضوع پر کبھی کوئی بات نہیں کریں گے جس سے ہمارے درمیان خوامخواہ کوئی تلخی پیدا ہو۔'' یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔

''ٹھیک ہے چارلس!'' مارتھا نے مجھ سے کہا۔ ''تم بھی سوجاؤ۔ میں بھی سونے جارہی ہوں۔ تمہیں صبح جلد اٹھنا ہے۔''

''مگر پیاری بہن!'' میں نے کہا۔ ''میں سونے سے پہلے کافی ضرور پیوں گا۔''

''مگر کافی تمہیں خود بنانی ہوگی۔'' مارتھا نے کہا۔ ''میں پہلے ہی بہت تھکی ہوئی ہوں۔''

میں مسکراتا ہوا کچن کی طرف بڑھ گیا۔ ابھی میں نے چولہے پر کیتلی رکھی ہی تھی کہ ایک منظر نے میری توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ مارتھا کے کچن کی کھڑکی کے بالکل سامنے ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی جس میں سے ایک روشن کمرے کا منظر صاف نظر آرہا تھا۔ وہاں ایک نوجوان حسین عورت لباس اتار رہی تھی۔ میں حیرت سے اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔ وہ بے حد حسین عورت تھی۔ اس کا جسم سنگ مرمر کی طرح چمک رہا تھا۔

لباس اتارنے کے بعد اس نے اپنی لمبی جرابیں اتار دیں۔ پھر ایک دروازہ کھول کر غالباً غسل خانے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئی اور ایک ہینگر پر دھلی ہوئی جرابیں سوکھنے کے لیے لٹکا دیں۔ اس کے بعد اس نے ایک باریک نائٹی پہن لی... مجھے پتا بھی نہیں چلا کہ مارتھا میرے پاس آکر کھڑی ہوگئی ہے اور سامنے والے منظر میں میرے گم ہونے کا تماشا دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔ اچانک وہ زور سے ہنس پڑی۔

''تو تم بھی لائل کی طرح... اس قدر شوقین ہو اس طرح کے منظر کے؟'' مارتھا نے کہا۔

''کیا وہ بھی یہ شوق...'' میں نے پوچھنا چاہا تو مارتھا

''ابھی آپ کے منگیتر کی حالت خطرے سے باہر نہیں ہے۔ان کا دوران خون تیز نہیں ہونا چاہیے۔اس لیے آپ یہ کوٹ پہن کر عیادت کے لیے جائیں''

www.pkdigest.com

نے اقرار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”وہ تو اس منظر میں کھو جاتا ہے۔“

”مارتھا! یہ عورت اپنی کھڑکی پر پردہ کیوں نہیں ڈالتی؟ اس طرح کھلم کھلا لباس بدلنا دوسروں کو دعوتِ نظارہ دینا نہیں تو اور کیا ہے؟“ میں نے جھنجھلاتے ہوئے اپنی بہن سے کہا۔

”صرف ویک اینڈ پر یہ پردے بند ہوتے ہیں۔“ مارتھا نے جواب دیا۔ ”جب اس کا شوہر گھر واپس آتا ہے۔ وہ بے چارہ نائٹ ڈیوٹی کرتا ہے نا... وہی اس کھڑکی کا پردہ پھیلاتا ہے... ویسے یہ عورت جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتی بلکہ یہ بے پروا ہے اور بس... اگر اسے اندازہ ہو جائے کہ اسے کوئی اس حالت میں دیکھ رہا ہے تو شاید یہ پردہ پھیلانا شروع کر دے۔ میری اس سے صرف ہیلو ہائے ہے... دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں اس لیے اس پر کسی قسم کا شک نہیں کیا جاسکتا۔ میں تو اس حرکت کو اس کی بے وقوفی اور بے پروائی کہوں گی۔“

مارتھا کی بات پوری ہوتے ہی اس کھڑکی کی لائٹ بند ہوگئی۔ میں مارتھا کی طرف گھوما اور اس سے کہا۔ ”لائل کو اس منظر میں گم دیکھ کر تمہیں غصہ نہیں آتا؟“

”مجھے کیا ضرورت ہے غصہ کرنے کی؟“ مارتھا نے سکون سے کہا۔ ”لائل کی بیوی میں ہوں، وہ عورت نہیں ہے۔ البتہ یہ منظر دیکھنے کے بعد لائل میرے ساتھ کچھ زیادہ ہی جوش اور سرگرمی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس لحاظ سے تو یہ منظر لائل پر مثبت اثر ڈالتا ہے۔“

☆☆☆

دوسرے دن دفتر پہنچتے ہی میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ سٹی ایڈیٹر سے کہہ دیا، آئندہ ایک ہفتے تک میں اپنی بہن مارتھا کے گھر مقیم رہوں گا۔ میں نے مارتھا کے گھر کا پتا اور فون نمبر بھی لکھوا دیا تاکہ ایمرجنسی کی صورت میں مجھ سے رابطہ کیا جاسکے۔ میں ایک اخبار میں کام کرتا تھا اور ایک سرگرم رپورٹر تھا۔

وہاں سے واپسی پر میں نے ایک ہارڈ ویئر اسٹور سے دروازے کے دو نئے بولٹ خرید لیے۔ لائل کہہ گیا تھا کہ مارتھا کے تحفظ کے لیے میں دروازے میں دو مزید بولٹ لگا دوں۔ گھر پہنچا تو مارتھا اور ٹوڈ نے میرا استقبال کیا۔

”میں بولٹ لے آیا ہوں۔“ میں نے مارتھا سے کہا۔

”ڈرل مشین کہاں ہے؟ ابھی لگا دیتا ہوں۔“

”تہ خانے میں، لائل کی ورکشاپ میں سب کچھ موجود ہے۔“ مارتھا نے کہا۔

میں تہ خانے میں پہنچا۔ ایک لمبی میز پر تقریباً سبھی اوزار رکھے ہوئے تھے۔ لائل اسی جگہ ٹی وی مرمت کرتا تھا۔ کئی پرانے ٹی وی بھی وہاں رکھے تھے۔ میں نے میز کی درازیں کھول کر ڈرل مشین تلاش کی۔ ایک دراز میں سے مجھے چمڑے کا ایک کیس ملا جس کے ساتھ ٹمن کا ایک باکس بھی رکھا تھا مگر وہ باکس بند تھا۔ میں نے چمڑے کا کیس کھولا تو اس میں سے ایک شیشہ کاٹنے والی قلم، ایک چھوٹا سا ربر کا پائپ اور اس کے سرے پر لگا ہوا کیپ ملا۔ سیاہ دستانوں کی ایک جوڑی اور ایک فولادی پٹی اس کے علاوہ تھی۔

یہ چیزیں دیکھ کر میں الجھن میں پڑ گیا۔ یہ آلات اور اوزار یا تو نقب زن استعمال کرتے تھے یا ڈاکو... ان سے تالے بھی توڑے جاسکتے تھے۔ آٹومیٹک لاک بھی کھولے جاسکتے تھے اور کھڑکیوں کے شیشے بھی آسانی سے کاٹے جاسکتے تھے۔ ان چیزوں کی موجودگی نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ لائل کی ورکشاپ میں ان سب کا کیا کام...؟ اور وہ سیاہ دستانے... یہ سب لائل کو میری نظروں میں مشکوک بنانے لگے تھے مگر میں نے جلد ہی اپنے خیالات کو جھٹک دیا اور ورکشاپ کا جائزہ لینے لگا۔ یکا یک مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے ایک ٹول کی فولادی پٹی اس ٹمن کے باکس کے سوراخ میں داخل کی تو اس کا لاک کھل گیا۔ اس باکس کے اندر کوئی خاص چیز نہیں تھی البتہ آٹھ عدد نائیلون کی لیڈیز جرابیں تھیں۔ ان جرابوں نے میرے دل و دماغ کو ہلا کر رکھ دیا۔

”تو کیا لائل ہی ان شادی شدہ، جوان اور حسین عورتوں کا جنونی قاتل ہے؟“ میں نے سوچا مگر خود ہی انکار میں سر ہلا دیا۔ میں لائل کے بارے میں ایسی کوئی بات سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ یکا یک مجھے وہ جوان عورت یاد آگئی جو اپنے کمرے کی کھڑکی کا پردہ بند کیے بغیر لباس بدل رہی تھی۔ مارتھا کے بقول، لائل اس منظر کو اکثر دیکھا کرتا تھا۔ اگر وہ جرابوں والا قاتل ہوتا تو وہ عورت اس سے بھی بچی نہ رہتی جو

پھر میں نے سوچا کہ اس طرح کے قاتل کبھی بھی اپنے گھر کے آس پاس ایسی حرکت نہیں کرتے اور وہ عورت لائل کے گھر کے بالکل قریب رہتی تھی۔ لہٰذا یہ بات یقینی تھی کہ لائل نے خود کو مشتبہ ہونے سے بچانے کے لیے اس عورت کو اب تک شکار نہیں کیا تھا۔ جبکہ لائل یہ بھی جانتا تھا کہ اس عورت کا شوہر صرف ویک اینڈ پر گھر آتا ہے ورنہ وہ اکیلی رہتی ہے۔

کافی دیر تک میں ان جرابوں کو تکتا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اگر لائل نے وہ سب نہیں کیا ہے تو جرابوں کی اس کی ورکشاپ میں موجودگی کا کیا مطلب

پھر میں نے ایک ایک کر کے ان کو تفصیل سے چیک کرنا شروع کیا۔ وہ جوڑیاں نہیں تھیں۔ ہر جراب دوسری سے الگ تھی۔ رنگ میں بھی، ڈیزائن میں بھی اور سائز میں بھی۔

جنونی قاتل کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ ایک جراب سے عورت کا گلا گھونٹتا ہے اور دوسری اپنی فتح کی یادگار کے طور پر ساتھ لے جاتا ہے۔ مجھے یاد آیا کہ چھ عورتیں قتل ہوئی تھیں جبکہ یہ جرابیں آٹھ تھیں... ایک عورت کنساس سٹی میں اور دوسری شکاگو میں قتل ہوئی تھی۔ یہ بات شک میں ڈالتی تھی کیونکہ لائل اکثر ان شہروں کے تجارتی دورے پر جاتا تھا۔

میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ خود کو بے حد پُرسکون رکھ کر اس معاملے کی چھان بین کروں گا۔ پولیس کے پاس جانے سے پہلے میں خود کو پوری طرح مطمئن کرنا چاہتا تھا۔ میری یہ بھی خواہش تھی کہ پولیس میرے نام کو صیغہ راز میں رکھے کیونکہ اگر یہ بات لائل یا مارتھا کو پتا چل جاتی تو میرے لیے مشکل کھڑی ہوسکتی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری بہن ایک جنونی قاتل اور نفسیاتی مریض کی محبت میں مزید مبتلا رہے... وہ کسی وقت مارتھا کو بھی مار سکتا تھا۔ دوسری طرف مارتھا اپنے شوہر کا جرم ثابت ہونے پر بھی مجھے کبھی معاف نہ کرتی اسی لیے میں احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ لائل کی واپسی میں ابھی چھ دن باقی تھے۔ میرے پاس چھان بین کا وقت تھا۔

میں نے وہ جرابیں واپس ٹمن کے باکس میں رکھ کر باکس بند کر دیا... اس کے بعد پہلا کام میں نے یہ کیا کہ وہ دونوں بولٹ جو میں بازار سے خرید کر لایا تھا، باہر والے دروازے پر لگا دیے۔

رات کے کھانے پر میں نے مارتھا سے عام سے لہجے میں سوال کیا۔ ”لائل اکثر شکاگو جاتا ہے نا؟“

”سال میں دو بار... پچھلی بار وہ جون میں گیا تھا۔“ مارتھا نے جواب دیا۔ 'کیا شکاگو والا قتل جون میں ہوا تھا؟' میں نے خود سے پوچھا اور دوسرے روز صبح ایک لائبریری جاکر اخبارات کنگھالے تو یہ انکشاف میرے سامنے آیا کہ کنساس سٹی والا قتل گزشتہ سال 16 جون کو ہوا تھا جبکہ شکاگو والا قتل 26 نومبر کو ہوا تھا۔

میں نے فوراً اپنے دوست ڈاکٹر سے رابطہ کیا اور اس سے ملنے کی درخواست کی تو اس نے مجھے اسی وقت بلا لیا۔ میری وجہ سے ڈاکٹر سام کو کئی اپائنٹ منٹ کینسل کرنے پڑے تھے۔

”ہاں... بولو چارلس! کیا بات ہے؟“ ڈاکٹر سام نے فوراً ہی پوچھا۔ ”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“

”مسئلہ میرا نہیں، اس جنونی قاتل کا ہے۔“ میں نے کہا۔

”جو جوان عورتوں کو ان کی لمبی جراب کی مدد سے ہلاک کر کے ایک جراب ساتھ لے جاتا ہے... کیا یہ ممکن ہے کہ وہ آدمی نارمل زندگی بسر کر رہا ہو، اس کی بیوی بھی ہو اور بچے بھی؟“

”بالکل ہوسکتا ہے۔“ ڈاکٹر سام نے جواب دیا۔ ”اس طرح کے بہت سے کیسز ہمارے سامنے آئے ہیں جن میں ایک نارمل اور خوش گوار گھریلو زندگی گزارنے والا شخص بھی جنونی قاتل بن جاتا ہے... مگر اس طرح کہ نہ کسی کو پتا چلتا ہے اور نہ شک ہوتا ہے۔“

”بات یہ ہے سام...“ کہتے کہتے میں رکا تو ڈاکٹر سام نے اٹھ کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”تم خاصے پریشان لگ رہے ہو۔ کیا بات ہے؟ کھل کر کہو، میں ایک نفسیاتی ڈاکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ تمہارا دوست بھی ہوں۔“

”میرے ذہن میں جس قاتل کا نام ہے، وہ بڑی عجیب حرکت کرتا ہے۔“ میں نے متذبذب لہجے میں کہا۔ ”وہ جوان عورتوں کا ایک جراب سے گلا گھونٹتا ہے اور دوسری جراب ساتھ لے جاکر اپنے پاس ایک باکس میں محفوظ رکھتا ہے اور اس باکس کو لاک کر دیتا ہے۔ وہ ایسا کیوں کرتا ہے ڈاکٹر؟“

”یار! تم نے خاصا مشکل سوال کر دیا ہے۔“ ڈاکٹر سام نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ”بہرحال... ممکن ہے وہ دوسری جراب اپنی فتح کی علامت کے طور پر ساتھ لے جاتا ہو... یہ بھی ممکن ہے کہ وہ جرابوں کو دیکھ کر، انہیں چھو کر لذت حاصل کرتا ہو... اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ انہیں جمع کر کے اپنے لیے تکیہ تیار کرائے۔“

”یہ کیا مذاق ہے؟“ میں نے بُرا مانتے ہوئے کہا۔

”یار! تم بھی تو کھل کر بات نہیں کر رہے...“

”اچھا، ایک وعدہ کرو کہ میں جو نام تمہیں بتانے جارہا ہوں اسے تم راز میں رکھو گے، کسی کے سامنے کسی بھی حال میں ظاہر نہیں کرو گے۔“

”میرے پاس آنے والے ہر مریض کا راز اس دفتر کی چار دیواری میں ہی رہتا ہے۔“ ڈاکٹر سام نے جواب دیا۔ ”تم بے فکر ہو کر بات کرو۔“

میں نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے شک ہے بلکہ کسی حد تک یقین بھی ہے کہ وہ جنونی قاتل کوئی اور نہیں بلکہ میرا بہنوئی لائل ہے۔“

”کیا... مارتھا کا شوہر؟“ ڈاکٹر سام نے اچھلتے ہوئے کہا۔ ”میں نہیں مان سکتا... میں کبھی نہیں مان سکتا۔ مجھے اس

www.pkdigest.com

شک کی وجہ بتاؤ گے؟''

میں نے شروع سے لے کر آخر تک ساری کہانی ڈاکٹر سام کو سنادی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اس کی سابقہ نفسیاتی بیماری شیزوفرینیا کے بارے میں بھی اسے بتادیا کہ کس طرح اس نے فوج کے ڈاکٹر تک سے اپنی یہ بیماری چھپائی تھی اور فوج میں بھرتی ہو کر کوریا چلا گیا تھا مگر واپسی پر جب پول کھلا تو اسے ذہنی امراض کے اسپتال میں داخل کیا گیا جہاں مارتھا کی تیمارداری اسے زندگی میں تو واپس لے آئی مگر ساتھ ہی وہ مارتھا پر بھی قابض ہو گیا... میں نے مارتھا کے گھر میں، تہ خانے کی ورکشاپ سے ملنے والی تمام اشیا کی تفصیل بھی بیان کردی۔

جب میری بات مکمل ہوئی تو ڈاکٹر سام کافی دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ اس کے چہرے پر تفکر کی علامات واضح تھیں... کافی دیر سوچنے کے بعد اس نے میری طرف رخ کر کے سوال کیا۔ ''اب کیا کیا جائے؟ مجھ سے تم کس قسم کی مدد چاہتے ہو؟''

''میں لائل کی نفسیاتی بیماری کا ریکارڈ چیک کرنا چاہتا ہوں۔ وہ آرمی کے اسپتال میں اپنا سالانہ چیک اپ کرانے باقاعدگی سے جاتا ہے... تم چونکہ ایک ماہر نفسیات ہو اس لیے میرے مقابلے میں اس ریکارڈ تک آسانی سے پہنچ سکتے ہو۔'' میں نے کہا۔

''یہ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' ڈاکٹر سام نے جواب دیا۔ ''میں اس اسپتال کے میڈیکل بورڈ کا ممبر بھی ہوں۔ تم فکر مت کرو، میں اس کا آرمی ریکارڈ اور ذہنی امراض کے اس اسپتال کا ریکارڈ بھی حاصل کرلوں گا جہاں کبھی لائل داخل ہوا تھا۔''

''یہ کام کب تک ہو جائے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت جلد... میں تمہیں فون کر دوں گا، تم سیدھے میرے پاس چلے آنا۔ پھر مل کر ریکارڈ کا جائزہ لے لیں گے۔'' ڈاکٹر سام نے جواب دیا تو میں جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

دوسرے روز سام نے مجھے فون کر کے اپنے آفس بلایا۔

میں گویا اڑتا ہوا اس کے پاس پہنچا۔

''یار چارلس! ایک بہت اہم انکشاف یہ سامنے آیا ہے کہ لائل کے باپ نے اپنی بیوی یعنی لائل کی ماں کا گلا گھونٹ دیا تھا اور بعد میں خود کو شوٹ کرلیا تھا۔'' ڈاکٹر سام نے کہا تو میں حیرت سے اسے تکنے لگا۔

''لیکن مارتھا نے تو یہ بات مجھے کبھی نہیں بتائی۔'' میں نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ کب کی بات ہے؟''

''اس وقت لائل بارہ سال کا تھا۔'' سام نے کہا۔ ''اس نے اپنے نفسیاتی ڈاکٹر کو دوران علاج یہ بھی بتایا تھا کہ اس کی ماں ایسی ہی موت کی مستحق تھی۔ لائل کو اپنی ماں سے نفرت اور باپ سے محبت تھی۔'' یہ کہہ کر ڈاکٹر سام رکا پھر بولا۔ ''اسپتال کے ریکارڈ میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ لائل نے بتایا تھا، اس کی ماں بے حد حسین تھی مگر شوہر کے ساتھ دھوکا کر رہی تھی۔ نہایت کم عمری میں ہی لائل نے اپنی ماں کو نہ جانے کتنے لوگوں کے ساتھ عشق لڑاتے دیکھا تھا۔ اس کی ماں نے اسے یہ دھمکی بھی دی تھی کہ اگر اس نے یہ بات کسی کو بتائی تو وہ اسے بہت مارے گی۔ اس کے علاوہ وہ کسی بھی مرد کے ساتھ اپنی خواب گاہ میں جاتی تو باہر دروازے پر لائل کو پہرے کے لیے کھڑا کر جاتی تھی... لائل اس کی ان باتوں کے باعث اس سے شدید نفرت کرنے لگا تھا۔ ایک دن اس نے اپنے باپ کو آتے دیکھا۔ اس وقت اس کی ماں کمرے میں اپنے عاشق کے ساتھ تھی... مگر لائل نے اسے خبردار نہیں کیا اور اس کا باپ کمرے میں چلا گیا۔ وہاں کا منظر دیکھنے کے بعد وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ پہلے اس نے اپنی بیوی کے عاشق کو ٹھوکریں مار مار کر کمرے سے باہر نکالا، پھر اس نے اپنی بیوی کی لمبی جراب اس کے گلے کے گرد باندھ دی اور اسے گلا گھونٹ کر مار ڈالا۔ آخر میں اس نے خودکشی کرلی۔''

''اوہ... تو یہ بات ہے!'' میں نے ڈاکٹر سام سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''گویا یہ احساسِ جرم ہے... لائل سمجھتا ہے کہ اس المیے کا ذمے دار وہ ہے۔ اسی لیے...''

''یہ بات نہیں ہے۔'' ڈاکٹر سام نے برہمی سے کہا۔ ''بے تکی رائے قائم نہ کرو۔ اصل بات یہ ہے کہ لائل آج تک اپنے باپ کی موت کو نہیں بھلا سکا ہے۔ وہ اس کی موت کا ذمے دار اپنی بدکردار ماں کو سمجھتا ہے۔ وہ کیوں احساسِ جرم کا شکار ہو گا؟ بلکہ وہ تو اس بات پر خوش تھا کہ اس نے بلاواسطہ طور پر ہی سہی، اپنی ماں کی موت میں اہم کردار ادا کیا ہے اور اس طرح دنیا سے ایک برائی کو ختم کیا ہے۔''

''ٹھیک ہے... اب یہ سب وہ کیوں کر رہا ہے؟'' میں نے ڈاکٹر سام سے سوال کیا۔

''اسے شادی شدہ اور حسین عورتوں سے نفرت ہے۔ وہ ان سب کو دھوکے باز سمجھتا ہے کیونکہ اس کی ماں حسین بھی تھی اور شادی شدہ بھی... وہ ان سب کو اپنی ماں جیسی سمجھتا ہے اسی لیے ان کی جان کا دشمن بنا ہوا ہے... تم نے شاید اس بات پر کبھی دھیان نہیں دیا ہوگا کہ اس نے قبول صورت مارتھا کا انتخاب ہی کیوں کیا؟ کیونکہ اسے یقین تھا کہ یہ عورت اسے

کبھی دھوکا نہیں دے گی۔ وہ بے چاری معمولی شکل صورت کی مالک ہے۔'' ڈاکٹر سام نے جواب دیا تو میرا متھا ٹھنک گیا۔

''یار! تم میری بہن کی توہین کر رہے ہو۔'' میں نے کہا۔ ''محبت دو دلوں کے درمیان بندھن کا نام ہے۔ یہ شکل صورت، دولت، حسن ہر چیز سے آزاد ہوتی ہے۔ لائل اور مارتھا کو ایک دوسرے سے محبت ہے۔ ان کی محبت کو بدنام نہ کرو ڈاکٹر۔''

''دیکھو دوست! میری بات کا برا نہیں مانو۔'' ڈاکٹر سام نے نرم لہجے میں کہا۔ ''تم لائل کو یہاں میرے پاس لے آؤ۔ میں اسے اس کاؤچ پر لٹاؤں گا۔ صرف دو چار بار میرے پاس آنے کے بعد ہی وہ سب کچھ سچ سچ بتا دے گا۔ بہرحال، ایک بات کی وضاحت کر دوں... وہ خوب صورت عورتوں کا دشمن ضرور ہے مگر ایسی عورتوں کا جو شوہر سے بے وفائی کر رہی ہوں... یہ صرف میرا اندازہ ہے۔''

''ہاں ڈاکٹر! چلو مان لیا کہ اس نے شادی شدہ حسین عورت کو نظر میں رکھ لیا لیکن اس نے یہ فیصلہ کیسے کیا ہوگا کہ وہ بے وفا بھی ہے...؟ قتل ہونے والی عورتوں کا آپس میں دور دور تک کوئی تعلق نہیں تھا۔'' میں نے کہا۔

''لائل ٹی وی کی مرمت کرتا ہے... وہ ان عورتوں کے گھر جاتا ہوگا... یہ عورتیں اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتی ہوں گی... وہ ہے بھی تو بہت اسمارٹ... بس اس نے غصے میں آ کر...'' ڈاکٹر سام نے جواب دیا۔

''لیکن ہلاک ہونے والی ہر عورت اپنے گھر میں اکیلی ہے، یہ اسے کیسے معلوم ہوتا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ اس کا مسئلہ تھا۔ وہ معلوم کر لیتا ہوگا... اس طرح کے نفسیاتی مجرم، جرم کا ارتکاب کرنے سے پہلے سو طرح کی پیش بندیاں کر لیتے ہیں۔ یہ میرا تجربہ بتاتا ہے۔'' ڈاکٹر سام نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ اب مجھے سارجنٹ فریڈ سے مل ہی لینا چاہیے۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''اس نوعیت کے کیسز کا وہی انچارج ہے۔''

سارجنٹ فریڈ اپنے دفتر میں موجود تھا۔

''سارجنٹ! میں تمہارے لیے ایک خبر لایا ہوں۔'' میں نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''حسین عورتوں کے جنونی قاتل والا کیس ختم ہوا یا نہیں؟''

یہ سنتے ہی سارجنٹ فریڈ مستعد ہو گیا۔ اس نے بے چینی سے کہا۔ ''چارلس! بتاؤ کیا بات ہے؟ کیا کوئی اہم سراغ تمہارے ہاتھ لگا ہے؟''

''ہاں... مگر میری ایک شرط ہے۔'' میں نے کہا۔

''مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔'' سارجنٹ نے میری شرط سنے بغیر ہی کہہ دیا۔

''نہ تو تم یہ راز کبھی کھولو گے کہ تمہیں یہ بات کس نے بتائی ہے اور نہ اس گواہ کو عدالت میں طلب کرو گے۔ بولو، منظور ہے؟'' میں نے سارجنٹ فریڈ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''منظور ہے۔'' سارجنٹ نے مستحکم لہجے میں کہا۔

اس کا جواب سننے کے بعد میں نے اس کے سامنے پوری کہانی بیان کر دی۔ سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔ کچھ بھی چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ سارجنٹ فریڈ اور میں اس کیس کے حوالے سے کافی دیر تک بحث میں الجھے رہے۔ وہ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے ہر طرح سے مطمئن ہونا چاہتا تھا تاکہ بعد میں مشکل پیش نہ آئے۔

قتل ہونے والی تین عورتوں کے گھروں سے پتا چلا کہ ان کے گھر ٹی وی مرمت کرنے والا آیا تھا۔ دو کیسز میں معلوم ہوا کہ ٹی وی کس نے مرمت کیا، یہ بات مرنے والی عورتوں کے شوہروں کو پتا نہیں تھی کیونکہ اس کام کا انتظام ان کی بیویوں نے کیا تھا جو مر چکی تھیں۔ ایک کیس میں تو شوہر کو پتا ہی نہیں تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں اس کا ٹی وی خراب ہوا تھا۔ اس وقت وہ شہر سے باہر تھا۔ ایک کیس میں شوہر نے بتایا کہ نہ اس کا ٹی وی خراب ہوا تھا اور نہ کوئی مرمت کرنے والا آیا تھا۔

سارجنٹ فریڈ نے مارتھا کے گھر پر چھاپا مار کر تلاشی لی۔ اس کے پاس سرچ وارنٹ تھا۔ مارتھا کو مطمئن کرنے کے لیے اس نے بتایا، چونکہ یہ معلوم ہوا ہے کہ مرنے والی کئی عورتوں نے کسی ٹی وی مرمت کرنے والے کو بلایا تھا، اس لیے وہ لائل کی ورکشاپ چیک کرے گا اور اس کا سروس رجسٹر بھی دیکھے گا۔ یہ سن کر مارتھا بہت پریشان ہوئی مگر چونکہ قانونی مسئلہ تھا اس لیے وہ کچھ نہ بول سکی۔ اس بے چاری کو اندازہ بھی نہیں تھا کہ اس ساری کارروائی کے پیچھے میرا... یعنی اس کے سگے بھائی کا ہاتھ ہے۔ میں نے جس جس طرح نشان دہی کی تھی سارجنٹ فریڈ نے بالکل انہی مقامات کی تلاشی لی۔ تھوڑی دیر بعد ہی چڑے کا کیس بھی مل گیا اور مین کا باکس بھی۔ نقب زنی کے تمام آلات وا وزار مع سیاہ دستانوں کے موجود تھے۔ مین کے باکس میں لمبی جرابیں اسی طرح رکھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے چھ جرابیں فریڈ نے لیبارٹری کو بھجوا دیں اور دو میں سے ایک کنساس سٹی اور دوسری شکاگو بھیج دی تاکہ کوئی فیصلہ کرنے میں مدد مل سکے۔

ہیری کی صبح کو جیسے ہی لائل شکاگو سے آنے والی پرواز سے سینٹ لوئس پہنچا تو اسے فوری طور پر گرفتار کر لیا گیا۔ یہ دیکھ کر مارتھا بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں اس کا نروس بریک ڈاؤن نہ ہو جائے۔ اس کی حالت پر مجھے رحم آ رہا تھا اس لیے میں اپنے فلیٹ جانے کے بجائے اس کے گھر ہی چلا گیا تاکہ اس مشکل وقت میں اسے سہارا دے سکوں۔ ان حالات میں مارتھا کو تنہا نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔

بہ ظاہر تو میں اس معاملے سے الگ تھلگ تھا مگر سارجنٹ فریڈ سے میری ملاقاتیں جاری رہیں، میں لمحے لمحے کی پیش رفت سے آگاہ رہنا چاہتا تھا۔

سارجنٹ فریڈ کو سو فیصد یقین تھا کہ جنونی قاتل لائل ہی ہے مگر ابھی اس کے لیے مزید شہادتوں کی ضرورت تھی۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ لائل کے سروس رجسٹر میں صرف ایک ایسی عورت کا نام لکھا تھا جس کا قتل ہوا تھا مگر سارجنٹ کا کہنا تھا کہ لائل نے باقی گھروں کا اندراج جان بوجھ کر نہیں کیا تاکہ کسی مصیبت کے وقت بچ سکے۔

دوسری پیچیدگی اس وقت پیدا ہوئی جب کنساس سٹی اور شکاگو سے یہ رپورٹ ملی کہ وہاں بھیجی جانے والی دونوں جرابوں میں سے کوئی بھی جراب ان سے میل نہیں کھاتی جن سے ان شہروں میں دو خواتین کو گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا تھا۔ اس صورت حال میں لائل پر سے شبہ ختم ہو جاتا تھا۔ میری اور سارجنٹ فریڈ کی پریشانی عروج پر تھی۔ ہمارے قائم کیے گئے نظریات غلط ثابت ہو رہے تھے اور لائل بے گناہ ثابت ہو رہا تھا۔ اس کے باوجود فریڈ ڈٹا ہوا تھا۔ اسے اب بھی امید تھی کہ لائل ہی وہ جنونی اور مطلوبہ قاتل ہے لہٰذا اس نے لائل کے خلاف تفتیش جاری رکھی۔

سارجنٹ فریڈ نے ایک بار پھر لائل کے گھر کی تلاشی لی۔ اس بار اس کے ہاتھ سیاہ سوٹ اور سیاہ ٹوپی بھی لگی جو بڑے رازدارانہ طریقے سے لائل کی الماری کے خفیہ خانے میں چھپائی گئی تھی۔ یہ سوٹ ملنے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ لائل قاتل بھی ہے۔ اس طرح کے سوٹ عام پہنے جاتے تھے۔

سارجنٹ فریڈ اور میں اس کیس میں الجھے رہے اور ہر نئے پہلو اور نئے امکان کا جائزہ لیتے رہے۔ تب یہ بات بھی سامنے آئی کہ ہر عورت کا قتل اس وقت ہوا تھا جب مارتھا نائٹ ڈیوٹی پر تھی۔ مارتھا کو حسبِ ضرورت اسپتال والے ہنگامی حالات میں بلاتے تھے۔ ظاہر ہے، وہ اپنے بچے ٹوڈ کو کہاں چھوڑ کر جاتی؟ لہٰذا وہ صرف اسی صورت میں اسپتال جاتی تھی جب لائل، ٹوڈ کی دیکھ بھال کے لیے گھر پر موجود ہوتا تھا۔

''چارلس! مجھے یقین ہے کہ یہ کام لائل کا ہی ہے۔'' سارجنٹ فریڈ نے مجھ سے کہا۔ ''وہ صرف اسی رات میں گھر سے نکلتا ہوگا جب مارتھا گھر پر موجود نہیں ہوتی ہوگی اور مارتھا صرف نائٹ ڈیوٹی کے لیے اسپتال گئی تھی... جن تاریخوں میں اس نے نائٹ ڈیوٹی کی ہے، انہی تاریخوں میں قتل ہوئے ہیں۔''

''وہ ٹوڈ کو اکیلا چھوڑ کر کیسے جا سکتا تھا؟'' میں نے سوال کیا۔

''بالکل جا سکتا تھا۔ وہ ایک جنونی قاتل ہے جس کا ذہنی توازن خراب ہے۔ وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔'' سارجنٹ فریڈ نے جواب دیا اور گہری سوچ میں گم ہو گیا۔ ''ہو سکتا ہے کسی رات وہ اپنی شخصیت کو بھول کر کچھ اور بن جاتا ہو۔''

میں مارتھا کے لیے فکرمند تھا مگر وہ حیرت انگیز طور پر اس صدمے سے جلد سنبھل گئی۔ میں اس میں پہلے والا اعتماد دوبارہ دیکھنے لگا تھا۔ حالانکہ وہ زرد ہو رہی تھی اور اس نے دو روز سے کچھ کھایا پیا بھی نہیں تھا تاہم وہ بہت پُراعتماد نظر آ رہی تھی۔ اس کی ایک کیلی ٹوڈ کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئی تھی تاکہ جب مارتھا اس مشکل سے نکل آئے تو وہ اسے واپس پہنچا دے۔

مارتھا اپنے شوہر کی گرفتاری پر بے حد برہم تھی۔ وہ اس کو کسی بھی صورت قصوروار ماننے کو تیار نہیں تھی۔ اس نے لائل کے لیے سینٹ لوئس کے سب سے مشہور وکیل جارج کی خدمات حاصل کی تھیں۔ جب مارتھا، جارج کے ساتھ لائل سے ملنے گئی تو میں بھی اس کے ہمراہ تھا۔

حسبِ توقع لائل نے اپنا جرم ماننے سے انکار کر دیا۔ جارج نے اس سے خاصی دیر گفتگو کی۔ اس کے خلاف موجود شہادتوں، بالخصوص ان آلات و اوزاروں والی کٹ کے بارے میں پیدا ہونے والے شک پر تشویش کا اظہار کیا جو دراصل نقب زنی کے آلات تھے مگر لائل مسلسل یہی کہتا رہا کہ ان آلات کی مدد سے وہ ٹی وی مرمت کرنے کا کام کرتا ہے، ان آلات کا تعلق نقب زنی سے ہرگز نہیں ہے۔

میں دیکھ رہا تھا کہ وکیل جارج کی آنکھوں میں بھی شک کی پرچھائیاں تھیں۔ غالباً وہ بھی لائل کو قصوروار سمجھ رہا تھا مگر جارج کوئی معمولی وکیل نہیں تھا۔ اگر مارتھا نے لائل کو بچانے کے لیے اس کی خدمات حاصل کی تھیں تو وہ اس کام میں کوئی کسر چھوڑنے والا نہیں تھا۔ اس کے باوجود میں محسوس کر رہا تھا کہ مارتھا بھی زیادہ پُراُمید نہیں ہے لیکن وہ خود کو بہت مطمئن ظاہر کر رہی تھی۔ شاید اسی لیے وہ ننھے ٹوڈ کو اپنی کیلی کے ہاں سے اپنے گھر واپس لے آئی تھی۔ اس نے مجھ سے بھی کہہ دیا

تھا کہ اب اسے میری ضرورت نہیں ہے، وہ اس گھر میں اکیلی رہ سکتی ہے چنانچہ میں اپنے فلیٹ میں واپس چلا آیا۔

میں مطمئن تھا کہ لائل جیل میں ہے اس لیے مارتھا کی جان کو فی الحال کوئی بھی خطرہ لاحق نہیں ہے مگر میں ہفتہ دس دن میں اس کے گھر کا چکر برابر لگا رہا تھا تاکہ اگر اسے کسی چیز کی ضرورت ہو تو لا دوں۔ میرا اس کے ساتھ ٹیلی فون پر بھی مسلسل رابطہ رہتا تھا۔ حالانکہ مارتھا بے حد اداس اور چڑچڑی ہو رہی تھی مگر وہ زبان سے کچھ نہیں کہتی تھی اور خود کو بے حد مطمئن ظاہر کر رہی تھی۔

عدالت میں لائل کی پیشی دو ہفتے بعد تھی۔ اس سے ایک ہفتے پہلے کی بات ہے، میں اپنے دفتر میں تھا کہ مجھے ایک کال موصول ہوئی جس کے مطابق ڈاور پلیس میں ایک قتل ہو گیا تھا... یہ علاقہ شہر کے جنوب میں تھا۔ میں فوراً ہی وہاں جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ میں اس قدر جلدی میں تھا کہ مجھے یہ یاد ہی نہیں آیا کہ ڈاور پلیس وہی علاقہ ہے جہاں میری بہن مارتھا اپنے شوہر لائل کے ساتھ رہتی تھی۔

وہاں پہنچ کر مجھے اپنی بے خبری کا احساس ہوا مگر جب میں نے یہ دیکھا کہ قتل اس مکان میں ہوا جس کے کمرے کی کھڑکی مارتھا کے کچن کی طرف کھلتی تھی تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے مارتھا کے کچن سے اسی کمرے میں ایک حسینہ کو لباس بدلتے دیکھا تھا اور اس منظر سے اکثر و بیشتر لائل بھی فیض یاب ہوا کرتا تھا۔ میں اس گھر کے اندر چلا گیا۔ اندر باوردی پولیس والے بھی تھے اور پولیس فوٹو گرافر، لیب اسٹاف اور دیگر لوگ بھی تھے۔ سارجنٹ فریڈ بھی وہاں موجود تھا۔ وہ ایک باوقار شخص سے بات کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی سارجنٹ نے اس آدمی سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''چارلس! یہ مقتولہ کے شوہر ہیں۔'' پھر اس نے مجھے سیڑھیوں کی طرف چلنے کا اشارہ کیا تو میں اس سمت بڑھ گیا۔ سارجنٹ بھی پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں اسی بیڈ روم میں تھا جس کی کھڑکی مارتھا کے کچن کی طرف کھلی ہوئی تھی۔ اس وقت وہی حسینہ ایک باریک ریشمی گاؤن میں فرش پر بے حس و حرکت پڑی تھی جسے ایک روز میں نے کچن کی کھڑکی سے لباس بدلتے دیکھا تھا۔ ایک نائیلون کی لمبی جراب اس کے گلے کے گرد کس کر بندھی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ بگڑ کر رہ گیا تھا۔

''جب اس کا شوہر آج صبح گھر آیا تو اس نے اسے اسی حالت میں پایا تھا۔'' سارجنٹ فریڈ نے مجھے بتایا۔ ''یہ شخص بھی نائٹ ڈیوٹی کرتا ہے۔ باقی کہانی وہی ہے۔ عورت پر کوئی مجرمانہ حملہ نہیں کیا گیا، نہ انگلیوں کے نشان ہیں... دونوں دروازوں کے اندر بولٹ چڑھے ہوئے ہیں۔ شیشے کے دروازے میں سے چھوٹا سا چور کٹر نکالا گیا تھا اور اندر ہاتھ ڈال کر حسب سابق بولٹ کھولا گیا تھا۔ باقی وارداتوں کی طرح اس واردات میں بھی دوسری جراب غائب ہے۔ گویا جنونی قاتل وہ جراب اپنی فتح کی علامت کے طور پر اپنے ساتھ ہی لے گیا ہے۔''

''اس کا مطلب... یہ... ہوا... کہ... لائل بے گناہ ہے...؟'' میں نے سارجنٹ فریڈ کو غور سے دیکھتے ہوئے سوال کیا اور مقتولہ کا دوبارہ جائزہ لینے لگا۔

''بالکل... لائل یقینی طور پر بے گناہ ہے۔'' سارجنٹ فریڈ نے کہا۔ ''وہ بے چارہ تو اس وقت جیل میں ہے، وہ یہ قتل کیسے کر سکتا ہے؟''

اس طرح اس کہانی کا خاتمہ ہوا۔ لائل کو فوری طور پر باعزت بری کر دیا گیا۔ اس سے نہ جانے کتنی معافی مانگی گئی، کتنی معذرت کی گئی... غرض مارتھا کو ایک بار پھر خوشی مل گئی اور وہ زندگی سے بھرپور نظر آنے لگی۔ اس کے بعد کبھی کسی عورت کا قتل نہیں ہوا مگر میں اکثر یہ سوچتا ہوں کہ مارتھا نے کئی بار مجھ سے ایک بات کہی تھی۔ ''میں لائل کی خاطر، اس کی محبت کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں۔ چاہے وہ ایک خوفناک درندہ ہی کیوں نہ بن جائے۔''

مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ مارتھا نے جوڈو کی ٹریننگ حاصل کی تھی۔ اس کے لیے کسی عورت کو ہلاک کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ لائل پر قتل کا الزام ہٹانے کے لیے اس نے ہی اپنے پڑوس میں رہنے والی عورت کا قتل کیا تھا تاکہ پولیس یہ سمجھنے پر مجبور ہو جائے کہ لائل بے گناہ ہے۔ لیکن وہ ایک ہوشیار اور سمجھ دار عورت ہے۔ اب وہ نائٹ ڈیوٹی بالکل نہیں کرتی... گویا وہ لائل کو تنہا نہیں چھوڑتی۔ دوسرا کام اس نے یہ کیا کہ لائل کا فائی وی مرمت کرنے کا کام بھی ختم کرا دیا۔ نہ وہ کسی عورتوں کے پاس جائے گا اور نہ انہیں دیکھ کر پاگل ہوگا۔ اس نے ورکشاپ بھی ختم کرا دی، یہ خانے سے ایک ایک اوزار ہٹا دیا۔ شاید لائل نے بھی حالات سے سمجھوتا کر لیا تھا... اگر وہ دوبارہ پکس جاتا تو اس کا پتا مشکل تھا۔ مگر میرے ساتھ ساتھ سارجنٹ فریڈ بھی آج تک حیران ہے کہ اگر لائل وہ قاتل نہیں تھا تو قاتل کون تھا... اور اس نے بعد میں کوئی واردات کیوں نہیں کی؟ مجھے اس سوال کا جواب معلوم ہے مگر میرا خیال ہے کہ میرے چپ رہنے میں ہی عافیت ہے۔

جال

یعقوب جمیل

سوچیں اور اُمیدیں ہر شخص کا مطمحِ نظر ہوتی ہیں ... مگر کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آپ جو سوچ رہے ہوتے ہیں، وہ بالکل پر فیکٹ ہوتا ہے۔ اس کے باوجود وہ سب رونما ہو جاتا ہے ...جس کا دور دور تک کوئی امکان نظر نہیں آتا۔

اس مجرم کی آپ بیتی جو جرم کرنے کے بعد بھی مجرم بننے سے قاصر رہا

مورگن جونی جب کلب میں داخل ہوا تو اس وقت کلب میں ڈنر کا وقت ہو چکا تھا۔ کلب کی خوب صورت جھیل کے کنارے میزیں اور کرسیں لگائی جا رہی تھیں۔ مورگن دھیرے دھیرے چلتا ہوا ایک کونے کی میز پر آ کر بیٹھ گیا۔

ابھی زیادہ تر میزیں خالی پڑی تھیں مگر دھیرے دھیرے لوگ ایک ایک دو دو کی تعداد میں آتے جا رہے تھے۔ مورگن اپنی کرسی پر بیٹھا جھیل کے پانی میں کنارے پر لگے بلب کے سفید دودھیا روشنی کو جھلملاتے ہوئے دیکھ رہا تھا، اچانک کسی کے قدموں کی آہٹ سن کر وہ چونک پڑا۔ اس کے سامنے والے دروازے سے لمبے قد کی ایک بے حد خوب صورت اور دلکش لڑکی اونچی ایڑی کے سینڈل پہنے اندر داخل ہو رہی تھی۔ مورگن اس کو اور اس کی مستانی چال کو دیکھتا ہی رہ گیا۔

مورگن نے اپنی زندگی میں کئی لڑکیاں دیکھی تھیں اور کئی کے ساتھ اس کے دوستانہ تعلقات بھی رہے تھے لیکن یہ لڑکی تو ان تمام لڑکیوں سے مختلف تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں میں اپنی ٹھوڑی ٹکائے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

لڑکی نے اپنے لیے جو میز منتخب کی تھی وہ مورگن کی میز کے قریب ہی تھی۔ اس کونے کی طرف ابھی زیادہ لوگ نہیں آئے تھے اس لیے درمیان کی چار پانچ میزیں خالی پڑی تھیں۔ مورگن نے بیٹھے بیٹھے اس لڑکی کی عمر کا اندازہ لگانے کی کوشش کی اور اسے لگا کہ یہ لڑکی کوئی کالج گرل ہی ہو سکتی ہے۔ ابھی وہ اس لڑکی کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ ویٹرس ہاتھ میں نوٹ بک اور بال پین لے کر... کھانے کا آرڈر لینے آ گئی۔

ویٹرس شاید اس لڑکی سے واقف تھی کیونکہ اس نے نزدیک آ کر ''ہیلو'' کہہ کر اس لڑکی کی طرف ہاتھ ہلایا تھا اور ٹھیک اسی وقت مورگن اور اس لڑکی کی نگاہیں بھی ٹکرائیں۔ دونوں کے آرڈر لینے کے بعد ویٹرس اس لڑکی سے کچھ کہنے کے لیے مڑ گئی تھی پھر اس نے دھیرے سے جھک کر کہا۔

''آپ دونوں قریب قریب بیٹھے ہیں، جب تک میں کھانا لے کر آتی ہوں بہتر ہے آپ دونوں باتیں کر کے انجوائے کریں۔'' یہ کہہ کر اس نے لڑکی کا تعارف مورگن سے کرا دیا اور چلی گئی۔ مورگن اپنی جگہ سے اٹھ کر لڑکی کی میز پر آ گیا

www.pkdigest.com

لڑکی کا نام جیکولین تھا۔ لڑکی کھانے کے دوران تو زیادہ تر خاموش رہی لیکن ..... کھانا ختم کرنے کے بعد وہ اٹھ کر اس طرح اس کے قریب آئی جیسے رخصت ہوتے وقت اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہو۔ لیکن مورگن کی درخواست پر وہ ایک کپ کافی پینے کے لیے راضی ہو گئی اور اس کی برابر والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

مورگن کو وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں، اس کے ریشم جیسے نرم ملائم بال، اس کے ہونٹ اور اس کی دلکش آواز وہ تو جیسے اس میں کھو کر ہی رہ گیا تھا۔ لیکن اس کو حیرت تو اس وقت ہوئی جب جیکولین نے اس سے کہا کہ وہ اسے پہلے سے جانتی ہے۔

''لیکن کیسے؟'' مورگن نے چونک کر پوچھا۔ ''تم مجھے کیسے جانتی ہو؟ میرا تو خیال ہے کہ ہم پہلی بار ہی ملے ہیں۔''

''میں اکثر تمہارے کلب میں اپنے دوستوں کے ساتھ جاتی رہتی ہوں۔'' جیکولین نے بتایا۔ ''میرا ایک دوست ہے جو ایک جوئے خانے میں رولٹ مشین چلاتا ہے۔ لیکن خود جوا کھیلنے تمہارے کلب میں آتا ہے۔''

''جب وہ خود جوئے خانے میں رولٹ مشین چلاتا ہے تو کیا وہ یہ نہیں سمجھتا کہ جوا آدمی کو تباہ کر دیتا ہے؟'' مورگن نے اسے غور کرو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جوا کھیلنا تو بڑی بے وقوفی ہے۔''

''ہاں وہ کچھ ایسا ہی بے وقوف ہے۔'' جیکولین ہنس کر بولی۔

اس کے اس جواب سے مورگن کو کچھ بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ وہ اس کے جواب سے مطمئن نہیں ہوا تھا اسی لیے اس نے کہہ دیا۔ ''جب تم جانتی ہو کہ وہ بے وقوف ہے تو پھر ایسے آدمی کے ساتھ تم رہتی ہی کیوں ہو؟''

جیکولین نے مورگن کی آنکھوں میں دیکھا اور پھر مسکرا کر بولی۔ ''یہ تو میں بھی سوچ رہی ہوں لیکن اگر مجھے کوئی چالاک اور ہوشیار آدمی جو اچھا بھی ہو، مل جائے تو میں اسے چھوڑ دوں۔''

اس پہلی ملاقات کے بعد مورگن اور جیکولین روزانہ ملنے لگے اور ایک ہفتے بعد تو مورگن اس کے گھر بھی پہنچ گیا اور ان ملاقاتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ مورگن اپنے گھر دیر سے جانے لگا۔ گھر میں اس کی بیوی اس کا انتظار کرتی رہتی لیکن اس نے اپنی بیوی ڈورسا کو کام کی زیادتی کا بہانہ بنا کر سمجھا لیا تھا اور ڈورسا نے اس کی باتوں پر یقین کر لیا تھا۔ وہ بے چاری اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتی تھی۔ اس وقت رات کے آٹھ بجے تھے اور مورگن ٹھیک وقت پر ویگاس کلب تک پہنچ گیا تھا۔ اس نے گاڑی پارک کی اور کچھ دیر تک اسٹیئرنگ پر سر جھکائے سوچتا رہا کہ یہاں وہ اپنی مرضی سے نہیں آیا تھا بلکہ یہاں آنے کا فیصلہ اسے ایک فون کال آنے کے بعد کرنا پڑا تھا اور یہ فون اسے آج صبح ہی آیا تھا۔

مورگن کو یہ بات تو اچھی طرح معلوم تھی کہ مسٹر مارک نے اس پر جو احسان کیا تھا اس کا بدلہ تو اسے ایک نہ ایک دن چکانا ہی پڑے گا اور شاید اب وہ وقت آ گیا ہے جب ہی تو مسٹر مارک نے صبح ہی صبح اسے فون کیا تھا اور اب وہ اسٹیئرنگ پر سر جھکائے یہ سوچ رہا تھا کہ مسٹر مارک کا کام اسے ایسے وقت میں کرنا پڑے گا جب حالات اس کے لیے بالکل ہی سازگار نہیں ہیں۔ لیکن جو بھی ہو اس کی مجبوری یہ تھی کہ وہ مسٹر مارک کو انکار نہیں کر سکتا تھا، اسے ہر حال میں اس کا کام تو کرنا ہی تھا چاہے حالات کیسے بھی ہوں۔

اصل میں مسٹر مارک سے اس کی ملاقات جیل میں ہوئی تھی۔ یہ چھ سال پہلے کی بات ہے۔ بعد میں جیل میں ہونے والی ملاقات دوستی میں بدل گئی تھی۔ مسٹر مارک اس جیل میں قیدی نہیں تھا بلکہ ہر ہفتے وہ جیل میں اپنے قیدی بیٹے سے ملنے کے لیے آتا تھا۔ اس کا بیٹا ایک نابالغ لڑکی کی عصمت دری کے جرم میں سزا کاٹ رہا تھا۔ مسٹر مارک کے بیٹے کی سزا کی مدت پانچ برس کی تھی۔ جبکہ مورگن جو کہ آٹھ سال کی سزا بھگتنے کے لیے اندر آیا تھا۔ ان آٹھ سالوں میں سے وہ تقریباً پانچ سال کی سزا تو کاٹ چکا تھا۔ جیل کے اندر ہی مسٹر مارک کے بیٹے پیٹر سے اس کی دوستی ہو گئی اور اسی وجہ سے مسٹر مارک سے بھی اس کی جان پہچان اور سلام دعا ہو گئی تھی۔ مسٹر مارک نے اپنے تعلقات اور رشوت کے زور پر اپنے بیٹے پیٹر کی بقیہ سزا ختم کرا کے اسے رہا کرا لیا تھا اور اس کے بعد انہوں نے اپنا پورا زور لگا کر مورگن کی بھی بقیہ سزا معاف کرا کے اسے بھی رہائی دلا دی تھی۔ مورگن جب جیل سے رہا ہوا تھا تو اس وقت اس کی تین سال کی سزا ابھی باقی تھی۔ مسٹر مارک کا اس پر یہی ایک بڑا احسان تھا۔ مورگن کو رہائی کے بعد ہی اس بات کا علم ہوا تھا کہ مسٹر مارک ملک کی ایک خطرناک دہشت گرد تنظیم کے ممبر ہیں اور اب چند ماہ بعد ہی اسے مسٹر مارک کے احسان کا بدلہ چکانے کے لیے اس کے حکم پر یہاں آنا پڑا تھا۔

وہ کار سے اترا اور دھیرے دھیرے چلتا ہوا کلب کی عمارت کی جانب بڑھنے لگا۔ اسے کوئی جلدی نہیں تھی کیونکہ مسٹر مارک نے اسے بتا دیا تھا کہ اسے ساڑھے دس بجے اس کے آدمی سے اسی کلب کے ریستوران میں ملنا ہے اور وہ آٹھ بجے اس لیے یہاں آ گیا تھا کہ آج جیکولین نے بھی اس سے اسی کلب میں ملنے کا کہا تھا۔ اس لیے اس نے جیکولین کو آٹھ بجے کا وقت دیا تھا تاکہ وہ گھنٹہ جیکولین کے ساتھ گزارنے کے بعد وہ ریستوران میں جا کر مسٹر مارک کے آدمی سے مل لے گا۔

جب وہ کلب کے ویٹنگ روم میں داخل ہوا تو جیکولین وہاں پہلے سے بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ جیکولین نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب بٹھاتے ہوئے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔ ''جانتے ہو ڈارلنگ، مجھے یہاں آئے ہوئے آدھا گھنٹہ ہو گیا ہے اور تم ہو کہ آج بھی لیٹ آئے ہو۔''

''یہ بات نہیں ہے جیکی۔'' مورگن نے پیار سے اس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہاں میں ٹھیک وقت پر ہی آ گیا تھا لیکن پارکنگ میں جگہ نہیں تھی، دس منٹ تو وہیں لگ گئے۔''

اس کے بعد دونوں میں ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ وہیں بیٹھ کر انہوں نے سینڈوچز بھی کھائے اور کافی بھی پی۔ باتوں باتوں میں اس نے جیکولین کو بتا دیا کہ مسٹر مارک اس سے کوئی کام لینا چاہتا ہے اور آج ساڑھے دس بجے اسی کلب میں مجھے اس کے ایک آدمی سے ملنا ہے۔ یہ سن کر جیکولین نے کہا کہ اس ملاقات میں وہ بھی اس کے ساتھ رہے گی لیکن مورگن نے یہ کہہ کر اسے منع کر دیا کہ میں نہیں چاہتا کہ میری دوست کی حیثیت سے تم ان لوگوں کی نظروں میں آ جاؤ کیونکہ یہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔

''لیکن ..... مارک اب تم سے کیا کام لینا چاہتا ہے؟'' جیکولین نے پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم۔'' مورگن نے کہا۔ ''یہ تو اس آدمی سے مل کر ہی معلوم ہو گا کہ وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے؟''

''کیا کوئی ایسا راستہ نہیں ہے کہ تم انکار کر دو؟'' جیکولین نے پوچھا۔

''نہیں۔'' مورگن نے مختصر سا جواب دیا۔

''اگر تم یہ شہر چھوڑ دو۔'' جیکولین نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ''کچھ عرصے کے لیے کہیں اور چلے جاؤ تو؟''

''نہیں یہ بھی ممکن نہیں ہے۔'' مورگن کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ آ کر غائب ہو گئی اور وہ بولا۔ ''جیل سے میری رہائی اس شرط پر ہوئی تھی کہ میں کہیں بھی رہوں ہر اڑتالیس گھنٹے یعنی دو دن کے اندر مجھے اس کی اطلاع پولیس ہیڈ کوارٹر میں دینی ہو گی۔ ورنہ میں پھر گرفتار کیا جا سکتا ہوں اور اس بار سزا بھی لمبی ہو سکتی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ ذرا دیر کے لیے رکا پھر کہا۔ ''اور دوسری بات تم مافیا کے لوگوں کو نہیں جانتیں کہ یہ لوگ کتنے خطرناک ہوتے ہیں، یہ لوگ ملک کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے ہیں، کوئی ان سے چھپ کر زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکتا۔ میں اگر پکڑا گیا تو میری چٹھی مارک کے سامنے ہی ہو گی اور وہ اپنی ضمانت واپس لے کر مجھے دوبارہ ایک لمبی سزا کے لیے جیل بھجوا دے گا یا موت کے گھاٹ اتار دے گا۔''

اس کے بعد جیکولین نے اسے اپنا خیال رکھنے کی تاکید کی اور دوسرے دن ملنے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد بھی مورگن وہیں بیٹھا سگریٹ پیتا رہا۔ پندرہ منٹ بعد اس نے گھڑی دیکھی ساڑھے دس بجنے ہی والے تھے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا کلب کے ریستوران کی طرف چل پڑا۔ مورگن، مسٹر مارک کے اس ایجنٹ کی صورت شکل سے واقف نہیں تھا مگر مسٹر مارک نے فون پر اس کی پہچان اور اس کا نام بتا دیا تھا۔ مسٹر مارک نے اس کا نام راجر بتایا تھا اور کہا تھا کہ ریستوران میں جس شخص کی میز پر پلاسٹک کی ایک گڑیا رکھی ہو گی وہی شخص ہمارا ایجنٹ راجر ہو گا۔

مورگن کلب کے لاؤنج سے گزر کر جب ریستوران کے دروازے میں داخل ہوا تو اسے قریب ہی ایک میز پر لال رنگ کی ایک گڑیا نظر آ گئی۔ یہ ایک چھوٹی سی گول میز تھی جس کے آمنے سامنے صرف دو کرسیاں ہی پڑی تھیں۔ جس میں سے ایک پر ایک دبلا پتلا لال بالوں والا ایک پینتیس چالیس سالہ شخص بیٹھا تھا۔ اس نے نمبروں والا چشمہ پہن رکھا تھا جس کے پیچھے اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں گدھ کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں۔

گڑیا کو دیکھ لینے کے بعد مورگن سیدھا اس کی میز پر پہنچ گیا۔ ''ہیلو مسٹر راجر!'' یقین ہو جانے کے باوجود مورگن نے احتیاط سے ہی کام لیا تھا۔ ''ہیلو'' کہہ کر اس نے اس بات کی گنجائش رکھ چھوڑی تھی کہ اگر وہ شخص راجر نہ ہوا تو اسے کوئی جواب بھی نہیں ملے گا۔

''بیٹھ جاؤ۔'' راجر نے کچھ اور کہے بغیر اسے بیٹھ جانے کے لیے کہا۔ مورگن اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا تو راجر نے اپنے دائیں بائیں ایک سرسری سی نظر ڈالی پھر وہ ذرا آگے کی طرف جھک کر دھیمی سی آواز میں بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہمارے آس پاس اس وقت کوئی موجود نہیں ہے اس لیے ہم بات کر سکتے ہیں۔''

''میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ بات جلد ہو جائے۔'' مورگن بولا۔

''تو سنو مسٹر مورگن!'' راجر اسی طرح آگے جھک کر بولا۔ ''ہمیں... میرا مطلب ہے تمہیں ایک قتل کرنا ہے... یا کسی سے کرانا ہے۔''

''کیا؟'' مورگن اس طرح چونک کر اچھل پڑا جیسے ایک ساتھ بہت سارے بچھوؤں نے اسے ڈنک مار دیا ہو۔ اس کا چہرہ اچانک ہی پیلا پڑ گیا، یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے اس کے جسم کا خون نچوڑ ڈالا ہو۔ اسے اپنا گلا سوکھتا ہوا محسوس ہونے

www.pkdigest.com

لگا۔ مورگن یہ تو جانتا تھا کہ اگر مسٹر مارک جیسا آدمی اس سے کوئی کام لینا چاہتا ہے تو وہ کوئی معمولی یا سیدھا سادہ آسان کام نہیں ہوگا لیکن وہ تو اس کے ہاتھوں کسی کو قتل کرانا چاہتا ہے... یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

”مجھے کیا کرنا ہوگا؟“ مورگن نے خود پر قابو پا کر اپنے لہجے کو پرسکون بنانے کی کوشش کی حالانکہ قتل اور قتل کی مدد دونوں ہی باتیں اس کے لیے خطرناک تھیں۔ ”قتل کس کو کرنا ہے؟“ اس نے پھر پوچھا۔

”ایک ایڈووکیٹ کو جو آج سے چند سال قبل ایف بی آئی کا ایجنٹ تھا۔“ راجر نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”اس کا نام جان اسمتھ ہے اور بزنس چیمبر کی تیسری منزل پر اس کا دفتر ہے۔“

”اس ایڈووکیٹ کا قصور کیا ہے؟“ مورگن نے پوچھا۔

”یہ مجھے نہیں معلوم۔“ راجر نے کہا۔ ”نہ کوئی یہ سوال چیف سے پوچھ سکتا ہے اور نہ ہی کسی کو وجہ بتائی جاسکتی ہے۔ چند سال قبل وہ ایف بی آئی کا ایجنٹ تھا۔ ممکن ہے اس دوران میں اس نے تنظیم کے کسی آدمی کو پکڑا ہو اور اسے سزا دلوائی ہو یا اس میں کسی قسم کی مدد کی ہو، یا یہ بھی ممکن ہے کسی عام آدمی کی ایڈووکیٹ سے دشمنی ہوگئی ہو اور وہ اسے تنظیم کی مدد سے قتل کرانا چاہتا ہو۔ دیکھو مورگن! بدلے کی آگ تو برسوں تک سینے میں جلتی رہتی ہے اور یہی آگ تو ہم جیسے لوگوں کے لیے روزگار مہیا کرتی ہے۔ بہرحال، مجھے یا تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے کہ کس کا کیا قصور تھا اور کون اسے قتل کرانا چاہتا ہے؟“

اس کے بعد راجر نے مورگن کو قتل کے پورے منصوبے سے آگاہ کردیا۔ مورگن یہ ساری باتیں سن کر تھوڑی دیر تک سوچتا رہا اور پھر اچانک اس نے دل ہی دل میں یہ فیصلہ کرلیا کہ وہ ایک بار پھر جرم کرے گا اور اس کے بعد وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جرم کی اس دلدل سے نکل جائے گا لیکن وہ اس جرم کا پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ یعنی ایک تیر سے دو شکار۔ اصل میں وہ جیکولین سے شادی کرنا چاہتا تھا اور اس کے لیے اسے اپنی بیوی ڈورسا کو راستے سے ہٹانا بہت ضروری تھا۔

”ٹھیک ہے مسٹر راجر! میں اس منصوبے سے پوری طرح مطمئن ہوں۔“ مورگن طویل خاموشی کو توڑتے ہوئے بولا۔ ”منصوبہ بہت آسان اور بے داغ ہے۔ میں اس قتل میں شامل ہونے کے لیے تیار ہوں لیکن مددگار کے روپ میں نہیں بلکہ یہ کام میں خود کروں گا۔“

راجر اس کی بات سن کر چونک گیا پھر کچھ سوچ کر اس نے کہا۔ ”ٹھیک ہے ایک گھنٹے بعد تمہیں بتا دیا جائے گا۔ اب تم گھر جاؤ۔“ پھر مورگن اپنی کرسی سے اٹھا اور راجر سے ہاتھ ملا کر صدر دروازے کی جانب بڑھتا چلا گیا۔

اس کے گھر پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد ہی اس کے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے ریسیور اٹھایا تو دوسری جانب سے راجر ہی بول رہا تھا۔ اس نے مورگن کو بتایا کہ اس کی پیشکش منظور ہوگئی ہے اور اب یہ کام وہی کرے گا۔ اس کے ساتھ راجر نے منصوبے کے چیدہ چیدہ نکات ایک بار پھر اسے سمجھا دیے۔

مورگن نے اس کی ساری باتوں کو بے دلی سے سنا کیونکہ اس منصوبے کو سننے کے بعد ہی تو اس نے خود قتل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کی بیوی ڈورسا تو پہلے ہی سے اس کے روزانہ دیر سے گھر لوٹنے پر پریشان تھی لیکن آج تو مورگن نے اپنے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے اسے اور زیادہ پریشان کردیا تھا۔ ڈورسا بار بار اس سے پوچھتی رہی کہ آخر بات کیا ہے؟ مگر مورگن بار بار جھنجلاتا رہا۔ اصل میں یہ جھنجلاہٹ وغیرہ اس کے سوچے سمجھے منصوبے کا ہی ایک حصہ تھی اور آخر میں اس نے ڈورسا کو بتا ہی دیا کہ اسے ایک آدمی کو قتل کرنا ہے جس کی وجہ سے وہ بہت زیادہ اپ سیٹ ہے، پھر اس نے ڈورسا کو یہ بھی بتایا کہ اس کام سے بچنے کے لیے اب کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔

اس کی بات سن کر ڈورسا بے چاری دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے روتی رہی اور وہ اس کے قریب ہی ٹہلتا رہا۔

ڈورسا گھبرا گئی تھی لیکن اس نے فوراً ہی کچھ نہیں کہا۔

ڈورسا کو خاموش دیکھ کر ایک بار تو مورگن کو یہی لگا تھا کہ اب اس کا پلان کسی صورت بھی کامیاب نہیں ہوگا اور اس نے بے کار میں ہی ایڈووکیٹ کے قتل کی ذمے داری اپنے سر لی ہے مگر اب انکار کی بھی تو گنجائش نہیں ہے اور اگر اس نے ہمت کرکے راجر کو فون کرکے انکار بھی کردیا تو کیا وہ لوگ اسے زندہ چھوڑیں گے؟ ہرگز نہیں! اس کا بچنا تو ممکن ہی نہیں ہے۔

وہ ڈورسا سے زبردستی بھی نہیں کرسکتا تھا۔ ایسا کرنے سے بات بگڑ سکتی تھی اور اگر ڈورسا یہ ذمے داری خود نہیں لیتی تو اس کا اپنا بنایا ہوا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ جاتا..... اس نے سوچا تو تھا کہ ڈورسا جب فاؤنٹین پین ٹائم بم لے کر ایڈووکیٹ جان اسمتھ کے کیبن میں داخل ہوجائے گی تو وہ ریموٹ کا بٹن دبا کر ان دونوں کو ہی اڑا دے گا اور اس کے بعد وہ جیکولین کو لے کر شہر سے کہیں دور چلا جائے گا۔ مافیا والوں کا کام ایڈووکیٹ جان اسمتھ کو قتل کرنا ہے، یہ کام اس

کے ہاتھوں ہوجائے گا تو وہ لوگ اسے پریشان بھی نہیں کریں گے اور وہ آرام سے..... جیکولین کے ساتھ زندگی گزار سکے گا۔

بہت دیر بعد آخرکار ڈورسا..... روتے روتے اس کے منصوبے میں شامل ہونے اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے تیار ہوگئی۔ اگلے روز گیارہ بجے کے درمیان اس منصوبے پر عمل کرنے کا وقت طے کرلیا گیا۔

ایڈووکیٹ اسمتھ کا دفتر بزنس چیمبر کی عمارت میں تیسری منزل پر تھا۔ اس عمارت کے گراؤنڈ فلور میں کار پارکنگ کے لیے خاص طور پر جگہ بنائی گئی تھی لیکن مورگن نے ڈورسا کو پارکنگ میں کار کھڑی کرنے سے منع کردیا تھا اور اس کے کہنے پر ہی ڈورسا نے بزنس چیمبر کی عمارت کے سامنے سڑک کے پار ایک خالی جگہ پر کار پارک کردی۔ پین ٹائم بم ڈورسا کے پاس ہی تھا۔ اسے یہ پین ٹائم بم اپنے پرس میں رکھ کر عمارت میں داخل ہونا تھا۔ تیسری منزل پر ایڈووکیٹ کے دفتر تک جانے کے لیے اسے لفٹ کے بجائے زینے کا استعمال کرنا تھا کیونکہ اکثر بڑی عمارتوں کے لفٹ کیبن میں خفیہ سرچنگ آلے لگے ہوتے ہیں اور اسی لیے مورگن نے یہ رسک نہیں لیا تھا اور ڈورسا کو زینے سے ہی اوپر جانے کی تاکید کی تھی۔

مورگن کا خیال تھا کہ اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ ڈورسا کے دفتر میں پہنچتے ہی اسے ایڈووکیٹ جان اسمتھ سے ملاقات کا وقت مل جائے گا۔

لیکن اب سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اسے یہ کیسے پتا چلے گا کہ ڈورسا کو ملاقات کی اجازت مل گئی ہے اور وہ ایڈووکیٹ سے ملنے کے لیے اس کے کیبن میں پہنچ گئی ہے؟ یہ بات مورگن نے پہلے نہیں سوچی تھی۔ اصل میں اس کا سارا دھیان تو ایڈووکیٹ کے قتل کے بجائے ڈورسا کے قتل پر لگا ہوا تھا لیکن وہ چاہتا تھا کہ اس معاملے کو صرف ایڈووکیٹ جان اسمتھ کے ہی قتل کا رنگ دیا جائے اور ڈورسا کے بارے میں یہ سمجھا جائے کہ وہ اتفاقیہ طور پر اس حادثے کا شکار ہوئی ہے۔ اس نے یہ بھی طے کرلیا تھا کہ ڈورسا کے قتل کے بعد وہ کہیں اور چلا جائے گا اور اسے پولیس کو یہ بتانے کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی کہ ڈورسا ایڈووکیٹ کے پاس کس لیے گئی تھی؟ مگر پھر بھی اس نے سوچ رکھا تھا کہ اگر پولیس کو بیان دینا ہی پڑا تو وہ بڑے اطمینان سے یہ کہہ دے گا کہ ڈورسا اپنے والد کی چھوڑی ہوئی پراپرٹی کے بارے میں صلاح مشورے کے لیے ایڈووکیٹ جان اسمتھ کے پاس جانے والی تھی اور یہ بات اسے ڈورسا نے کئی روز پہلے بتائی تھی۔ اس لیے ممکن ہے وہ اسی سلسلے میں وہاں گئی ہو اور اس ناگہانی حادثے کا شکار ہوگئی ہو۔ یہ سب تو وہ باتیں تھیں جو ڈورسا کے قتل کے بعد پیش آنے والی تھیں جن کے جوابات اس نے پہلے سے سوچ رکھے تھے۔

لیکن اب جو مسئلہ درپیش تھا اس کے بارے میں تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ تو عمارت کے نیچے یا سڑک کے کنارے کہیں موجود ہوگا اور وہاں اسے یہ کیسے معلوم ہوگا کہ ڈورسا ایڈووکیٹ کے کیبن میں پہنچ گئی ہے یا نہیں؟

لیکن جلد ہی اس نے دماغ پر زور دے کر اس مسئلے کو حل کرلیا۔ اس کے اندازے کے مطابق ڈیڑھ دو منٹ کے اندر ڈورسا ایڈووکیٹ جان اسمتھ کے کیبن میں ہوگی۔ اس لیے اس نے سوچا کہ وہ ایک منٹ بعد لفٹ کے ذریعے اوپر جائے گا اور ڈورسا کو ایڈووکیٹ کے کیبن کے اندر جاتے ہوئے دیکھ کر فوراً ہی واپس نیچے چلا جائے گا اور پھر اس نے ایسا ہی کیا۔

اوپر جاکر وہ عمارت کی لمبی راہ داری میں ایک جگہ کھڑا ہوگیا۔ اس نے دور سے ہی دیکھ لیا تھا کہ ڈورسا ایڈووکیٹ کے کیبن کے باہر ایک صوفے پر بیٹھی ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ڈورسا کو ابھی تک اندر نہیں بلایا گیا تھا۔ تقریباً پانچ منٹ ہی مورگن کو انتظار کرنا پڑا ہوگا کیونکہ اس کے بعد ہی ایک نوجوان شخص ہاتھ میں چند فائلیں اٹھائے کیبن سے باہر نکلا اور اس نے ڈورسا کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔ اس شخص کا اشارہ پاکر ڈورسا اٹھ کھڑی ہوئی۔ مورگن کو اسی وقت کا انتظار تھا۔ وہ ڈورسا کو اٹھتے دیکھ کر ہی تیزی سے باہر کی طرف لپکا۔ اس نے لفٹ کے اوپر سے نیچے آجانے کا انتظار بھی نہیں کیا بلکہ تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے پہنچ گیا۔

عمارت کے سامنے والی سڑک کو پار کرکے وہ اپنی پارک کی ہوئی کار کے پاس آگیا۔ اب اسے جلدی سے کار کے ڈیش بورڈ میں چھپا کر رکھے گئے ریموٹ کو نکال کر دبا دینا تھا تاکہ ایڈووکیٹ جان اسمتھ کے ساتھ ہی ڈورسا بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کے راستے سے ہٹ جائے۔

لیکن کار پر ہاتھ رکھتے ہی اچانک اسے ایک زوردار جھٹکا لگا۔ اسے یاد آیا کہ کار کا دروازہ تو لاک ہے اور چابی ڈورسا کے پاس ہی رہ گئی ہے۔ ڈورسا ہی کار ڈرائیو کرتی ہوئی یہاں تک آئی تھی اور کار پارک کرنے کے بعد چابی اس کے پاس رہ گئی تھی۔ مورگن کو یہ بھی یاد آیا کہ کار کو پارک کرنے کے بعد ڈورسا نے ہی کار کے شیشے چڑھائے تھے۔

اس وقت وہ ذرا بھی گھبرائی ہوئی نظر نہیں آئی تھی۔ حالانکہ اسے معلوم تھا کہ مورگن اس کے ساتھ اوپر نہیں جائے گا بلکہ

www.pkdigest.com

وہ نیچے ہی کار کے پاس رہے گا لیکن اس کے باوجود بھی وہ کار کی چابی مورگن کو دینے کے بجائے اپنے ساتھ ہی لے کر چلی گئی تھی... مورگن سخت پریشان تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ ڈورسا نے ایسا کیوں کیا؟ کیا جان بوجھ کر وہ چابی اپنے ساتھ لے گئی ہے یا غلطی سے چابی اس کے پاس رہ گئی تھی؟

وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ ڈورسا کو تو اس نے بتا دیا تھا کہ ریموٹ کنٹرول کا بٹن تو اس کے واپس آجانے کے بعد ہی دبایا جائے گا اسے تو صرف فائونٹین پین بم کو ایڈووکیٹ جان اسمتھ کی میز کے نیچے رکھی ہوئی ردی کی ٹوکری میں ڈال کر واپس آجانا ہے اور اسے یہ بھی پتا تھا کہ بم کا ریموٹ کار کے ڈیش بورڈ میں رکھا ہے لیکن ڈورسا کو مورگن کے اصل منصوبے کا علم ہی نہیں تھا جس کے مطابق دھماکا اسی وقت ہونا تھا جب وہ ایڈووکیٹ کے کیبن میں اس کے پاس ہی بیٹھی ہوگی۔

لیکن اب جبکہ مورگن کو یہ یقین ہوگیا کہ کار کی چابی ڈورسا کے پاس ہے تو وہ تقریباً پاگل ہی ہوگیا، لمحہ لمحہ اس کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ اسے لگنے لگا تھا کہ اس کا منصوبہ ادھورا ہی رہ جائے گا۔ ایڈووکیٹ جان اسمتھ کا قتل تو ڈورسا کے واپس آجانے کے بعد بھی ہو جائے گا لیکن اس کا اصل شکار ڈورسا بچ جائے گی اور اس کے ہوتے ہوئے محبوب صورت جیکولین اس کے ہاتھ نہیں لگ پائے گی۔

اس نے جب بھی ڈورسا کو طلاق دینے کی بات کی تھی تو ڈورسا نے ہر بار اسے یہ دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے ایسی کوئی کوشش کی تو وہ عدالت میں جا کر اس کے سارے پچھلے جرائم کا راز فاش کردے گی۔ ڈورسا کی اس دھمکی نے اسے طلاق تک قدم بڑھانے سے روک رکھا تھا لیکن اب تو ڈورسا کو ہمیشہ کے لیے خاموش کردینے کا موقع ہاتھ سے پھسلتا جارہا تھا اور وہ کسی قیمت پر بھی اس موقع کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔

اس نے جلدی کی اور قریب پڑے ہوئے پتھر کے ایک ٹکڑے سے اس نے سلائیڈنگ ڈور کی دو حصوں والی کھڑکی کا ایک شیشہ توڑ دیا لیکن ڈیش بورڈ تک اب بھی اس کا ہاتھ نہیں پہنچ رہا تھا۔ شیشہ ٹوٹ تو گیا تھا لیکن اس کی بڑی بڑی نکیلی کرچیاں کھڑکی کے چاروں طرف مضبوطی سے جڑی ہوئی تھیں جنہیں نکالنا بے حد مشکل کام تھا اور وہ ان کرچیوں کو نکالے بغیر اپنا سر اندر ڈال کر ڈیش بورڈ تک اپنا ہاتھ نہیں لے جاسکتا تھا اس کا ہاتھ اندر تک دروازے کے لاک ہینڈل تک تو پہنچ رہا تھا لیکن گاڑی سینٹرل لاک میں تھی جس کی وجہ سے کسی بھی دروازے کا اس وقت تک کھلنا مشکل تھا جب تک آخر میں بند کیا جانے والا دروازہ چابی سے نہ کھولا جائے۔

اس الجھن میں اب تک کافی وقت گزر گیا تھا۔ آخر اس نے کھڑکی پر لگی ہوئی شیشے کی نکیلی کرچیوں کو کھینچ کھینچ کر نکالنا شروع کردیا۔ کافی محنت کے بعد وہ کھڑکی کو صاف کرنے میں کامیاب ہوگیا اور اس نے کھڑکی میں ہاتھ ڈال کر جلدی سے ڈیش بورڈ میں رکھا ہوا ریموٹ نکال لیا اور فوراً ہی اس کا بٹن دبا دیا۔

بزنس چیمبر کی چار منزلہ عمارت ایک زوردار دھماکے سے ہل گئی۔ تیسری منزل پر واقع ایڈووکیٹ جان اسمتھ کا دفتر اڑا تو چوتھی منزل کا بھی ایک حصہ تیسری منزل پر آگرا۔ ایڈووکیٹ جان اسمتھ کے ساتھ دو اور آدمی بھی اس ملبے تلے دب کر ہلاک ہوگئے تھے۔

لیکن ٹھیک دھماکے کے وقت ڈورسا سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچ گئی تھی حالانکہ طے یہی ہوا تھا کہ جب ڈورسا واپس آکر مورگن کے پاس آجائے گی تب ہی ریموٹ کا بٹن دبا کر دھماکا کیا جائے گا لیکن مورگن نے اس کا انتظار نہیں کیا تھا اور اس کے آنے سے پہلے ہی دھماکا کردیا تھا اور اس سے ڈورسا نے مورگن کی نیت کا اندازہ لگا لیا۔ وہ ساری حقیقت سمجھ گئی تھی۔

سڑک پار کرنے کے بعد ڈورسا نے پہلے کار کی ٹوٹی ہوئی کھڑکی کو دیکھا اور پھر ہاتھ میں پکڑی ہوئی کار کی چابی ہوا میں لہرا کر سوالیہ نظروں سے مورگن کی طرف دیکھنے لگی، مورگن تو اسے زندہ سلامت دیکھ کر پہلے ہی بوکھلا گیا تھا اس لیے وہ بغلیں جھانکنے لگا۔

اس وقت فائر بریگیڈ کی گاڑیاں، ایمبولینس اور پولیس کی گاڑیاں وہاں آگئیں۔ ریلیف کے لیے فوراً ہی کام شروع ہوگیا تھا۔ اس درمیان میں ڈورسا نے پولیس افسران کو دھماکے کی ساری کہانی اور اس کے ساتھ مورگن کے کئی پچھلے گناہوں کی داستانیں بھی سنا دیں۔

جب مورگن پر عدالت میں مقدمہ شروع ہوا تو ڈورسا وعدہ معاف گواہ بن گئی اور مقدمے کے دوران میں ہی اس نے مورگن سے طلاق بھی لے لی۔ لیکن مورگن کو جس کا انتظار تھا وہ اس سے ایک بار بھی ملنے نہیں آئی۔ اس کے گرفتار ہونے کے چند روز بعد ہی جیکولین نے ایک نیا بوائے فرینڈ ڈھونڈ لیا تھا شاید وہ ایک لمبی عمر تک مورگن کا انتظار نہیں کرسکتی تھی۔ مورگن کو عمر قید کی سزا سنائی جاچکی تھی اور وہ اپنے ہی بچھائے ہوئے جال میں خود ہی پھنس گیا تھا۔

رات کافی گرم تھی۔ وہ دونوں اس وقت اس سستے سے ہوٹل کی دوسری منزل پر ایک کمرے میں مقیم تھے۔ عورت کا نام تھیڈا تھا اور مرد کا گارون۔ کمرے میں ایک پیڈسٹل فین دھیمی رفتار سے چل رہا تھا۔ تھیڈا اور گارون دونوں ہی متفکر نظر آرہے تھے مگر گارون کے انداز میں درشتی تھی۔ تھیڈا خاصی حسین تھی مگر اب اس کا حسن آہستہ آہستہ اس کا ساتھ چھوڑ رہا تھا۔ پھر بھی اس نے خود کو اس انداز سے سنوار رکھا تھا کہ پہلی نظر میں اس پر کسی نوخیز لڑکی کا گماں گزرتا تھا۔ وہ گارون کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

''سنو تھیڈا!'' گارون نے کہا۔ ''تمہیں میرے منصوبے کے بارے میں سوچنا ہوگا اور اس پر عمل کرنا ہوگا ورنہ...'' یہ کہہ کر گارون خاموش ہوگیا اور تیز نظروں سے تھیڈا کو دیکھنے لگا۔

''مگر میرے لیے یہ سب کرنا بے حد مشکل ہوگا۔'' تھیڈا نے کہا۔ ''تم جانتے ہو کہ میں تم سے کس قدر محبت کرتی ہوں اور تمہارے لیے ہر کام کرنے کو تیار رہتی ہوں۔ میں نے تمہاری خاطر اپنا گھر چھوڑا۔ اپنے ماں باپ کو چھوڑا... تم سال سال دو دو سال کے لیے جیل جاتے رہے۔ میں تمہارا

اپنے لیے سب کچھ کر گزرنے والے بے ضمیر مجرم کا قصہ عبرت

تیز رفتار وقت کے ساتھ بھاگتی زندگی میں ٹھہراؤ کا مقام ضرور آتا ہے ...مگر کچھ لوگ اس مقام کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے دبے پاؤں گزرتے چلے جاتے ہیں ...ایک ایسے ہی مجرم کا احوال جو ہر صورت اپنے ارادے کی تکمیل چاہتا تھا۔

سفاک

مرزا ظفر بیگ

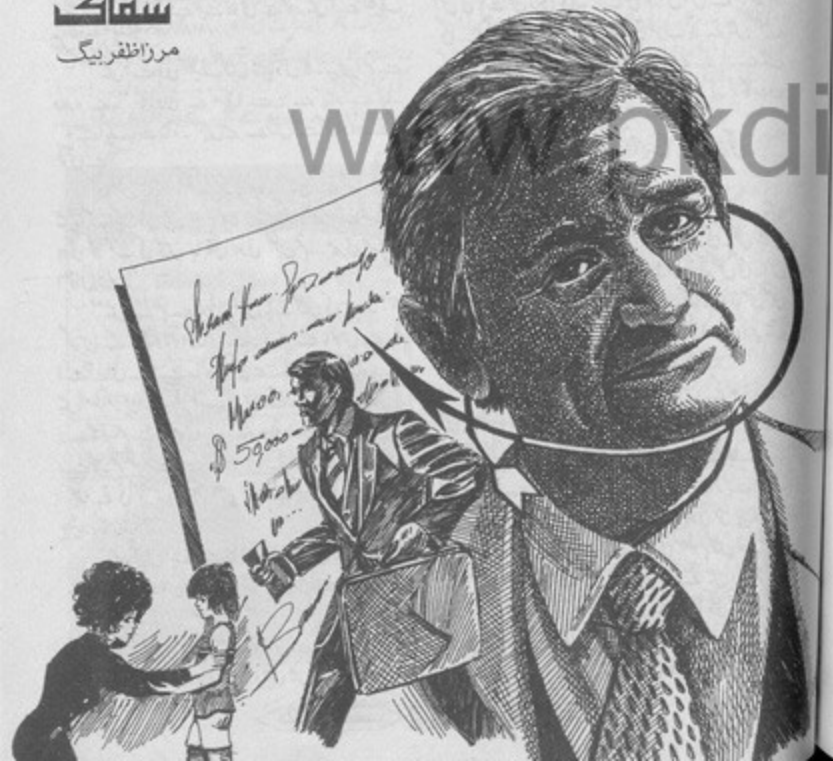

www.pkdigest.com

انتظار کرتی رہی... اس بار تم پورے پانچ سال بعد باہر آئے ہو۔'' یہ کہہ کر تھیڈا نے اپنے آنسو صاف کیے پھر بولی۔ ''مگر اس بار میں اس کام میں تمہارا ساتھ نہیں دوں گی۔ میں اس بچے کو اغوا نہیں ہونے دوں گی۔''

''کیا بکواس کر رہی ہو؟'' یکا یک گارون غرایا۔ ''تم نے ہر حالت میں میرا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اب تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ وہ بچہ ہمارے لیے سونے کی چڑیا ہے۔ ہمارا کاروبار ہے اور میں اپنے کاروبار کے سامنے کسی کو نہیں آنے دوں گا۔ میں اسے اغوا کر کے اس کے باپ سے تاوان وصول کروں گا۔ ویسے بھی وہ بن ماں کا بچہ ہے۔ تم اس کی گورنس رہی ہو۔ میں اسے مار کر کیا کروں گا؟ مجھے صرف رقم سے غرض ہے۔''

''دیکھو گارون! جب تک تم جیل میں رہے، میں اس بچے کی گورنس رہی۔'' تھیڈا نے کہا۔ ''اس کے باپ نے مجھے پناہ دی تھی ورنہ نہ جانے میرا کیا حشر ہوتا۔ بہرحال، مجھے مسٹر گرین کے بچے سے محبت ہو گئی ہے اور میں اسے تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی۔''

''میں اسے کوئی تکلیف نہیں پہنچاؤں گا۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔'' گارون نے تھیڈا سے بڑے پیار سے کہا۔ ''ویسے ایک بات بتاؤ۔ تمہیں میرے جیل سے آزاد ہونے کی خوشی ہے؟''

''بالکل ہے۔'' تھیڈا نے کہا۔ ''میں نے تمہاری یاد میں ایک ایک دن گن گن کر کاٹا ہے۔ اگر مجھے تم سے محبت نہ ہوتی تو کب کی کہیں جا چکی ہوتی لیکن تم... میری محبت کا امتحان نہ لو۔''

''میں نے تم سے کوئی مشکل بات نہیں کی ہے۔'' ہم گرین کے بچے کو اغوا کریں گے۔ وہ تم سے مانوس ہے۔ تم اسے آسانی سے اپنے ساتھ لا سکتی ہو۔ پھر ہم اس کے بدلے میں مسٹر گرین سے رقم طلب کریں گے۔ جب وہ ادائیگی کر دے گا تو ہم بچے کو چھوڑ دیں گے۔ وہ تمہاری حفاظت میں ہی رہے گا۔ تم فکر مت کرو۔'' گارون نے نرم لہجے میں تھیڈا کو سمجھانے کی کوشش کی مگر اس کے لہجے کی درشتی تھیڈا سے پوشیدہ نہیں رہ سکی۔

''میں تمہیں ایک بات بتانا چاہ رہی ہوں۔'' تھیڈا نے کچھ کہنا چاہا تو گارون نے ہاتھ اٹھا کر اس کی بات کاٹ دی۔

''بس اب اس منصوبے پر عمل کی تیاری شروع کرو۔ تم نے مجھے جیل میں جو خطوط بھیجے تھے ان سے میں مسٹر گرین کی مالی حیثیت کا اندازہ کر چکا تھا اور وہیں میں نے یہ سارا پلان بھی تیار کر لیا تھا۔'' گارون نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''مگر میں جو بات تم سے کہنا چاہ رہی ہوں...'' تھیڈا نے پھر کہا تو گارون نے اس مرتبہ نہایت سخت لہجے میں کہا۔

''اب کوئی بات نہیں ہوگی۔ سن لیا تم نے؟'' یہ کہہ کر وہ لباس بدلنے کے لیے واش روم میں چلا گیا۔

واپس آ کر اس نے کہا۔ ''تھیڈا! ہمارے کام میں غلطی کی گنجائش نہیں ہوتی۔ ہمیں برق رفتاری سے اپنے پلان پر عمل کرنا ہے... پوری احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ۔ اس میں ذرا بھی کمی نہ ہو ورنہ پھانسی کا پھندا ہم دونوں کے گلے میں پڑ جائے گا۔''

پھر وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔ جاتے جاتے وہ رکا اور بولا۔ ''تم مسٹر گرین کی ملازمت چھوڑ دو... اس کے بعد ایک ہفتے تک اس گھر کے قریب بھی مت جانا۔ جمعرات کو گرین اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر جھیل پر جاتا ہے۔ وہاں اس کا اپنا ہٹ ہے۔'' گارون بولے جا رہا تھا اور تھیڈا بے زاری سے اس کی بات سن رہی تھی۔ ''اب نئی گورنس اس کے ساتھ ہوگی... بچہ تمہیں جانتا ہے۔ اسے اپنی طرف بلانے میں تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی... اب اس منصوبے کے بارے میں اچھی طرح سوچ لو۔ میں ابھی آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر گارون ہوٹل کے کمرے سے نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد تھیڈا آہستہ آہستہ سسکنے لگی۔

☆☆☆

اگلے روز صبح بیدار ہوتے ہی گارون نے اپنی جیب میں موجود رقم گنی... پھر اس نے تھیڈا کی رقم شمار کی۔ کل ملا کر سات سو پینتیس ڈالر تھی۔ اس وقت تھیڈا کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے جماہی لیتے ہوئے گارون کی طرف دیکھا۔ وہ خاصی تھکی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ گارون نہا دھو کر تیار ہوا۔ ذرا سی دیر میں وہ ہمیشہ کی طرح چست اور پھرتیلا نظر آنے لگا تھا۔

''میں ذرا کام سے جا رہا ہوں۔'' اس نے تھیڈا سے کہا۔ ''تم ناشتا کر لینا۔ میں جلدی واپس آؤں گا۔'' یہ کہہ کر وہ مارچ کرتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد تھیڈا ابڑے تھکے تھکے اور نقاہت بھرے انداز سے اٹھی۔ بعض اوقات وہ سوچتی تھی کہ شاید وہ تھکی ہوئی ہی پیدا ہوئی ہے۔ کیوں؟ اس کا جواب اسے خود بھی معلوم نہیں تھا۔ ممکن ہے اس کا سبب شراب نوشی ہو۔ کسی زمانے میں وہ کثرت سے شراب نوشی کرتی تھی مگر اب اس میں کمی آ چکی تھی پھر بھی اس کا بدن ٹوٹتا رہتا تھا۔ پھر اسے احساس ہوا کہ وہ اس قدر کیوں تھکی ہے۔ اسے اس کے سوال کا جواب مل چکا تھا۔

اسے اچھی خوراک نہیں ملتی تھی۔

وہ اپنے دکھوں سے اس قدر تنگ آ چکی تھی کہ اس نے کئی بار خودکشی کا ارادہ بھی کیا مگر کم ہمتی کے باعث اس پر بھی عمل نہ کر سکی۔ وہ سوچتی تھی کہ اس کے مقابلے میں گارون ہمیشہ سے ہی بے حد پھرتیلا ہے۔ اسے تھکن چھو کر بھی نہیں گزرتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ گارون کے سامنے اسی کی طرح صاف ستھری اور چاق و چوبند نظر آئے... زندگی اور حرارت سے بھرپور۔

تیار ہونے کے بعد وہ ناشتے کے لیے ہوٹل سے باہر ایک ریسٹورنٹ میں چلی گئی۔ ناشتے کے بعد اس نے اپنی حالت بہتر محسوس کی۔ اب وہ مسٹر گرین کے ننھے بیٹے کو اغوا کرنے کے منصوبے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

ایک ریسٹورنٹ میں ناشتا کرنے کے بعد گارون ریسٹورنٹ سے باہر آیا۔ تھوڑی دور پیدل چلنے کے بعد وہ ایک بس میں سوار ہو گیا اور ایک اسٹاپ پر اتر گیا جہاں پرانی اور استعمال شدہ کاریں فروخت ہوتی تھیں۔ وہ پورا میدان طرح طرح کی کاروں سے بھرا ہوا تھا۔

کافی تلاش کے بعد اس نے ایک گرے کلر کی سیڈان پسند کی۔ اس کی نمبر پلیٹ پر لکھا ہوا نمبر نوٹ کیا، کار کی قیمت معلوم کی اور واپس روانہ ہو گیا۔ ہوٹل پہنچا تو تھیڈا اس کی منتظر تھی۔

''تھیڈا!'' اس نے کہا۔ ''میں نے ایک گرے سیڈان دیکھی ہے جس کا نمبر یہ ہے۔'' اس نے کار کا نمبر تھیڈا کو بتایا اور کہا۔ ''تم اس کار کو پانچ سو ڈالر میں خرید سکتی ہو۔ ویسے سیلز مین نے مجھے اس کی قیمت ساڑھے پانچ سو ڈالر بتائی ہے۔ کار خرید کر مجھ سے البربرو میں ٹھیک تین بجے ملنا۔ باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔'' یہ کہہ کر اس نے پانچ سو ڈالرز کے نوٹ تھیڈا کی طرف بڑھا دیے۔

تھیڈا کے جانے کے بعد گارون بھی ہوٹل کے کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس نے مارکیٹ سے ایک پستول خریدا اور ساتھ ہی اس کی گولیاں بھی خرید لیں۔

جب گارون مقررہ مقام پر پہنچا تو تھوڑی دیر بعد ہی گرے سیڈان بھی آتی نظر آ گئی۔ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر تھیڈا بیٹھی تھی۔ چند لمحوں بعد ہی گارون اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ تھیڈا نے گیئر بدلا اور کار شمال کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس طرف خاصا ٹریفک رواں تھا۔

''کتنے میں خریدی؟'' گارون نے سوال کیا۔

''صرف چار سو پچھتر ڈالرز میں۔'' تھیڈا نے جواب دیا۔

''بہت خوب!'' گارون نے کہا اور بقیہ رقم تھیڈا کے پرس میں سے نکال کر اپنے پرس میں منتقل کر لی۔ تھیڈا نے کچھ نہیں کہا۔

''اب مجھے وہ جھیل دکھا دو جہاں مسٹر گرین کے بچے کو اپنی گورنس کے ساتھ آنا ہے۔'' گارون نے کہا۔

''کیا ابھی چلو گے؟'' تھیڈا نے سوال کیا۔

''ہاں، میں اسے پہلے سے دیکھنا چاہتا ہوں۔'' گارون بولا۔ اس کی مستعد نظریں اس جگہ کا بغور جائزہ لے رہی تھیں۔ سڑکیں، عمارتیں، پل، بس، جھیل... وہ ایک ایک چیز کو اپنے ذہن کے پردے پر نقش کر رہا تھا۔ وہ خاصا پیچیدہ اور الجھا ہوا راستہ تھا مگر گارون کے تیز ذہن نے اسے یاد کر لیا تھا۔

☆☆☆

تھیڈا نے کار کو بائیں طرف موڑا۔ اب ہائی وے کے اس طرف پتھریلی سڑک تھی جس کے دونوں طرف صنوبر کے درخت تھے۔ یہاں گھنے درختوں کی وجہ سے سورج کی روشنی بھی کم آ رہی تھی۔

''ہائی وے سے آدھے میل کے بعد تھیڈا نے گرے

سیڈان کا بریک دبا دیا اور کار ایک جھٹکے سے رک گئی۔ گارون دیکھ رہا تھا کہ تھیڈا کا چہرہ لٹھے کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ اس نے لرزتے ہوئے کہا۔ ''وہ... سامنے... جھیل بھی ہے اور اس کے قریب ہٹ بھی۔''

جھیل سڑک کے جنوب مغرب میں واقع تھی اور سیدھی جا رہی تھی۔ اس کے اطراف سبزہ بھی تھا اور بے شمار مختلف اقسام کے درخت بھی۔ متعدد جھاڑیوں نے اس جگہ کو گھیر رکھا تھا۔ جھیل کے اختتام پر سرخ اینٹوں سے وہ ہٹ تعمیر کیا گیا تھا۔ جھیل کے ساتھ لکڑی کا ایک پلیٹ فارم تھا جس کے برابر میں بوٹ ہاؤس تھا۔ جھیل کے دوسرے کنارے پر ایک ڈرائیونگ بورڈ بھی تھا۔

''جس سڑک پر ہم ہیں یہ سرکاری ہے یا نجی؟'' گارون نے تھیڈا کی طرف دیکھے بغیر سوال کیا۔

''میرے خیال میں سرکاری ہے۔'' تھیڈا نے کہا تو گارون نے دل ہی دل میں اسے برا بھلا کہا۔ اس کے دھندے میں کوئی کام ''خیال'' سے نہیں ہوتا تھا بلکہ سو فیصد یقین سے ہوتا تھا۔

''مسٹر گرین کی زمین اس سڑک کے دونوں طرف ہے۔'' تھیڈا نے کہا۔ ''وہ لگ بھگ ایک ہزار ایکڑ زمین کے مالک ہیں۔''

''خوب!'' گارون نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ اس نے آخری مرتبہ اس جگہ پر نظر ڈالی، عمدہ جگہ تھی۔ اس کے کام کے لحاظ سے بہترین تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ بعد میں وہ اس جگہ کے نقشے پر بھی نظر ڈالے گا اور اس کے اطراف سے آنے والی سڑکوں کے بارے میں بھی جاننے کی کوشش کرے گا۔

☆☆☆

گارون نے پورا انتظام کر لیا تھا۔ اس نے نامپا کے جنوب میں ایک چھوٹی سی کاٹیج کرائے پر حاصل کر لی تھی۔ وہ دریا کے مقابل واقع تھی۔ اس کاٹیج تک آنے کے لیے ایک خراب اور ناہموار راستہ تھا جو اسٹیٹ ہائی وے سے خاصا گھومتا ہوا ادھر آتا تھا۔ ویسے اس راستے سے تین راستے ملتے تھے مگر اس مخصوص راستے پر زیادہ ٹریفک نہیں چلتا تھا۔ یہ کاٹیج اس کے لیے بہترین پناہ گاہ کا کام دے سکتی تھی کیونکہ خطرے کے وقت یہاں سے نکلنا بہت آسان تھا۔ گارون کسی بھی کشتی کی طرح کئی سمتوں میں جا سکتا تھا۔

اس کاٹیج کا مالک ایک بوڑھا سنکی تھا جسے کم دکھائی دیتا تھا۔ اس کی اس کمی نے گارون کا کام اور بھی آسان کر دیا تھا۔ وہ ایک بوڑھا کسان تھا اور ہر وقت اپنے کمرے میں بند پڑا رہتا تھا جو اس کاٹیج سے کچھ فاصلے پر واقع تھا۔ وہ اور کوئی کام کرنے کے قابل نہیں رہا تھا اس لیے اس نے اپنا کاٹیج کرائے پر اٹھانے کا فیصلہ کیا تھا۔ چنانچہ اب وہ کاٹیج گارون کے پاس تھا۔ گارون بوڑھے کسان کو ایک ہفتے کا ایڈوانس کرایہ دے چکا تھا۔

جب گارون شام پانچ بجے اپنے ہوٹل پہنچا تو تھیڈا حیرت اور خوشی سے اچھل پڑی۔ پھر وہ رونے لگی۔ ساتھ ہی کہتی جا رہی تھی۔ ''خدا کا شکر ہے کہ تم واپس آ گئے۔ میں تو سمجھی تھی کہ اس بار تم نے مجھے واقعی چھوڑ دیا ہے۔''

''میں نے سارا انتظام کر لیا ہے۔'' گارون نے تھیڈا کی بات ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ ''کل اس وقت تک ہمارا کام پورا ہو چکا ہوگا۔ آؤ تمہیں کھانا کھلا لاؤں۔''

''مگر میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' تھیڈا نے نقاہت بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں باہر نہیں جا سکوں گی۔ تم میرے لیے یہیں کچھ لے آؤ۔''

گارون نے غور سے تھیڈا کا جائزہ لیا۔ یکایک اس کی آنکھیں سکڑنے لگی تھیں۔ اس نے غصے سے کہا۔ ''سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس معاملے میں تم پر بھروسا کروں یا نہیں۔''

''مجھ پر بھروسا رکھو... میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' تھیڈا نے کہا۔ ''بس... اس وقت میرا دل بوجھل ہو رہا ہے۔ وہ بچہ...''

''سنو... اب تک ہر کام صحیح طریقے سے انجام پا چکا ہے۔'' گارون نے سرد لہجے میں کہا۔ ''لیکن اگر تم نے اپنی حرکتوں سے میرے پلان کو چوپٹ کرنے کی کوشش کی تو میں کیا کروں گا، اس کا تمہیں خوب اندازہ ہو جائے گا۔ تمہارے حق میں یہی بہتر ہوگا کہ اپنے آپ کو سنبھالو... ابھی بہت کام باقی ہے۔''

''گارون میں کر تو رہی ہوں۔ اپنے آپ کو سنبھالنے کی پوری کوشش کر رہی ہوں۔'' تھیڈا نے عاجزی سے کہا۔ ''بس میرے دل میں جو خوف بیٹھ گیا ہے وہ نہیں نکل پا رہا۔ تم مجھے ایک ڈرنک لا دو۔ صرف ایک! اس سے میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔''

''میں تمہارے لیے ڈرنک تو نہیں لاؤں گا البتہ نیند کی گولیوں کی پوری بوتل لا دوں گا۔ تم اس بوتل کو اپنے معدے میں اتار لینا۔ تمہارا ہمیشہ کے لیے قصہ پاک ہو جائے گا۔''

گارون نے نہایت طیش کے عالم میں کہا اور کسی بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح کمرے میں ٹہلنے لگا۔ تھیڈا بے چارگی کے عالم میں اسے دیکھ رہی تھی۔ پھر گارون نے تھیڈا کا بازو پکڑ کر اسے اٹھایا اور باتھ روم میں دھکا دیتے ہوئے کہا۔ ''جاؤ اپنا منہ دھو کر آؤ۔''

وہ کسی سعادت مند بچے کی طرح اندر چلی گئی اور ٹھنڈے پانی کے چھینٹے اپنے چہرے پر مارنے لگی۔ گارون نے دل ہی دل میں تھیڈا پر لعنت بھیجی اور سونے کے لیے بستر پر لیٹ گیا۔ اسے صبح جلد اٹھنا تھا تاکہ تازہ دم ہو کر اپنا مشن مکمل کر سکے جس کی وہ طویل عرصے سے پلاننگ کر رہا تھا۔

☆☆☆

صبح آنکھ کھلتے ہی گارون اچھل کر بستر پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے سر کو ہلکے ہلکے جھٹکے دیے اور تھیڈا کو آوازیں دینے لگا مگر اس نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی تو گارون نے اسے جھنجوڑ ڈالا۔ تھیڈا نے آنکھیں کھول دیں اور بڑی مشکل سے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں نیند کا خمار بھی تھا اور تھکن بھی۔ گارون کا دل چاہا کہ اس عورت کے منہ پر دو چار زوردار تھپڑ مارے تاکہ اس کی آنکھیں کھل جائیں مگر پھر اس نے خود پر ضبط کیا کیونکہ ابھی اسے تھیڈا کی ضرورت تھی۔

''تھیڈا ڈارلنگ! اٹھو، صبح ہو گئی ہے۔ ہمیں ابھی بہت کام کرنا ہے۔'' اس نے اپنی آواز میں شہد جیسی مٹھاس سموتے ہوئے کہا۔ اس کے بعد اس نے تھیڈا کے بالوں پر بڑے پیار سے ہاتھ پھیرا۔

''گارون وہ بچہ...'' تھیڈا نے آنکھیں کھولتے ہوئے کہا۔

''تم اس کی فکر مت کرو۔'' گارون نے کہا۔ ''بلاوجہ خود کو پریشان کر رہی ہو۔ میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ وہ بالکل ٹھیک رہے گا اور اس کا بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔''

''گارون! کیا تمہیں واقعی مجھ سے محبت ہے؟'' تھیڈا نے پوچھا۔

''تم جانتی ہو کہ میں تم سے کس قدر پیار کرتا ہوں۔'' گارون نے اسے محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم مجھے بعد میں چھوڑ تو نہیں دو گے؟'' تھیڈا نے کہا۔

''ارے! کیسی بچوں کی سی باتیں کر رہی ہو۔'' گارون نے دل ہی دل میں گویا دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔

''دیکھو گارون! جب تم جیل میں تھے تو مسٹر گرین کا گھر اور ان کا اکلوتا بچہ ہی میرے لیے سب کچھ تھے۔'' تھیڈا نے کہا۔ ''جب تم آ گئے تو میں نے انہیں چھوڑ دیا۔ اب تم اس بچے کو اغوا کرنے جا رہے ہو۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم اس خیال کو دل سے نکال دو؟'' تھیڈا کے لہجے میں عاجزی تھی۔

''کیا تم پاگل ہو گئی ہو؟'' گارون نے مشتعل ہوتے ہوئے کہا پھر اس نے خود کو کنٹرول کیا اور کہا۔ ''بس اب تھوڑی ہی دیر کی تو بات ہے کل شام تک ہم ایک موٹی رقم کے ساتھ اس علاقے سے نکل جائیں گے اور کسی دوسری ریاست میں جا کر ایک نئی زندگی شروع کریں گے۔''

''میرا خیال ہے کہ تم اس منصوبے کو اپنے دل سے نکال دو۔'' تھیڈا نے حتمی لہجے میں کہا۔

''جلدی اٹھو اور تیار ہو جاؤ۔'' گارون نے سرد لہجے میں کہا اور باتھ روم میں چلا گیا۔ وہ واپس آیا تو تھیڈا بالکل بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔ اس نے کسی روبوٹ کی طرح ناشتا کیا۔ پھر گارون کے ساتھ ہوٹل سے باہر آ گئی۔ لگ بھگ نو بجے ان کی کار پارکنگ لاٹ سے نکل چکی تھی۔

تھیڈا، گارون کو پہلے ہی بتا چکی تھی کہ مسٹر گرین کا بیٹا اپنی گورنس کے ساتھ صبح جھیل پر پہنچ جاتا تھا جبکہ مسٹر گرین بعد میں آتے تھے۔ وہ تمام کاموں سے نمٹ کر شام تک وہاں پہنچتے تھے۔ جھیل والے ہٹ پر دو ملازم بھی تھے جو کاٹیج کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ جھیل کی طرف والے راستے پر بڑھتے ہوئے گارون ان تمام باتوں کو یاد کر رہا تھا جو اسے تھیڈا نے بچے کے بارے میں بتائی تھیں۔ مسٹر گرین کی بیوی اور اس بچے کی ماں کا انتقال ہو چکا تھا۔ اسی لیے وہ بچہ آیاؤں کی گود میں پل رہا تھا۔ پہلے اسے تھیڈا نے پالا تھا اور اب دوسری گورنس اس کی پرورش کر رہی تھی۔ مسٹر گرین کو اپنے بیٹے سے بے حد محبت تھی... اور کیوں نہ ہوتی؟ وہ اس کی زندگی کا محور تھا۔ گارون نے اسی محبت سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا تھا۔

☆☆☆

گارون نے سڑک سے اپنی گاڑی اس طرف گھمائی تو اس کے سامنے جھیل کا منظر آ گیا۔ وہ ہٹ بھی نظر آ رہا تھا جس کے سامنے ایک سیاہ سیڈان کھڑی تھی۔ گورنس اور مسٹر گرین کا بچہ وہیں تھے۔

گارون نے اپنی گاڑی روک دی اور تھیڈا سے کہا۔ ''اب ہم آگے پیدل جائیں گے۔'' اس نے تھیڈا کی طرف دیکھا۔ اس کی رنگت زرد پڑ چکی تھی اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمایاں تھے۔

''تم جانتی ہو نا کہ تمہیں کیا کرنا ہے؟'' گارون نے تھیڈا سے پوچھا تو اس نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ گارون نے اسے اترنے کا اشارہ کیا اور اپنی طرف کا دروازہ بھی کھول دیا۔ تھیڈا کے ساتھ چلتے ہوئے اس نے اپنے پستول کو ٹٹولا اور مطمئن ہو گیا۔ اس نے بچے کی طرف دیکھا۔ وہ غالباً جھیل میں موجود مینڈکوں کو پتھر مار رہا تھا اور خوب قہقہے لگا رہا تھا۔

اس نے تھیڈا اور گارون کو دیکھا تو ٹھٹک گیا۔ وہ بہ مشکل چار سال کی عمر کا تھا۔ بڑا پیارا بچہ تھا۔ تھیڈا کو دیکھتے ہی وہ اس کی طرف دوڑا۔ اس کے دونوں ہاتھ آگے کی طرف پھیلے ہوئے تھے۔

تھیڈا نے اسے اپنے سینے سے لپٹا لیا اور پیار کرتے ہوئے بولی۔ ”جو! تم کیسے ہو؟ تمہاری یہ نئی گورنس کیسی ہے؟ تمہارا خیال تو رکھتی ہے نا؟“

”ہاں... مس ہیلن بہت اچھی ہے... تم بھی اچھی تھیں۔“ جو گرین نے معصومیت سے کہا اور گارون کی طرف دیکھنے لگا۔ اسی دوران جو کی گورنس مس ہیلن بھی آگے آگئی۔ جو نے اس کا تھیڈا سے تعارف کرایا تو وہ خاصی گرم جوشی سے ملی۔

”یہ مسٹر راجر ہیں۔ انہی کے ساتھ میں یہاں آئی ہوں۔“ تھیڈا نے جو اور ہیلن سے کہا تو ہیلن نے انہیں اندر آنے کو کہا۔ وہ دونوں ہیلن اور جو کے ساتھ ہٹ کے اندر چلے گئے۔

”مسٹر گرین کب آئیں گے؟“ تھیڈا نے ہیلن سے پوچھا۔

”رات کو آئیں گے۔“ اس نے جواب دیا تو تھیڈا کا دل دھڑک اٹھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کاش مسٹر گرین جلدی آجاتے تو جو کے اغوا کا منصوبہ ناکام بھی ہوسکتا تھا مگر... ادھر تھیڈا کی حالت دیکھ کر گارون سوچ رہا تھا کہ اگر اس عورت نے کوئی گڑبڑ کر دی تو کیا ہوگا؟ وہ اپنے پلان کو کسی بھی صورت میں ناکام نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

”میں تم لوگوں کے لیے ٹھنڈا مشروب لاتی ہوں۔“ یہ کہہ کر ہیلن اندر چلی گئی اور گارون اور تھیڈا وہیں جو کے پاس بیٹھ گئے۔ ہیلن ابھی ریفریجریٹر تک پہنچی ہی تھی کہ گارون نے اپنا پستول نکالا اور اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اس نے پستول کے دستے سے ہیلن کے سر پر ضرب لگائی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ ضرب کتنی زوردار تھی... ہیلن فرش پر گر کر بے حس و حرکت ہو گئی۔ تھیڈا کا جسم گویا مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ معصوم جو نے یہ منظر دیکھا تو اس کی آنکھوں میں خوف آگیا۔ اس نے لرزتے ہوئے کہا۔ ”مسٹر! تم نے... میری... گورنس... کو مارا...“

گارون نے جو کا بازو پکڑ لیا۔ جو نے زوردار چیخ ماری تو گارون نے اس کے منہ پر تھپڑ لگایا... جو فوراً ہی بے ہوش ہو گیا۔ تھیڈا اچٹی اچٹی نظروں سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔

”اٹھاؤ اسے... اور کار میں لے جا کر لٹا دو۔“ گارون نے سرد لہجے میں کہا۔ ”اور زیادہ ڈرامے بازی کی ضرورت نہیں ہے۔“

”وہ... گار... ون...“ تھیڈا نے کچھ کہنا چاہا مگر اس کے حلق سے آواز نہیں نکلی۔ اس نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے جو کو اٹھایا۔ نہ جانے جو بے ہوش ہوا تھا یا خوف زدہ ہو گیا تھا مگر تھیڈا کا دل اسے اس حال میں دیکھ کر کٹ رہا تھا۔

”جلدی کرو۔“ تھیڈا کی سستی دیکھ کر گارون چیخ اٹھا تو تھیڈا نے جھرجھری لی اور معصوم بچے کو اپنے بازوؤں میں اٹھا کر باہر آگئی۔

اس کے جانے کے بعد گارون بے ہوش پڑی ہیلن کی طرف متوجہ ہوا جس کا جسم ہل رہا تھا۔ وہ شاید ہوش میں آرہی تھی مگر گارون نے اسے ہوش میں نہیں آنے دیا۔ اس کے سائیلنسر والے پستول نے گورنس کی زندگی کا چراغ بجھا دیا۔ پھر وہ تیزی سے باہر آیا جہاں کار میں تھیڈا اس کی منتظر تھی... جو اس کی گود میں تھا اور ابھی تک بے ہوش تھا۔ تھیڈا کا چہرہ سفید پڑ چکا تھا۔ گارون نے کار میں بیٹھ کر اس کا انجن اسٹارٹ کیا۔ اسی لمحے جو کے حلق سے کراہنے کی آواز نکلی۔

”اس کا سر نیچے کرلو...“ گارون نے کہا اور گاڑی کو آندھی طوفان کی طرح آگے بڑھا دیا۔

پندرہ منٹ بعد وہ اس کاٹیج کے سامنے پہنچ گیا جو اس نے بطور خاص اس مقصد کے لیے کرائے پر حاصل کی تھی۔

”اسے اندر لے جاؤ... اور خیال رکھنا کہ یہ شور نہ مچائے۔“ گارون نے تھیڈا سے کہا تو اس نے خاموشی سے اس کے حکم کی تعمیل کی۔

”ویسے تو یہاں کسی کے آنے کا کوئی امکان نہیں پھر بھی تم اس بچے کو کھڑکیوں یا دروازے تک نہ آنے دینا۔“

اس دوران جو ہوش میں آگیا۔ اس نے رونا اور مچلنا شروع کر دیا۔ ”میں اپنے گھر جاؤں گا... میں اپنے ڈیڈی کے پاس جاؤں گا۔ ہیلن کہاں ہے؟“

تھیڈا نے اسے چپ کرانے کی کوشش کی مگر جو مسلسل رو رہا تھا۔ اس نے تھیڈا سے کہا۔ ”یہ بہت برا آدمی ہے۔ اس نے مس ہیلن کو مارا ہے... مجھے میرے گھر لے چلو... پلیز۔“

”فکر مت کرو۔ گھبراؤ نہیں... میں تمہیں تمہارے ڈیڈی کے پاس لے جاؤں گی۔“ تھیڈا نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

تھیڈا جو کو بہلاتی رہی۔ گارون نے کار اسٹارٹ کی اور واپس روانہ ہوگیا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں سڑک کے کنارے چار فون بوتھ بنے ہوئے تھے۔ اس نے ایک بوتھ میں داخل ہو کر مسٹر گرین کی کمپنی کا نمبر ملایا۔ یہ نمبر اس نے ایک دن پہلے ٹیلی فون ڈائریکٹری سے حاصل کیا تھا۔ دوسری طرف سے مسٹر گرین کی سیکریٹری کی آواز سنائی دی۔ وہ اپنی کمپنی کا تعارف کرا رہی تھی کہ گارون نے اس سے کہا۔ ”میری مسٹر گرین سے بات کراؤ۔ میں جلدی میں ہوں۔“

”مگر وہ تو بہت مصروف ہیں۔“ سیکریٹری نے کہا۔ ”ویسے تم کون ہو اور ان سے کیوں بات کرنا چاہتے ہو؟“

”یہ مسٹر گرین کے اکلوتے بیٹے کی زندگی کا سوال ہے...“ گارون نے صرف اتنا ہی کہا تھا کہ کلک کی آواز آئی اور دوسری طرف سے مسٹر گرین کی آواز سنائی دی۔

”میں گرین بول رہا ہوں۔“ گارون نے محسوس کیا کہ مسٹر گرین کی آواز نرم اور لہجہ شائستہ تھا۔ ”تم نے میری سیکریٹری سے...“

”سنو مسٹر!“ گارون نے پھنکارتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا بیٹا جو اس وقت میرے قبضے میں ہے اور وہ اسی صورت میں زندہ رہے گا جب تم میری ہر بات مانو گے ورنہ...“

ایک لمحے کے لیے ایسا لگا جیسے مسٹر گرین کو سکتہ ہوگیا ہے۔

”میں نے تمہارے بیٹے کو جھیل والے ہٹ سے اغوا کیا ہے۔ ابھی تک وہ بالکل محفوظ ہے... اور آئندہ بھی رہے گا بشرطیکہ تم میری ہدایات پر عمل کرو۔“

”مجھے کیا کرنا ہے؟“ دوسری جانب سے مسٹر گرین نے پوچھا۔

”دس لاکھ ڈالرز چھوٹے بڑے نوٹوں کی شکل میں جمع کرو۔ تمام نوٹ استعمال شدہ ہونے چاہئیں۔ ان کا پیکٹ بناؤ اسے ایک تھیلے میں ڈالو پھر اس تھیلے کو ساتھ لے کر روٹ نمبر 92 پر آجاؤ۔ اس سے دس منٹ کی مسافت پر ایک گاؤں آئے گا جس سے گزرنے کے بعد کھیت ہیں۔ ان کھیتوں میں

WWW.JBDPRESS.COM

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

آخری معرکہ 300/-
اندھیری رات کے مسافر 225/-
قیصر و کسریٰ 300/-
پاکستان سے دیار حرم تک 125/-
گمشدہ قافلے 300/-
داستان مجاہد 200/-
پردیسی درخت 275/-
قافلہ حجاز 300/-
خاک اور خون 300/-
معظم علی 275/-
سفید جزیرہ 150/-
کلیسا اور آگ 225/-
پورس کے ہاتھی 125/-
محمد بن قاسم 225/-
ثقافت کی تلاش 100/-
آخری چٹان 275/-
اور تلوار ٹوٹ گئی 300/-
شاہین 275/-
سو سال بعد 125/-
انسان اور دیوتا 225/-
یوسف بن تاشفین 225/-

جہانگیر بکس • لاہور 042-7220879 • راولپنڈی 051-5539609 • ملتان 061-4781781 • فیصل آباد 041-2627568 • حیدر آباد 0300-3012131 • کراچی 021-2765086

وہ تھیلا پھینک کر واپس چلے جانا۔ بعد میں تمہیں تمہارا بیٹا مل جائے گا۔ میں فون کر کے بتادوں گا کہ وہ کہاں ہے۔"

"مگر وہ..." مسٹر گرین نے کچھ کہنا چاہا تو گارون نے غراتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔

"اگر تم نے پولیس کے پاس جانے کی حماقت کی یا مطلوبہ رقم مقررہ وقت تک اس مقام پر نہیں پہنچائی تو تمہارا بیٹا ٹکڑوں کی صورت میں تم تک پہنچا دیا جائے گا۔"

تھوڑا رکنے کے بعد گارون نے پھر کہا۔ "میں کس مزاج کا آدمی ہوں اس کا اندازہ لگانے کے لیے اپنے جھیل والے ہٹ پر جاکر خود دیکھ لو۔ وہاں تمہیں جوگی کورنس مس ہیلن کی لاش مل جائے گی۔ میں اپنے راستے کے کانٹے اسی طرح صاف کیا کرتا ہوں مگر خیال رہے کہ اس کے قتل کے بارے میں پولیس کو تم کل صبح دس بجے کے بعد بتاؤ گے، اس سے پہلے نہیں۔"

"وہ... میں... میں..." گرین ہکلانے لگا تھا۔

"اب میں مزید کوئی کال نہیں کروں گا۔ تمہارے پاس دوسرا موقع نہیں ہے۔ اگر میری ہدایات پر عمل نہیں ہوا تو جس طرح میں نے ہیلن کو ختم کیا ہے اسی طرح جوئی کو بھی کردوں گا۔ میں باتوں پر نہیں، عمل پر یقین رکھتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے گارون نے سلسلہ منقطع کردیا اور فون بوتھ سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

گارون نے اپنی گاڑی درختوں کی آڑ میں پارک کی۔ اس کی نظریں سامنے سے آنے والی سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔ دس منٹ کے انتظار کے بعد اسے ایک تیز رفتار کار آتی نظر آئی تو اس نے اپنی کرائے کی گرے سیڈان کا انجن اسٹارٹ کر دیا۔ آنے والی کیڈی کی ڈرائیونگ سیٹ پر گرین بیٹھا تھا۔ تھیڈا نے اسے گرین کا جو حلیہ بتایا تھا اسے دیکھتے ہی گارون اسے پہچان گیا تھا۔ وہ بے حد نروس ہو رہا تھا۔ اس کے سفید بال ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے۔ گارون نے اسے شناخت کے لیے یہ ہدایت دی تھی کہ وہ اس سنگِ میل کے پاس رک کر اپنی کار سے اترے گا اور اس کے ٹائر کا معائنہ کرے گا تاکہ وہ سمجھ جائے کہ اس کا مطلوبہ آدمی آگیا ہے۔ حسبِ ہدایت گرین نے ایسے ہی ٹائر کو دیکھا پھر دوبارہ کار میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کردیا۔

اب اس کی کیڈی ان کھیتوں کی طرف بڑھ رہی تھی جو گاؤں کے دونوں طرف تھے اور جن میں اسے رقم کا تھیلا پھینکنے کا حکم ملا تھا۔ گارون کی کار اس کے تعاقب میں تھی۔ وہ ایک خاص فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے جا رہا تھا تاکہ گرین کو اس پر شبہ نہ ہو۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور دل دس لاکھ ڈالرز ملنے کے خیال سے خوش ہو رہا تھا۔ کچھ دور جانے کے بعد آگے جانے والی کار ایک کھیت کے قریب رک گئی۔ اس میں سے گرین اترا۔ اس نے حسبِ ہدایت رقم کا تھیلا کھیت میں پھینکا اور فوراً واپس ہوگیا۔ اس دوران گارون آس پاس کا جائزہ لیتا رہا۔ اسے یقین ہوگیا تھا کہ گرین نے پولیس کو اطلاع نہیں دی ہے کیونکہ دور دور تک نہ کوئی کار نظر آرہی تھی اور نہ کوئی انسان۔

گارون کار روک کر محتاط قدموں سے آگے بڑھا۔ اس نے کھیت میں پڑا ہوا تھیلا اٹھایا اور فوراً کار میں آن بیٹھا۔ کار میں بیٹھ کر اس نے تھیلے میں سے نوٹوں کا بنڈل نکالا اور تھیلے کو باہر پھینک دیا۔ پھر اس نے اس پیکٹ کو چوما اور اپنے برابر والی سیٹ پر ڈال دیا۔ اب اس کی کار دوسری کاروں کے ساتھ ٹریفک کے ہجوم میں شامل ہو چکی تھی۔ آخر وہ اس کرائے کی کاٹیج پر پہنچا مگر اس نے اپنی کار اس سے کچھ فاصلے پر روک لی۔ اس نے پچھلی سیٹ اٹھائی اور رقم کا پیکٹ کھول کر اس میں ساری رقم نکالی اور سیٹ کے نچلے حصے پر پھیلا دی۔ پھر اس نے سیٹ پہلے کی طرح کر دی۔ اب وہ مطمئن تھا اور ذہن میں کچھ بچا رہا تھا۔

اب اسے ایک اہم کام کرنا تھا۔ اسے اس شہر سے غائب ہونا تھا... صبح دس بجے سے پہلے... اس کا منصوبہ وہ پہلے سے ہی بنا چکا تھا۔ نہ اسے تھیڈا سے کوئی ہمدردی تھی اور نہ اس بچے جوئی سے... اسے صرف رقم سے غرض تھی جو اسے مل چکی تھی۔ وہ ایک آزاد پنچھی تھا... کبھی کسی کا ہو کے نہیں رہا تھا۔ تھیڈا کے پاس وہ اپنے مطلب سے ہی آیا تھا۔ ورنہ اس کے لیے اب اس عورت میں کوئی کشش باقی نہیں رہ گئی تھی۔ بوڑھی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ سنکی بھی ہوتی جا رہی تھی۔ اسی لیے وہ گارون کو زہر لگنے لگی تھی۔

گارون نے کاٹیج کے پاس پہنچ کر کار روک لی۔ کار کی آواز سنتے ہی تھیڈا بے قراری کے عالم میں باہر آگئی۔ اس نے آتے ہی دونوں ہاتھوں سے گارون کا بازو تھام لیا۔

"گارون! کام ہوگیا؟ رقم مل گئی؟ کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟" اس نے ایک ہی سانس میں کئی سوال ایک ساتھ کر ڈالے۔

"ہاں۔" گارون نے سرد مہری سے کہا۔ "وہ بچہ کیا کر رہا ہے؟ سو رہا ہے یا جاگ رہا ہے؟"

"سو گیا ہے۔ روتے روتے تھک گیا تھا۔" تھیڈا نے کہا۔ "میں نے اسے اطمینان دلایا تھا کہ جب وہ سو کر اٹھے گا تو اس کے ڈیڈی اسے لینے آجائیں گے۔"

☆☆☆

گارون بے پروائی سے کاٹیج میں داخل ہوا۔ تھیڈا اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ اس کی آنکھوں میں تشویش تھی۔

"کیا جوئی اندر والے کمرے میں ہے؟" گارون نے پوچھا۔

"ہاں... مگر اسے سونے دو میں نے اسے بڑی مشکل سے سلایا ہے۔" تھیڈا نے عاجزی سے کہا۔

گارون نے آہستگی سے دروازہ کھولا۔ سامنے لوہے کا پلنگ بچھا ہوا تھا جس پر ایک گندے سے گدے پر جوئی سو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بڑی معصومیت تھی۔ وہ ننھا فرشتہ لگ رہا تھا۔

"دیکھو گارون! اسے مت جگانا۔ وہ پہلے ہی بے حد خوف زدہ ہے۔" تھیڈا نے گارون کی خوشامد کی۔

"میں اسے دیکھنے آیا ہوں اور بس..." گارون نے سرد لہجے میں کہا مگر تھیڈا کا دل نہیں مانا۔

گارون آگے بڑھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا ہاتھ قمیص کے اندر گیا جہاں اس کا پستول تھا۔ یہ دیکھتے ہی تھیڈا اچھل کر اس کے سامنے آگئی اور زور سے بولی۔ "نہیں نہیں تم یہ نہیں کر سکتے۔ تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ..."

"پیچھے ہٹ جاؤ احمق عورت!" گارون نے سخت لہجے میں کہا۔ "وہ مجھے دیکھ چکا ہے اور پولیس کو میرا حلیہ بتا دے گا۔ میں ایسے گواہ کو زندہ نہیں چھوڑ سکتا جو بعد میں میرے لیے پھانسی کا پھندا بن جائے۔ ہٹ جاؤ میرے راستے سے۔"

"ایک منٹ رکو... میری بات سنو۔" تھیڈا نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ "تم اس بچے کو نہیں مار سکتے... کبھی نہیں۔"

"وہ کیسے؟" گارون نے تلخی سے پوچھا۔ "مجھے کون روکے گا؟"

"میں روکوں گی تمہیں۔" تھیڈا نے کہا۔ "میں نے ابھی تک تمہیں نہیں بتایا تھا مگر اب مجبوراً بتا رہی ہوں۔ یہ تمہارا بیٹا ہے... تمہارا اپنا... کیا تم اپنی اولاد کو مار دو گے؟"

یہ سنتے ہی گارون نے چونک کر تھیڈا کی طرف دیکھا پھر اس نے سر جھٹک کر کہا۔ "تم جھوٹ بول رہی ہو۔ اسے بچانے کے لیے تم نے یہ کہانی گھڑی ہے۔ اگر یہ میرا بیٹا تھا تو تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ مجھ سے اتنی اہم بات کیوں چھپائی؟"

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔" تھیڈا نے بے چارگی سے کہا۔ "جب تم جیل گئے تھے تو میں امید سے تھی مگر میں یہ خبر سنا کر اس وقت تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی پھر میں اس بچے کے مستقبل کے لیے بے حد فکر مند ہوگئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میں تم سے زندگی میں اب کبھی نہیں مل سکوں گی اسی لیے میں نے محنت مزدوری کی اور اس بچے کو جنم دیا۔" یہ کہہ کر تھیڈا ہانپنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے مگر گارون ان آنسوؤں سے بے پروا نظر آرہا تھا۔

"تو کیا تم نے اسے جنم دے کر کسی اور کو دے دیا تھا؟" آخر گارون نے سوال کیا۔

"کیا کرتی؟ مجبوری تھی۔ میرے اپنے کھانے کے لیے ہی

"تبدیلی"

"اپنی بیوی کی وجہ سے میں کچھ مذہبی ہوگیا ہوں۔"

"وہ کیسے؟"

"شادی سے پہلے مجھے جہنم پر کچھ زیادہ یقین نہیں تھا۔"

"مجبوری"

وقار کی بھتیجی نے پچھلے دنوں اس سے کہا۔ "انکل! میں آپ کی سالگرہ پر تحفے میں دینے کے لیے رومال خریدنے گئی تھی لیکن مجھے آپ کی ناک کا سائز ہی یاد نہیں رہا۔"

"کم از کم"

ٹیم سات وکٹوں سے ہار گئی۔ کھلاڑی منہ لٹکائے ڈریسنگ روم میں واپس آرہے تھے۔ منیجر نے انہیں حوصلہ دیا۔ "اتنا افسردہ ہونے کی ضرورت نہیں... ایک چیز تو بہرحال ہم نے جیتی تھی۔"

"کیا...؟" ایک کھلاڑی نے ذرا چونک کر پوچھا۔

"ٹاس۔" منیجر نے جواب دیا۔

"بروقت"

شوہر نے دفتر سے بیگم کو گھر فون کیا۔ "بیگم! مجھے عمر شریف کے ڈرامے کے لیے دو پاس ملے ہیں۔"

"میں جانے کے لیے تیار ہونا شروع کرتی ہوں۔" بیگم نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں... فوراً تیار ہونا شروع کردو... پاس کل کے لیے ہیں۔" شوہر نے کہا۔

"مصرف"

کلاس روم میں ٹیچر نے بچوں سے پوچھا۔ "گائے کی کھال کا سب سے بڑا استعمال کیا ہے؟"

"وہ گائے کو ایک جگہ رکھتی ہے۔" ایک بچے نے جواب دیا۔

کچھ نہیں تھا۔ اس کا پیٹ کیسے بھرتی؟" تھیڈا نے کہا۔ "مجبور ہو کر میں نے اسے ایک یتیم خانے میں داخل کرا دیا۔ اتفاق سے انہی دنوں مسٹر گرین اور ان کی بیگم وہاں آ گئے۔ وہ کسی بچے کو گود لینا چاہتے تھے۔ جو انہیں پسند آ گیا۔ انہوں نے اسے گود لے لیا۔ میں خوش تھی کہ چلو اب میرا بچہ ایک لکھ پتی کے ہاں پلے گا اور اسے ماں کا پیار بھی مل جائے گا مگر مسز گرین چند ماہ بعد ہی انتقال کر گئیں تو مسٹر گرین پریشان ہو گئے۔ انہیں جو کی پرورش کے لیے کسی گورنس کی ضرورت تھی۔ لہٰذا اس موقع پر میں نے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ اس سے دو فائدے ہوئے۔ پہلا فائدہ یہ ہوا کہ مجھے اپنے بچے کے پاس رہنے کا موقع مل گیا اور اسے ایک بار پھر میری آغوش نصیب ہو گئی اور دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ مجھ بے سہارا کو بھی چھت مل گئی۔ اس طرح میں اپنے بچے کے ساتھ اس کی گورنس بن کر رہنے لگی مگر مجھے اس بات کا بے حد دکھ تھا کہ وہ مجھے کبھی ماما نہیں کہہ سکتا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ میں اس کی اصل اور حقیقی ماں ہوں۔" یہ کہہ کر تھیڈا خاموش ہو گئی۔ اس کے گالوں پر آنسوؤں کی لڑیاں بہہ رہی تھیں۔

"تم جھوٹ بول رہی ہو۔ بکواس کر رہی ہو۔" یہ کہتے ہوئے گارون نے پستول والا ہاتھ بلند کیا اور اس کا رخ جو کی طرف کر دیا۔ معصوم بچہ اس مصیبت سے بے خبر سو رہا تھا۔

☆☆☆

تھیڈا کسی شیرنی کی طرح گارون کے سامنے تنی کھڑی تھی۔ اس کا یہ روپ گارون نے پہلی بار دیکھا تھا ورنہ وہ اس کے سامنے بھیگی بلی بنی رہتی تھی۔

"تم وعدہ خلافی کر رہے ہو گارون!" تھیڈا نے کہا۔

"اور تم مسلسل جھوٹ بولے جا رہی ہو۔" گارون نے غرا کر کہا۔

"آج میں تمہیں بھی ہوں۔" تھیڈا چیخ کر بولی۔ "تم مجھ سے محبت نہیں کرتے۔ تم کسی سے بھی محبت نہیں کرتے... تم محبت کر ہی نہیں سکتے... تم ایک خود غرض اور بے رحم انسان ہو۔ سفاک... بھیڑیے ہو... اپنے ہی بچے کو مارنے کے درپے ہو۔"

"بے وقوف عورت! میں تمہیں اپنے ساتھ کہیں نہیں لے جاؤں گا۔" گارون نے کہا۔ "تم میرے مستقبل میں کہیں فٹ نہیں ہو سکتیں۔ میں تمہارے وجود کو اپنے گلے میں گھنٹی کی طرح نہیں لٹکا سکتا۔ تمہارے لیے کیا یہ کم ہے کہ میں تمہیں زندہ چھوڑ رہا ہوں۔ صرف اس لیے کہ کبھی تم میرے بہت قریب رہی ہو... ہیلن کو میں مار چکا ہوں... اب اس بچے کو بھی..." یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا ہی تھا کہ تھیڈا اس سے الجھ گئی۔ اس نے کسی شیرنی کی طرح اس کا منہ نوچ لیا۔ گارون کوشش کر رہا تھا کہ جو کو مار دے۔ اس ہنگامے میں جو کی آنکھ کھل گئی۔ کمرے کا منظر دیکھ کر وہ زور زور سے رونے لگا۔

اسی لمحے گارون نے فائر کر دیا۔ گولی تھیڈا کے لگی جس نے دونوں ہاتھوں سے پستول کو دبوچ لیا تھا مگر گولی کھا کر بھی اس نے پستول پر اپنی گرفت کمزور نہیں پڑنے دی بلکہ پوری قوت استعمال کرتے ہوئے گارون کو بستر پر گرا دیا۔ گارون غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ پھر تھیڈا نے گارون کے رخسار پر زور سے کاٹ لیا۔ گارون بلبلا گیا۔ تھیڈا کے تیز دانتوں نے اس کے رخسار کا گوشت ادھیڑ دیا تھا۔ اس کی گرفت کمزور پڑتے ہی تھیڈا اس کی گرفت سے نکلی اس نے پستول پہلے ہی چھین لیا تھا۔ پھر اس نے وقت ضائع کیے بغیر پستول کا رخ گارون کی طرف کیا اور ٹریگر دبا دیا۔ گارون کی آنکھوں میں شدید حیرت تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ تھیڈا نے اسے گولی مار دی ہے۔

پھر تھیڈا نے اپنے خون آلود بیٹے کو تھاما اور جو سے کہا۔

"جلدی... کرو۔"

جو بری طرح خوف زدہ تھا اور مسلسل روئے جا رہا تھا۔

"میرے ڈیڈی کہاں ہیں؟ میں اپنے گھر جاؤں گا۔"

[illegible] جو سے تھیڈا نے کہا۔

"وہ... اس... بس... سڑک... کے... کونے... پ... کھڑے... ہوں... گے... وہاں چلے... جاؤ... راستے میں جو بھی... ملے... اسے سب... کچھ... بتا دینا... جاؤ... شاباش..." یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا سر ایک طرف ڈال دیا... جو تھوڑی دیر تک کھڑا کچھ سوچتا رہا۔ پھر اس نے تھیڈا اور گارون کی لاشوں کی طرف دیکھا اور زور زور سے چیخنے لگا۔ معصوم بچہ تھا۔ وہ اس دہشت ناک منظر سے اتنا خوف زدہ ہو گیا تھا کہ اس سے بھاگا بھی نہیں جا رہا تھا۔ چند لمحوں بعد اس نے ایک بار پھر ان دونوں کی طرف دیکھا جو کل ہی تو اس سے ملنے آئے تھے... اس انکل نے اس کی مس ہیلن کو بھی مار دیا تھا اور اب... اس کی آنٹی کو بھی... وہ بہت گندہ آدمی تھا۔ اچھا ہوا کہ اس کا اتنا سارا خون نکل آیا۔ وہ اپنے ڈیڈی سے اس کی شکایت کر کے اس کی خوب پٹائی کرائے گا... گندہ آدمی...

پھر جو کاٹیج سے نکلا اور ادھر ادھر دیکھتا ہوا ہائی وے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

پہلا رنگ

گم گشتہ لمحے

غوثیہ شبیر

پیار اور تعلق کی مہک کبھی پرانی نہیں ہوتی ...کبھی کسی شخص سے تعلق پہلی نظر میں قائم ہو جاتا ہے۔ اس تعلق کے بننے اور اظہار میں بہت وقت لگ جاتا ہے ...بعض اوقات برسوں ساتھ رہنے کے باوجود بھی کوئی تعلق نہیں بن پاتا ...دو افراد مجبوری کی زنجیر میں بندھے ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں ...مگر ان کے احساسات اور سوچ کے دھارے ایک سے نہیں ہوتے ...دو بہنوں کے تعلق و محبت کو اجاگر کرتی ایک پُر فسوں داستان

جھوٹ اور سچ... یقین وگمان کے درمیان گھومتی کہانی کا آغاز اور انجام

گلاس وال کے اس پار نظر آتی صوفے پر میری نظریں جمی ہوئی تھیں۔ ٹینس ریکٹ بائیں ہاتھ میں پکڑے وہ اچھل اچھل کر بہت مہارت سے اسٹروکس لگا رہی تھی۔ اس کا قد چھوٹا اور رنگت گوری تھی۔ اس کا قدرتی طور پر بے حد چھیلا

جسم کھیل میں اس کی معاونت کر رہا تھا اور اس کے مقابل موجود شکیل کو اسے ریٹرنز دینے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ شکیل ایک دراز قامت اور وجیہہ لڑکا تھا۔ اس سے ملنے جلنے والے یقیناً اسے پسند کرتے ہوں گے جیسا کہ صوفیہ اسے پسند کرنے لگی تھی اور یہ پسندیدگی اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ وہ ہمارے اور اس کے درمیان موجود کلاس ڈفرنس کو بھول کر بہت باقاعدگی سے اسے گھر پر بلانے لگی تھی۔ شکیل کو اس کے ساتھ اپنے گھر میں دیکھ کر مجھے شدید ناگواری کا احساس ہوتا تھا۔ اب بھی میں اسی احساس کے ساتھ ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ کھیل میں اس قدر مگن تھے کہ انہیں اپنے دیکھے جانے کا بھی احساس نہیں تھا۔

"صوفیہ کی اس لڑکے سے کچھ ضرورت سے زیادہ دوستی نہیں ہو گئی ہے؟" میری توجہ ہنوز شکیل اور صوفیہ کی طرف تھی کہ اپنے قریب ابھرنے والی آہٹ کی آواز پر میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ ہمارا یعنی میرا اور صوفیہ کا چچا زاد بھائی ارسلان تھا جس نے مجھے متوجہ ہوتے دیکھ کر یہ تبصرہ کیا تھا۔

"میں خود بھی یہ بات محسوس کر رہی ہوں۔" ارسلان کے ہاتھ میں موجود چائے کا کپ لیتے ہوئے میں نے اس میں سے ایک گھونٹ لیا اور کپ واپس اسے تھما دیا۔ وہ میرا ہم عمر تھا اور ہم دونوں کے درمیان بے حد بے تکلفی اور دوستی تھی۔ ممی کے انتقال کے بعد وہی تھا جس نے بزنس سنبھالنے میں میری قدم قدم پر راہنمائی کی تھی۔ اگر وہ نہ ہوتا تو یقیناً مجھے اس کام میں بہت دشواری پیش آتی۔

"شکیل ہینڈسم لڑکا ہے اور صوفیہ ابھی زیادہ سمجھدار نہیں ہوئی ہے اس لیے اپنے اور اس کے درمیان ڈفرنس کو دیکھے بغیر اس سے انسپائر ہو گئی ہے۔ تمہیں چاہیے کہ تم اسے سمجھاؤ ورنہ یہ شاطر مڈل کلاس لڑکا اسے قابو میں کر لے گا۔"

"مجھے تو لگتا ہے کہ وہ صوفیہ کو اپنے قابو میں کر چکا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو صوفیہ اتنی بے تکلفی سے اسے گھر آنے کی اجازت نہیں دیتی۔" ارسلان کے مشورے پر میں نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

"ہو سکتا ہے بات ابھی صرف فرینڈشپ تک ہی ہو اور تم صوفیہ کو سمجھاؤ تو وہ اپنے قدم پیچھے ہٹا لے۔ صوفیہ نادان ہے لیکن بڑی بہن کی حیثیت سے تمہارا فرض بنتا ہے کہ تم اسے صحیح اور غلط کے درمیان فرق کو سمجھاؤ۔ تمہاری خاموشی اسے تباہ بھی کر سکتی ہے۔" ارسلان کے ان الفاظ نے مجھے سخت تشویش میں مبتلا کر دیا۔ میں صوفیہ سے بہت محبت کرتی تھی۔ میرے اور اس کے درمیان عمروں میں پانچ سال کا فرق تھا۔

ایک تو پانچ سال کے اس فرق کی وجہ سے ہی میں قدرتی طور پر خود کو صوفیہ کا بزرگ سمجھتی تھی، دوسرے ممی پاپا کے انتقال کے بعد بڑی بہن کی حیثیت سے اس کی سرپرستی کی ذمے داری بھی مجھ پر عائد ہوتی تھی۔ اب جو ارسلان نے کھل کر صوفیہ اور شکیل کے تعلق کے بارے میں خدشات کا اظہار کیا تو میرے اندر اس تعلق کے لیے پیدا ہونے والی ناگواری تشویش میں ڈھل گئی۔

"میں صوفیہ سے بات کروں گی لیکن اگر اس نے میری بات نہ مانی تو کیا ہو گا؟ اس عمر میں لڑکیاں ویسے ہی زیادہ جذباتی ہوتی ہیں اور تم سمجھ سکتے ہو کہ میں صوفیہ پر زیادہ زور نہیں ڈال سکتی۔ ممی پاپا میں سے کوئی زندہ ہوتا تو الگ بات تھی۔ وہ لوگ اسے زبردستی بھی روک سکتے تھے لیکن میری بات کو وہ بس ایک حد تک ہی اہمیت دے سکتی ہے۔" میں نے ارسلان سے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔

"بہرحال، بات تو تمہیں کرنی ہی ہو گی۔ تم صوفیہ سے بات کر کے دیکھو، میں بھی اپنے طور پر اسے سمجھانے کی کوشش کروں گا۔" ارسلان کا یہ جملہ میرے لیے بہت تسلی آمیز تھا۔ ارسلان اس سے قبل بھی میرے لیے بہت کارآمد ثابت ہوتا رہا تھا۔ اس معاملے میں اس نے میری معاونت کا وعدہ کیا تو مجھے یقین ہونے لگا کہ میں اس معاملے سے بخیر و خوبی نمٹ لوں گی۔

☆☆☆

"تمہاری اور شکیل کی دوستی کچھ زیادہ نہیں بڑھ گئی ہے؟ آج کل وہ تقریباً روزانہ ہی تم سے ملنے آنے لگا ہے۔" ارسلان کے مشورے پر میں نے اسی دن، رات کے کھانے پر صوفیہ سے شکیل والا معاملہ ڈسکس کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے اس کا ذکر چھیڑ دیا۔ ہمیں بات کرنے کا موقع فراہم کرنے کے لیے ارسلان آج کھانے پر نہیں رکا تھا اور جلدی واپس چلا گیا تھا۔ شکیل اس سے بھی پہلے جا چکا تھا۔ ایک آدھ بار کے سوا وہ بھی کھانے کے وقت تک نہیں رکا تھا۔

"شکیل بڑا دلچسپ شخص ہے آپی! میں اس کی کمپنی کو انجوائے کرتی ہوں اسی لیے اصرار کر کے اسے یہاں بلا لیتی ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے بے پروا انداز میں میری بات کا جواب دیا۔

"مجھے تمہاری اور اس کی دوستی کی تک سمجھ نہیں آتی۔ تمہارا ابھی گریجویشن کا پہلا سال چل رہا ہے اور وہ ماسٹر کرنے کے بعد یونیورسٹی چھوڑ چکا ہے۔ تمہارے اور اس کے بیک گراؤنڈز بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں ورنہ میں سوچتی کہ

تم پڑھائی میں اس سے ہیلپ لیتی ہو اس لیے یہ دوستی پالی ہے۔" سرسری لہجے میں کہتے ہوئے میں نے ایک کباب اپنی پلیٹ میں ڈالا اور صوفیہ کے چہرے کا جائزہ لیا۔ وہ کچھ الجھی ہوئی نظر آنے لگی تھی۔ یقیناً شکیل کے بارے میں میری اتنی تفتیش اسے تشویش میں مبتلا کر رہی تھی۔

"میں نے شاید آپ کو بتایا تو تھا کہ میری اور شکیل کی دوستی بالکل اتفاقی ہے۔ ایک دن جب میں یونیورسٹی سے واپس آ رہی تھی تو میری گاڑی بند ہو گئی تھی۔ اس دن موسم بھی بہت خراب تھا۔ ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی اور اندازہ ہو رہا تھا کہ جلد بارش تیز ہو جائے گی۔ اس وقت شکیل نے خود میرے پاس آ کر مجھے مدد کی پیشکش کی اور پانچ منٹ میں میری بند گاڑی اسٹارٹ کر دی۔"

"ظاہر ہے، ایک موٹر مکینک کے بیٹے کے لیے یہ کون سا مشکل کام تھا۔" اپنی اور شکیل کی دوستی کی وجہ بیان کرنے کے لیے صوفیہ جو واقعہ سنا رہی تھی میں اس سے اچھی طرح واقف تھی، اس لیے اس کی بات کاٹتے ہوئے طنز سے بولی۔

"آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں آپی... میں کچھ نہیں سمجھ پا رہی۔" میرے اس انداز پر بری طرح الجھتے ہوئے اس نے مجھ سے سوال کر ڈالا۔

"میں تمہیں، تمہارے اور شکیل کے درمیان موجود ڈفرنس بتا رہی ہوں۔ ٹھیک ہے، شکیل نے ایک بار مشکل وقت میں تمہاری مدد کی تھی لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ تم اسے اپنا ہم پلہ ہی بنا لو۔ دوستی ہمیشہ اپنے برابر کے لوگوں سے کرنی چاہیے۔ شکیل ایسا شخص نہیں ہے کہ تم ایک دوست کی حیثیت سے اسے اپنے سرکل میں شامل کر سکو۔" اس بار میں نے زیادہ صاف لفظوں میں اپنا مطلب اس پر واضح کیا۔

"اور اگر میں کہوں کہ شکیل میرے لیے ایک دوست سے بڑھ کر حیثیت رکھتا ہے تو...؟" اپنے ہاتھوں میں موجود چمچ اور کانٹا پلیٹ میں رکھتے ہوئے اس نے کچھ باغیانہ نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تو میں کہوں گی کہ یہ تمہاری حماقت ہے اور تمہیں اس حماقت کو یہیں ختم کر دینا چاہیے۔" میں نے سرد لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا۔

"لیکن میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ میں نے شکیل کو اپنا لائف پارٹنر بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" میرے خدشے کے مطابق صوفیہ نے میری بات کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی اور باغیانہ روش اختیار کرتے ہوئے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

"یہ تمہارا اکیلے کا فیصلہ ہے یا شکیل بھی اس میں شامل ہے؟"

"لازمی بات ہے، شکیل بھی اس میں شامل ہے۔ میں اکیلی تو یہ فیصلہ نہیں کر سکتی۔" میرے طنز سے پوچھے گئے سوال کا اس نے بے حد اطمینان سے جواب دیا اور دوبارہ سے کھانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ خود میری اپنی بھوک بالکل اڑ چکی تھی اور غصے سے برا حال ہو رہا تھا۔ غصے کی اسی کیفیت میں، میں تیز لہجے میں بولی۔

"مجھے معلوم ہے کہ یہ سب شکیل کی ہی پلاننگ ہو گی۔ وہ اپنی مڈل کلاس سے نکلنے کے لیے تمہیں سیڑھی بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اپنی ماسٹرز کی ڈگری اور پرائیویٹ فرم کی جاب کے سہارے تو وہ آئندہ بیس سال میں بھی اپنا اسٹیٹس نہیں بدل سکتا اس لیے اس نے یہ شارٹ کٹ سوچا ہے۔" میں نے صوفیہ کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کیا جس پر اس کے چہرے پر غصے کی سرخی سی دوڑ گئی اور وہ تیز لہجے میں بولی۔

"آپ کو شکیل پر ایسا کوئی الزام لگانے کا حق نہیں ہے آپی! وہ ایک شریف اور غیرت مند آدمی ہے۔ اسے دولت کا کوئی لالچ نہیں، وہ صرف اور صرف مجھ سے محبت کرتا ہے۔"

عطاء الحق قاسمی کی تصنیف وصیت نامے سے انتخاب

پیر صاحب تھوڑا شریف کا وصیت نامہ

پیارے بیٹے، ایک بات ہمیشہ یاد رکھو اور وہ یہ کہ ہم صرف پیر نہیں بلکہ روحانی اور دنیاوی طاقت کے سارے سرچشمے ہمارے قبضے میں ہیں یعنی ہم پیر بھی ہیں، سیاست داں بھی ہیں، حکمران بھی ہیں، اس کے علاوہ جاگیریں انگریز کے وقت سے ہمیں ملی ہوئی ہیں۔ یوں اللہ کا دیا سب کچھ ہمارے پاس ہے، بینک بیلنس ہے، ڈھور ڈنگر ہیں، مرید ہیں۔ ان سب نعمتوں کی قدر کرو خصوصاً مریدوں کا خاص خیال رکھو کہ ہماری ساری شان و شوکت ان کے دم سے ہے۔ اگر وہ تمہارے ہاتھ چومنا چاہیں تو کسی بخل سے کام نہ لو۔ اگر تم اس وقت دوستوں سے مصروف گفتگو ہو تو بھی انہیں مایوس نہ کرو بلکہ اپنا بایاں ہاتھ ان کی طرف بڑھا دو، وہ ہاتھ چومتے رہیں! تم باتیں کرتے رہو۔ ایسے مواقع پر تم انہیں لائن بنانے کے لیے کہو، وہ لائن میں آئیں اور ایک ایک کر کے ہاتھ چومتے جائیں۔ ان کے جانے کے بعد جیب سے ٹشو پیپر نکال کر ہاتھ کو اچھی طرح صاف کر لیا کرو اور گھر پہنچتے ہی ڈیٹول سے ہاتھ دھونا بھی نہ بھولو۔ مریدوں کا اظہار عقیدت اپنی جگہ اور حفظانِ صحت کے اصول اپنی جگہ، دونوں کو کبھی گڈمڈ نہ کرو!

www.pkdigest.com

''اور اگر میں یہ ثابت کر دوں کہ تمہارا خیال غلط ہے تو...؟'' میں نے چیلنج کرنے والے انداز میں اس سے پوچھا۔

''مجھے یقین ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ مجھے شکیل پر مکمل بھروسا ہے۔'' وہ بہت پُراعتماد تھی۔

''ٹھیک ہے، میں کل ہی تمہارے اس بھروسے کو آزما لوں گی۔ تم کل شام شکیل کو مجھ سے ملاقات کے لیے بلواؤ۔ میں اس سے تمہارے سامنے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔'' میں نے دوٹوک الفاظ میں صوفیہ کو حکم دیا اور اپنی کرسی چھوڑ کر ڈائننگ ٹیبل سے اٹھ گئی۔ صوفیہ کے ردِعمل کے بارے میں پہلے سے اندازہ ہونے کے باوجود مجھے اس کے رویے نے دکھ پہنچایا تھا اور میں ٹھیک طرح سے کھانا نہیں کھا سکی تھی۔

☆☆☆

''شکیل آ گیا ہے آپی... اور ڈرائنگ روم میں آپ کا ویٹ کر رہا ہے۔'' میں آفس سے آنے کے بعد فریش ہو کر آئینے کے سامنے کھڑی اپنے بال بنا رہی تھی جب صوفیہ نے میرے کمرے کے دروازے پر دستک دینے کے بعد دروازہ ذرا سا کھول کر اندر جھانکتے ہوئے یہ اطلاع دی۔

''اوکے! میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔'' دروازے کی طرف سر گھما کر دیکھنے کے بجائے میں نے آئینے میں نظر آتے اس کے عکس پر نظر ڈال کر جواب دیا۔ وہ فوراً واپس پلٹ گئی۔ اس کا رویہ اور انداز بالکل معمول کے مطابق تھا۔ یوں لگتا تھا کہ شکیل کے سامنے اس کے لیے میری کوئی اہمیت ہی نہ ہو جبکہ میرا معاملہ بالکل الٹ تھا۔ مجھے اس کی بے حد فکر تھی اور یہ اس کی محبت ہی تھی جس سے مجبور ہو کر میں شکیل سے ایک اہم موضوع پر بات کرنے کے لیے راضی ہوئی تھی۔ آج کی اس ملاقات کے لیے مجھے اپنی ایک اہم میٹنگ ملتوی کروا کر جلدی گھر واپس آنا پڑا تھا۔ یوں تو میں نے ممی کی زندگی میں ہی فیکٹری کے معاملات میں دلچسپی لینی شروع کر دی تھی لیکن ان کے انتقال کے بعد مجھے بہت زیادہ محنت اور ذمے داری سے کام کرنا پڑتا تھا اور اسی لیے اکثر اوقات مجھے گھر واپس آنے میں دیر ہو جاتی تھی۔ صوفیہ کی تعلیم ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی اس لیے میں نے اس کے شانوں پر کوئی ذمے داری نہیں ڈالی تھی اور خود ہی سارے مسائل سے نمٹتی رہتی تھی۔ اپنے اتنے پُرشفقت رویے کے جواب میں اس کا آج کا انداز مجھے دکھی کر گیا تھا۔ دکھ کی اس کیفیت میں گھرے میں نے ڈریسنگ ٹیبل پر ہی پڑا اپنا موبائل اٹھایا اور ارسلان کا نمبر ڈائل کیا۔

''کہاں ہو ارسلان... ابھی تک پہنچے نہیں؟'' دوسری طرف سے اس کی ''ہیلو'' سنائی دیتے ہی میں نے اس سے پوچھا۔

''میں بس پہنچنے والا ہوں۔ ٹریفک میں پھنسنے کی وجہ سے کچھ لیٹ ہو گیا ہوں۔'' اس نے اپنی تاخیر کا سبب بتایا اور پوچھا۔ ''کیا شکیل پہنچ گیا ہے؟''

''ہاں، ابھی صوفیہ نے مجھے اس کے آنے کی اطلاع دی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم بھی یہاں پہنچ جاؤ، تب ہی میں اس سے ملاقات کروں۔ مجھے صوفیہ کے ری ایکشن کی طرف سے فکر ہے اس لیے میں چاہتی ہوں کہ میں تمہارے سامنے ہی کوئی بات کروں۔ صوفیہ تم سے کافی اٹیچڈ ہے اور اس کے کسی نیگیٹو ری ایکشن کی صورت میں تم اسے سنبھال سکتے ہو۔''

''ڈونٹ وری تانیا! میں آ رہا ہوں، میں سب سنبھال لوں گا۔'' اس نے مجھے تسلی دی تو میں نے کال ڈس کنیکٹ کر کے موبائل کو ڈریسنگ ٹیبل پر ڈال دیا اور یونہی آئینے میں اپنے خدوخال کا جائزہ لینے لگی۔ بہنیں ہونے کے باوجود میں اور صوفیہ ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے۔ میرا قد اس کے مقابلے میں لمبا تھا اور میں گندمی رنگت کے ساتھ تیکھے نقوش کی مالک تھی جبکہ صوفیہ کا ناک نقشہ ذرا پھیکا تھا مگر اس کی گوری رنگت اس کمی کو چھپا لیتی تھی۔ بال البتہ ہم دونوں بہنوں کے ہی گھنیرے سیاہ اور شانوں سے ذرا نیچے تک تھے۔ آئینے میں اپنا جائزہ لیتے ہوئے میں اپنے اور صوفیہ کے درمیان موازنہ کر رہی تھی۔ اس سرگرمی کے دوران مجھے احساس ہی نہیں ہوا اور میں نے تیز سرخ رنگ کی لپ اسٹک نکال کر اپنے ہونٹوں پر لگا لی۔ میں شروع ہی سے ہر شے میں ہلکے رنگوں کا استعمال کرنا پسند کرتی تھی۔ فیکٹری کے معاملات سنبھالنے کے بعد میری یہ عادت مزید پختہ ہو گئی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ لوگ مجھے ایک کم عمر اور ناتجربہ کار لڑکی سمجھ کر مجھے دھوکا دینے کی کوشش کریں چنانچہ دانستہ ایسے حلیے میں رہتی تھی جس کے باعث میں اپنی عمر سے کچھ بڑی دکھائی دے سکوں۔ سرخ رنگ کی لپ اسٹک کے استعمال سے مجھے ایک دم ہی اپنی شخصیت بہت بدلی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے ٹشو بکس میں سے ایک ٹشو پیپر نکالا کہ لپ اسٹک کو ہونٹوں سے صاف کر سکوں کہ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور ارسلان اندر چلا آیا۔

''چلو بھئی تانیا! چل کر شکیل صاحب سے نمٹ لیں۔ یہ معاملہ جتنی جلدی ختم ہو جائے اتنا اچھا ہے۔ میں تمہیں اس

طرح مسلسل پریشانی میں گھرا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔'' کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے بولنا شروع کر دیا اور میرا ہاتھ تھام کر مجھے کمرے سے باہر لے گیا۔ میرے پاس کوئی موقع نہیں تھا کہ میں لپ اسٹک کو صاف کر سکوں۔ بالوں میں ہلکی سی نمی ہونے کے باعث میں حسبِ عادت انہیں بھی جوڑے کی شکل میں نہیں لپیٹ سکی تھی اور اب ارسلان کے ساتھ چلتے ہوئے کھلے بالوں کی لٹیں شریر ہو کر اس کے بازو سے ٹکرا رہی تھیں۔ میں اور ارسلان ساتھ ساتھ چلتے اسی کیفیت میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ سامنے ہی شکیل اور صوفیہ بیٹھے تھے۔ میں نے ایک ہی نظر میں دونوں کے بدلتے ہوئے تاثرات محسوس کر لیے۔ شکیل کی آنکھیں صرف مجھ پر مرکوز تھیں اور میں نے واضح طور پر ان آنکھوں میں چمک محسوس کی تھی جبکہ اس کے مقابلے میں صوفیہ کے ماتھے پر ناگواری کے باعث ہلکے سے بل پڑ گئے تھے۔ شکیل کی آنکھوں کی چمک کی وجہ تو میری نسوانی جبلت نے مجھے فوراً سمجھا دی۔ وہ ایک مرد تھا جس نے حلیے میں آنے والی ذرا سی تبدیلی کے باعث میری شخصیت میں پیدا ہونے والی کم عمری کے تاثر کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا تھا لیکن صوفیہ جانے کیوں تھوڑی سی برہم نظر آ رہی تھی۔ شاید اسے شکیل کو اتنی دیر تک انتظار کروانا پسند نہیں آیا تھا۔ میں اور ارسلان ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو شکیل نے احتراماً اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے ہمارا استقبال کیا۔ ارسلان نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی ایک سنگل صوفے پر بیٹھ گیا۔ میں نے بھی اپنے لیے ایسے ہی ایک صوفے کا انتخاب کیا تھا۔

''تانیا نے آج کس سلسلے میں گفتگو کرنے کے لیے تمہیں زحمت دی ہے، یہ بات تو صوفیہ نے تمہیں بتا ہی دی ہوگی۔ ہو سکتا ہے اس موقع پر میری موجودگی تمہیں پسند نہ آئی ہو لیکن اس سلسلے میں، میں پہلے ہی وضاحت کر دوں کہ میں یہاں صرف تانیا کی خواہش پر آیا ہوں۔ اس کا خیال ہے کہ یہ ایک نازک موقع ہے جس پر وہ میری موجودگی کو اہم سمجھتی ہے۔ اس لیے اگر تمہیں کوئی اعتراض ہے بھی تو معذرت چاہتا ہوں کہ ان دونوں بہنوں کے ایک سچے خیرخواہ کی حیثیت سے میں تمہاری خواہش کے برخلاف یہاں موجود رہنے پر مجبور ہوں۔'' گفتگو کا آغاز ارسلان نے ایک وضاحت سے کیا۔

''مجھے آپ کی موجودگی پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' ارسلان کی وضاحت کا اس نے ایک مختصر جملے میں جواب دیا۔

''ٹھیک ہے تو پھر ہم اصل معاملے کی طرف آ جاتے ہیں۔ جہاں تک مجھے تانیا سے معلوم ہوا ہے، اس کے مطابق تم اور صوفیہ ایک دوسرے میں انٹرسٹڈ ہو اور آپس میں شادی کرنا چاہتے ہو۔ تانیا کے خیال میں یہ ایک احمقانہ فیصلہ ہے اور تمہارے اور صوفیہ کے درمیان جو کلاس ڈفرنس ہے اس کی موجودگی میں وہ اس رشتے کو قائم کرنے کے حق میں نہیں ہے...''

''میرے خیال میں یہ فیصلہ کرنے کا حق مس تانیا کے بجائے صوفیہ کو حاصل ہے کہ وہ کس سے شادی کرے۔ صوفیہ ایک عاقل و بالغ لڑکی ہے اور اپنے بارے میں فیصلہ کر سکتی ہے۔''

وہ ارسلان کی بات کاٹتے ہوئے تیزی سے بولا تو میرے ہونٹوں پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ آ گئی اور میں اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے معنی خیزی سے بولی۔ ''صوفیہ کے حقوق سے میں اچھی طرح واقف ہوں مسٹر شکیل! اس وقت میں نے اس کے کسی حق کو چیلنج کرنے کے لیے نہیں بلکہ کچھ ایسے حقائق بتانے کے لیے تمہیں یہاں بلوایا ہے جن کے جاننے کے بعد شاید تمہیں اپنے فیصلے پر نظرثانی کی ضرورت محسوس ہو۔''

''مطلب؟'' وہ تھوڑا سا الجھا۔

''مطلب بہت واضح ہے۔ تم جس دولت کے چکر میں صوفیہ سے شادی کے خواہش مند ہو، صوفیہ کو اس میں سے کچھ بھی نہیں ملے گا۔'' میں نے زیادہ لمبی تمہید باندھنے کے بجائے ڈائریکٹ بات کرنا مناسب سمجھی اور صاف صاف لفظوں میں وہ کچھ کہہ دیا جس کے بعد مجھے یقین تھا کہ شکیل کو صوفیہ میں کوئی دلچسپی نہیں رہے گی۔

''آپ شاید مجھ سے شادی ہونے کی صورت میں صوفیہ کو عاق کرنے کی دھمکی دے رہی ہیں؟'' اس نے جواباً میری نظروں سے نظریں ملاتے ہوئے سنجیدگی سے سوال کیا۔ اس سے قبل کہ میں اس کے سوال کا کوئی جواب دیتی، صوفیہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور احتجاج کرنے والے انداز میں بلند آواز میں بولی۔

''آپ ایسا کچھ نہیں کر سکتیں آپی! میں اور آپ اس جائداد پر برابری کا حق رکھتے ہیں۔ ممی اور پاپا زندہ ہوتے تو الگ بات تھی۔ وہ ایسا کوئی فیصلہ سنا سکتے تھے لیکن آپ کو ایسا کوئی فیصلہ کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ آپ ہرگز بھی مجھے میرے حق سے محروم کرنے یا عاق کرنے کی دھمکی نہیں دے سکتیں۔''

''مجھے تمہیں ایسی کوئی دھمکی دینے کی قطعی ضرورت نہیں

www.pkdigest.com

ہے... کیونکہ حقیقت میں تمہارا پراپرٹی میں کوئی حصہ ہے ہی نہیں تو میں تمہیں اس سے محروم کس طرح کر سکتی ہوں؟'' صوفیہ سے نظریں چراتے ہوئے میں نے اس کی بات کا جواب دیا تو یوں لگا جیسے وہ صدمے سے گنگ ہو کر رہ گئی ہو... مگر لمحہ بھر کے وقفے کے بعد وہ دوبارہ بولی تو اس کی آواز پہلے سے بھی زیادہ بلند تھی۔

''آپ نے یقیناً میری لاعلمی کا فائدہ اٹھا کر کوئی چال چلی ہے اور سازش کر کے ساری پراپرٹی اپنے نام لکھوالی ہے۔ او مائی گاڈ! میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ میری اپنی بڑی بہن مجھ سے اتنا بڑا دھوکا کرے گی۔ آپ نے مجھے چیٹ کیا ہے لیکن آپ اچھی طرح سمجھ لیں کہ میں اتنی آسانی سے آپ کو اپنے حق پر قبضہ نہیں کرنے دوں گی۔ میں آپ کے خلاف کورٹ میں جاؤں گی۔'' وہ اچھی خاصی جذباتی ہو رہی تھی اور زور زور سے بولتی مجھے دھمکیاں دے رہی تھی۔

''تانیا نے تمہارے ساتھ کوئی چیٹنگ نہیں کی ہے صوفیہ! میرا تمہیں مشورہ ہے کہ تم آرام سے بیٹھ جاؤ اور سکون سے تانیا کی ساری بات سنو۔'' اس بار ارسلان نے مداخلت کی تو وہ مجھے گھورتی ہوئی واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔

''میں اس وقت تم پر جو انکشافات کرنے جا رہی ہوں وہ یقیناً تمہارے لیے بہت تکلیف دہ ہوں گے۔ میری ذاتی خواہش تھی کہ تمہیں ان باتوں کی کبھی خبر نہ ہو سکے لیکن موجودہ صورتِ حال میں، میں مجبور ہو گئی ہوں کہ تمہیں سچائی سے آگاہ کر دوں۔ البتہ میں کچھ بتانے سے قبل، باوجود اس کے کہ میں ان حالات کے لیے کسی بھی طرح قصوروار نہیں ہوں، تم سے معذرت چاہتی ہوں۔'' صوفیہ کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے دھیمے لہجے میں گفتگو کا آغاز کیا لیکن میں دیکھ رہی تھی کہ میرے ان الفاظ کا اس پر کچھ بھی اثر نہیں ہوا ہے اور وہ سپاٹ سے چہرے کے ساتھ میری بات سن رہی ہے۔ میں نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا اور بولی۔ ''اس کہانی کا آغاز بہت سال پہلے اس وقت ہوا جب ممی اور پاپا جوان تھے اور ایک ساتھ ایک ہی یونیورسٹی میں پڑھا کرتے تھے۔ ممی اور پاپا کی حیثیتوں میں بہت نمایاں فرق تھا۔ پاپا ایک مڈل کلاس فیملی سے تعلق رکھتے تھے جبکہ ممی نانا کی پراپرٹی کی اکلوتی وارث تھیں۔ اس کلاس ڈفرینس کے باوجود ان دونوں میں محبت کا رشتہ قائم ہو گیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے۔ کم از کم ممی کو اس وقت یہی گمان تھا کہ یہ پسندیدگی اور محبت کا جذبہ دو طرفہ ہے۔ انہوں نے پاپا سے شادی کے لیے نانا پر زور ڈالنا شروع کر دیا۔ نانا نے بھی اس وقت اس بے جوڑ رشتے کی اسی طرح مخالفت کی جس طرح آج میں کر رہی ہوں لیکن ممی اکلوتی ہونے کی وجہ سے بے حد ضدی تھیں اور انہیں نانا سے اپنا ہر مطالبہ منوانا آتا تھا۔ شادی کے معاملے میں بھی نانا زیادہ عرصے اپنی مخالفت جاری نہیں رکھ سکے اور اپنی رضامندی دینے پر مجبور ہو گئے۔ ویسے بھی اس عرصے میں وہ اتنی معلومات تو حاصل کر ہی چکے تھے کہ پاپا میں کوئی اخلاقی خرابی موجود نہیں اور وہ ایک ذہین شخص ہیں۔ ممی سے شادی کے بعد پاپا نے اپنی ذہانت کو ثابت بھی کیا۔ انہوں نے نہ صرف کچھ عرصے میں سارا بزنس سنبھال لیا بلکہ اسے ترقی بھی دی۔ بزنس کو ترقی دینے کے اسی عمل میں وہ جاپان تک جا پہنچے۔ پھر ان کا اکثر بزنس کے سلسلے میں جاپان آنا جانا لگا رہنے لگا۔ نانا ان کی کارکردگی پر بہت خوش اور مطمئن تھے اور شاید جب ایک جان لیوا ہارٹ اٹیک کے نتیجے میں وہ اس جہان سے گزرے تو بھی اپنے دل میں یہ گہرا اطمینان ساتھ لے کر گئے تھے کہ ان کی بیٹی ایک خوش گوار زندگی گزار رہی ہے۔ ممی خود بھی مطمئن تھیں۔ محبت کی شادی، خوش حالی، خیال رکھنے والا شوہر اور اولاد سب کچھ تو انہیں میسر تھا۔ شادی کے دس سال گزرنے تک وہ یہ اطمینان بھری زندگی گزارتی رہیں لیکن گیارہویں سال کے آغاز پر انہیں ایک شدید صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔'' یہاں تک بولنے کے بعد میں ذرا سا سانس لینے کے لیے رکی اور سب چہروں کا جائزہ لیا تو شکیل اور صوفیہ کے چہروں پر مجھے شدید تجسس دکھائی دیا، البتہ ارسلان بالکل ریلیکس بیٹھا تھا۔ وہ اس ساری کہانی سے واقف تھا اور اس کے لیے کوئی بھی بات انکشاف کا درجہ نہیں رکھتی تھی۔ میں نے ایک بار پھر اپنی گفتگو کا ٹوٹا ہوا سلسلہ جوڑ کر بولنا شروع کر دیا۔ ''ممی کو پہنچنے والے صدمے کا تعلق جاپان کی سرزمین سے جڑا ہوا تھا۔ اپنے جاپان کے مسلسل دوروں میں پاپا نہ جانے کب ایک جاپانی لڑکی کے اسیر ہو گئے تھے اور انہوں نے وہیں اس سے چوری چھپے شادی بھی کر لی تھی۔ بزنس کے بہانے وہ آئے دن جاپان جاتے رہتے تھے لیکن پھر اچانک ہی ان پر انکشاف ہوا کہ ان کی جاپانی بیوی ان سے بے وفائی کی مرتکب ہو رہی ہے۔ قدرتی طور پر انہیں اس بات سے شاک لگا اور وہ اپنی جاپانی بیوی کو طلاق دینے کے بعد اس سے اپنی بچی لے کر پاکستان آ گئے۔ وہ عورت شاید خود بھی کسی جھنجٹ میں پڑنا نہیں چاہتی تھی اس لیے اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور اس طرح پاپا اپنی جاپانی بیوی کی یادگار یعنی تمہیں لے کر ممی کے پاس پہنچ گئے۔'' میں نے یہ جملہ صوفیہ کی طرف دیکھتے ہوئے

کہا تھا جسے سن کر وہ اچھل پڑی اور اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے چیخ کر بولی۔ ''آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔''

''اگر تمہیں لگتا ہے کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں تو آئینے سے جا کر پوچھ لو۔ آئینہ خود اس بات کی گواہی دے دے گا کہ تمہارے نقوش میں جھلکنے والے اس جاپانی پن کے پیچھے کون سا سچ چھپا ہے۔'' گمبھیر لہجے میں کہے ہوئے میرے اس جملے نے اسے واپس صوفے پر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ وہ بچپن سے اپنے بارے میں ایسے ریمارکس سننے کی عادی تھی جن میں اسے دیکھنے والا کوئی بھی نیا شخص بے ساختہ ہی اس کی جاپانیوں سے مشابہت کا ذکر چھیڑ دیتا تھا۔ کچھ لوگ تو باقاعدہ اسے جاپانی گڑیا کہہ کر پکارتے تھے۔ ہم جہاں بھی ایک ساتھ موجود ہوتیں، لوگ ہمارے ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہونے کا ذکر ضرور کرتے تھے۔ شاید اس وقت اسے وہی ساری باتیں یاد آ گئی تھیں اور وہ ہارے ہوئے انداز میں اپنی جگہ گم صم سی ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ مجھے اس کو اس کیفیت میں دیکھ کر دکھ پہنچا اور دل چاہا کہ آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لوں۔ سوتیلی ہی سہی، آخر وہ میری بہن تھی جس سے مجھے بہت محبت بھی تھی لیکن ابھی وہ اصل بات کہنی باقی تھی جس کے لیے مجھے ماضی کے صفحوں میں دفن یہ داستان دہرانی پڑ رہی تھی۔ چنانچہ میں نے ایک بار پھر اس کی طرف سے نظریں چراتے ہوئے اپنی گفتگو کا سلسلہ شروع کر دیا۔

''پاپا جب صوفیہ کو لے کر ممی کے پاس آئے تو ممی کو بہت دکھ پہنچا۔ وہ شخص جس سے وہ بہت محبت کرتی تھیں، مسلسل پانچ سال سے ان سے بے وفائی کر رہا تھا اور اب اپنی بے وفائی کی ایک چار سالہ نشانی لے کر ان کے پاس آ پہنچا تھا۔ اس موقع پر ممی کو یہ بھی احساس ہوا کہ اصل میں پاپا کو ان سے محبت تھی ہی نہیں اور انہوں نے صرف ایک اچھی زندگی کے حصول کے لیے ممی کا ساتھ قبول کیا تھا۔ اس ساری صورتِ حال کو سمجھ لینے کے بعد ممی نے کوئی ہنگامہ کھڑا کیا، نہ ہی پاپا کو برا بھلا کہا۔ وہ خاموش ہو گئیں اور اس شرط کے ساتھ صوفیہ کو قبول کر لیا کہ بے شک اس گھر میں وہ میری طرح برابری کے حقوق کے ساتھ رہے گی لیکن پراپرٹی پر جو کہ اصل میں ممی کی تھی، اس پر اس کا قانوناً کوئی حق نہیں ہوگا۔ میری عمر اس وقت نو سال تھی اور میں تھوڑا بہت حالات کو سمجھ رہی تھی۔ ممی اور پاپا کے رشتے میں آ جانے والا کھنچاؤ بھی مجھ سے چھپا ہوا نہیں تھا۔ بعد میں وقت کے ساتھ ساتھ ممی خود بھی مجھے بہت سی باتوں سے آگاہ کرتی رہیں۔ ان سے مجھے معلوم ہوا کہ اس واقعے کے بعد انہوں نے جاپان میں اپنا بزنس مکمل طور پر ختم کر دیا اور خود بزنس کے معاملات سنبھالنے لگیں۔ پاپا بھی فیکٹری جاتے تھے لیکن اب ان کی حیثیت ایک تنخواہ دار ملازم کی سی تھی۔ ممی نے ان کی بے وفائی پر بہت انوکھے طریقے سے انتقام لیا تھا۔ پاپا کو فیکٹری سے بہت اچھی سیلری ملتی تھی لیکن ان کی مالکانہ حیثیت ختم ہو گئی تھی۔ ممی نے انہیں صاف بتا دیا تھا کہ اس ساری پراپرٹی کی مالک تانیا ہو گی اور انہیں یا ان کی بیٹی کو ورثے میں ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں ملے گی۔ اس لیے اگر وہ اپنی بیٹی کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں تو اپنی سیلری میں سے رقم جمع کر سکتے ہیں لیکن پاپا نے ممی کے اس مشورے پر عمل نہیں کیا۔ وہ جانتے تھے کہ اگر ممی کو چھوڑ دیا تو جو شاندار سیلری مل رہی ہے، وہ کہیں اور سے نہیں مل سکے گی۔ اس لیے انہیں چھوڑنے کی ہمت تو نہیں کر سکے لیکن اپنی بے عزتی کے صدمے کو بھلانے کے لیے اعتدال کی حد سے نکل کر شراب نوشی کرنے لگے۔ حد سے بڑھی ہوئی اس شراب نے اپنا رنگ دکھایا اور ایک دن جب وہ سخت نشے میں تھے تو ڈرائیونگ کرتے ہوئے حادثے کا شکار ہو گئے۔ ممی کے دل میں بے شک ان کے خلاف غصہ تھا لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ تھی کہ وہ ان سے بے حد محبت کرتی تھیں۔ ان کی موت کا غم انہوں نے اپنے سینے سے لگا لیا اور بہ ظاہر ٹھیک ٹھاک نظر آنے کے باوجود اندر سے گھلنے لگیں۔ انہوں نے بزنس کو بہت خوبی کے ساتھ سنبھالا لیکن خود کو پوری طرح نہ سنبھال سکیں اور جگر کے کینسر میں مبتلا ہو گئیں۔ اپنی موت سے کچھ عرصے پہلے انہوں نے پراپرٹی پر صرف میرے حق کے بارے میں.... بتاتے ہوئے مجھے یہ اختیار دے دیا تھا کہ اب آگے میں جو چاہوں فیصلہ کر سکتی ہوں اور موجودہ حالات میں، میں یہ فیصلہ کر چکی ہوں کہ صوفیہ کو اس پراپرٹی میں سے جو اصل میں صرف میری ہے، کچھ بھی نہیں ملے گا۔'' اپنی بات کہنے کے بعد میں نے بہ طور خاص شکیل کی طرف دیکھا۔ وہ اس ساری گفتگو کے دوران بالکل خاموش رہا تھا۔ اب جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ ایک گہرا سانس لیتے ہوئے بولا۔

''کیا میں یقین کر لوں کہ جو کچھ آپ نے ابھی کہا، وہ سب سچ تھا اور آپ نے مجھے آزمانے کے لیے کوئی کہانی گھڑ کر نہیں سنائی؟''

''یہ سب سو فیصد سچ ہے مسٹر شکیل! میں کافی عرصے سے بزنس میں تانیا کی مدد کر رہا ہوں اور اچھی طرح جانتا ہوں کہ جو کچھ تانیا نے کہا ہے اس میں کہیں کوئی مبالغہ نہیں۔'' میرے بجائے ارسلان نے اس کے سوال کا جواب دیا۔

''اور اگر میں آپ کی گواہی کو ماننے سے انکار کر دوں

www.pkdigest.com

"تو...؟"

"تو آپ کو قانونی ثبوت بھی فراہم کیے جاسکتے ہیں۔" شکیل کے تیز لہجے میں پوچھے گئے اس سوال کا ارسلان نے اطمینان سے جواب دیا اور پھر اسے سمجھانے والے انداز میں بولا۔ "بے شک، تانیا اور صوفیہ کی مائیں الگ ہیں لیکن ان کے والد تو ایک ہی ہیں اور میرا ان سے ان کے والد کے حوالے سے رشتہ ہے۔ ظہیر انکل کی بیٹیاں ہونے کی حیثیت سے یہ دونوں ہی میرے لیے برابر ہیں اس لیے میں کسی ایک کے حق میں جانب داری سے کام ہرگز نہیں لے سکتا۔"

"ارسلان بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں شکیل! یہ واقعی جھوٹ نہیں بول سکتے۔ میں سچ مچ ان کے لیے اتنی ہی اہم ہوں جتنی کہ تانیا آپی۔ اب تم اس حقیقت کی روشنی میں جو بھی چاہو، وہ فیصلہ کرسکتے ہو۔" صوفیہ جو پسپائی اختیار کرنے کے بعد مسلسل دھیمی سسکیوں کے ساتھ روتی رہی تھی، ایک دم ہی مداخلت کرتے ہوئے آنسو بھری آنکھوں سے شکیل کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"فیصلہ تو بہت پہلے ہوچکا تھا صوفیہ! میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ مجھے تمہاری دولت میں کوئی دلچسپی نہیں۔ اب بھی میں اپنے دعوے پر قائم ہوں اور تمہاری آپی سے درخواست کرتا ہوں کہ تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیں۔ مجھے ان سے تمہارے سوا کچھ بھی نہیں چاہیے۔" شکیل کا جواب میرے لیے قطعی غیر متوقع تھا۔ اس جواب پر میں اسے بے یقینی سے دیکھتی رہ گئی۔ ارسلان کی بھی کچھ یہی کیفیت تھی۔ صوفیہ بھی ہیجان زدہ نظر آتی تھی جبکہ وہ خود اطمینان سے بیٹھا محظوظ ہونے والے انداز میں مسکرا رہا تھا۔

☆☆☆

"میں سوچ رہی ہوں کہ اپنا کلفٹن والا اپارٹمنٹ صوفیہ کو جہیز میں دے دوں۔ شکیل جس علاقے میں رہتا ہے صوفیہ کے لیے وہاں رہنا بہت مشکل ہوگا، اس لیے بہتر ہے کہ میں خود اس کی رہائش کا بندوبست کردوں۔ گاڑی بھی لازماً دینی ہوگی۔ شکیل کی کھٹارا بائیک پر صوفیہ کا سفر کرنا مجھے قطعی اچھا نہیں لگے گا۔" شکیل کے جواب نے میرے لیے اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی تھی اس لیے مجھے اس کے رشتے پر ہامی بھرنی پڑی تھی۔ میرے ہاں کہتے ہی آگے کے مراحل بہت تیزی سے انجام پائے تھے اور شادی کے لیے قریبی ڈیٹ فکس کردی گئی تھی۔ میں پچھلی ہر بات کو نظرانداز کرکے شادی کے سلسلے میں بھرپور تیاریاں کررہی تھی۔ البتہ اس دن کے بعد سے صوفیہ کا انداز کچھ کھچا کھچا سا تھا۔ وہ مجھ سے پہلے جیسی بے تکلفی سے پیش آنا چھوڑ چکی تھی۔ میں اس کی کیفیت کو سمجھ رہی تھی۔ اچانک ہونے والے انکشاف نے اسے صدمہ پہنچایا تھا اور یہ جاننے کے بعد کہ وہ کسی بھی شے میں میرے ساتھ برابری کی حق دار نہیں، بہت محتاط سی ہوگئی تھی۔ میں جانتی تھی کہ اگر اس پر یہ انکشاف نہ ہوتا تو وہ اپنی شادی کے موقع پر بے دریغ شاپنگ کرتی لیکن اب صورت حال یہ تھی کہ وہ خود سے شاپنگ پر جانے کا نام بھی نہیں لیتی تھی۔ میں خود ہی اپنے طور پر اس کے لیے اچھی سے اچھی چیز خرید کر لانے کی کوشش کررہی تھی۔ مجھے اس سے محبت تھی اور اس کی کیفیت مجھے تکلیف میں مبتلا کردیتی تھی۔ اب بھی میں نے اسے تکلیف سے بچانے کے لیے اپنا مہنگا ترین اپارٹمنٹ اسے دینے کا فیصلہ کرلیا تھا اور ارسلان کو اس فیصلے سے آگاہ کررہی تھی۔ میری بات سن کر ارسلان سوچ میں پڑ گیا پھر بولا۔

"گاڑی تو ٹھیک ہے لیکن اپارٹمنٹ کے بارے میں تھوڑا احتیاط سے کام لو۔ شکیل پر ابھی تک مجھے مکمل بھروسا نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ سب کچھ جان لینے کے باوجود اس نے کسی جہیز کے لالچ میں ہی صوفیہ سے شادی پر آمادگی ظاہر کی ہو۔ وہ کہتے ہیں نا کہ بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی... شکیل بھی ہوسکتا ہے اسی بات پر عمل کررہا ہو۔ یہ تو طے ہے کہ پراپرٹی میں حصہ نہ ملنے کے باوجود صوفیہ اپنے ساتھ جہیز میں اتنا کچھ لے کر جائے گی جو اسے اپنی کلاس کی کسی لڑکی سے شادی کرکے نہیں مل سکتا۔ صوفیہ کچھ کم عقل ہے، اگر تم نے اپارٹمنٹ اس کے نام کردیا تو شکیل اسے بہلا پھسلا کر اس سے اپارٹمنٹ اپنے نام کرواسکتا ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ شکیل کو اچھی طرح آزما لینے سے پہلے تم کوئی بھی بہت قیمتی شے اس کے قبضے میں نہ جانے دو۔ البتہ تم صوفیہ کو ویسے ہی اپارٹمنٹ رہنے کے لیے دے سکتی ہو... یا یہ ہے کہ تم اپارٹمنٹ اس کے نام کردو لیکن فی الحال یہ بات اسے اور شکیل کو معلوم نہ ہونے دو۔"

"تمہارا خیال ٹھیک ہے۔ میں اپارٹمنٹ صوفیہ کے نام کررہی ہوں لیکن فی الحال اس بات کو خفیہ رکھوں گی۔ مجھے خود بھی شکیل کی طرف سے ابھی پورا اطمینان نہیں ہے، ورنہ تم جانتے ہی ہو کہ میں نے فیکٹری میں بھی صوفیہ کو بیس فیصد شیئرز کا مالک بنانے کا فیصلہ کررکھا ہے۔ قانوناً اس کا کوئی حق نہ ہونے کے باوجود میں بڑی بہن کی حیثیت سے اسے تحفتاً کچھ نہ کچھ دینا چاہتی ہوں لیکن موجودہ حالات میں یہ فوری طور پر ممکن نہیں ہے۔ کچھ عرصہ گزر جائے اور مجھے شکیل کی طرف

سے اطمینان ہوجائے تو پھر میں یہ کام کردوں گی۔" ارسلان کی تائید کرتے ہوئے میں نے اسے اپنا آئندہ کا پروگرام بتایا۔

"یہی بہتر رہے گا۔" اس نے میری تائید کی اور پھر گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیا آج تمہارا لنچ کا ارادہ نہیں ہے؟"

"بس کاموں میں الجھ کر یاد ہی نہیں رہا۔ ابھی چلتے ہیں۔ فضول میں تمہیں بھی میری وجہ سے اتنی دیر تک بھوکا رہنا پڑا۔" میں شرمندگی سے بولتی ہوئی فوراً پرس سنبھال کر اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔

"مجھے اپنے بھوکے رہنے سے کوئی پریشانی نہیں لیکن یہ جو تمہاری عادت ہے ناکہ کام میں الجھ کر اپنا خیال رکھنا بھول جاتی ہو، یہ مجھے سخت زہر لگتی ہے۔" وہ بھی اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا اور خفگی سے بولا۔

"کیا کروں ارسلان! مصروفیت ہی اتنی ہوتی ہے کہ کسی بات کا ہوش نہیں رہتا۔ وہ تو شکر ہے کہ تم اتنا خیال رکھتے ہو تو میرا بوجھ کچھ ہلکا ہوجاتا ہے۔ حالانکہ مجھے معلوم ہے کہ خود تمہاری اپنی بھی مصروفیات کچھ کم نہیں ہوں گی۔ وکالت کے میدان میں قدم جمانا کچھ اتنا آسان تو نہیں ہوتا۔ اس جدوجہد کے دوران اگر تم میرا بھی خیال رکھتے ہو تو یہ تمہارا مجھ پر بڑا احسان ہے۔" اس کے ساتھ باہر نکلتے ہوئے میں نے دل کی گہرائی سے ممنونیت کا اظہار کیا۔

"فضول باتیں مت کرو۔ تم صرف میری کزن ہی نہیں، دوست بھی ہو۔ ایک دوست کی حیثیت سے اگر میں تمہارے کچھ کام آجاتا ہوں تو اس میں احسان والی کیا بات ہے؟" اس نے مجھے نرمی سے ڈانٹتے ہوئے کہا تو میں مسکرانے لگی۔

ہم دونوں نے ایک قریبی ریسٹورنٹ جا کر بڑے خوش گوار موڈ میں لنچ کیا۔ لنچ کے دوران ہم ادھر ادھر کی ہلکی پھلکی باتیں کرتے رہے۔ لنچ سے فارغ ہونے کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔ "یہاں سے اب تم کہاں جاؤ گے؟"

"خیریت، تمہیں کوئی کام ہے کیا؟" میرے سوال کا مقصد بھانپتے ہوئے اس نے فوراً سوال کیا۔

"ہاں۔ اصل میں، میں چاہ رہی تھی کہ صوفیہ اپنے لیے جیولری خرید لے۔ میں تو فارغ نہیں ہوں، ابھی مجھے واپس فیکٹری جانا ہے۔ اگر تم اس کام کے لیے صوفیہ کو اپنے ساتھ لے جاسکو تو میرا ایک بوجھ کم ہوجائے گا۔ ویسے بھی میرے خیال میں میرے مقابلے میں وہ تمہارے ساتھ زیادہ ایزی ہوکر اپنے لیے جیولری پسند کرسکے گی۔"

"ٹھیک ہے، میں چلا جاتا ہوں۔ تمہیں اتنی لمبی چوڑی وضاحت دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے حسب معمول فوراً میری بات پر ہامی بھرلی۔ میں نے اپنے پرس سے کریڈٹ کارڈ نکال کر اس کے حوالے کیا تاکہ اس کی مدد سے وہ صوفیہ کو خریداری کرواسکے۔ اس کے بعد ہم اپنے اپنے راستوں پر روانہ ہوگئے۔ فیکٹری کی طرف جاتے ہوئے میرے ذہن میں اب بھی وہ خیال آرہا تھا جس پر پہلے بھی میں کئی بار سوچ چکی تھی۔ ممی کی ڈھیر ساری بیش قیمت جیولری میری کسٹڈی میں تھی۔ میرے ذہن میں کئی بار یہ خیال آیا تھا کہ میں صوفیہ کو جہیز میں یہی جیولری دے دوں لیکن پھر میں نے اپنے اس خیال کو رد کردیا تھا۔ وہ جیولری میری ماں کی نشانی تھی جس سے یقیناً صوفیہ کو میری جیسی انسیت نہیں ہوسکتی تھی۔ دوسرا مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں وہ شکیل کے دباؤ میں آکر بھی اس جیولری کو بیچ باچ نہ دے۔ اگر ایسا ہوتا تو میں اپنی ماں کی نشانی سے محروم ہوجاتی مگر پھر بھی کبھی کبھی مجھے یہ خیال آتا تھا کہ کہیں سوتیلے پن کی وجہ سے تو میں صوفیہ کو ان چیزوں سے محروم نہیں کررہی۔ اس وقت بھی میں ایسا ہی کچھ سوچ رہی تھی لیکن پھر میں نے اس سوچ کو اپنے ذہن سے جھٹک دینا ہی مناسب سمجھا۔ وجہ چاہے کچھ بھی رہی ہو لیکن میں اپنے اندر اس بات کے لیے آمادگی نہیں پا رہی تھی کہ صوفیہ کو اپنی ممی کی جیولری میں حصے دار بناؤں۔

☆☆☆

آخرکار طے شدہ تاریخ پر صوفیہ کی شادی انجام پاگئی تو مجھے کچھ سکون ہوا۔ شادی ایک ہوٹل میں ہوئی تھی اور سارے انتظامات میں نے اپنے شایانِ شان کروائے تھے۔ صوفیہ اور شکیل کے ڈریس ایک بہت نامور ڈیزائنر نے تیار کیے تھے اور وہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ بہت خوب صورت لگ رہے تھے۔ پھر بھی جانے کیوں مجھے صوفیہ کے ساتھ بیٹھے شکیل کو دیکھ کر چڑ سی محسوس ہورہی تھی۔ شاید میں ان کی شادی پر پورے دل سے راضی نہیں تھی اس لیے وقتاً فوقتاً میرے دل میں ناپسندیدگی کے جذبات ابھرتے رہتے تھے۔ اس وقت ان جذبات کا اظہار میں شکیل کی والدہ اور بہن بھائیوں کو نظرانداز کرکے کررہی تھی۔ دنیا کا رواج ہے کہ لڑکی والے لڑکی کے سسرالیوں کو سرآنکھوں پر بٹھاتے ہیں لیکن میں نے ایسی کوئی زحمت نہیں کی تھی۔ تقریب میں بزرگ کی حیثیت سے موجود چچا اور چچی... یعنی ارسلان کے والدین کا بھی ان لوگوں کے ساتھ یہی رویہ تھا۔ وہ دوسرے مہمانوں سے تو بہت اچھی طرح ملے تھے لیکن شکیل کے گھر والوں کے ساتھ

ذرا سرد مہری سے پیش آئے تھے۔ ارسلان کا بھی یہی خیال تھا کہ شکیل کے گھر والوں کو ان کی حیثیت کے مطابق ہی ٹریٹ کیا جائے تو مناسب ہے، ورنہ بعد میں یہ لوگ سر پر چڑھ سکتے ہیں۔ اسی کے مشورے پر میں نے شادی کے موقع پر ان لوگوں کو قیمتی تحائف دینے سے بھی گریز کیا تھا۔ شاید یہ ہماری طرف سے روا رکھے جانے والے سلوک کا ہی نتیجہ تھا کہ ان لوگوں نے شکیل کے ساتھ میرے دیے ہوئے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہونے کے بجائے اپنے گھر میں ہی رہنے کو ترجیح دی تھی۔ میرے نقطہ نظر سے یہ صوفیہ کے حق میں بہتر ہی ہوا تھا لیکن ظاہر ہے، شکیل کو یہ سب اچھا نہیں لگا تھا۔

اس بات کا اندازہ مجھے شادی کے دوسرے دن صوفیہ سے بات چیت کرتے ہوئے ہوا۔ گفتگو کے دوران یونہی روانی میں اس نے مجھے بتادیا کہ شکیل کو اپنے گھر والوں کو نظر انداز کیا جانا اچھا نہیں لگا تھا۔ ان کے اپارٹمنٹ میں شفٹ نہ ہونے کے حوالے سے اس نے بتایا تھا کہ شکیل نے اپنے گھر والوں کو وہاں آنے کی پیشکش کی تھی لیکن اس کی والدہ نے یہ کہہ کر انکار کردیا تھا کہ وہ اپنا ذاتی گھر چھوڑ کر کسی دوسرے کے گھر میں رہنا پسند نہیں کرتیں۔ اگر اپارٹمنٹ شکیل کا اپنا ہوتا تو وہ اس بارے میں غور کرسکتی تھیں۔ میں نے ارسلان کو ان باتوں کے بارے میں بتایا تو وہ بولا۔

‘‘اسی لیے میں نے تمہیں اپارٹمنٹ صوفیہ کے نام کر دینے والی بات شو کرنے سے منع کیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اس طرح ان لوگوں کی اصلیت کھل کر سامنے آجائے۔ اب دیکھو انہوں نے اپنے مڈل کلاس حربے استعمال کرنا شروع کردیے ہیں۔ ابھی سرسری طور پر اس بات کا ذکر ہوا ہے کہ اپارٹمنٹ شکیل کی ملکیت نہیں، بعد میں اپنی والدہ کی ناراضگی کا بہانہ بناتے ہوئے وہ صوفیہ پر زور دے گا کہ اپنی بہن سے کہہ کر اپارٹمنٹ میرے نام کروادو۔’’ میں ارسلان کے اس خیال سے متفق تھی۔ وہ وکیل تھا اور اس کو ہر طرح کی چالبازیوں کی خبر تھی... جبکہ میں پڑھی لکھی اور بزنس وومن ہونے کے باوجود گھریلو سیاست کے بارے میں قطعی لاعلم تھی۔

شادی کے بعد کا ایک ہفتہ خاموشی سے گزر گیا۔ اس دوران میرے کریڈٹ کارڈز کے بلز آگئے تھے اور مجھے اندازہ ہورہا تھا کہ صوفیہ نے بے دریغ خریداری کی ہے۔ شاید ابتدا میں اس نے جو تکلفانہ رویہ اختیار کیا تھا، وہ ارسلان کے ساتھ شاپنگ پر جانے کی وجہ سے ختم ہوگیا تھا۔ خصوصاً اس نے جیولری بہت مہنگی خریدی تھی۔ بہرحال، میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور خاموشی سے بلوں کی ادائیگی کر دی۔ صوفیہ سے یوں بھی رابطہ کم ہی ہوتا تھا۔ وہ اور شکیل ہنی مون کے لیے کہیں نہیں گئے تھے اور شہر میں ہی موجود تھے۔ اس کے باوجود ملنے کے لیے میری طرف نہیں آتے تھے۔ میں نے بھی یہ سوچ کر نظر انداز کردیا تھا کہ نیا شادی شدہ جوڑا ایک دوسرے میں گم ہوگا اور انہیں کسی اور سے ملنے کی فرصت نہیں ملتی ہوگی۔ ایک ہفتے بعد میری ملاقات ان دونوں سے ایک ہوٹل میں ہوئی۔ ارسلان نے ان دونوں کو وہاں ڈنر پر انوائٹ کیا تھا اور ساتھ ہی مجھے بھی انوائٹ کرلیا تھا۔

‘‘تم دونوں تو شادی کرکے ایسے گم ہوئے ہو کہ مجھ سے ملنے آنے کی بھی زحمت نہیں کرتے۔’’ ڈنر کے دوران میں نے ان دونوں سے شکوہ کیا۔ حقیقتاً صوفیہ کی شادی کے بعد میں کچھ تنہا سی ہوگئی تھی اور مجھے اس کی کمی محسوس ہوتی تھی۔

‘‘میں نے تو کئی دفعہ صوفیہ سے کہا لیکن یہی ٹال گئی کہ آپی اتنی تھکی ہوئی آتی ہیں۔ روز روز وہاں جاکر انہیں ڈسٹرب کرنا ٹھیک نہیں ہے۔’’ شکیل نے میرے شکوے کے جواب میں فوراً بتایا جبکہ صوفیہ سر جھکائے سوپ کے پیالے میں چمچہ گھماتی رہی۔ وہ جب سے آئی تھی، کچھ چپ چپ سی لگ رہی تھی۔ حالانکہ اس طرح چپ چاپ بیٹھنا اس کی سرشت میں نہیں تھا۔ وہ بہت چنچل اور نٹ کھٹ سی ہوا کرتی تھی۔

‘‘کیا بات ہے صوفیہ! کچھ چپ چپ سی ہو؟’’ مجھ سے برداشت نہ ہوا تو اس سے پوچھ بیٹھی۔

‘‘اپنی باتوں کا کوٹا یہ میرے کان کھا کھا کر ختم کرچکی ہے۔ سچ تاپا! مجھے تو شادی کے بعد ہی اندازہ ہوا ہے کہ لوگ کیوں کہتے ہیں کہ پرسکون شادی شدہ زندگی کے لیے بیوی کو گونگا اور شوہر کو بہرا ہونا چاہیے۔ اب تو میرا دل چاہنے لگا ہے کہ دونوں میں سے کم از کم ایک بات ہی ہو جائے۔’’ میرے سوال کا جواب صوفیہ کے بجائے شکیل نے ہنستے ہوئے شوخی سے دیا۔ صوفیہ بدستور خاموش رہی۔

‘‘صوفیہ! یہ تمہاری کنپٹی کے پاس کیا ہوا ہے؟ یہ چوٹ تمہیں کیسے لگی؟’’ ارسلان جو صوفیہ کے دائیں جانب بیٹھا تھا، اس نے اچانک ہی اس کے بائیں ہاتھ کی کنپٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

‘‘کچھ نہیں... بس ذرا باتھ روم میں سلپ ہوگئی تھی تو چوٹ لگ گئی۔’’ اس نے کچھ بوکھلائے ہوئے انداز میں جواب دیتے ہوئے اپنا ہاتھ چھپانے کی کوشش کی لیکن ہاف سلیوز کی وجہ سے کامیاب نہیں ہوسکی۔

‘‘کمال ہے صوفیہ! تم نے مجھے بتایا بھی نہیں کہ تمہیں

کوئی چوٹ لگی ہے۔ بتادیتیں تو میں کسی ڈاکٹر سے ڈریسنگ ہی کروا دیتا۔’’

‘‘زخم لگانے والوں کو مرہم رکھنے کی باتیں سوٹ نہیں کرتیں۔’’ شکیل کی تشویش کا جواب صوفیہ نے مدھم مگر سرد سے لہجے میں دیا۔ اس بات کے بعد وہاں کا ماحول بوجھل سا ہوگیا۔ صوفیہ تو پہلے ہی خاموش تھی، شکیل کی شوخیاں بھی دم توڑ گئیں۔ اسی بوجھل ماحول میں کھانا ختم ہوا پھر ان لوگوں نے ہم سے واپسی کی اجازت لے لی۔

‘‘مجھے صوفیہ کی طرف معاملات ٹھیک نہیں دکھائی دے رہے۔’’ ان دونوں کے رخصت ہونے کے بعد ارسلان نے خیال ظاہر کیا۔

‘‘ہاں، میں بھی محسوس کررہی ہوں کہ ان کے درمیان ٹینشن سی چل رہی ہے۔’’ میں نے تشویش زدہ لہجے میں اس کی تائید کی۔

‘‘مجھے شک ہے کہ شکیل نے صوفیہ کو زدوکوب کیا ہے۔ تم نے دیکھا نہیں تھا کہ میرے کنپٹی کی چوٹ کے بارے میں پوچھنے پر صوفیہ کچھ بوکھلا گئی تھی اور صاف لگ رہا تھا کہ اس نے بہانہ بنانے کی کوشش کی ہے۔’’

ارسلان کا یہ تجزیہ مجھے مزید متوحش کرگیا۔ میں فوراً ہی بولی۔ ‘‘تو صوفیہ کو چاہیے تھا کہ وہ اس بارے میں کھل کر ہمیں بتاتی۔ وہ کوئی لاوارث تو نہیں ہے کہ شکیل اس کے ساتھ جو چاہے وہ سلوک کرے۔’’

‘‘یہ تمہارا خیال ہے لیکن شادی سے پہلے صوفیہ پر اپنے بارے میں جو انکشاف ہوا تھا، اس کے بعد یقیناً وہ خود کو لاوارث ہی سمجھنے لگی ہوگی۔’’

‘‘میرے ہوتے ہوئے یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ میں اس سے بات کرتی ہوں۔’’ میں نے جھٹ اپنا موبائل نکال کر صوفیہ کا نمبر ملانے کی کوشش کی لیکن ارسلان نے میرے ہاتھ سے موبائل لے کر رکھ دیا اور بولا۔

‘‘جلد بازی سے کام مت لو۔ میں نے صرف ایک خیال ظاہر کیا ہے۔ ہوسکتا ہے صوفیہ کے ذہن میں ایسا کوئی خیال نہ ہو اور وہ صرف اس لیے تمہیں کچھ بتانے سے گریز کررہی ہو کہ اس نے یہ شادی تمہاری مخالفت کے باوجود اپنی ضد پر زبردستی کی ہے۔ وہ پہلے اپنے طور پر معاملات کو سدھارنے کی کوشش کرنا چاہ رہی ہوگی۔ میرے خیال میں اسے کچھ وقت دینا چاہیے۔ ممکن ہے وہ خود ہی بتادے۔’’

‘‘اور تب تک شکیل اسے مارتا پیٹتا، اس پر ظلم کرتا رہے؟’’ مجھے اس خیال سے ہی شدید غصہ آرہا تھا کہ کسی نے میری بہن پر ہاتھ اٹھایا تھا۔

‘‘تم پریشان مت ہو۔ ہوسکتا ہے میں نے ایک غلط اندازہ لگایا ہو۔ بہرحال، میں اپنے طور پر صوفیہ سے مل کر اصل حالات جاننے کی کوشش کروں گا۔ تب تک تم صبر سے کام لو۔ ایسے معاملات میں جذباتیت ٹھیک نہیں ہوتی۔ بلاوجہ بات بڑھ بھی سکتی ہے۔’’ ارسلان نے مجھے سمجھایا تو میں ذرا ٹھنڈی پڑ گئی۔ واقعی اس معاملے کو ٹھنڈے دل سے اور سوچ سمجھ کر ہینڈل کرنے کی ضرورت تھی۔

☆☆☆

صوفیہ کے معاملے پر میں کوئی حتمی رائے قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکی تھی۔ میری خواہش پر ارسلان ایک دوبار اس سے جاکر ملا تھا۔ اس نے ارسلان کو بھی اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا، تاہم ارسلان کی بھی رائے تھی کہ صوفیہ خوش نہیں ہے اور اس کی شادی شدہ زندگی میں کچھ گڑبڑ ہے۔ کاروباری مصروفیات کے ساتھ ساتھ میرے ذہن پر اس ٹینشن کا بھی بوجھ تھا۔ انہی ٹینشن سے بھرے دنوں میں سے ایک دن تھا جب صوفیہ اچانک میرے آفس چلی آئی۔ اسے آفس میں دیکھ کر مجھے بہت حیرت ہوئی۔ اسے تو گھر پر مجھ سے ملنے آنے کی فرصت نہیں تھی پھر اس طرح آفس آنا کیا معنی رکھتا تھا؟ میں نے اس کے سامنے اپنی اس حیرت کا اظہار بھی کردیا جس پر وہ اداسی سے مسکرائی اور بولی۔

‘‘آپ کا شکوہ جائز ہے آپی... مگر کیا کروں، شکیل میرا کہیں آنا جانا پسند ہی نہیں کرتا۔ وہ چاہتا ہے کہ میں اپنا سارا وقت اسے اور اس کے گھر کو دوں۔’’

‘‘ٹھیک ہے۔ شادی کے بعد شوہر کا حق سب سے زیادہ ہوتا ہے لیکن دوسرے لوگوں کا بھی تو کچھ حق ہے تم پر۔ شکیل کو تمہیں اس حد تک پابند نہیں کرنا چاہیے۔’’ میں نے غصے سے کہا تو اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور چپ چاپ اپنی انگلیوں کے ناخنوں کو تکنے لگی۔ مجھے خود ہی اس کی مجبوری کا احساس ہوا تو بات کو ختم کرکے اس کی پسند کے مشروب اور اسنیکس کا آرڈر دینے کے لیے انٹرکام کی طرف متوجہ ہوگئی۔ آرڈر دے کر فارغ ہونے کے بعد میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ ہنوز پہلے والی پوزیشن میں بیٹھی تھی۔ مجھے لگا کہ وہ کچھ پریشان ہے اور شاید یہ پریشانی ہی اسے میرے آفس تک لے آئی ہے۔

‘‘کیا بات ہے صوفیہ! تمہیں کوئی ٹینشن ہے کیا؟ تم پہلے کی طرح اب بھی اپنی ہر پریشانی مجھ سے شیئر کرسکتی ہو۔ حالات سے مجبور ہوکر میں نے جو سچ تمہیں بتایا تھا، اسے بھول

www.pkdigest.com

جاؤ اور یہ یاد رکھو کہ میں تمہاری بڑی بہن ہوں جسے تم سے بہت محبت ہے۔'' اس سے اس کی پریشانی کے بارے میں پوچھنے کے ساتھ میں نے بہت نرم لہجے میں اسے یقین دلایا تو وہ بولی۔

''مجھے آپ کی محبت پر پورا یقین ہے... آپی اسی لیے تو میں آپ کے پاس آئی ہوں۔ اس وقت آپ ہی ہیں جو میری ہیلپ کرسکتی ہیں۔''

''بالکل... میں تمہاری ہر طرح کی ہیلپ کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن تم مجھے اپنا مسئلہ بھی تو بتاؤ؟'' میں نے اسے یقین دلاتے ہوئے پوچھا۔

میرا خیال تھا کہ اس کے اور شکیل کے درمیان جو کشمکش چل رہی ہے، آج وہ اس کے متعلق مجھے اعتماد میں لینے کے لیے یہاں آئی ہے مگر جب اس نے اپنی بات کہی تو میرے خیال کی تردید ہوگئی۔ اس نے کہا۔ ''پرابلم شکیل کی امی کا ہے آپی! ان کے گردے بالکل ناکارہ ہوگئے ہیں لیکن علاج کے لیے جو رقم درکار ہے وہ شکیل کے پاس نہیں۔ اگر آپ اس سلسلے میں ہیلپ کرسکیں تو یہ آپ کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہوگا۔''

''کیا شکیل نے تمہیں میرے پاس رقم مانگنے بھیجا ہے؟'' میں نے بغور اس کی شکل دیکھتے ہوئے پوچھا۔ گردوں کے علاج کے لیے لاکھوں کی رقم درکار ہوتی ہے، میں اس بات سے واقف تھی۔ مجھے یہ رقم دینے پر کوئی اعتراض بھی نہیں تھا لیکن میں جاننا چاہتی تھی کہ وہ شخص جو صوفیہ کو مجھ سے ملنے کے لیے بھی نہیں آنے دیتا تھا، کیا اسی نے اپنے مطلب کے لیے اسے میرے پاس بھیجا ہے؟

''نہیں۔ اسے تو معلوم بھی نہیں۔ میں خود یہاں آئی ہوں۔'' صوفیہ میرے سوال کے جواب میں بولی مگر میں نے نوٹ کرلیا تھا کہ یہ جواب دیتے ہوئے وہ مجھ سے نظریں چرا رہی ہے۔

''او کے! میں تمہیں رقم دے دیتی ہوں۔'' ایک گہرا سانس لیتے ہوئے میں نے اس سے کہا اور بھاری مالیت کا ایک چیک لکھ کر اس کے حوالے کردیا۔ اسی وقت پیون کولڈ ڈرنکس اور اسنیکس لے کر آگیا۔ صوفیہ کو اصرار سے کھلانے پلانے کے ساتھ میں اس سے ہلکی پھلکی بات چیت کرتی رہی۔ وہ زیادہ دیر میرے پاس نہیں رکی اور جلد ہی معذرت کرتی ہوئی اٹھ گئی۔

''صوفیہ! اگر تمہیں کوئی اور بھی پریشانی یا مسئلہ ہو تو تم مجھ سے شیئر کرسکتی ہو۔'' وہ آفس سے نکل رہی تھی جب میں نے اسے مخاطب کرکے اس سے کہا۔

''تھینک یو آپی! اگر کوئی پرابلم ہوئی تو میں آپ کو ضرور بتاؤں گی۔'' وہ اسی مردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ جو اس پر بالکل سوٹ نہیں کرتی تھی، مجھے جواب دے کر باہر نکل گئی۔ میرے ذہن میں اس مسکراہٹ کو دیکھ کر یہ خیال مزید پختہ ہونے لگا کہ وہ خوش نہیں ہے۔ بہرحال، میں چاہتی تھی کہ وہ خود یہ بات مجھے بتائے اس لیے زیادہ زور نہیں دیا۔

میرے اگلے تین چار دن بے حد مصروف تھے۔ ایک آدھ بار مجھے خیال آیا کہ شکیل کی والدہ کی طبیعت معلوم کرنے جاؤں لیکن بالکل ٹائم نہیں مل سکا۔ آخر ایک دن لنچ ٹائم میں، میں نے یہ موقع نکال لیا اور ان کے گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔ حالات کچھ بھی تھے بہرحال، وہ صوفیہ کی ساس تھیں اور اس کی بڑی بہن ہونے کے ناتے میرا فرض بنتا تھا کہ میں دیکھنے جاؤں۔ سفید پوش طبقے کی آبادی میں موجود ان کا گھر اپنے محلے کے دیگر گھروں سے ملتا جلتا تھا۔ صاف نظر آتا تھا کہ عرصہ دراز سے گھر پر نیا پینٹ نہیں کروایا گیا۔ گھر تھا بھی کافی پرانا تعمیر شدہ اور وقت کے ساتھ ساتھ بار بار تعمیر کیے جانے والے روڈ کی وجہ سے کچھ نیچے ہوگیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ تیز بارش کے دنوں میں باہر کا پانی ان کے گھر میں بھر جاتا ہوگا۔

میری دستک کے جواب میں شکیل کی بہن دروازے پر آئی۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں تھوڑی سی حیرت آئی تاہم اس نے زبان سے اظہار نہیں کیا اور خوش اخلاقی سے خوش آمدید کہتی ہوئی مجھے اپنے ساتھ اندر لے گئی۔ تین کمروں پر مشتمل اس گھر کا چھوٹا سا ڈرائنگ روم بہت سادہ لیکن صاف ستھرا تھا۔ مجھے وہاں بیٹھے ہوئے ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ شکیل کی امی وہاں چلی آئیں۔ وہ بالکل اسی طرح صحت مند اور فریش لگ رہی تھیں جیسا میں نے انہیں شادی کے موقع پر دیکھا تھا۔ ان کے چہرے سے کسی شدید بیماری تو کیا معمولی سی علالت کے بھی آثار ظاہر نہیں ہو رہے تھے۔ اپنی بیٹی کی طرح وہ بھی مجھ سے خوش دلی سے ملیں اور میرا احوال معلوم کرنے لگیں۔

''میں تو بالکل ٹھیک ہوں آنٹی! صوفیہ اور شکیل سے معلوم ہوا تھا کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے خیریت پوچھنے آگئی تھی۔'' وہ اتنے اچھے طریقے سے بات کر رہی تھیں کہ میں چاہتے ہوئے بھی ان سے سخت لہجے میں بات نہیں کر سکی۔ ورنہ ان کی شکل دیکھتے ہی مجھے یقین ہوگیا تھا کہ جس بہانے سے مجھ سے اتنی بڑی رقم اینٹھی گئی ہے، وہ بہانہ درست نہیں ہے۔

''میری طبیعت...؟'' وہ تھوڑی سی حیران ہوئیں پھر بولیں۔ ''ہاں، پچھلے ہفتے میں تھوڑی سی بیمار تو تھی شاید اسی حوالے سے شکیل نے تم سے ذکر کیا ہو مگر خیر، ایسی کوئی پریشانی کی بات نہیں تھی۔ معمولی سا موسمی بخار تھا جو دو دن میں اتر بھی گیا۔ پھر بھی تمہارا شکریہ کہ تم اپنی اتنی مصروفیت میں سے وقت نکال کر میری خیریت معلوم کرنے آگئیں۔'' وہ بہت میٹھے لہجے میں بول رہی تھیں لیکن میرے اندر بری طرح آگ بھڑک گئی تھی۔ خود کو بے وقوف بنائے جانے کا احساس شدید غصے میں مبتلا کررہا تھا۔ میں فوراً ہی وہاں سے جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ انہوں نے بہت اصرار کیا کہ میں تھوڑی دیر بیٹھ کر شربت وغیرہ پی لوں لیکن میں بے مروتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کے گھر سے باہر نکل گئی۔ اس دھوکا دہی پر مجھے اتنا شدید غصہ آرہا تھا کہ میں نے راستے میں ہی صوفیہ کے موبائل پر کال ملائی اور اس سے غضب ناک لہجے میں اس بارے میں پوچھ گچھ کرنے لگی۔

''میں خود آپ سے بات کرنے والی تھی آپی! مجھے خود کل ہی اس معاملے کی اصلیت کا علم ہوا ہے۔ مجھے معلوم ہوتا کہ آپ آنٹی کی خیریت معلوم کرنے ان کے گھر جا پہنچیں گی تو میں پہلے ہی آپ سے بات کرلیتی۔''

''کیا بات کرلیتیں؟ آخر اتنے بڑے جھوٹ کے پیچھے کیا اصلیت چھپی ہے؟'' میں بدستور غصے میں تھی اس لیے تیز لہجے میں بولی۔

''ایکچو لی آپی! اس رقم کی شکیل کو خود ضرورت تھی۔ اس نے شادی کے موقع پر کچھ دوستوں سے قرض لیا تھا۔ اب وہ دوست اس سے اپنی رقم کی واپسی کا تقاضا کر رہے تھے۔ اس کے لیے اس نے یہی حل سوچا کہ فی الحال بہانے سے آپ سے رقم لے لی جائے اور پھر بعد میں وہ آپ کی رقم سہولت سے واپس کردے۔ کل رات ہی اس نے مجھے ساری بات بتائی ہے۔ وہ بہت شرمندہ تھا کہ اس نے میرے ساتھ یہ غلط بیانی کی۔ پلیز! آپ میری خاطر شکیل کی اس غلطی کو معاف کردیں۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ وہ جلد سے جلد آپ کی رقم واپس کردے گا۔''

''بات رقم کی نہیں ہے صوفیہ! بات اس دھوکے کی ہے جو شکیل نے تمہیں اور مجھے دیا۔ اگر وہ سچ بتا کر مجھ سے رقم مانگ لیتا تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوتا لیکن اس نے ایک جھوٹ کا سہارا لے کر تمہیں استعمال کیا اور اس وقت تم نے بھی مجھ سے غلط بیانی کی کہ میں شکیل کے کہنے پر نہیں بلکہ اپنی مرضی سے آئی ہوں۔ شوہر پرست بیوی ہونا اچھی بات ہے لیکن عورت کو اس قدر بھی بے وقوف نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ شادی کے وقت کسی بھی شے سے غرض نہ ہونے کا دعویٰ کرنے والا شکیل اب اسی طرح بہانوں سے مجھ سے رقم اینٹھے گا۔ اس نے یونہی تو تم سے شادی پر ہامی نہیں بھری تھی۔'' صوفیہ کی بات کے جواب میں، میں نے اپنے دل میں پلتے سارے شکوک اس پر ظاہر کردیے۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے آپی! میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ آئندہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔'' اس کی آواز سے ظاہر تھا کہ وہ میری باتوں پر رونے کے قریب ہے۔ اس کی کیفیت کو محسوس کرکے میں نے اپنے غصے کو ضبط کرلیا اور آہستہ سے بولی۔

''ٹھیک ہے صوفیہ! میں فون بند کررہی ہوں لیکن تمہیں ایک نصیحت ضرور کروں گی۔ جتنا نقصان ہوچکا اور جو غلطی ہو گئی، اسے بھول جاؤ اور کوئی ایسا فیصلہ کرلو کہ آئندہ تمہیں یا مجھے کوئی نقصان نہ پہنچ سکے۔ ابھی وقت تمہارے ہاتھ میں ہے، تمہارے پیروں میں کوئی زنجیر نہیں پڑی ہے۔ ابھی تم اپنے بارے میں زیادہ آسانی سے اور آزادانہ فیصلہ کرسکتی ہو۔'' میری اس نصیحت کے جواب میں وہ خاموش رہی۔ میں نے خود ہی ایک گہرا سانس لیتے ہوئے موبائل آف کردیا۔

☆☆☆

اس واقعے کو گزرے کچھ دن ہوئے تھے جب میں نے صوفیہ سے اس کے موبائل پر رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ اس کا موبائل آف تھا۔ میں مسلسل کال کرتی رہی لیکن ہر بار مجھے اس کا موبائل آف ہی ملا۔ اپارٹمنٹ میں لینڈ لائن کی سہولت نہیں تھی۔ موبائل کے اس دور میں اس کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوئی تھی لیکن اب صوفیہ سے رابطہ نہ ہوسکنے پر مجھے اس کی کا احساس ہو رہا تھا۔ رقم والے معاملے کے بعد میری کوشش ہوتی تھی کہ روزانہ دن میں کم از کم ایک بار صوفیہ سے بات ضرور کروں، اس طرح مجھے اس کے حالات سے آگاہ رہنے میں آسانی رہتی تھی لیکن جانے کیوں صوفیہ نے اپنا موبائل آف کر رکھا تھا۔ آخر کار تھک ہار کر میں نے شکیل کا نمبر ملالیا۔

''ہیلو تانیا! کیسی ہیں آپ؟ آج آپ نے مجھے یاد کرنے کی زحمت کیسے کرلی؟'' اس نے فوراً ہی میری کال ریسیو کی اور چھوٹتے ہی کچھ طنز سے پوچھا۔

''میں نے تمہیں یاد نہیں کیا۔ مجھے اپنی بہن کی یاد آرہی تھی لیکن اس کا موبائل آف ہے اس لیے میں نے تمہارے

www.pkdigest.com

موبائل پر کال کرلی ہے۔ میری صوفیہ سے بات کرواؤ۔"
اس کے طنز کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے میں نے تحکمانہ لہجے میں اس سے کہا تو وہ بولا۔ "افسوس! اس وقت میں آپ کے اس حکم کی تعمیل نہیں کرسکتا۔"
"کیوں... کیوں نہیں کرسکتے؟ کیا تمہیں میرے صوفیہ سے بات کرنے پر کوئی اعتراض ہے؟" میں نے تیز لہجے میں اس سے سوال کیا۔
"میں کون ہوتا ہوں اعتراض کرنے والا... لیکن فی الحال وہ گھر میں ہی نہیں ہے تو میں آپ کی اس سے بات کیسے کرواؤں؟ اگر آپ کو اس سے کوئی بہت ضروری بات کرنی ہے تو ارسلان صاحب کے موبائل پر کال کریں۔ ممکن ہے آپ کا اس سے رابطہ ہو جائے۔" کچھ زہریلے سے لہجے میں مجھے یہ مشورہ دے کر اس نے لائن کاٹ دی تو میں الجھن میں پڑ گئی۔ رات کے دس بجے آخر صوفیہ ارسلان کے ساتھ کیوں تھی؟ وہ بھی اس صورت میں کہ شکیل اس کے ساتھ نہیں تھا۔
اسی الجھن میں، میں نے ارسلان کا نمبر ڈائل کیا۔
"ہیلو ارسلان! کہاں ہو تم؟" اس کے کال ریسیو کرتے ہی میں نے اس سے بے تابی سے سوال کیا۔
"گھر پر ہوں۔ ٹی وی دیکھ رہا ہوں۔ خیریت... تمہیں کوئی کام ہے کیا؟" اس نے میری بات کا جواب دیتے ہوئے پوچھا تو میں نے نوٹ کیا کہ پیچھے سے کچھ شور سنائی دے رہا تھا جو یقیناً ٹی وی ہی کا تھا۔
"نہیں، کام تو کوئی نہیں۔ بس میں صوفیہ سے بات کرنے کی کوشش کررہی تھی لیکن اس کا موبائل آف جا رہا تھا۔ میں نے سوچا تھوڑی دیر تم سے بات کرلوں۔" براہ راست اس سے صوفیہ کے بارے میں پوچھنا مناسب نہیں تھا اس لیے میں نے ایک ایسی بات کی کہ اگر صوفیہ وہاں موجود ہو یا کچھ دیر قبل ان دونوں کی ملاقات ہوئی ہو تو وہ خود ہی مجھے بتا دے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا اور وہ ہنستے ہوئے بولا۔
"تم بھی اچھی خاصی احمق ہو تانیا! مانا کہ صوفیہ تمہاری بہن ہے لیکن یار! میرے خیال میں ایک نئی شادی شدہ لڑکی کو فون کرنے کے لیے یہ وقت کچھ مناسب نہیں۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ مصروف ہوگی۔" میں نے اسے یہ بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ میری ابھی ابھی شکیل سے بات ہوئی ہے اور اس نے صوفیہ کے بارے میں مجھے کیا اطلاع دی ہے۔ میں سمجھ گئی تھی کہ شکیل نے مجھ سے غلط بیانی کی ہے۔ وہ میری صوفیہ سے بات نہیں کروانا چاہتا اس لیے اس نے یہ الزام نما جھوٹ گھڑا ہے۔ اگر میں ارسلان کو ایسی کوئی بات بتاتی تو یقیناً اسے افسوس ہوتا کہ میں نے نہ صرف شکیل کی بات پر یقین کرلیا تھا بلکہ تصدیق کے لیے اسے کال بھی کر بیٹھی تھی۔ میں نے ارسلان سے چند ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد فون بند کردیا۔ دوسرے دن میری صوفیہ سے بات ہوئی تو اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ شکیل نے سچ مچ غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ موبائل بند ہونے کے بارے میں میرے استفسار کے جواب میں وہ بولی۔
"ہاں آپی! پتا نہیں کیسے کل میرا موبائل آف ہوگیا تھا۔ شاید بے دھیانی میں مجھ سے بٹن دب گیا تھا۔ صبح شکیل نے ہی دیکھ کر مجھے بتایا۔"
"اور شکیل نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ میں نے اس کے موبائل پر تمہیں کال کی تھی؟" میں نے اس سے سوال کیا۔
"نہیں۔ شاید وہ بھول گئے ہوں گے۔ ویسے مجھے خود بھی آپ کی کال آنے کا پتا نہیں چلا۔ شاید اس وقت میں واش روم میں ہوں گی۔"
"تم گھر سے باہر تھیں۔" اس کا جواب سن کر میں سکون سے بولی اور اس کے ردعمل کا انتظار کرنے لگی۔
"کب؟ کل تو میں گھر سے باہر ہی نہیں نکلی۔" اس کا ردعمل میری حسب توقع تھا۔
"تقریباً رات کے دس گیارہ بجے۔ شکیل نے مجھے بتایا تھا کہ تم ارسلان کے ساتھ گئی ہو۔" میں نے اسے بتایا۔
"لیکن میں تو ارسلان کے ساتھ کہیں نہیں گئی۔ میری تو بہت عرصہ ہوا ان سے ملاقات بھی نہیں ہوئی۔ میرے خیال میں شکیل نے آپ سے مذاق کیا ہوگا۔" حیرت سے بولتے ہوئے اس نے اپنا خیال ظاہر کیا۔
"معلوم نہیں۔ یہ تو تم زیادہ بہتر سمجھ سکتی ہو۔ مجھے تو بس اتنا ڈر ہے کہ کہیں وہ تمہاری زندگی ہی کو مذاق بنا کر نہ رکھ دے۔" میری اس بات کے جواب میں اس کے پاس حسب معمول خاموشی تھی۔ میں نے ہمیشہ کی طرح تھک ہار کر رابطہ منقطع کردیا۔
اس واقعے کو کچھ دن گزرے تھے کہ ایک اور ایسا واقعہ پیش آگیا جس نے میرے غصے کا گراف بے حد بلند کردیا۔ وہ چھٹی کا دن تھا۔ ارسلان نے اصرار کیا کہ ہمیں آج کی شام ساتھ گزارنی چاہیے۔ میں نے بھی رضامندی دے دی۔ مسلسل کام اور تنہائی کی وجہ سے میں خود بھی ضرورت محسوس کررہی تھی کہ کچھ وقت تفریح میں گزارا جائے۔ اس شام میں بڑے اہتمام سے تیار ہوئی۔ بلیک کلر کی خوب صورت ساڑی پر میں نے ممی کے کلیکشن سے منتخب کردہ ایک نازک سا اور نفیس

سیٹ پہنا۔ البتہ جوڑے والا ہیئر اسٹائل اور لائٹ کلر کی لپ اسٹک کا استعمال حسب معمول تھا۔ آئینے نے مجھے بتایا کہ میں اس روپ میں بہت باوقار اور خوش نظر لگ رہی ہوں۔ ارسلان طے شدہ وقت پر مجھے لینے آیا تو اس نے اپنی زبان سے آئینے کی کہی بات کی تصدیق کردی۔ اپنی تعریف پر اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میں خوش گواری سے ہنس دی۔ اس کے بعد ہم دونوں گھر سے روانہ ہوگئے۔ بلا مقصد ادھر اُدھر گھومتے ہم نے بہت سی باتیں کیں۔ تقریباً ساڑھے آٹھ بجے ڈنر کیا پھر ارسلان کی خواہش پر ہم ایک انگلش فلم دیکھنے سنیما چلے گئے۔ ہمیں وہاں پہنچنے میں کچھ تاخیر ہوگئی تھی اور فلم کا آخری شو شروع ہوچکا تھا۔ ارسلان وہ فلم پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ اس نے مجھے فلم کی ابتدائی اسٹوری بتادی۔ فلم ختم ہونے کے بعد ہم گھر کے لیے روانہ ہوئے تو مجھے احساس ہوا کہ میں نے اپنی زندگی کا ایک بہت خوش گوار دن گزارا ہے۔ اس بات کا اظہار میں نے ارسلان سے کیا تو وہ ہنس پڑا اور پھر مخمور لہجے میں بولا۔

”یقین کرو تانیا! آج کا دن میرے لیے بھی بہت یادگار ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ خوش گوار دن میرے لیے مستقبل کی بے شمار خوشیوں کا پیغام لے کر آیا ہے۔“ ارسلان کی خوشی اس کے لفظوں سے ہی نہیں، چہرے سے بھی جھلک رہی تھی اور صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بہت خوش ہے۔ گھر پہنچنے کے بعد میں نے اسے کافی کی آفر کی تو وہ فوراً راضی ہوگیا۔

”بی بی! شکیل صاحب کا کئی بار فون آچکا ہے۔ وہ صوفیہ بی بی کے بارے میں بھی پوچھ رہے تھے کہ کیا وہ یہاں آئی تھیں؟ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ جیسے ہی گھر آئیں، ان سے بات کرلیں۔“ ہم دونوں گھر کے اندر داخل ہی ہوئے تھے کہ ملازمہ نے مجھے شکیل کے فون کے بارے میں بتایا۔ مکمل تفریح کے موڈ میں ہونے کی وجہ سے کسی بھی قسم کی ڈسٹربنس سے بچنے کے لیے میں نے اور ارسلان نے اپنے موبائلز آف کررکھے تھے۔ شکیل نے یقیناً پہلے مجھ سے میرے موبائل پر بات کرنے کی کوشش کی ہوگی اور رابطہ نہ ہونے کے باعث گھر کے نمبر پر ٹرائی کرتا رہا ہوگا لیکن مجھے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اسے مجھ سے کیا کام پڑگیا ہے اور اس نے صوفیہ کی یہاں موجودگی کے متعلق کیوں پوچھا تھا؟ الجھے ہوئے ذہن کے ساتھ میں نے اس کا نمبر ڈائل کیا۔ اس نے فوراً ہی میری کال ریسیو کرلی۔

”خیریت ہے شکیل! تم کس کام سے مجھے بار بار فون کرنے کی کوشش کررہے تھے؟“ میں نے ادھر اُدھر کی کوئی بات کرنے کے بجائے اس سے براہ راست سوال کیا۔

”میں صوفیہ کے متعلق پوچھنا چاہ رہا تھا۔ اصل میں اتنی رات ہوگئی ہے اور وہ واپس نہیں آئی تو مجھے تشویش ہورہی تھی۔“

”کیا مطلب؟ صوفیہ کہاں گئی ہے جو اب تک واپس نہیں آئی؟“ اس کی بات پر میں نے چونک کر پوچھا۔

”کیا وہ آپ کی طرف نہیں آئی؟ گھر سے تو وہ یہی کہہ کر نکلی تھی کہ آپ سے ملنے جارہی ہے۔“ اس نے مجھ سے بھی زیادہ حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”میرے خیال میں تو یہ بات تمہیں ملازمہ نے پہلے ہی بتادی تھی۔“

”جی ہاں، اس نے مجھے بتایا تھا لیکن میں نے سوچا کہ شاید وہ باہر ارسلان صاحب کی گاڑی میں بیٹھی ہو اس لیے ملازمہ کو علم نہ ہوسکا ہو۔ کیا وہ آپ لوگوں کے ساتھ نہیں تھی؟“

اس کے سوال نے میرا دماغ بھک سے اڑادیا اور میں غصے سے بولی۔ ”تم کس قسم کی باتیں کررہے ہو شکیل؟ پہلے تم نے کہا کہ صوفیہ میرے پاس آنے کے ارادے سے گھر سے نکلی تھی۔ اب تم اس کے ارسلان کی گاڑی میں بیٹھے ہونے کا ذکر کررہے ہو۔ آخر صوفیہ کا ارسلان کی گاڑی میں ہونے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے؟“

”میں کوئی بے بنیاد بات نہیں کررہا ہوں۔ صوفیہ گھر سے نکلی تھی تو میں نے اپارٹمنٹ کی کھڑکی سے اسے ارسلان کی گاڑی میں بیٹھ کر جاتے دیکھا تھا۔ اب تک میں یہی سمجھ رہا ہوں کہ وہ آپ دونوں کے ساتھ ہے لیکن آپ کی لاعلمی سے تو یہ ظاہر ہورہا ہے کہ ارسلان اسے اپنے ساتھ آپ کے گھر نہیں لایا تھا۔“

”آف کورس نہیں لایا تھا۔ لانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میرا اور ارسلان کا ایک طے شدہ پروگرام تھا جس میں صوفیہ کا کوئی ذکر نہیں تھا لیکن تمہاری باتوں سے ایسا لگ رہا ہے کہ تم ارسلان کو زبردستی انوالو کرنے کی کوشش کررہے ہو۔ اس سے پہلے بھی تم الزام لگا چکے ہو۔ اس وقت میں صوفیہ کی وجہ سے نظرانداز کرگئی تھی لیکن اب بہت ہوچکا مسٹر شکیل... یاد رکھو اگر میری بہن کو کوئی نقصان پہنچا تو میں تمہیں ہرگز نہیں بخشوں گی۔“ میں نے غصے سے تیز لہجے میں بولتے ہوئے فون بند کردیا۔ ارسلان سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے مختصراً اسے ساری بات بتائی۔

”وہ خبیث پتا نہیں صوفیہ کے ساتھ کیا گیم کھیل رہا ہے۔ اس کے انداز سے لگتا ہے کہ وہ زبردستی تمہارے اور

صوفیہ کے تعلقات کی تشہیر کرکے تم لوگوں پر کوئی الزام لگانا چاہتا ہے۔“ ساری بات بتانے کے ساتھ میں نے خیال آرائی کی۔

”اس کا جو بھی مقصد ہو، فی الحال تو ہمیں یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ صوفیہ کہاں ہے؟ اس کا اتنی رات کو اکیلے گھر سے باہر ہونا تشویش ناک بات ہے۔“ میرے برخلاف ارسلان نے تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے سب سے اہم مسئلے کی طرف میری توجہ مبذول کروائی اور مجھے صوفیہ کے سیل پر کال کرنے کا مشورہ دیا۔ میں نے صوفیہ کا نمبر ملایا تو دوسری طرف بیل جانے کی آواز سنائی دینے لگی، حالانکہ شکیل کے مطابق صوفیہ کا موبائل آف تھا۔ تین چار بیلز کے بعد صوفیہ نے کال ریسیو کرلی۔ اس کی آواز تھوڑی سی بھاری ہورہی تھی۔

”ہیلو صوفیہ! کہاں ہو تم؟“ اس کی آواز سنتے ہی میں نے بے تابی سے پوچھا۔

”گھر پر ہی ہوں آپی! طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی اس لیے ذرا جلدی سوگئی تھی۔ آپ بتائیں کیسے فون کیا؟ مجھے تو آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں۔“

”اور شکیل کہاں ہے؟“ اس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے میں نے دوسرا سوال کیا۔

”وہ شاید ٹی وی لاؤنج میں ہے۔ میں آپ کی اس سے بات کرواؤں کیا؟“ میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے اس نے مجھ سے پوچھا۔

”نہیں، کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں ابھی وہاں آرہی ہوں اور وہاں آکر خود اس سے بات کرتی ہوں۔“

”بات کیا ہے آپی... کچھ مجھے بھی تو بتائیں؟“ میرے لہجے کی گمبھیرتا کو محسوس کرتے ہوئے اس نے پریشانی سے مجھ سے پوچھا لیکن میں نے اسے کوئی جواب دیے بغیر فون بند کردیا۔

”چلو ارسلان! ہمیں اسی وقت صوفیہ کی طرف جانا ہوگا تاکہ شکیل سے اس کے جھوٹ کے بارے میں پوچھ سکیں۔ میں صوفیہ کو اس چالاک شخص کے رحم و کرم پر اس طرح نہیں چھوڑ سکتی۔“ میں پوری طرح جلال میں آچکی تھی۔ ارسلان خاموشی سے میرے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ صوفیہ کے اپارٹمنٹ پر پہنچ کر میں نے ڈور بیل بجائی تو اندر سے کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا۔ میں نے وقفے وقفے سے دو تین بار بیل بجائی مگر صورت حال ہنوز وہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اپارٹمنٹ خالی پڑا ہے۔ تھوڑی سی پریشانی محسوس کرتے ہوئے میں نے موبائل نکال کر صوفیہ کا نمبر ملایا۔ اس کا موبائل بند تھا۔ مجھے تشویش نے گھیرلیا۔

”شکیل کا نمبر ملاؤ۔“ ارسلان نے مجھے مشورہ دیا تو میں نے شکیل کا نمبر ڈائل کیا۔

”کہاں ہو تم... اور صوفیہ کہاں ہے؟“

”میں گھر سے باہر ہوں اور صوفیہ کو ہی تلاش کرنے کی کوشش کررہا ہوں۔“

”واپس آؤ۔ میں اور ارسلان تمہارے اپارٹمنٹ کے باہر کھڑے ہیں۔“ اس کا جواب سن کر میں نے حکم دیا۔ دس بارہ منٹ کے انتظار کے بعد شکیل وہاں پہنچ گیا۔

”آپ لوگ یہاں کیسے پہنچ گئے؟“ ہمیں دیکھتے ہی اس نے سوال کیا۔

”ہم صوفیہ سے ملنے آئے ہیں۔ تم لاک کھولو تاکہ ہم اس سے مل سکیں۔“ میں نے اسے حکم دیا۔

”لیکن صوفیہ تو گھر پر نہیں ہے۔ میں نے فون پر بھی آپ کو بتایا تھا۔ پہلے تو میں یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ آپ کے ساتھ ہے اس لیے زیادہ پریشان نہیں ہوا لیکن آپ کے انکار کے بعد میں خود اپنے طور پر اسے ڈھونڈنے نکلا تھا۔“

”بکواس بند کرو۔ میں نے خود ابھی تھوڑی دیر پہلے صوفیہ سے اس کے موبائل پر بات کی ہے۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ گھر پر ہی ہے۔“ شکیل کے جواب پر چراغ پا ہوتے ہوئے میں چیخی تو وہ ایسی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا جیسے اسے میری ذہنی حالت پر شبہ ہو۔ تاہم اس نے اپنی زبان سے کچھ نہیں کہا اور کی ہول میں چابی ڈال کر لاک کھول دیا۔ میں جھپٹ کر اندر داخل ہوئی اور سیدھے صوفیہ کے بیڈروم کا رخ کیا۔ اس کا بیڈروم خالی تھا۔ میں نے ایک ایک کرکے اپارٹمنٹ کے سارے کمرے، یہاں تک کہ واش رومز اور کچن بھی چیک کرلیا لیکن صوفیہ کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔

”میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ صوفیہ شام سے بھی پہلے کی گھر سے نکلی ہوئی ہے لیکن پتا نہیں کیوں آپ میری بات کا یقین نہیں کررہی ہیں۔“ شکیل جو میری ساری کارروائی دیکھ رہا تھا، مجھے اپنی تلاش میں مایوس ہوتے دیکھ کر بولا۔

”شٹ اپ! تم نے ہی صوفیہ کو غائب کیا ہے۔“ میں اس پر غرائی اور ارسلان کی طرف مڑ کر بولی۔ ”پولیس کو کال کرو ارسلان! اب پولیس ہی آکر اس شخص سے پوچھے گی کہ اس نے میری بہن کو کہاں چھپایا ہے؟“

ارسلان نے فوراً ہی میری بات پر عمل کیا۔

”آپ کیسی باتیں کررہی ہیں تانیا! میں بھلا کیوں صوفیہ

www.pkdigest.com

کو غائب کروں گا؟ وہ میری بیوی ہے۔'' شکیل نے احتجاج کیا۔

''تم نے کیوں ایسا کیا، یہ تو پولیس ہی تم سے معلوم کرے گی۔ میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ تم نے میری بہن کی زندگی عذاب بنا رکھی تھی۔ محبت کا فریب دے کر تم نے اس سے جس مقصد کے لیے شادی کی تھی، وہ مقصد حاصل نہیں ہوا تو تم اسے تنگ کرنے لگے اور اس پر جھوٹے الزامات لگانے لگے۔''

''میں نے اسے کوئی فریب نہیں دیا تھا۔ فریب تو شاید میں خود کھا گیا تھا۔ میں نے اسے جو سمجھ کر اس سے شادی کی تھی، وہ اس سے بہت مختلف نکلی۔ اس کی خاطر میں نے اپنے گھر والوں کو چھوڑ کر یہاں رہنا تک منظور کر لیا لیکن وہ تو شاید مجھ سے محبت کرتی ہی نہیں تھی... یا پھر آپ کی ہائی سوسائٹی کی ویلیوز ہی ایسی ہیں کہ عورت اپنے شوہر سے زیادہ غیر مردوں کے ساتھ گھومنے پھرنے اور وقت گزارنے میں خوشی محسوس کرتی ہے۔'' اپنی بات کے اختتام پر اس نے کھا جانے والی نظروں سے ارسلان کو دیکھا۔

''تم صوفیہ پر الزام تراشی کر کے اپنی جان نہیں چھڑا سکتے۔ تمہیں بتانا ہی ہوگا کہ صوفیہ کہاں ہے؟'' اس بار ارسلان نے بھی تحمل کا دامن چھوڑ دیا اور غصے سے بولا۔

''یہ بات میں نہیں تم بتاؤ گے مسٹر ارسلان! صوفیہ کو تمہارے ساتھ جاتے ہوئے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ تم بتاؤ کہ تم نے میری بیوی کو کہاں غائب کیا ہے؟'' شکیل نے ایک دم ہی ارسلان کا گریبان پکڑ لیا اور غراتے ہوئے اس سے پوچھنے لگا۔

''بکواس بند کرو ذلیل آدمی! اپنے جرم کو چھپانے کے لیے تم مجھ پر اور صوفیہ پر جھوٹا الزام لگا رہے ہو۔'' یوں لگا کہ ارسلان کا ضبط بالکل آخری انتہا پر پہنچ کر جواب دے چکا ہو۔ اس نے ایک زوردار گھونسا شکیل کے جبڑے پر دے مارا۔ پھر تو جیسے وہاں کوئی طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ دونوں بڑھ چڑھ کر ایک دوسرے پر حملے کرنے لگے۔ میں چیخنے لگی اور درمیان میں آ کر اس جھگڑے کو روکنے کی کوشش کی لیکن وہ دونوں ہی اتنی جنونی کیفیت میں تھے کہ مجھے ذرا خاطر میں نہیں لائے۔ میں اپارٹمنٹ سے دوڑتی ہوئی باہر نکلی کہ سیکیورٹی گارڈز کو بلا سکوں۔ اس وقت میرا دماغ اس قدر ماؤف ہو رہا تھا کہ مجھے یہ خیال تک نہیں آیا کہ اس کام کے لیے انٹرکام بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اپارٹمنٹ سے نکلنے کے بعد مجھے گارڈز کے کیبن تک جانے کی زحمت نہیں اٹھانی پڑی۔ سامنے سے پولیس والے ایک گارڈ کی راہنمائی میں اسی طرف آ رہے تھے۔ میں نے جلدی سے انہیں اندر جاری لڑائی کے بارے میں آگاہ کیا۔ وہ لوگ تیزی سے اندر داخل ہوئے اور صورتِ حال کو سنبھال لیا لیکن اس دوران وہ دونوں ایک دوسرے کو اچھا خاصا زخمی کر چکے تھے۔

''گرفتار کر لیں آفیسر اس شخص کو۔ اس نے میری بہن کو نہ جانے کہاں غائب کر دیا ہے اور اب معصوم بن رہا ہے۔'' میں نے پولیس آفیسر سے کہا تو شکیل بھی اپنی صفائی دینے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر ظاہر ہے کہ پولیس مین کے لیے اس کے مقابلے میں ایک وکیل اور ایک بزنس ویمن کی بات زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔

☆☆☆

''بہت ڈھیٹ انسان ہے... مسلسل اپنے اس بیان پر اڑا ہوا ہے کہ صوفیہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور وہ اپنی مرضی سے گھر سے گئی تھی۔ مجھ پر اس کی الزام تراشی بھی جاری ہے لیکن وہ کوئی مسئلہ نہیں۔ ایس ایچ او مجھے اچھی طرح جانتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ میں ایسی گھٹیا حرکت نہیں کر سکتا۔ بلڈنگ کے ایک سیکیورٹی گارڈ کے بیان نے بھی صورتِ حال کافی واضح کر دی ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے شکیل اور صوفیہ ایک ساتھ گاڑی میں باہر گئے تھے۔ پس شکیل اعتراف نہیں کر رہا۔ پولیس والے اپنی طرح چھترول کریں گے تو ہی بکے گا۔'' شکیل کی گرفتاری کے بعد میں واپس گھر آ گئی تھی جبکہ ارسلان تھانے چلا گیا تھا۔ اب وہ وہیں سے واپس آ کر مجھے رپورٹ دے رہا تھا۔

''پولیس والوں سے کہو کہ جلد از جلد اس کی زبان کھلوائیں۔ جب تک وہ زبان نہیں کھولے گا ہمیں صوفیہ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوگا۔ نہ جانے اس نے صوفیہ کے ساتھ کیا کیا ہے؟ اس کا یوں غائب ہونا مجھے سخت پریشان کر رہا ہے۔'' اپنی کنپٹیوں کو انگلیوں کی مدد سے دباتے ہوئے میں نے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ میں جو ایک بھرپور چھٹی گزارنے کے بعد بڑی شاداں و فرحاں تھی، اب نہایت ٹینشن میں آ چکی تھی۔ پریشانی اور بھاگ دوڑ میں ساری رات ہی گزر گئی تھی اور اب بس صبح ہونے ہی والی تھی۔

''تم پریشان مت ہو۔ صوفیہ یقیناً خیریت سے ہوگی۔ شکیل اسے کوئی شدید نقصان پہنچانے کی غلطی نہیں کر سکتا۔ اس نے یقیناً کسی خاص مقصد کے تحت اسے غائب کیا ہوگا۔ وہ مقصد جلد ہمارے سامنے آ جائے گا۔ ایک بار کچھ معلوم ہو جائے پھر ہم ہر قیمت پر صوفیہ کو چھڑا لیں گے۔'' ارسلان نے مجھے دلاسا دیا۔

''لیکن اس کا صوفیہ کو غائب کرنے کے پیچھے کیا مقصد ہو سکتا ہے؟'' میں الجھی۔

''وہی جو اس سے شادی کرنے کے پیچھے تھا۔ شکیل نے اس مقولے کو سامنے رکھ کر... کہ مرا ہوا ہاتھی بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے، صوفیہ کے بارے میں حقیقت جاننے کے باوجود اس سے شادی کی تھی۔ اسے امید ہوگی کہ صوفیہ اپنے ساتھ بے حد شان دار جہیز لائے گی لیکن تم نے اپارٹمنٹ پر صوفیہ کی ملکیت ظاہر نہ کر کے اسے مایوس کر دیا۔ پھر اس نے بہانے سے صوفیہ پر دوبارہ رقم لانے کے لیے زور دیا ہوا اور صوفیہ نے انکار کر دیا ہو۔ صوفیہ کے کردار کے بارے میں وہ پہلے ہی شکوک پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا، اب موقع دیکھ کر اس نے یہ بات کہہ دی کہ صوفیہ خود ہی کہیں چلی گئی ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر ہم اس سے سودے بازی کریں تو وہ صوفیہ کا پتا بتا دے گا۔'' ارسلان کی باتیں میرے دل کو لگ رہی تھیں۔ واقعی یہی وجہ ہو سکتی تھی صوفیہ کو غائب کرنے کی۔

''تو ٹھیک ہے، تم کر لو اس سے سودے بازی۔ میں اس گھٹیا انسان سے اپنی بہن کو بچانے کے لیے اس کی منہ مانگی قیمت ادا کرنے کو تیار ہوں۔''

''ابھی نہیں۔ ابھی پولیس کو اس کا کام کرنے دو۔ مجھے امید ہے کہ پولیس اس سے سچ اگلوا لے گی۔'' میرے بے حد جذباتی ہو کر کہنے پر ارسلان نے مجھے سمجھایا اور پھر بولا۔ ''ایسا کرو کہ تم کچھ دیر کے لیے سو جاؤ۔ ساری رات جاگتے ہوئے گزری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ پریشانی اور تھکن مل کر تمہیں بیمار کر دیں۔'' اس کا مشورہ کافی حد تک درست تھا لیکن میں اپنی جگہ سے نہیں اٹھی۔

''چلو چلو، اٹھو شاباش۔ جا کر تھوڑی دیر آرام کرو تاکہ فریش ہو کر کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہو سکو۔ میں بھی تھوڑی دیر کے لیے گھر جاؤں گا اور فریش ہونے کے بعد واپس آ جاؤں گا۔'' وہ زبردستی مجھے شانوں سے پکڑ کر میرے بیڈ روم تک لے گیا اور اپنے ہاتھ سے مجھے ایک نیند کی گولی کھلائی۔ اس کے روانہ ہونے کے بعد میں نے آنکھیں بند کیں تو میرے ذہن پر بہت بوجھ تھا لیکن نیند کی گولی نے اثر دکھایا اور بالآخر میں سونے میں کامیاب ہو گئی۔ دوبارہ میری آنکھ کھلی تو کافی دن چڑھ آیا تھا۔ میں بستر سے اٹھ کر سیدھی باتھ روم میں چلی گئی۔ ہاتھ لینے کے بعد میں نے خود کو کافی بہتر محسوس کیا۔ مجھے امید تھی کہ میں ایک کپ چائے پیوں گی تو رہی سہی سستی بھی دور ہو جائے گی۔ باتھ روم سے باہر آنے کے بعد مجھے ملازمہ کو اس کام کے لیے بلانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ خود ہی ہاتھ میں ایک لفافہ لیے چلی آئی۔

''یہ کیا ہے؟'' اس نے لفافہ میرے ہاتھ میں تھمایا تو میں نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ لفافے پر واضح لکھائی میں میرا نام لکھا تھا لیکن بھیجنے والے کا نام کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

''یہ چوکیدار نے دیا ہے جی۔ کہہ رہا تھا کہ کوئی لڑکا موٹر سائیکل پر آ کر دے گیا ہے۔'' ملازمہ نے بتایا۔ اس دوران میں لفافہ کھول چکی تھی۔ لفافے میں سے صرف ایک سی ڈی نکلی تھی۔ وہ سی ڈی مجھے کس نے اور کیوں بھیجی تھی، میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں سی ڈی ہاتھ میں لیے اس کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ ارسلان چلا آیا۔

''یہ سی ڈی کیسی ہے؟'' اس نے آنے کے بعد فوراً ہی میرے ہاتھ میں موجود سی ڈی کو نوٹ کر لیا۔

''معلوم نہیں۔ کوئی لڑکا گیٹ پر چوکیدار کو دے گیا تھا۔ میرے خیال میں اسے لگا کر دیکھتے ہیں، تب ہی پتا چلے گا کہ اس میں کیا ہے؟''

''یہ کام بعد میں کرتے ہیں پہلے تم ناشتا کر لو۔'' اس نے یقیناً اندازہ کر لیا تھا کہ میں کچھ دیر قبل ہی جاگی ہوں اور ابھی ناشتا نہیں کیا اس لیے میرا ہاتھ تھام کر مجھے ڈائننگ روم تک لے گیا۔ میرا ایک پیالی چائے کے سوا کچھ بھی کھانے پینے کا موڈ نہیں تھا لیکن اس کے اصرار پر مجھے زبردستی ایک سلائس اور بوائل انڈا لینا پڑا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر ہم دونوں دوبارہ بیڈ روم میں آ گئے۔ اکثر اوقات میں فیکٹری سے متعلق کوئی نہ کوئی کام گھر پر بھی لے آتی تھی اس لیے میں نے اپنے بیڈ روم میں ایک جدید ماڈل کا پی سی رکھا ہوا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے احساس تھا کہ مجھے بھیجی جانے والی سی ڈی کسی خاص اہمیت کی حامل ہے اس لیے اسے دیکھنے کے لیے میں نے اپنے بیڈ روم میں موجود پی سی کا استعمال ہی مناسب سمجھا تھا۔ کمپیوٹر آن کر کے میں نے سی ڈی روم میں سی ڈی لگائی اور ماؤس سنبھال لیا۔ ذرا دیر بعد مانیٹر پر منظر ابھرا، اس نے مجھے اور ارسلان کو چونکا دیا۔ وہ چھوٹے سائز کے ایک کمرے کا منظر تھا جس میں پڑے سنگل بیڈ پر صوفیہ سو رہی تھی یا شاید بے ہوش تھی۔ مانیٹر پر چند سیکنڈز تک اس کی بند آنکھیں نظر آتی رہیں۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی پلکوں میں لرزش پیدا ہوئی اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھوں کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ ابھی اس کا ذہن پوری طرح بیدار

www.pkdigest.com

نہیں ہوا ہے اور وہ اپنے اردگرد کے ماحول کو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس کوشش کے دوران اس نے بائیں جانب کروٹ لی اور اپنا داہنا ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے رکھ کر لیٹ گئی۔ اسے اس انداز میں لیٹے ہوئے مشکل سے چند سیکنڈز ہی گزرے ہوں گے کہ اس کے چہرے پر خوف زدہ سے تاثرات ابھر آئے۔ اسی وقت اسکرین پر منظر وسیع ہونے لگا۔ اس منظر میں سب سے چونکانے والی چیز... جس کی وجہ سے صوفیہ کے چہرے پر خوف ابھر رہا تھا، ایک ریوالور تھا۔ یہ ریوالور جس شخص کے ہاتھ میں تھا، وہ اس منظر میں نظر نہیں آ رہا تھا۔ صرف دستانوں میں چھپے اس کے ہاتھ ظاہر تھے اور یوں لگتا تھا کہ وہ کمرے کے دروازے سے باہر ریوالور کا رخ صوفیہ کی طرف کیے کھڑا ہے۔ ایک دم ہی اس خاموش فلم میں ایک زوردار دھماکا گونجا۔ دھماکا ریوالور سے نکلنے والی گولی کا تھا۔ گولی صوفیہ کے بہت قریب اس کے ہاتھ کے نیچے رکھے تکیے میں دھنسی تھی۔ صوفیہ ایک دم ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھی اور دہشت ناک انداز میں چیخنے لگی۔ وہ شدید ہراساں تھی اور اس کی سیاہ زلفیں اس کے چہرے پر بکھری گئی تھیں۔ ہراساں تو میں خود بھی ہو گئی تھی۔ گولی اس کے جتنے قریب تکیے میں پیوست ہوئی تھی، اس بات کا پورا امکان تھا کہ اگر ذرا سی بھی اندازے کی غلطی ہو جاتی تو وہ گولی صوفیہ کے خوب صورت چہرے کے کسی حصے کو بھی نشانہ بنا سکتی تھی۔ اس دہشت ناک منظر کے بعد ایک دم ہی اسکرین تاریک ہو گئی اور انگریزی میں ٹائپ شدہ حروف اسکرین پر روشن ہونے لگے۔ یہ میرے لیے ایک پیغام تھا جس میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے لکھا گیا تھا۔

''مس تانیا!

امید ہے کہ اپنی بہن کو اس حال میں دیکھ کر تمہیں اچھا نہیں لگا ہو گا۔ اگر تم اس کی خیریت چاہتی ہو تو پچاس کروڑ روپے کا انتظام کر کے رکھو۔ آج کسی وقت تم سے رابطہ کر کے اس رقم کے بارے میں مزید ہدایت دی جائے گی۔ اور ہاں، یہ بتانے کی تو ضرورت نہیں کہ اگر اس بارے میں پولیس کو کوئی اطلاع دی گئی تو تمہاری بہن کی سلامتی کی کوئی گارنٹی نہیں ہو گی۔''

اس پیغام کو پڑھ کر میں نے اپنا سر تھام لیا۔ صوفیہ کو سچ مچ اغوا کیا گیا تھا اور اغوا کرنے والے نے اس کی رہائی کے لیے اتنی بڑی رقم کا مطالبہ کیا تھا جس کا فوری طور پر بندوبست کرنا کسی طور میرے لیے ممکن نہیں تھا۔

''یہ سب کیا ہے ارسلان؟'' آخر کار میں نے سر اٹھا کر اپنی ہی طرح گم صم بیٹھے ارسلان سے پوچھا۔

''وہی جس کا مجھے ڈر تھا۔'' اس نے جواب دیا۔

''لیکن یہ سب کس نے کیا؟ ہمیں تو شکیل پر شک تھا کہ اس نے صوفیہ کو غائب کیا ہے لیکن اب جبکہ وہ تھانے میں بند ہے تو یہ سب کون کر رہا ہے؟ کون ہے جس نے مجھے یہ ویڈیو بھجوائی ہے؟'' میں کچھ ہیجانی سی کیفیت کا شکار ہونے لگی تھی۔

''اس کے تھانے میں بند ہونے سے کیا ہوتا ہے؟ اس کام میں وہ اکیلا تو نہیں ہو گا۔ یقیناً اس نے اپنی مدد کے لیے کسی نہ کسی کو اپنا شریک بنایا ہو گا اور اب وہ شخص شکیل کی عدم موجودگی میں یہ سب کر رہا ہو گا۔'' ارسلان کے اس خیال سے میں نے بھی اتفاق کیا پھر پریشانی سے بولی۔

''اتنی بڑی رقم کا انتظام کیسے ہو گا ارسلان؟ اس نے تو پچاس کروڑ ایسے مانگ لیے ہیں جیسے پچاس ہزار یا پچاس لاکھ ہوں۔''

''تم اتنی پریشان مت ہو۔ جب کوئی رقم کا مطالبہ کرنے کے لیے تم سے رابطہ کرے تو اس سے سودے بازی کی کوشش کرنا۔ عموماً اس طرح کے معاملات ایسے ہی بڑے مطالبوں سے شروع ہوتے ہیں اور پھر اغوا کرنے والے اپنی ڈیمانڈ سے بے حد کم رقم پر راضی ہو جاتے ہیں۔ ویسے تم کہو تو میں پولیس سے بات کروں؟ ہمارا اصل مجرم تو پولیس کی کسٹڈی میں ہی ہے۔ پولیس خود ہی اس سے اس معاملے میں بات کر لے گی۔''

''نہیں، میں صوفیہ کی زندگی کے لیے کوئی رسک نہیں لے سکتی۔ ہو سکتا ہے کہ ہمارا شکیل پر شک غلط ہو اور صوفیہ کو کسی دوسری پارٹی نے اغوا کیا ہو۔ اس طرح اس کے لیے خطرہ بہت بڑھ جائے گا۔''

میں نے ارسلان کی تجویز سے انکار کیا تو وہ شانے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے، جیسی تمہاری مرضی۔ میں ہر صورت میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تمہارے اس فیصلے کے بعد ہمارے پاس ہاتھ پر ہاتھ دھر کر انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا۔''

''میں نے یہ فیصلہ صوفیہ کی سیفٹی کے لیے کیا ہے۔'' میں نے اسے وضاحت دی۔ اس کے بعد واقعی ہمارے پاس ہاتھ پر ہاتھ دھر کے انتظار میں بیٹھنے کے سوا کوئی کام نہیں رہا۔

☆☆☆

میں نے وہ سارا دن گھر پر ہی گزارا۔ فیکٹری میں، میں نے اپنی سیکریٹری کو فون کر کے ناسازیِ طبع کا بہانہ بنا دیا تھا اور ہدایت دے دی تھی کہ اگر کوئی اہم بات ہو تو فون پر مجھ سے رابطہ کیا جا سکتا ہے۔ پورے دن میں اس کی صرف دو کالز

آئی تھیں۔ وہ ایک سمجھ دار لڑکی تھی اس لیے بہت سے معاملات اپنے طور پر بھی نمٹا لیتی تھی۔ ایک کال چچی کی بھی آئی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ انہیں ارسلان کے ذریعے صوفیہ کے غائب ہونے کی اطلاع مل چکی ہے لیکن چچا کا بلڈ پریشر بہت ہائی ہونے کی وجہ سے وہ اس موقع پر میرے پاس آنے سے قاصر ہیں۔ چچا کی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے انہوں نے انہیں صوفیہ والے معاملے کی خبر بھی نہیں دی تھی کہ کہیں ٹینشن کی وجہ سے ان کا بلڈ پریشر مزید شوٹ نہ کر جائے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ چچا کا خیال کریں اور میری طرف سے پریشان نہ ہوں۔ میرے پاس ارسلان موجود ہے۔ ہم دونوں مل کر ساری صورت حال سنبھال لیں گے۔ انہوں نے صوفیہ کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کرتے ہوئے فون بند کر دیا۔ وہ فون جس کا مجھے اور ارسلان کو انتظار تھا، شام میں تقریباً چھ بجے کے لگ بھگ آیا۔

''رقم کا انتظام ہو گیا؟'' میرے ہیلو کہتے ہی فون کرنے والے نے کھرکھراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''رقم بہت بڑی ہے۔ اتنی بڑی رقم کا انتظام کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔''

''تو ٹھیک ہے... پھر اپنی بہن کے کفن کا انتظام کر لو۔ میرا اندازہ [illegible] ہو۔ اس بار میں تمہیں [illegible] کے بجائے صوفیہ کے [illegible] بتاؤں گا۔'' میرے جواب پر اس نے نہایت سفاکی سے دھمکی دی۔

''پلیز... پلیز ایسا مت کرنا۔ میں صوفیہ کی رہائی چاہتی ہوں لیکن تمہاری ڈیمانڈ بہت زیادہ ہے۔ اتنی بڑی رقم کا انتظام کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔'' میں نے لجاجت سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''ایک فیکٹری کی مالکہ سے ایسی بات سننا کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔'' اس نے اپنی اسی کھرکھراتی ہوئی آواز میں طنز کیا۔

''فیکٹری کی مالکہ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ میرے اکاؤنٹ میں پچاس کروڑ روپے کی رقم یونہی پڑی ہو۔ بزنس میں روپیا ہمیشہ رولنگ میں رہتا ہے۔ اگر تمہارے پاس ذرا بھی عقل ہے تو یہ بات خود بھی سمجھ سکتے ہو۔ ویسے بھی بزنس کی صورت حال اب پہلے جیسی نہیں رہی۔ میرے پاپا کے انتقال کے بعد ہمارا بزنس بہت کم ہو گیا تھا اور ممی کے بعد تو صورت حال اور بھی خراب ہو گئی۔ میری ناتجربہ کاری کی وجہ سے شروع شروع میں کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ اب جا کر تو دوبارہ اسٹیبلش ہونا شروع ہوا ہے۔ ایسے میں، میں تمہیں پچاس کروڑ کی رقم کہاں سے فراہم کر سکتی ہوں؟ تم اپنی ڈیمانڈ میں کمی کرو۔'' حسب پروگرام میں نے اس سے مطالبہ کیا۔

''دیکھو مس تانیا! مجھے تمہاری مجبوری کی داستان سننے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں اپنی ڈیمانڈ بتا چکا ہوں۔ اس میں ایک روپے کی بھی کمی نہیں ہو گی۔ اگر تمہارے پاس رقم نہیں ہے تو اپنی فیکٹری بیچ دو۔'' بہت اطمینان سے مشورہ دینے کے بعد اس نے فون بند کر دیا۔ میں ''ہیلو ہیلو'' ہی کرتی رہ گئی۔ ارسلان جو اس دوران خاموش بیٹھا رہا تھا، سی ایل آئی پر آنے والا نمبر چیک کرنے لگا۔ کال موبائل سے کی گئی تھی۔ ارسلان نے اپنے موبائل سے اس نمبر پر کال ملائی۔ دوسری طرف سے موبائل آف تھا۔ اس نے مایوس ہو کر اپنا موبائل واپس جیب میں رکھ لیا اور میری طرف متوجہ ہوا۔

''کیا کہہ رہا تھا وہ؟''

''وہ اپنی ڈیمانڈ کم کرنے پر راضی نہیں ہے۔ مجھے مشورہ دے رہا تھا کہ میں رقم کے لیے فیکٹری بیچ دوں۔''

''واٹ ربش؟ فیکٹری بیچنا بچوں کا کھیل ہے کیا کہ آئس کریم کی طرح کھڑے کھڑے بیچ دی جائے۔'' میرا جواب سن کر ارسلان کو غصہ آ گیا۔ میں خود ایک صوفے پر سر تھام کر بیٹھ گئی۔

''ہاں ایس ایچ او صاحب! میں ایڈووکیٹ ارسلان بات کر رہا ہوں۔ کچھ اگلا اس کمینے نے؟'' کچھ دیر بعد ارسلان کی آواز سن کر میں نے سر اٹھایا۔ وہ فون پر بات کر رہا تھا۔

''چمڑی ادھیڑ دیں آپ اس کی۔ آپ کو ہر حال میں اس سے سچ اگلوانا ہے۔'' وہ بہت غصے میں ایس ایچ او کو ہدایات دے رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے موبائل لے کر آف کر دیا۔

''کیا حماقت کر رہے ہو ارسلان؟ اگر صوفیہ کے اغوا کے پیچھے شکیل کا ہی ہاتھ ہے تو اس پر تشدد سے اس کے ساتھی بھڑک کر صوفیہ کو کوئی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ دوسری صورت میں فضول میں اس بے چارے کے ساتھ زیادتی ہو جائے گی۔''

''دوسری کوئی صورت ہو ہی نہیں سکتی تانیا! ساری صورت حال تمہارے سامنے ہے اور صاف پتا چل رہا ہے کہ یہ شکیل کی ہی حرکت ہے۔ تم دوسری کسی صورت کے بارے میں سوچ بھی کیسے سکتی ہو؟'' میری بات سن کر وہ جھنجلایا۔

''میں نے صرف ایک امکان کی بات کی ہے۔ بہرحال، اصل بات سامنے آنے تک ہم کوئی حتمی فیصلہ نہیں

www.pkdigest.com

دے سکتے۔'' میرا اپنا ذہن الجھا ہوا تھا۔ کئی باتیں ذہن میں چکرا رہی تھیں۔ ایک طرف یہ خیال تھا کہ اگر یہ شکیل کی ہی حرکت ہے تو اس نے اتنی آسانی سے خود کو پولیس کی گرفت میں کیوں آنے دیا؟ دوسری طرف یہ سوچ بھی ذہن میں آتی تھی کہ وہ منظر بر رہ کر یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ اس معاملے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ وہ تو خود مظلوم ہے جسے غلط شک کے تحت تھانے میں بند کر دیا گیا ہے۔ اسی ادھیڑبن میں وقت گزرتا چلا گیا۔ پریشانی کے ہی عالم میں، میں نے اور ارسلان نے تھوڑا بہت کھانا زہر مار کیا۔ ملازمین کو ہم نے اس معاملے کی ہوا نہیں لگنے دی تھی، اس طرح بات لیک آؤٹ ہو سکتی تھی اور کڈنیپرز کی دھمکی کو سامنے رکھتے ہوئے میں کسی صورت ناوان والی بات پولیس تک نہیں پہنچنے دینا چاہتی تھی۔ اپنے طور پر بے شک ملازمین نے یہ اندازہ تو لگا لیا ہوگا کہ ہم لوگ کسی وجہ سے پریشان ہیں لیکن ظاہر ہے، سوال کرنے کی ان میں جرأت نہیں تھی۔ انتظار کی سولی پر لٹکے مزید چند گھنٹے اور گزر گئے۔ رات ساڑھے گیارہ بجے ایک بار پھر فون کی گھنٹی بجی اور وہی کھڑکھڑاتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''ہاں... تو کیا فیصلہ کیا تم نے؟''

''میں کوئی فیصلہ کیسے کر سکتی ہوں؟ تم اپنی ذہنیت سے ذرا نیچے آنے کو تیار نہیں ہو اور اس طرح اچانک فیکٹری بیچنا میرے لیے ممکن نہیں۔ فیکٹری اتنی آسانی سے تو نہیں بک سکتی۔ اس کے لیے پہلے اخبار میں اشتہار دینا ہوگا۔ پھر جو پارٹیز آئیں گی، ان سے بات چیت کر کے سودا کرنے میں بھی کچھ وقت لگے گا۔ یہ سارا پروسس کافی لمبا ہے اور اتنے لمبے عرصے کے لیے نہ تو تم انتظار کر سکتے ہو اور نہ ہی میں اپنی بہن کو تمہاری قید میں رہنے دینا چاہتی ہوں۔'' میں نے اس کی بات کا جواب دیا۔

''مجھے معلوم تھا کہ تم یہی سب کچھ کہو گی۔ اسی لیے میں نے خود ایک حل سوچ لیا ہے۔ تم فیکٹری صوفیہ کے نام کر دو۔'' اس کی بات پر مجھے زور کا جھٹکا لگا اور شک کا ایک ناگ سا ذہن میں سر سرایا۔ میری اس کیفیت سے بے خبر وہ اپنی ہی کہے جا رہا تھا۔

''فیکٹری صوفیہ کے نام منتقل کرنے میں تمہیں زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارا وہ دست راست ایڈووکیٹ ارسلان اس وقت بھی تمہارے ساتھ ہو گا۔ اس سے کہہ کر جلد از جلد کاغذات تیار کرواؤ۔ اس دوران میں بھی اپنے کاغذات تیار کروالوں گا۔ میری ایک تھرڈ پارٹی سے بات ہو گئی ہے۔ میں اس پارٹی سے تمہاری فیکٹری کا سودا کر لوں گا۔ صوفیہ تو ہے ہی میرے قبضے میں... وہ آرام سے سائن کر دے گی۔ بس اس طرح کرنے کے لیے مجھے صوفیہ کو کچھ زیادہ دن کے لیے اپنا مہمان رکھنا پڑے گا لیکن تم فکر نہ کرو، وہ میرے پاس بہت آرام سے رہے گی۔'' اس شخص نے اپنا سارا منصوبہ مجھے بتا دیا۔ میں ماؤف ہوئے ذہن کے ساتھ یہ سب سنتی رہی۔

''مجھے معلوم ہے کہ تمہارے لیے فوری طور پر فیصلہ کرنا مشکل ہوگا۔ میں تمہیں صبح تک کا وقت دیتا ہوں۔ اس دوران تم اچھی طرح سوچ لو کہ بہن اور فیکٹری میں سے تمہیں کیا چیز زیادہ عزیز ہے؟'' اس نے فون بند کر دیا۔

''اس بار ایک اور نئے نمبر سے فون کیا ہے خبیث نے۔ تم بتاؤ کیا کہہ رہا تھا وہ؟'' میرے بات کرنے کے دوران ارسلان نمبر چیک کر چکا تھا۔ میں نے فون بند کیا تو مجھ سے پوچھنے لگا۔ میں نے اسے ساری بات بتا دی۔

''دیکھا، میں کہہ رہا تھا نا کہ اس کام کے پیچھے شکیل کا ہی ہاتھ ہے۔ اس نے بہت چالاکی سے کام لیتے ہوئے اپنے بجائے صوفیہ کے نام فیکٹری کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ بیوی کی ملکیت پر اس کا بھی تو حق ہوگا۔ یہ تھرڈ پارٹی وغیرہ کی کہانی صرف خود پر سے شک ہٹانے کے لیے سنائی گئی ہے۔''

ارسلان بھی تقریباً اسی رخ پر سوچ رہا تھا جس رخ پر میں سوچ رہی تھی مگر میری سوچ کا ایک ایک زاویہ ایسا بھی تھا جس نے میرا دل بری طرح خراب کر دیا تھا۔ میں فی الحال وہ بات کسی سے شیئر کرنے کے بجائے خود اس پر اچھی طرح سوچنا چاہتی تھی اس لیے ارسلان سے بولی۔ ''تم گیسٹ روم میں جا کر تھوڑی دیر آرام کر لو۔ میں بھی کچھ دیر سونا چاہتی ہوں۔ صبح تک ویسے بھی ہمیں اب کچھ نہیں کرنا۔'' ارسلان نے خاموشی سے میری بات پر عمل کیا۔ میں بھی بستر پر جا کر لیٹ گئی لیکن نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ مختلف سوچوں میں گھرا میرا ذہن نیند کی آغوش میں جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ آخر کار صبح کے قریب میں ایک فیصلے پر پہنچ گئی۔ فیصلہ ہو گیا تو نیند بھی مہربان ہو گئی۔ دوبارہ میری آنکھ ساڑھے سات بجے کھلی۔ فریش ہونے کے بعد میں ناشتے کے لیے جا ہی رہی تھی کہ فون آ گیا۔

''مجھے تمہارا مطالبہ منظور ہے۔ میں آج ہی کاغذات تیار کرنے کے لیے کہہ دیتی ہوں۔ تم بعد میں فون کر کے مجھے بتا دینا کہ یہ کاغذات کہاں پہنچائے جائیں۔'' وہی مخصوص کھڑکھڑاتی ہوئی آواز سن کر میں نے اپنا فیصلہ سنایا اور اس کو مزید کوئی بات کرنے کا موقع دیے بغیر اس بار خود لائن ڈس کنیکٹ کر دی۔

☆☆☆

''تم سیریس پرسنٹ۔'' ناشتے کے دوران میں نے ارسلان کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تو اس نے حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہنڈرڈ پرسنٹ۔ میں اصل بات سمجھ چکی ہوں اس لیے یہ فیصلہ کیا ہے؟'' میں نے اطمینان سے جواب دیا تو ارسلان چونکا۔

''کیا مطلب؟''

''مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے ارسلان۔ میں صوفیہ سے بہت زیادہ محبت کا دعویٰ کرتی تھی لیکن حقیقت میں میرے دل میں کہیں سوتیلا پن موجود تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں ممی کی طرف سے اختیار مل جانے کے بعد صوفیہ کو پراپرٹی میں ففٹی پرسنٹ کا شریک بنا لیتی۔ لیکن میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ بات تھی کہ یہ ساری پراپرٹی میری ممی کی ہے اور مجھے اس میں صوفیہ کو برابری سے حصہ دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ صوفیہ کے شکیل سے شادی کے فیصلے کو بنیاد بنا کر میں نے اسے اس تھوڑے بہت حق سے بھی محروم کر دیا جس کے بارے میں پہلے میرا ارادہ تھا کہ میں صوفیہ کو دوں گی۔ یہ ساری صورت حال یقیناً صوفیہ کے لیے تکلیف دہ ہو گی۔ ایک تو اچانک ہونے والا یہ انکشاف کہ ہم دونوں سگی بہنیں نہیں ہیں، اس پر سے میرا اسے ہر شے سے محروم کر دینا... ان سب چیزوں نے مل کر اس کے دل میں میرے لیے نفرت پیدا کر دی ہو گی لیکن اس نے مجھ پر اپنی یہ نفرت ظاہر نہیں ہونے دی اور شکیل کے ساتھ مل کر ایک منصوبہ بنا لیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ میں اتنی بے وقوف نہیں ہوں کہ اس منصوبے کو سمجھ نہ سکوں۔ میں سب سمجھ چکی ہوں مگر پھر بھی چاہتی ہوں کہ فیکٹری صوفیہ کے نام کر دی جائے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ صوفیہ نے شکیل کے ساتھ مل کر خود اپنے اغوا کا ڈراما کیا ہے؟'' میری بات سن کر ارسلان نے حیرت سے پوچھا اور میرے اثبات میں سر ہلانے پر بولا۔ ''تم پھر بھی فیکٹری اس کے نام کرنے کو تیار ہو؟''

''ہاں، میں چاہتی ہوں کہ اپنی غلطی کی تلافی کر دوں۔'' میں نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اسے جواب دیا۔

''تم بہت عظیم ہو تانیا اور نہ سب کچھ سمجھ جانے کے بعد یہ فیصلہ کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔''

''نہیں، میں اتنی عظیم نہیں ہوں۔ صوفیہ کو میرے ساتھ کیے جانے والے اس دھوکے کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔'' تم فیکٹری اس کے نام ٹرانسفر کروانے کے ساتھ ساتھ طلاق کے پیپرز بھی تیار کرواؤ۔ میں فیکٹری اس کے نام کرنے سے پہلے شکیل سے طلاق نامے پر سائن کرواؤں گی۔ میری طرح صوفیہ کو بھی احساس ہونا چاہیے کہ لالچ کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ فیکٹری اپنے نام کروانے کے بعد جب اسے اس شخص کے بغیر رہنا پڑے گا جس سے اسے محبت ہے تو اسے معلوم ہوگا کہ ان مادی چیزوں کی کیا حقیقت ہوتی ہے؟''

میرا لہجہ بہت سرد تھا۔ ارسلان کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا اور پھر بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ جیسا تم چاہو ویسا ہی ہوگا۔''

ناشتے سے فارغ ہو کر وہ گھر سے روانہ ہو گیا۔ میں نے بھی گھر پر رکنا غیر ضروری سمجھا اور فیکٹری چلی گئی۔ فیکٹری میں مجھے عجیب سی اجنبیت کا احساس ہوتا رہا۔ اس فیکٹری میں ہمیشہ میں مالکانہ حق کے ساتھ گھومتی پھرتی تھی لیکن اب یہ کسی اور کی ہونے والی تھی۔ مجھے اپنے اس فیصلے پر کوئی افسوس نہیں تھا۔ اگر میں یہ فیصلہ نہیں کرتی تو ہو سکتا تھا کہ مایوس ہونے کے بعد شکیل اور صوفیہ اگلی بار مجھے قتل کرنے کی سازش کرتے۔ میرے بعد تو یقیناً صوفیہ کو ہی سب کچھ ملنا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ نفرت میں اس حد تک جاتی، بہتر تھا کہ میں اس کی طرف سے کی جانے والی محبت کی آزمائش پر ہی پسپائی اختیار کر لیتی۔

''میں نے طلاق نامہ تیار کروالیا ہے تانیا! اگر تم فوری طور پر شکیل سے اس پر سائن کروانا چاہتی ہو تو تھانے پہنچ جاؤ۔ میں بھی وہیں آ جاتا ہوں۔'' سہ پہر کے بعد مجھے ارسلان کی کال موصول ہوئی تو میں نے تھانے پہنچنے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ میں اور ارسلان تقریباً ساتھ ساتھ تھانے پہنچے۔ ایس ایچ او کے کمرے میں مجھے شکیل کی ماں اور اس کا چھوٹا بھائی جس کی عمر تقریباً چودہ پندرہ سال تھی، بیٹھے نظر آئے۔ مجھے دیکھ کر شکیل کی ماں فوراً کھڑی ہو گئی۔

''میرا بیٹا بے قصور ہے بیٹی! مجھے معلوم ہے کہ وہ ایسی حرکت کبھی نہیں کر سکتا۔ لالچ میں وہ اتنا اندھا نہیں ہو سکتا کہ جرم کی راہ پر چل پڑے۔ تمہیں یقیناً کوئی بہت بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ میرے سامنے اپنے بیٹے کی صفائی پیش کر رہی تھیں۔

''ساری ماؤں کو اپنے بیٹے اتنے ہی معصوم نظر آتے ہیں بی بی! تم کوئی انوکھی بات نہیں کر رہی ہو لیکن ہم نے بھی ثبوتوں کے ساتھ تمہارے بیٹے پر ہاتھ ڈالا ہے، ایسے ہی بلاوجہ اسے تھانے میں بند نہیں کر دیا۔'' ایس ایچ او نے جھڑکنے والے انداز میں ان سے یہ بات کہی تو ان کی آنکھوں میں ٹھہرے آنسو رخساروں پر بہنے لگے۔

www.pkdigest.com

"شکیل کو یہاں بلوائیں ایس ایچ او صاحب! میں اس سے بات کرنا چاہتی ہوں۔" شکیل کی والدہ اور ایس ایچ او میں سے کسی کی بھی بات پر تبصرہ کیے بغیر میں نے ایس ایچ او سے کہا تو اس نے ایک سپاہی کو آواز لگا کر اس سے شکیل کو لانے کو کہا۔ شکیل اس انداز میں وہاں لایا گیا کہ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگی تھی اور وہ کچھ لڑکھڑا کر چل رہا تھا۔ مار پیٹ اور تشدد کے باعث اس کا لباس جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا اور اس کے پھٹے ہوئے لباس پر کہیں کہیں خون کے دھبے نظر آرہے تھے۔ اسے دیکھ کر اس کی والدہ تیزی سے آگے بڑھیں اور اسے اپنے گلے سے لگا کر رونے لگیں۔ وہ بھی اپنی ماں کے ساتھ رونے میں شریک ہوگیا اور بڑی رقت سے بولا۔ "مجھے معاف کر دیں امی! میں نے آپ لوگوں کو نظر انداز کر کے اپنے اچھے مستقبل کے لالچ میں صوفیہ سے شادی کی اور نتیجے میں اس حال کو پہنچ گیا۔ مجھے یقیناً آپ کی بددعا لگی ہے۔"

"نہیں میرے بچے! ماں کبھی اپنی اولاد کو بددعا نہیں دیتی۔ میں تو ہمیشہ تیرے لیے دعا ہی کرتی رہتی ہوں۔" وہ اسے چومتے ہوئے تڑپ کر بولیں۔

"اوئے بند کرو تم بابے اس فلمی سین کو۔ تمہارے ان ڈراموں کو دیکھنے کی فرصت نہیں ہے ہمارے پاس۔" ایس ایچ او نے کڑکتی ہوئی آواز میں حکم دیا۔ اپنے افسر کا اشارہ پا کر ایک سپاہی ان دونوں کی طرف بڑھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنے ہاتھ سے انہیں ایک دوسرے سے دور کرتا، شکیل کی والدہ خود ہی اس سے الگ ہوگئیں۔ آنسو البتہ بدستور ان کی آنکھوں میں تھے۔ خود شکیل بھی ابھی تک بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ اس نے اپنے ہتھکڑی لگے دونوں ہاتھ سر پر اس طرح رکھ لیے تھے کہ اس کا آدھا چہرہ چھپ گیا تھا۔ شاید تھانے میں اس کی ضرورت سے کچھ زیادہ ہی مار لگی تھی جس کی وجہ سے اس کی حالت پتلی ہوگئی تھی یا پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ ڈراما کر رہا ہو۔ حقیقت جو بھی تھی، مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں جس کام کے لیے آئی تھی مجھے وہی کرنا تھا۔ میرے اشارے پر ارسلان نے اپنے بیگ سے طلاق کے پیپر نکال کر میز پر رکھے۔

"سائن کرو اس پر۔" میں نے شکیل کو حکم دیا تو وہ رونا چھوڑ کر میری طرف متوجہ ہوا اور پوچھا۔

"کیا ہے یہ؟"

"طلاق نامہ... تمہیں صوفیہ کو طلاق دینی ہے۔" میں نے سرد مہری سے بتایا۔

"اس کا مطلب ہے کہ صوفیہ آپ لوگوں کے پاس ہے اور آپ مجھے پھنسا کر زبردستی طلاق دلوانا چاہتے ہیں۔"

"میں تمہاری کسی بات کا جواب دینے کی پابند نہیں ہوں۔ سیدھی طرح اس پر سائن کرو ورنہ ساری زندگی اسی طرح سڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔" میں نے اس کے حلیے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دھمکی دی۔

"سائن کر دو بیٹا! یہ پیسے والے لوگ ہیں۔ ہم ان سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔"

شکیل کی ماں نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے سمجھایا تو اس نے مجھے گھورتے ہوئے طلاق نامے پر سائن کر دیے اور سائن کرنے کے بعد بولا۔ "اگر میں صوفیہ سے بے زار نہ ہو چکا ہوتا تو آپ کی دھمکی پر بھی اسے طلاق دینے کے لیے راضی نہیں ہوتا۔"

میں نے اس کی بات کا جواب دینا پسند نہیں کیا اور طلاق نامہ اٹھا کر ارسلان کے حوالے کر دیا۔

"اب تو یہ لوگ میرے بیٹے کو چھوڑ دیں گے نا بیٹی؟ تم ایس ایچ او صاحب سے کہو کہ وہ شکیل کو میرے ساتھ جانے دیں۔" شکیل کی والدہ دیکھ رہی تھیں کہ ایس ایچ او صرف ایک تماشائی بنا بیٹھا ہے اور اس کمرے میں ہونے والی ساری کارروائی میری مرضی سے ہو رہی ہے، اس لیے وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"ابھی نہیں... پہلے صوفیہ گھر آجائے پھر۔ اس کے واپس آنے تک شکیل کو یہیں رکنا ہوگا۔" میں نے انہیں جواب دیا اور پھر ایک لمحہ بھی رکے بغیر وہاں سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

آگے کے مراحل بہت تیزی سے طے ہوئے۔ میں نے فیکٹری صوفیہ کے نام کر دی۔ اس دوران فون پر اس کھڑکھڑاتی آواز والے شخص کا مجھ سے رابطہ رہا۔ اس پر یہ بات ظاہر کیے بغیر کہ میں اصل سازش کو سمجھ چکی ہوں، میں اس کی ہدایات پر عمل کرتی رہی۔ اس کے حکم پر میں نے فیکٹری کے کاغذات ایک پی او بکس پر بذریعہ ڈاک بھجوا دیے۔ اگر میں چاہتی تو اس موقع پر پولیس کو انوالو کر کے اس سازش میں شریک افراد کو گرفتار کروا سکتی تھی لیکن میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ حالانکہ ارسلان نے تو میری اس سلسلے میں رائے جاننے کی بھی کوشش کی تھی لیکن پھر شاید میری دلچسپی نہ دیکھ کر اس نے خاموشی اختیار کر لی۔ کاغذات بھجوانے کے کچھ عرصے بعد صوفیہ واپس گھر آگئی۔ میرا سامنا ہونے پر وہ بہت والہانہ انداز میں مجھ سے گلے لگ کر ملی مگر میرا انداز سرد ہی تھا۔

"تمہارے گھر واپس آجانے کی خوشی میں، میرے پاس تمہیں دینے کے لیے ایک تحفہ ہے۔" وہ مجھ سے الگ ہوئی تو میں نے اس سے کہا اور ایک بند لفافہ اسے تھما دیا۔ اس لفافے میں اس کا طلاق نامہ تھا۔ اس نے بہت اشتیاق سے لفافہ کھولا اور اس میں سے برآمد ہونے والا طلاق نامہ دیکھ کر بنا کچھ کہے ایک جھٹکے سے مڑی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اس دن کے بعد سے میرا اور اس کا بس آتے جاتے ہی ایک دوسرے سے سامنا ہو جاتا تو ہو جاتا، ورنہ ہم میں سے کوئی بھی اب شاید آپس میں بات کرنے کا خواہش مند نہیں تھا۔ میں فیکٹری کی مصروفیت ختم ہونے کے بعد فی الحال فارغ تھی۔ اب دل بھی نہیں چاہتا تھا دوبارہ ان بکھیڑوں میں الجھنے کا۔ یہی خواہش ہوتی تھی کہ سکون سے گھر میں رہ کر ایک عام عورت کی زندگی گزاری جائے لیکن یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ اس سلسلے میں ارسلان کی طرف سے کوئی پیش رفت ہو۔ ہماری اس سلسلے میں آپس میں کبھی کوئی واضح بات نہیں ہوئی تھی۔ بس گہری دوستی تھی اور جس طرح ارسلان ہر معاملے میں میرا خیال رکھتا تھا، اس سے مجھے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے لیکن آج کل شاید وہ بہت زیادہ مصروف تھا، اس لیے مجھ سے ملاقات کا بھی وقت نہیں نکال پا رہا تھا۔ میرے شب و روز اس فراغت اور تنہائی کی وجہ سے بہت بوریت میں گزرنے لگے تھے۔ بے تحاشا مصروفیات کی وجہ سے مجھے وہ دوستیاں بنانے اور نبھانے کا موقع بھی نہیں مل سکا تھا کہ میں اس بوریت کو دور کرنے کے لیے دوستوں کی کمپنی کا ہی فائدہ اٹھا لیتی۔ اپنی اس بوریت سے گھبرا کر ایک دن میں چچا اور چچی سے ملنے جا پہنچی۔ ارسلان گھر پر نہیں تھا۔ تھوڑی دیر ان دونوں کے ساتھ گزار کر میں واپس گھر آگئی۔ گھر واپس پہنچی تو مجھے پورٹیکو میں ارسلان کی پرانی مہران کھڑی نظر آئی۔

"ارسلان صاحب کب آئے؟" میں نے اندر جاتے ہوئے ایک ملازمہ سے سامنا ہونے پر اس سے پوچھا۔

"کافی دیر ہوگئی جی۔ آپ کے گھر سے نکلتے ہی آگئے تھے۔" اس نے اطلاع دی تو مجھے حیرت ہوئی کہ وہ اتنی دیر سے آیا ہوا ہے اور فون کر کے مجھے اطلاع تک نہیں دی۔

"ارسلان صاحب، صوفیہ بی بی کے کمرے میں ہیں جی۔ ان دونوں نے کھانا بھی وہیں کھایا ہے۔" مجھے سوچ میں ڈوبے دیکھ کر ملازمہ نے اطلاع دی۔ اس کے لہجے سے مجھے ایسا لگا کہ اس نے جان بوجھ کر یہ بات بتائی ہے۔ وہ ہماری بہت پرانی ملازمہ تھی اور مجھ سے خاصی انسیت رکھتی تھی۔ اس کے انداز نے مجھے ٹھٹکا دیا اور میں بے ساختہ ہی صوفیہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ دروازے پر پہنچتے ہی مجھے اندر سے ابھرنے والی ہنسی کی آوازیں سنائی دے گئیں۔ میں نے ناب گھما کر آہستہ سے تھوڑا سا دروازہ کھولا۔ اب میں اندر سے آتی آوازیں زیادہ بہتر طریقے سے سن سکتی تھی۔

"میں ایک ایک دن گن گن کر گزار رہا ہوں صوفیہ! تمہاری عدت کی مدت پوری ہوتے ہی ہم شادی کر لیں گے۔ اب مجھ سے تمہارے بغیر بالکل نہیں رہا جاتا۔" جذبات سے بوجھل یہ آواز ارسلان کی تھی۔ مجھے بالکل یقین نہیں آیا۔

"رہا تو اب مجھ سے بھی نہیں جاتا لیکن کچھ سوچا ہے کہ اس شادی کے لیے آپی کے سامنے کیسے بات کرو گے؟"

"تانیا کا کوئی مسئلہ نہیں۔ فیکٹری تمہارے نام ٹرانسفر ہو چکی ہے۔ اب تانیا سوائے چیخنے چلانے کے کچھ نہیں کر سکے گی۔" صوفیہ کے تشویش سے پوچھے گئے سوال کا اس نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔

"ویسے ترکیب بہت اچھی سوچی تم نے۔ اگر تم مجھے اصل بات نہیں بتاتے تو آپی تو مجھے صرف بیس فیصد حصہ دے کر تمام سے ہر چیز پر قابض ہو جاتیں۔ تم نے ہر اندازہ بالکل ٹھیک لگایا تھا۔ بے وقوف شکیل کو پھنسا کر اس سے شادی کرنے سے لے کر ہر ہر بات ویسے ہی ہوئی جیسے تم نے سوچی تھی۔ میں تو بھئی مان گئی کہ تم بہت جینئس ہو۔"

"نہیں یار! مجھ سے اندازے کی ایک غلطی تو بہرحال ہوئی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ تانیا تمہارے اغوا والی بات پر یقین کر لے گی اور جس طرح ہم اس کے سامنے حالات پیش کرتے رہے ہیں، اس کا شک صرف شکیل پر جائے گا لیکن اس نے بھانپ لیا کہ تم بھی اس سازش میں شامل ہو۔ وہ الگ بات ہے کہ وہ تمہیں شکیل کا ساتھی سمجھتی رہی اور اس کی اس غلط فہمی نے میرا کام آسان کر دیا۔ شکیل سے تمہیں طلاق دلوانے کے لیے مجھے پاپڑ نہیں بیلنے پڑے اور سارا کام خود تانیا نے کر دیا۔" اپنی بات کے اختتام پر ارسلان زور سے ہنسا۔

ادھر میرا یہ حال تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ میں اب تک جس پر بھروسا کرتی رہی تھی، وہی میرے ساتھ دھوکا کرتا رہا اور ایک بے تصور شخص کو پھنسوا دیا تھا۔ بے چارہ شکیل ابھی تک تھانے میں ہی بند تھا۔ اس کے خلاف کوئی مقدمہ دائر کیے بغیر، کسی عدالت سے سزا ملے بغیر اسے یوں قید میں رکھنا بھی ارسلان کے تعلقات اور پیسے کے بل بوتے پر ممکن ہوا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ چار چھ ماہ وہ حوالات میں بند رہ کر اپنے کیے

www.pkdigest.com

کی سزا بھگت لے تو پھر اسے چھوڑا جائے مگر اب مجھے سمجھ آرہا تھا کہ میں اَن جانے میں کسی اور کی آلۂ کار بنی ہوئی تھی۔

''چچا نے بھی خوب ایکٹنگ کی۔ فون پر وہ اتنی اچھی آواز نکالتے تھے کہ میں سامنے بیٹھی ہونے کے باوجود یقین نہیں کر پائی تھی کہ یہ چچا ہی بات کررہے ہیں۔'' اندران دونوں کی گفتگو جاری تھی۔

''ابو کو خود ظہیر انکل کی موت کا بہت غم ہے۔ اپنی زندگی میں وہ ہم لوگوں کو کافی سپورٹ کیا کرتے تھے لیکن آخری دنوں میں ان کا حال اچھا نہیں تھا۔ شائلہ آنٹی نے ان سے سارے اختیارات چھین لیے تھے۔ ابو شائلہ آنٹی کو ہی ظہیر انکل کی موت کا ذمے دار سمجھتے ہیں۔ اس لیے ان کے نزدیک یہ بات بالکل صحیح تھی کہ شائلہ آنٹی کی بیٹی سے وہ فیکٹری چھین لی جائے جس سے انہوں نے ظہیر انکل کو محروم کیا تھا۔'' ایک ایک کرکے سارے پردے میری نظروں کے سامنے سے ہٹتے جارہے تھے۔ میں مسلسل اپنوں ہی کے ہاتھوں بے وقوف بنتی رہی تھی۔ صوفیہ اور ارسلان یقیناً پہلے سے ایک دوسرے کی محبت میں مبتلا تھے لیکن بغیر دولت کے صوفیہ سے شادی کرنا ارسلان کو ایک گھاٹے کا سودا لگا ہوگا۔ اس لیے وہ حقیقت جو میں نے ایک دن شکیل کے سامنے بیان کی تھی، وہ ارسلان پہلے ہی اس کے علم میں لے آیا اور اسے اپنا ہم نوا بنا کر ساری سازش تیار کرڈالی۔ یہ سب جان لینے کے بعد مجھ میں مزید برداشت کی ہمت نہیں رہی اور میں زوردار آواز میں پورا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ وہ دونوں سامنے بیڈ پر اس انداز میں بیٹھے ہوئے تھے کہ صوفیہ کا سر ارسلان کے شانے پر تھا اور وہ اس کے کھلے بالوں کی ایک لٹ اپنی انگلی میں لپیٹے ان سے کھیل رہا تھا۔ مجھے سامنے پاکر وہ دونوں گھبرا کر ایک دوسرے سے دور ہوگئے۔

''مجھے تم دونوں سے کوئی بات نہیں کرنی۔ تم دونوں ابھی اس گھر سے نکل جاؤ اور آئندہ کبھی مجھے اپنی شکل مت دکھانا۔ میرے خیال میں تمہیں اس کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔ فیکٹری، انڈسٹری اپارٹمنٹ اور اچھا خاصا کیش، سب ہی کچھ تو ہے تم لوگوں کے پاس۔ ان سب چیزوں کے لیے تو میرے خونی رشتوں نے مجھ سے دھوکا کیا ہے۔ اب جاؤ اور ان چیزوں کے ساتھ خوش رہو۔'' میں نے انہیں کچھ بھی کہنے کا موقع دیے بغیر حکم دیا تو وہ دونوں سر جھکائے ہوئے وہاں سے باہر نکل گئے۔ میں دکھی دل کے ساتھ اپنے کمرے میں آگئی۔ ساری بات مجھے اچھی طرح سمجھ آگئی تھی۔ ارسلان جو بچپن سے مجھے جانتا تھا اور میری فطرت کے سارے رنگوں سے واقف تھا، اس نے بہت سوچ سمجھ کر یہ چال چلی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ میں جلد جذباتی ہوجاتی ہوں اس لیے ہر اس رخ سے مجھ پر وار کیا جس سے میرے جذبات میں ہلچل مچائی جاسکے۔ پہلے صوفیہ کی ایک نامناسب لڑکے سے شادی، پھر اس کی ازدواجی زندگی میں گڑبڑ کا تاثر اور اس کے بعد اس کے اغوا کا ڈراما۔ یہ سب حربے ایسے تھے کہ میں جذباتی ہوکر صوفیہ کی جان بچانے کی خاطر فیکٹری اس کے نام کرسکتی تھی۔ میں نے کسی حد تک اگرچہ اس سازش کو سمجھ لیا تھا لیکن میری عجیب وغریب فطرت نے مجھ سے وہی فیصلہ کروایا جو وہ لوگ چاہتے تھے۔ مجھے مالی نقصان کا دکھ نہیں تھا۔ یہ گھر، ممی کے زیورات اور بینک میں موجود رقم اب بھی ایک اچھی زندگی گزارنے میں میری مدد کرسکتے تھے لیکن میں رشتوں کے معاملے میں جس طرح اچانک تہی داماں ہوگئی تھی، یہ چیز مجھے بہت دکھ پہنچا رہی تھی۔ اپنے اس دکھ کے دوران مجھے شکیل یاد آیا۔ وہ بے چارہ فضول میں ہی بلاقصور سزا بھگت رہا تھا۔ میں نے ایس ایچ او کو فون کرکے اس کی رہائی کی ہدایت دی اور ذرا سا سکون محسوس کرتے ہوئے تکیے پر سر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

''میڈم! ایک صاحب آئے ہیں۔ آپ نے آؤٹ ڈور کاموں کے لیے ایک میل ورکر کی ضرورت کا جو اشتہار دیا تھا، اس کے سلسلے میں انٹرویو دینے۔'' میں اپنے آفس میں بیٹھی ایک ضروری فائل دیکھ رہی تھی کہ کاؤنٹر پر موجود لڑکی نے انٹرکام پر مجھے اطلاع دی۔ ایک گھریلو زندگی کی خواہش کو ترک کرنے میں ایک بار پھر میدانِ عمل میں اتر آئی تھی۔ بہت بڑے کاروبار کے لیے نہ تو میرے پاس سرمایہ تھا اور نہ ہی ہمت، اس لیے میں نے ایک بوتیک کھول لیا تھا۔ شہر کے معروف اور مہنگے ترین شاپنگ سینٹر میں قائم کردہ اس بوتیک سے متعلق بہت سے آؤٹ ڈور کام ایسے تھے جن کے لیے مجھے خود ہی بھاگ دوڑ کرنی پڑتی تھی۔ میں نے سوچا کہ اس کام کے لیے ایک میل ورکر رکھ لیا جائے۔ چنانچہ اخبار میں اشتہار دے دیا۔ اخبار میں اشتہار چھپنے کے بعد نتیجے میں کل دو لڑکے انٹرویو دینے آئے تھے لیکن مجھے وہ اتنے زیادہ ذمے دار نہیں لگے تھے کہ کام کو پوری طرح سنبھال سکیں۔ اب ایک اور شخص انٹرویو دینے کے لیے آیا تو میں نے اسے اندر بلوالیا۔ وہ شخص دروازہ ناک کرکے اندر آیا تو میں اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ہم دونوں کی نظریں بہ یک وقت ایک دوسرے سے ملیں اور ہم دونوں ہی چونک گئے۔

''سوری! میں یقیناً غلط جگہ آگیا ہوں۔'' وہ فوراً واپس پلٹنے لگا۔

''رک جاؤ شکیل! میں تم سے بات کرنا چاہتی ہوں۔'' میں نے اسے پکارا تو وہ ذرا جھجکتا ہوا واپس پلٹ کر میرے سامنے رکھی کرسی پر آبیٹھا۔

''جاب کی تلاش میں ہو؟''

''آپ کی مہربانی سے۔'' میرے نرمی سے پوچھے گئے سوال کا اس نے بے حد تلخی سے جواب دیا تو میں کچھ شرمندہ سی ہوگئی۔ یقیناً اتنے دن حوالات میں بند رہنے کے نتیجے میں وہ اپنی جاب سے محروم ہوگیا تھا۔

''سوری شکیل! وہ سب ایک غلط فہمی کے نتیجے میں ہوا۔ اب تک تو تم بھی حالات سے واقف ہوچکے ہوگے۔ تم اور میں ایک ہی سازش کا شکار ہوئے تھے مگر دیکھ لو، میں نے خود کو سنبھال لیا۔''

میری بہت نرمی سے کہی گئی اس بات نے اس کے چہرے کا تناؤ کم کردیا اور وہ آہستہ سے بولا۔ ''آپ کو سوری کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے ساتھ جو کچھ ہوا، میرے اپنے لالچ کے نتیجے میں ہوا۔ صوفیہ کی اپنی جانب پیش قدمی کو میں نے اس کی اوپن حیثیت دیکھتے ہوئے ہی قبول کیا تھا۔ حالانکہ میرا اپنی خالہ زاد سے رشتہ طے تھا اور میری والدہ کی شدت سے خواہش تھی کہ وہ اپنی بھانجی کو بہو بنائیں لیکن میں نے دولت کی چمک دمک کے سامنے اپنی ماں کی خواہش کو رد کردیا۔ آپ نے صوفیہ کے بارے میں جب یہ انکشاف کیا کہ وہ آپ کی دولت میں حصے دار نہیں ہے تو مجھے اس بات پر یقین نہیں آیا اور میں نے یہی سمجھا کہ آپ مجھے آزمانے کے لیے یہ سب کچھ کہہ رہی ہیں۔ شادی کے بعد صوفیہ کا رویہ میرے ساتھ بہت خراب تھا۔ وہ میرا، میرے گھر والوں سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتی تھی اور خود آزادانہ گھومتی پھرتی تھی۔ میں نے کئی بار خود اپنی آنکھوں سے اسے ارسلان کے ساتھ دیکھا مگر صرف اس لیے اس صورتِ حال کو برداشت کرتا رہا کہ ایک دن صوفیہ کے ذریعے مجھے ڈھیر ساری دولت مل جائے گی۔ دولت تو خیر کیا ملتی، بدنامی اور رسوائی کا سامنا کرنا پڑا۔ ساتھ ہی لگی بندھی نوکری بھی چلی گئی۔ اب میں جاب کی تلاش میں جوتیاں چٹخاتا پھر رہا ہوں۔ میری خالہ زاد کی پچھلے ہفتے کہیں اور شادی ہوگئی ہے۔ مجھے اس سے محبت نہیں تھی لیکن اس بات کا ضرور غم ہے کہ میں اپنی ماں کی دلی خواہش پوری نہیں کرسکا اور خود بھی دولت اور محبت دونوں سے محروم رہا۔ لالچ کے نتیجے میں، میں جس انجام سے دوچار ہوا ہوں، اس کے بعد تو اس لائق بھی نہیں رہا کہ اس لڑکی کو جس کے لیے میں نے اپنے دل میں محبت کا جذبہ محسوس کیا تھا، کم از کم ایک بار یہ بات بتا سکوں۔'' وہ بہت دل گرفتگی سے بتا رہا تھا۔ میرا دل نہ جانے کیوں اس بات پر بہت زور سے دھڑکا اور میں نے اپنے سامنے رکھے پیپر ویٹ کو انگلی کی مدد سے گھماتے ہوئے اس سے پوچھ لیا۔

''وہ لڑکی کون ہے؟''

''ہے ایک لڑکی... جسے میں نے زندگی میں بس ایک بار کھلے بالوں اور شوخ رنگ کی لپ اسٹک کے ساتھ دیکھا تھا اور دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ لیکن میں اسے یہ بات نہ تو جب بتا سکتا تھا اور نہ ہی اب بتا سکتا ہوں۔'' جھکی نظروں کے ساتھ وہ کچھ نہ بتانے کا کہہ کر سب کچھ بتا چکا تھا۔

''خیر، یہ تمہارا پرسنل معاملہ ہے۔ میں تمہارے ساتھ کی گئی زیادتی کی تلافی اس طرح کرسکتی ہوں کہ تم میرے پاس جاب کرلو۔ سیلری مناسب ہوگی اور وقت کے ساتھ ساتھ اس میں اضافے کے ساتھ دیگر سہولتیں بھی ملتی چلی جائیں گی۔'' میں نے ایک دم ہی اس بات کو ختم کرکے موضوع بدل دیا۔

''مجھے منظور ہے۔'' شکیل نے آہستہ سے کہا اور اٹھ کر باہر نکل گیا۔ میرا دل چاہا کہ میں اسے آواز دے کر روک لوں اور اسے بتاؤں کہ میرے دل میں بھی ایک شخص کی محبت نے گھر بنایا تھا لیکن اس وقت وہ شخص کسی اور لڑکی کی زلفوں کا اسیر نظر آتا تھا۔ میں اس صورتِ حال پر بہت جھنجلاتی اور یہ جھنجلاہٹ ہی تھی جس کی وجہ سے میں نے کلاس ڈفرینس کو بہانہ بنا کر اسے اس لڑکی کی زندگی سے دور رکھنا چاہا تھا۔ لیکن زندگی کی بساط پر کھیلی گئی میری یہ چال ناکام ہوکر مجھ پر ہی الٹ گئی تھی۔ دراصل محبت ہمیشہ ایثار اور قربانی مانگتی ہے۔ میں نے اور شکیل نے اس اصول کو نظرانداز کردیا تھا۔ اس صورت میں ہمیں شکست کا سامنا تو کرنا ہی تھا۔ صوفیہ اور ارسلان بہ ظاہر کامیاب ہوگئے تھے لیکن کون جانے وقت کے کس لمحے میں انہیں مکافاتِ عمل سے گزرنا پڑے۔ میری اور شکیل کی زندگیوں میں یہ وقت ذرا جلدی آگیا تھا۔ ممکن ہے، وقت کبھی ہماری اس لغزش کو معاف بھی کردے اور کبھی زندگی کے کسی موڑ پر ہم ایک دوسرے کے سامنے اپنی محبت کا اعتراف کرنے کے لائق ہوسکیں۔ البتہ صوفیہ اور ارسلان کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ انہیں جب بھی مکافاتِ عمل کے مرحلے سے گزرنا پڑا، ان کے پاس تلافی کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔

www.paksociety.com

شمن موسم

ایچ اقبال

موسم اچھا ہو ...مقام خوبصورت ہو اور ساتھ محبت کرنے والی ہستی ہو تو سیر وتفریح کا لطف دوبالا ہوجاتا ہے۔ ایک دلفریب موسم میں تفریح کرنے والے جوڑے کا قصہ ...ایک حادثے نے ان کے سارے پروگرام کو غلط کر دیا تھا۔

آپ کے پسندیدہ مصنف ایچ اقبال کی کوشش وکاوش بطور خاص آپ کے لیے سرورق کا دوسرا رنگ

جب پہاڑوں پر تفریح کا پروگرام بنا تو فلک بہت خوش ہوئی تھی لیکن جب دوپہر کو وہ وہاں پہنچے تو بہت بور ہوئی۔ پہاڑوں پر بھی وہ ایک گرم دن تھا۔

جب دونوں میاں بیوی ریسٹ ہاؤس پہنچے تو رافع نے کہا۔ ''پہاڑوں پر کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے۔ یہ بوریت زیادہ دیر نہیں رہے گی۔ بارش کا امکان نظر آرہا ہے۔ یقیناً موسم اچھا ہوجائے گا۔''

''جب اچھا ہوگا تو ہوگا۔'' فلک منہ بناتے ہوئے ریسٹ ہاؤس کی کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔

رافع بستر پر لیٹ کر اخبار پر نظر دوڑانے لگا جو اس نے کراچی سے راولپنڈی پہنچنے کے بعد ائرپورٹ سے لیا تھا۔ اسے سرخیوں میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی تو اس نے اخبار ایک طرف ڈال دیا اور پھر فلک کی آواز نے اسے چونکا بھی دیا۔

''ارے! یہ بھی یہاں آیا ہوا ہے۔'' فلک کی آواز ایسی تھی جیسے چونکی بھی ہو لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کے لہجے میں مسرت بھی تھی۔

''کون ہے؟'' رافع کہتا ہوا کھڑکی کی طرف بڑھا۔

وہ کھڑکی ایسے رخ پر کھلتی تھی کہ وہاں سے بل کھاتی ہوئی پتلی سی سڑک اور آس پاس بنے ہوئے ریسٹ ہاؤس دیکھے جاسکتے تھے۔

فلک کے ہونٹوں پر اب ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

''کون تھا؟'' رافع نے پھر پوچھا۔ اسے سڑک ویران نظر آئی تھی۔

''وہ اس طرف مڑ گیا۔'' فلک نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ''ادھر ہی کسی ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرا ہوگا۔''

''میں یہ پوچھ رہا ہوں جانِ من کہ وہ تھا کون؟ تم چونک کیوں گئیں؟''

''غیر متوقع طور پر نظر آیا تھا نا۔''

''تھا کون؟'' رافع اس مرتبہ چڑ سا گیا۔

فلک ہنسی۔ ''بتاؤں گی تو کڑھ جاؤ گے۔ شاید یہ کہو کہ بالکل بور یا بستر کسیں اور چلتے ہیں۔''

رافع کی پیشانی پر شکن پڑ گئی۔ ''سفیان؟'' اس کا لہجہ سوالیہ تھا۔

''دیکھا... خود ہی سمجھ گئے نا؟'' فلک اسے شرارتی نظروں سے دیکھنے لگی۔

رافع نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ''تو اس نے یہاں بھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا؟''

''کیسی بات کررہے ہو؟ وہ پیچھا کیوں کرے گا؟ اگر مجھے اس کا پروگرام معلوم ہوتا تو میں خود اس سے کہتی کہ ساتھ ہی چلو۔''

''رابطہ نہیں ہوا تھا اس سے؟'' رافع نے کھردرے لہجے میں پوچھا۔

''نہیں۔'' فلک نے محبت سے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ ''فون تو کیا تھا میں نے اسے لیکن اس نے کسی وجہ سے موبائل بند کیا ہوا تھا۔ میں نے گھر پر بھی ٹرائی کیا لیکن گھنٹی بجتی رہی، کسی نے فون نہیں اٹھایا۔ میں دوبارہ کوشش کر ہی نہیں سکی۔ تم نے پروگرام ہی اچانک بنایا تھا۔''

یہ بات ظاہر ہے کہ رافع بھی اتنی جلدی نہیں بھول سکتا تھا۔ اسے دفتر سے نکلتے ہی گرمی لگی تھی تو اسے اچانک کسی پہاڑی علاقے پر جانے کی سوجھی تھی۔ اس نے فوراً کار کا رخ ایک بکنگ آفس کی طرف کر دیا تھا۔ دو گھنٹے بعد ہی کی فلائٹ میں سیٹیں مل گئی تھیں۔ ٹکٹ لے کر گھر پہنچنے کے بعد ہی اس نے فلک سے تیار ہونے کے لیے کہا تھا۔ بہ مشکل ایک گھنٹا گزرا ہوگا کہ وہ گھر سے نکل کر ائرپورٹ روانہ ہوگئے تھے۔ راولپنڈی میں رات انہوں نے ایک ہوٹل میں گزاری تھی اور صبح ہوتے ہی ایک کار لے کر مری آگئے تھے۔ کار کے لیے رافع نے اپنے کسی دوست سے گزشتہ رات ہی کہہ دیا تھا۔

سفیان سے پہلی ملاقات رافع کو گراں نہیں گزری تھی۔ بہ قول فلک وہ اس کے کالج کا بہت بے تکلف دوست تھا۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ وہ دوستی رافع کو کھلنے لگی۔ سفیان اور فلک کو ایک دوسرے سے ملے بغیر چین ہی نہیں آتا تھا۔ اگر وہ ملتے نہیں تھے تو فون پر دیر تک نہ جانے کیا کیا باتیں کرتے رہتے تھے۔ ان کے اتنے لگاؤ کے باعث رافع کے دماغ میں کچھ ناروا سے خیالات کلبلانے لگتے تھے لیکن پھر فلک کی کسی بھی حرکتِ محبانہ سے اس کا دماغ ہلکا پھلکا ہوجاتا تھا۔ وہ اس سے اتنی ہی محبت کرتی تھی جیسے اس پر جان چھڑکتی ہو۔

اس وقت مری کے ریسٹ ہاؤس میں بھی اس نے اپنی بانہیں اتنی محبت سے رافع کے گلے میں ڈالی تھیں کہ اس کے کہنے کے مطابق رافع نے اسی وقت بوریا بستر لپیٹ کر کہیں اور جانے کے بارے میں نہیں سوچا۔

''آؤ اب کچھ دیر آرام کرلیں۔'' رافع نے فلک کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے بستر کی طرف لے جاتے ہوئے کہا۔

''میں سوچ رہی تھی کہ سفیان کا ریسٹ ہاؤس ڈھونڈا جائے۔''

''ہوگئیں بے قرار۔'' رافع نے ٹھنڈی سانس لی۔

''مزہ رہے گا رافع! ابھی تک اس کی شرارتیں نہیں گئیں۔''

''کیسے مل جائے گا اس کا ریسٹ ہاؤس؟ اس گرمی میں ابھی کوئی بھی باہر نہیں نکل رہا ہے۔ وہ یہاں ہے تو مل ہی جائے گا۔ مری میں شناساؤں سے مڈبھیڑ ہو جانے کا قوی امکان رہتا ہے۔''

بات معقول تھی۔ غالباً اسی لیے فلک نے اس بارے میں کچھ اور نہیں کہا۔ وہ بستر پر رافع کے ساتھ لیٹتے ہوئے بولی۔ ''کوئی مشروب پینے کو دل چاہ رہا ہے۔ چوکیدار کو آپ نے خواہ مخواہ چھٹی دے دی۔''

ریسٹ ہاؤس کا چوکیدار، خانساماں بھی تھا۔

رافع نے کہا۔ ''پہاڑوں پر تفریح کا ایک مزہ یہ بھی ہے کہ اپنے سارے کام خود کیے جائیں۔''

''میرا تو موڈ نہیں ہے کچھ کرنے کا۔'' فلک نے ایک ٹشو پیپر سے چہرے کا پسینا خشک کرتے ہوئے کہا۔

''میں بنا لاؤں؟'' رافع نے محبت سے پوچھا۔

''اب اترائیے نہیں، بس لیٹے رہیے۔'' فلک نے کہا اور اس کا بازو اپنی گردن کے نیچے رکھ لیا۔ اس کا یہی والہانہ انداز رافع کو سفیان کے بارے میں زیادہ سوچنے کا موقع نہیں دیتا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''اگر اس کے ساتھ مطربہ بھی ہوئی تو اور مزہ آئے گا۔''

مطربہ، سفیان کی بیوی تھی۔ جس طرح رافع کبھی کبھی سفیان سے چڑ جاتا تھا، اسی طرح مطربہ بھی فلک اور سفیان کی بے تکلفی سے کھسیانی تھی لیکن جس طرح فلک کچھ نہ کچھ کہہ کر رافع کا اکھڑا ہوا مزاج اعتدال پر لے آتی تھی، اسی طرح سفیان کو بھی کرنا پڑتا تھا۔

رافع بولا۔ ''ان دونوں کی شادی میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''کیوں؟''

رافع نے فوراً کچھ نہیں کہا۔

مطربہ کا تعلق فلمی دنیا سے تھا۔ ابتدا میں وہ صرف بیک سنگر تھی۔ شاید اسی رعایت سے اس نے اپنا نام مطربہ رکھ لیا ہو اور اس کا اصل نام کچھ اور ہو۔ بعد میں اس نے اداکاری بھی شروع کر دی تھی۔ اس کا شمار صف اول کی اداکاراؤں میں نہیں ہوتا تھا لیکن آئی وہ ہیروئن ہی کی حیثیت سے تھی۔

''جواب نہیں دیا آپ نے۔'' فلک کچھ توقف سے بولی۔ ''ان کی شادی آپ کی سمجھ میں کیوں نہیں آئی؟''

''بعض فلمی دنیا کی لڑکیوں کا دماغ عرش پر رہتا ہے۔ ان کے لیے پیسے والے آدمیوں کی کمی بھی نہیں ہوتی۔ پھر بھی اس نے کلیریکل جاب کرنے والے کو اپنا لیا۔''

''پیسے والے لوگ فلمی دنیا کی لڑکیوں کو داشتہ بناتے ہیں، بیوی بنا کر نہیں رکھتے، مطربہ بیوی بن کر رہنا چاہتی ہو گی۔'' فلک نے جواب دیا، پھر ہنس کر بولی۔ ''رہ گئی کلیریکل جاب کرنے والے کی بات، تو مجھے دیکھیے مصور ہوں میں اور شادی کر لی میں نے ایک ہتھوڑا مار کے سے۔''

رافع ہنس پڑا۔ وہ ایک بہت بڑے ادارے میں چیف انجینئر تھا۔

''ہتھوڑا مار کہا اچھا کہا تم نے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

فلک بھی دوبارہ ہنسی۔ ''تو کیا غلط کہا؟''

''اوہو!'' یکایک رافع نے اپنا ہاتھ فلک کی گردن سے نکالا اور اٹھتے ہوئے بولا۔ ''اندھیرا چھانے لگا ہے۔ شاید بادل آ رہے ہیں۔''

اس کے ساتھ فلک بھی کھڑکی تک چلی گئی۔

''ارے!'' اس کے منہ سے نکلا۔ ''بادل تو بہت گھر کر آئے ہیں۔ ابھی تو خاصی دھوپ تھی۔''

''پہاڑوں پر ایسا ہی ہوتا ہے۔ دھوپ چھاؤں کا خوب صورت کھیل۔''

یہ ایک اتفاق تھا کہ فلک پہلے کبھی پہاڑوں پر نہیں آئی تھی حالانکہ اس کا تعلق ایک آسودہ حال گھرانے سے تھا۔ اس کے والد بہت بڑے تاجر تھے۔

ہلکی سی پھوار کھڑکی سے اندر آئی تو رافع اور فلک بے اختیار کچھ پیچھے ہٹ گئے۔

پھر بادل گرجے، بجلی کڑکی اور موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ رافع نے جلدی سے کھڑکی بند کی۔ بارش کا رخ ایسا ہی تھا کہ سارا پانی اندر آتا۔

''اب مزہ آئے گا یہاں آنے کا۔'' فلک خوش ہو کر بولی۔ ''وہ گرمی وقتی بات تھی۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا۔ اب بنا لاؤ مشروب۔''

''اب تو موسم اچھا ہو گیا ہے۔ اب تو کچھ اور دل چاہ رہا ہے۔'' فلک کی نگاہوں میں شوخی تھی۔

''اچھا!'' رافع ہنسا۔ اس نے فلک کی آنکھوں کا مطلب سمجھ لیا تھا۔

وہ جو مطلب تھا، اس کی وضاحت کے بعد فلک نے اٹھ کر کمرے میں رکھا ہوا چھوٹا سا فریج کھولا۔ دودھ کی بوتل انہوں نے اسی میں رکھی تھی۔ صاف ستھرے گلاس ایک چھوٹی سی ٹرے میں فریج کے اوپر رکھے ہوئے تھے۔

گلاسوں میں دودھ نکالتے نکالتے فلک یکایک چونکی۔

''ارے!'' اس کے منہ سے نکلا۔ ''شربت کی بوتل تو یہیں رکھی ہے آپ نے۔''

کونے کی ایک چھوٹی سی تپائی پر رکھی ہوئی شربت کی بوتل بستر سے اس لیے دکھائی نہیں دی تھی کہ اس کے آگے بھی کچھ سامان رکھا ہوا تھا۔

''حد کر دی آپ نے!'' فلک پھر بولی۔ ''جب شربت پینے کو دل چاہا تھا تو میں اس لیے نہیں اٹھی تھی کہ کمرے سے نکل کر کچن تک جانے کو دل نہیں چاہا تھا۔ میں یہی سمجھی تھی کہ دوسرے سامان کے ساتھ یہ بوتل بھی آپ وہیں رکھ آئے ہوں گے۔''

''بس یہ بوتل ہی یہاں رکھ دی تھی لیکن یاد نہیں رہا تھا کہ تمہیں بتا دیتا۔''

''اچھا ہوا کہ آپ انجینئر ہیں۔ شاعر ہوتے تو اور زیادہ بدحواس رہتے۔''

رافع ہنس کر رہ گیا۔

فلک نے گلاسوں میں دودھ نکال کر اس میں شربت بھی ملا کر گھولا۔

ایک گلاس رافع کو دیتے ہوئے وہ بولی۔ ''اب ذرا کھڑکی کھول لیجیے! بارش تو اب بہت ہلکی ہو چکی ہے۔''

''ابھی پھوار تو پڑ رہی ہو گی۔ پانی تو اندر آئے گا۔''

''شاید ہوا کا رخ بدل گیا ہو۔''

فلک کا خیال درست ثابت ہوا۔ کھڑکی کھولنے پر بوچھار اندر نہیں آئی۔ اب سڑک بھی سنسان نہیں تھی۔ کچھ لوگ چھتریاں لے کر موسم سے لطف اندوز ہونے کے لیے باہر نکل پڑے تھے۔

''ایک غلطی ہو گئی۔'' رافع نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ ''ریسٹ ہاؤس آنے سے پہلے خاصی خریداری کر ڈالی تھی لیکن چھتری لینا بھول گیا۔''

''اتنے بدحواس ہیں آپ تو انجینئری کیسے کرتے ہوں گے؟'' فلک نے منہ چڑانے والے انداز میں کہا۔ ''بور ہی کر دی آپ نے! چھتری ہوتی تو ہم بھی باہر نکل کر...''

بادلوں کی گرج اتنی زور کی تھی کہ فلک اپنی بات پوری نہیں کر سکی۔

بارش یکایک پھر تیز ہونے لگی۔ سڑکوں پر ٹہلنے والوں نے اپنے اپنے مسکنوں کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔

''دیکھا!'' رافع ہنس کر بولا۔ ''اگر چھتری ہوتی تو ہمارا بھی یہی حال ہوتا۔''

کون کہتا ہے کہ؟

اولاد نہیں ہو سکتی

آج بھی لاکھوں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ مایوسی گناہ ہے۔ انشاء اللہ اولاد ہو گی۔ خاتون میں کوئی اندرونی پرابلم ہو یا مردانہ جراثیم کا مسئلہ۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کیا ہے۔ جو آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھلا سکتا ہے۔ آپ کے گھر میں بھی خوبصورت بیٹا پیدا ہو سکتا ہے۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر تمام حالات سے آگاہ کر کے بذریعہ ڈاک وی پی VP بے اولادی کورس منگوائیں۔

المسلم دارالحکمت رجسٹرڈ (دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد۔ پاکستان

0300-6526061

0547-521787

فون اوقات

صبح 9 بجے سے رات 11 بجے تک

آپ ہمیں صرف فون کریں

دوائی آپ تک ہم پہنچائیں گے

”بہت اچھے۔“ فلک نے خوش گوار لہجے میں کہا۔ ”اپنی بدحواسی کو سنبھالا دینے کی کوشش کرنے لگے۔“

بارش اب اور تیز ہو گئی تھی لیکن رخ ایسا تھا کہ وہ دونوں کھڑکی میں کھڑے رہ کر نظارہ کر سکتے تھے۔ سڑک اب پھر سنسان ہو گئی تھی۔ وہ دونوں شربت ملا ہوا دودھ پیتے اور موسم پر تبصرے کرتے رہے۔

شام تک بارش کا سلسلہ یونہی جاری رہا۔ کبھی بہت تیز، کبھی پھوار، حتمی طور پر اندھیرا پھیلنے کے بعد رکی۔

”اب باہر نکل سکتے ہیں۔“ رافع بولا۔ ”بادل چھٹ گئے ہیں۔“

”اب تو میں نہیں نکلوں گی۔“ فلک نے کہا۔ ”پانی کا شور دیکھ رہے ہیں، کتنا ہے اور سڑک پر بھی بہہ رہا ہے۔“

”یہ صورت حال تو ابھی خاصی دیر رہے گی۔ اوپر کا سارا پانی تو نیچے ہی کی طرف آتا ہے۔“

”جب تک یہ حال ہے، اس وقت تک میں باہر نہیں نکلوں گی۔“

”تو چلو اتنی دیر میں کچھ کھا پی لیا جائے۔“

”ہاں بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے۔“

ان دونوں نے کچن کا رخ کیا۔

”سب کچھ فریج میں رکھ دیا تھا میں نے۔“ رافع بولا۔ ”مائیکرو ویو اوون میں گرم کر لیں گے۔“

کچن میں داخل ہو کر فلک نے فریج کھولا۔

”او، گاڈ!“ اس کے منہ سے نکلا۔

”کیا ہوا؟“ رافع نے شیرمال کا پیکٹ کھولتے کھولتے، رک کر فلک کی طرف دیکھا۔

”سب ختم ہو گیا ہوگا۔“ فلک نے بجلی کا وہ بٹن دباتے ہوئے کہا جہاں فریج کا پلگ لگا ہوا تھا۔ ”پتا نہیں کب سے بند پڑا ہے یہ۔ اب چیزیں رکھنے سے پہلے اسے آن تو کر دیتے۔“

رافع لپک کر قریب آ گیا۔

فلک فریج میں سے ایک ایک چیز نکال کر سونگھنے لگی۔ وہ منہ بھی بناتی جا رہی تھی۔ رافع فکرمندی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”ہر چیز میں بو آ گئی ہے۔“ فلک نے مایوسانہ انداز میں کہا۔

رافع شیرمال کا پیکٹ سنبھالے سنبھالے قریب آ گیا تھا۔ اس نے بھی کوئی چیز نکال کر سونگھی۔

فلک بولی۔ ”یہ نہ جانے کب سے بند پڑا ہوا ہوگا۔ آپ یہ بھی نہیں دیکھ سکے کہ اسے کھولتے وقت اس کا بلب جلا، یا نہیں۔“

”میرے دماغ میں شاید یہ بات ہو کہ اس کا بلب فیوز ہو گیا ہوگا۔“

”اب اپنی حماقت کا جواز مت تراشیں۔ آج یہ بھی دیکھ لیں گے کہ پہاڑوں پر ایک رات کا فاقہ کیا مزہ دیتا ہے۔“

فلک نے فریج میں رکھی ہوئی چیزیں نکال نکال کر پھینکنا شروع کر دیں۔

”انڈے تو خراب نہیں ہوئے ہوں گے!“ رافع نے کہا۔ ”شیرمال باہر ہی تھے۔ انہیں گرم کر کے انڈے تل لیں گے۔“

”انڈے تو میں آپ کو ہرگز نہیں کھانے دوں گی۔“ فلک نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”کولیسٹرول بڑھا ہوا ہے آپ کا۔“

”تم تو کھا سکتی ہو۔“

”یہ تو مجھ سے نہیں ہوگا کہ آپ بھوکے رہیں اور میں کھا لوں۔“

رافع مسکرایا۔ ”مجھے اپنی حماقت کی سزا تو ملنا چاہیے۔“

”یہ نہیں ہوگا۔ میں بھی کچھ نہیں کھاؤں گی۔“ فلک نے کہا۔ ”اور اگر فاقے سے بچنا ہی ہے تو بازار سے کچھ لے کر آیئے۔“

”چل کر کسی ہوٹل ہی میں کھا لیتے ہیں۔“

”نا بابا!“ فلک نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ”پانی کا شور دیکھ رہے ہیں آپ؟ جگہ جگہ ... کیچڑ ہو گئی ہے۔ کہیں تو گر پڑوں گی کہیں اور پھر بارش کا بھی کوئی اعتبار نہیں۔ اچانک پھر شروع ہو سکتی ہے۔ اگر بازار کا کھانا ہے تو آپ ہی جا کر کچھ لائیں۔“

فلک نے سب چیزیں نکال کر پھینک دی تھیں۔ اس نے فریج بند کرتے ہوئے کہا۔ ”اب کھڑے کیا ہیں، اگر کچھ لانا ہے تو جلدی سے جا کر لائیں۔“

”تم بھی ساتھ چلتیں تو اچھا لگتا۔“

فلک نے پھر کانوں کو ہاتھ لگائے۔ رافع کو اکیلے ہی جانا پڑا۔ کار موجود تھی لیکن اس وقت پھسلواں سڑک پر ڈرائیونگ مخدوش تھی۔ ویسے بھی ڈرائیونگ کے معاملے میں رافع خاصا محتاط تھا۔

☆☆☆

ہوٹل اتنی دور تھا کہ وہاں تک جانے اور کھانے کا سامان لے کر آنے میں ایک گھنٹا لگ گیا۔ رافع کے ایک ہاتھ میں ٹارچ تھی جس کی روشنی میں ایک ایک قدم اس نے بڑی احتیاط سے اٹھایا تھا۔

چند قدم کا احاطہ طے کر کے وہ اسی دروازے پر رکا جس کمرے کو انہوں نے خواب گاہ کے طور پر استعمال کیا تھا۔ گھنٹی بجانے کے لیے ہاتھ بڑھاتے بڑھاتے وہ یکایک رک گیا۔ اندر سے ایسی آوازیں آ رہی تھیں جیسے بہت دھیمی آواز میں گفتگو کی جا رہی ہو۔ ایک نسوانی اور دوسری مردانہ تھی۔ نسوانی آواز فلک ہی کی ہو سکتی تھی لیکن مردانہ؟

شعوری یا لاشعوری طور پر ایک خیال رافع کے دماغ میں رہتا تھا۔ اسی کی وجہ سے رافع کے دماغ میں ایک نام ابھرا۔

سفیان!

یہ نام اس کے دماغ میں چکا ہی تھا کہ ایک پیکٹ اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ اس کی آواز ہوتے ہی وہ سرگوشیاں بند ہو گئیں جو کمرے سے آ رہی تھیں۔

”فلک!“ رافع نے پکارا۔ اس کے انداز میں غصہ بھی تھا اور تلخی بھی۔

فوری طور پر کوئی جواب نہیں ملا۔ نہ ایسی آہٹ سنائی دی کہ دروازہ کھولنے کے لیے فلک اس طرف آ رہی ہو۔

”فلک!“ رافع نے زیادہ زور سے پکارا۔

اس مرتبہ دروازہ کھولتے ہی وہ رافع سے اس طرح لپٹ گئی جیسے بہت خوف زدہ ہو۔ اس کا جسم بھی کانپ رہا تھا۔

”ڈاکو۔“ وہ بہ مشکل بول سکی۔

رافع کے دماغ میں اس وقت کچھ اور ہی خیالات چکرا رہے تھے۔ وہ فلک کو ایک طرف کرتا بلکہ کسی حد تک دھکیلتا ہوا تیزی سے اندر داخل ہوا اور چاروں طرف نظر دوڑانے لگا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔

رافع متصل کمرے میں جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھا۔

”وہ جا چکا ہے رافع۔“ عقب سے فلک کی لرزتی آواز سنائی دی۔ ”وہ اس کھڑکی سے کود کر باہر نکل گیا تھا۔“

اشارہ اسی کھڑکی کی طرف تھا جس سے وہ دونوں بارش کا نظارہ کرتے رہے تھے۔

رافع دوسرے کمرے سے اس طرف نکل گیا جدھر کچن تھا...... دماغ میں سفیان کا نام آنے کے بعد سے اس کے جسم میں چنگاریاں سی چٹخنے لگی تھیں۔

تو اب یوں بھی ملاقاتیں ہوں گی، وہ سوچتا ہوا واپسی کے لیے پلٹا۔

فلک بھی اس کے پیچھے پیچھے آ گئی تھی۔ اس کے چہرے سے خوف اب بھی ظاہر ہو رہا تھا جو رافع کی دانست میں اداکاری تھی۔

”میں بتا رہی ہوں نا۔“ فلک بولی۔ ”وہ کھڑکی سے باہر نکل گیا تھا۔“

”شاید وہ میرا ہی کچھ لوٹ لے گیا۔“ رافع نے تلخی سے کہا۔

”زیورات۔“ فلک نے بتایا۔ ”سارے زیورات اور وہ رقم جو میرے پرس میں تھی۔“

رافع دیکھ رہا تھا کہ فلک کے گلے سے لاکٹ، کانوں سے ٹاپس اور ہاتھ میں انگوٹھیاں بھی نہیں تھیں۔ کلائی سے گھڑی بھی غائب تھی۔

”آپ کچھ بول کیوں نہیں رہے ہیں؟“ فلک کچھ روہانسی ہوئی۔

”بولوں گا۔“ رافع نے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کمرے میں لے آیا۔

”وہاں سے۔“ فلک نے پھر کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

رافع کھڑکی کی طرف گیا۔ ٹارچ اب بھی اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے روشنی باہر ڈالی۔ کسی جانب سے آتا ہوا پانی ریسٹ ہاؤس کی دیوار سے ٹکرا رہا تھا۔

”تم نے دروازہ کیوں کھولا تھا؟“ رافع نے مڑ کر فلک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”دروازہ میں نے بند ہی نہیں کیا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہاں بھی اس قسم کی وارداتیں ہوتی ہوں گی۔ میں بستر پر لیٹی ہوئی گنگنا رہی تھی کہ بہت آہستگی سے دروازہ کھلا۔ میں تو اس خیال سے خوش ہوئی تھی کہ آپ مجھے ڈرانے کی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے لیکن خود میری جان نکل گئی جب میں نے دروازے کے باہر سے ایک ہاتھ اندر آتے دیکھا۔“ فلک اس طرح بول رہی تھی جیسے ہیجان میں مبتلا ہو۔ ”ہاتھ پر دستانہ چڑھا ہوا تھا اور اس کی گرفت میں پستول تھا۔ اس نے اندر آ کے دروازہ بند کر دیا۔ میں بستر سے اٹھتے وقت گرتے گرتے بچی۔ ہاتھ پیر قابو ہی میں نہیں تھے۔“

”اس کے بعد تم نے سب کچھ لٹ جانے دیا؟“ رافع کے لہجے کی تلخی برقرار تھی۔

”اس نے مجھے دھمکی دی تھی رافع۔“ فلک نے جواب دیا۔ ”اگر میں زیورات اور نقد رقم اس کے حوالے نہیں کرتی تو وہ مجھے گولی مار دیتا۔“

”گفتگو بھی سرگوشیوں میں ہو رہی تھی۔“ رافع نے تیکھے لہجے میں کہا۔

”اس نے مجھے تنبیہ کی تھی کہ بلند آواز میں نہ بولوں۔“

”جب تم نے سب کچھ اسے دے دیا تھا تو باتیں کیا

www.pkdigest.com

ہو رہی تھیں؟"

"وہ کہہ رہا تھا کہ رقم اور ہوگی۔ میں نے اسے بتایا مزید رقم نہیں ہے لیکن وہ میرے جواب پر اعتبار نہیں کر رہا تھا۔"

"اور بحث کیے جا رہا تھا کہ تم غلط کہہ رہی ہو؟"

"ہاں رافع! وہ تو جب باہر کسی چیز کے گرنے کی آواز سنائی دی تو وہ بھاگا۔"

"پیکٹ پڑے ہیں دروازے پر! وہ اٹھالاؤ۔"

فلک نے ٹھنڈی سانس لی۔ "اب تو بھوک ہی مر گئی ہے۔" لیکن اس کے باوجود وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

رافع بستر پر بیٹھ گیا... کسی ثبوت کے بغیر وہ یہ بات اپنی زبان پر نہیں لانا چاہتا تھا جو اس کے دماغ میں چکرا رہی تھی۔

فلک کھانے کے سامان کے پیکٹ اٹھالائی اور تپائی پر رکھ کر رافع کی طرف آئی۔ اب ایسا ظاہر ہو رہا تھا جیسے اس نے اپنی خوف زدگی پر قابو پالیا ہو۔

"شکر ہے کہ آپ آگئے۔" وہ بستر پر بیٹھ کر رافع کے سینے سے لگتے ہوئے بولی۔ "اس کی موجودگی میں خون خشک ہوا جا رہا تھا میرا۔ میں اب یہاں نہیں رکوں گی۔ واپس چلو کراچی۔"

"پولیس کو فون تو کرنا چاہیے۔" رافع نے اپنا موبائل نکالتے ہوئے کہا۔

"نہیں، نہیں۔" فلک نے اس کا موبائل والا ہاتھ پکڑ لیا۔ "اب اس پریشانی میں کیوں پڑا جائے، کوئی سراغ لگانے کے بجائے وہ لوگ ہماری ہی جان کھاتے رہیں گے۔ جو ہو گیا اس پر صبر کر لینے ہی میں عافیت ہے۔ میں سب زیورات تو اپنے ساتھ لائی نہیں تھی۔ سب کچھ گھر پر ہے۔ بس وہی ہاتھ سے گیا جو میں پہنے ہوئے تھی۔ بس رسٹ واچ کا افسوس ہے۔ وہ آپ نے مجھے بڑے چاؤ سے دلائی تھی۔"

"اور وہ بھی تم نے اسے دے دی۔" رافع نے تلخی سے کہا۔ اس کی دانست میں یہ سب فلک کا ڈراما تھا۔

"میں کیا کرتی رافع۔" فلک نے کہا۔ "آپ کو اچھا لگتا، اگر آپ کو یہاں میری لاش پڑی ہوئی ملتی؟"

رافع کچھ نہیں بولا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ فلک اسے پولیس کو فون کرنے سے کیوں روک رہی ہے؟ کیا اسے خدشہ ہے کہ اس کا راز کھل جائے گا، یا واقعی وہ سب کچھ سچ ہے جو اس نے بتایا تھا؟

"آپ سمجھ گئے ہیں نا میری بات؟" فلک پھر بولی۔ "اس قسم کے معاملات میں پولیس کا ریکارڈ شاید ہی کبھی اچھا رہا ہو۔"

بات بہرحال غلط نہیں تھی۔ رافع نے ٹھنڈی سانس لے کر موبائل اپنی جیب میں ڈال لیا۔

فلک نے اٹھ کر تپائی کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ "میں یہ سب فریج میں رکھ آتی ہوں۔ رات کو کسی وقت بھوک لگے گی تو کھالیں گے، لیکن یہ طے ہے کہ کل ہمیں کراچی واپس چلے جانا ہے۔ اب میں یہاں رہوں گی تو یہ واقعہ بھلا نہیں سکوں گی۔"

رافع اب بھی خاموش رہا۔ فلک پیکٹ اٹھا کر فریج میں رکھنے چلی گئی۔

جب وہ دونوں بستر پر لیٹ گئے تو فلک نے بتایا۔ "وہ رین کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ چہرے پر اس نے رومال باندھ رکھا تھا۔ پتا نہیں کیسے، وہ پل دو پل کے لیے اس کے چہرے سے ہٹ گیا تھا۔ شاید گرہ ڈھیلی ہو گئی ہو۔ بہرحال، میں نے اس کا چہرہ تو دیکھ لیا ہے۔ شاید وہ بھی کہیں دکھائی دے جائے۔"

رافع اب بھی چپ رہا تو فلک نے کہا۔ "آپ اتنے چپ کیوں ہو گئے ہیں؟"

"سوچ رہا ہوں۔" رافع نے سنجیدگی سے کہا۔ "اس ڈاکو کو معلوم کیسے ہو گیا کہ میں کہیں چلا گیا ہوں اور تم اکیلی ہو۔"

"یہ تو ہم نے فلموں میں بھی دیکھا ہے۔" فلک نے کہا۔ "اس قسم کے لوگ ہر طرف نظر رکھتے ہیں۔ انہیں موقع کی تلاش رہتی ہے۔"

"سفیان کو فون نہیں کیا تم نے؟" رافع نے اچانک موضوع بدلا۔

فلک چونکی۔ "اس وقت یہ خیال کیسے آ گیا آپ کو؟"

"یونہی۔"

فلک نے کچھ رک کر جواب دیا۔ "بارش اگر گرج چمک کے ساتھ ہو تو نیٹ ورک بڑی حد تک بے کار ہو کر رہ جاتا ہے۔"

"شام کے بعد تو موسم ٹھیک ہو گیا تھا۔"

"آپ کے جانے کے بعد خیال آیا تھا مجھے! ایک بار کوشش کی تھی میں نے لیکن نیٹ ورک اس وقت بھی درست نہیں تھا۔ رابطہ تو ہوا لیکن آواز بہت دھیمی تھی۔ ڈس کنکٹ بھی جلدی ہو گیا۔ دوبارہ میں نے کوشش اس لیے نہیں کی کہ اب کل موسم ٹھیک ہو گا، تبھی کروں گی۔"

اس جواب نے رافع کے شکوک اور بڑھا دیے۔ یہ تو وہ بھی جانتا تھا کہ گرج چمک کے باعث موبائل کا نیٹ ورک

بڑی حد تک ناکارہ ہو جاتا ہے لیکن اسے یاد تھا کہ جب گرج چمک کے ساتھ بارش ہو رہی تھی تو فلک نے اپنا موبائل ایک پل کو بھی اپنے پرس سے نہیں نکالا تھا۔ وہ دونوں ساتھ ہی رہے تھے۔ دو ایک مرتبہ باتھ روم جانے کے باعث ان میں علیحدگی ہوئی تھی۔ اگر اس وقت فلک نے سفیان سے رابطہ کرنا چاہا تھا تو یہ تعجب کی بات تھی۔ سفیان کے معاملے میں اس نے رافع سے کبھی رازداری نہیں برتی تھی۔ اس کے علاوہ یہ بھی اس کے لیے ناقابلِ یقین تھا کہ موسم ٹھیک ہو جانے کے بعد فلک نے صرف ایک مرتبہ کوشش کی تھی۔ مانا تو یہ بھی جا سکتا تھا کہ موسم کی خرابی کے باعث نیٹ ورک شاید اس وقت بھی پوری طرح کام نہ کر رہا ہو لیکن رافع کا دماغ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ فلک نے دوبارہ کوشش نہیں کی ہو گی۔ اگر وہ نہ بھی کرتی تو سفیان کوشش کرتا۔ اس کے موبائل پر فلک کا نمبر تو یقیناً آ جانا چاہیے تھا۔ یہ سب باتیں رافع کو یقین دلا رہی تھیں کہ ان دونوں میں کچھ باتیں تو ضرور ہوئی ہوں گی جو فلک اس سے چھپا رہی ہے جبکہ پہلے کبھی اس نے ایسی رازداری سے کام نہیں لیا تھا۔

رافع کو یہ خیال بھی آیا کہ فلک نے اس کے ساتھ جانے سے گریز کیا تھا، بہانہ یہ کیا تھا کہ جگہ جگہ پانی ہو گا جبکہ اس سے پہلے وہ کہہ چکی تھی کہ اگر چھتری ہوتی تو وہ بھی موسم سے لطف اندوز ہونے کے لیے باہر نکلتے۔

گویا وہ ریسٹ ہاؤس میں اس لیے رکنا چاہتی تھی کہ موبائل پر سفیان سے رابطہ کر کے اسے بلا سکے۔

غالباً وہ سفیان ہی ہو گا، رافع کی ذہنی رو اسی طرف چلتی رہی، اس نے سوچا کہ ان دونوں کو زیادہ وقت گزر جانے کا احساس نہیں رہا ہو گا، لہٰذا اس کی آمد پر سفیان وہاں سے بھاگ نکلا اور فلک نے ڈاکے کا ڈراما رچا ڈالا۔

یہ تمام شکوک اور ان کے جواز اپنی جگہ لیکن رافع کو ایک خیال یہ بھی آیا کہ یہ سب کچھ کیا محض اتفاق ہو سکتا ہے؟ شاید فلک نے واقعی سفیان سے موبائل پر رابطہ کرنے کی زیادہ کوشش نہ کی ہو، شاید کھانے کا سامان خریدنے کے لیے اس کے ساتھ نہ جانے کا سبب فلک کا بدلا ہوا موڈ ہو اور ڈاکو کے بارے میں اس کا بیان درست ہو۔

"آئیں اب تو کھانا کھالیں۔" فلک کی آواز نے اسے چونکایا۔

اپنے خیالات میں اسے دھیان ہی نہیں رہا تھا کہ فلک کب فریج میں سے کھانا نکال کر کچن میں لے گئی تھی... اب کھانا اس کے سامنے رکھا تھا۔

"آئیے!" فلک نے پھر کہا، اس وقت وہ کرسیاں، تپائی کے قریب سرکا رہی تھی۔ کھانے کی پلیٹیں تپائی پر ہی تھیں۔

رافع اس طرف بڑھا۔

"اتنا پریشان کیوں نظر آ رہے ہیں آپ؟" فلک پھر بولی۔

"جو کچھ ہو گیا، کیا وہ پریشان کن نہیں ہے فلک؟"

"میں نے تو اب خود پر قابو پالیا ہے۔ ڈاکو جو کچھ لے گیا، آپ اسے میری جان کا صدقہ سمجھ کر بھول جائیے۔ اب بس یہ طے ہے کہ ہم کل یہاں سے چلے جائیں گے۔"

رافع جواب میں کچھ کہے بغیر کرسی پر بیٹھ گیا۔ فلک کے چہرے پر اب اسے جو اطمینان نظر آ رہا تھا، اس کی وجہ سے اسے اپنے شبہات کمزور لگنے لگے تھے۔ اگر وہ درست ہوتے تو فلک کے دل کا چور اسے اس حد تک بشاش نہ ہونے دیتا جتنی بشاش وہ اب نظر آ رہی تھی۔

کھانے کے دوران میں وہ بولی۔ "ہاں، یہ ضرور ہے کہ یہ واقعہ کبھی بھلایا نہیں جا سکے گا اور آئندہ کسی اجنبی جگہ پر میں اکیلی ہرگز نہیں رہوں گی۔ میں نے ابھی کچن میں ایک بات سوچی ہے۔ میرے زیورات، گھڑی اور نقد رقم جو فلک گئی، اس کی تو خیر کوئی خاص اہمیت نہیں لیکن اس کے پستول کے سامنے میں جس کرب اور خوف کا شکار رہی ہوں، اس کی سزا اس کم بخت کو مل سکے تو اچھا ہے۔ اگر وہ بلیک لسٹڈ ہوا تو اسے پکڑا جا سکتا ہے۔"

"تم ہی نے مجھے روک دیا پولیس کو فون کرنے سے۔"

"میں یہاں اس پریشانی میں نہیں پڑنا چاہتی۔ اب کچن میں آپ کے دوست انور مختار صاحب کا خیال آیا ہے۔ وہ حکومت کے کسی خفیہ ادارے میں ہیں نا؟"

"ہاں۔"

"تو پھر اگر وہ شخص بلیک لسٹڈ ہے تو انور صاحب کے ذریعے اسے گرفتار کیا جا سکتا ہے۔ میں کراچی پہنچ کر اس کی تصویر انہیں دے دوں گی۔"

"تصویر؟" رافع چونکا۔ "اس کی تصویر کہاں سے ملے گی؟"

"میں بناؤں گی۔" فلک نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "قدرت نے مجھے تصویر بنانے کا شوق اسی لیے دیا تھا کہ یہ فن اس موقع پر میرے کام آ سکے۔"

"تم بنا سکو گی اس کی تصویر؟"

"کیوں نہیں بنا سکوں گی؟"

"تم ہی بتا چکی ہو کہ جب اس کے چہرے سے رومال

www.pkdigest.com

سرکا تھا تو تم اسے دو چار سیکنڈ کے لیے دیکھ سکی تھیں۔"

"اس چہرے سے میری جو اذیت ناک یاد وابستہ ہے، اس کی وجہ سے چند سیکنڈ ہی میں اس کے نقوش میرے دماغ میں پوری طرح محفوظ ہو گئے ہیں۔"

"اگر تم نے یہ سوچا ہے تو ایسا کر لیں گے۔" رافع نے کہا۔ "تم جانتی ہو کہ انور میرا بہت اچھا دوست ہے۔ وہ اگر کچھ کر سکے گا تو ضرور کرے گا۔"

کھانے کے دوران میں اسی موضوع پر باتیں ہوتی رہیں، پھر وہ آرام کرنے کے لیے بستر پر لیٹے۔ یہ ان دونوں ہی کی عادت تھی کہ چائے وہ رات کا کھانا کھانے کے پندرہ بیس منٹ بعد پیتے تھے۔ بنیادی طور پر یہ عادت رافع کی تھی جو شادی کے بعد فلک کو بھی پڑ گئی تھی۔

رافع نے غور سے فلک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ تو طے پا چکا ہے کہ صبح ناشتا کرنے کے بعد ہم کراچی روانہ ہو جائیں گے۔"

فلک سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

رافع بولا۔ "کیا سفیان سے ملنے کا ارادہ نہیں ہے؟"

"ابھی سوچ تو رہی تھی کہ اسے فون کروں۔" فلک نے کہا، پھر ہنس پڑی۔ "وہ فوراً دوڑا چلا آئے گا۔"

"چلو اچھا ہے، جائے اس کے ساتھ ہی پی لیں گے۔"

رافع اب بھی فلک کو غور سے دیکھتا رہا۔ وہ اس کے چہرے کے تاثرات سے کوئی انداز ہ لگانا چاہتا تھا۔

فلک نے موبائل پر سفیان کا نمبر ملایا اور اس کا اسکیچ بھی آن کر دیا۔ وہ اپنی باتیں رافع کو بھی سنانا چاہتی تھی۔

اس کا مقصد؟ رافع سوچنے لگا۔ ابھی تک اس کے دماغ کو فلک کی طرف سے مکمل اطمینان نہیں ہوا تھا۔

دو گھنٹیوں کے بعد دوسری طرف سے کال ریسیو کی گئی اور سفیان کی آواز آئی۔ "ہاں فلک! معاف کرنا، میں تمہیں بتا نہیں سکا۔ اس وقت میں تم سے بہت دور ہوں۔"

"کتنی دور ہو؟" فلک کے لہجے میں شرارت تھی۔

"وہ دراصل چند دن مطربہ کی کوئی فلمی مصروفیت نہیں تھی۔ اچانک اس نے مری کا پروگرام بنا ڈالا۔ میں اپنے دفتر کو بھی اطلاع نہیں دے سکا کہ چند دن غیر حاضر رہوں گا۔ پنڈی پہنچنے کے بعد اطلاع دی تھی۔ یوں سمجھ لو کہ افراتفری سی رہی۔ تمہیں بھی فون نہیں کر سکا۔"

فلک ہنسی۔ "کچھ ایسا ہی میرے ساتھ بھی ہوا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"رافع نے بھی اچانک پروگرام بنایا تھا۔"

"کیا پروگرام بنایا تھا؟"

"مری آنے کا۔"

"کیا؟" سفیان کا انداز چونکا ہوا تھا۔ "تم مری میں ہو؟"

"ہاں۔"

"کس ہوٹل میں ٹھہری ہو؟"

"یہاں ریسٹ ہاؤس ہے رافع کا۔"

"کس جگہ؟"

فلک جواب دینے لگی۔

اس گفتگو سے صاف ظاہر ہوا تھا کہ وہ دونوں مری میں ایک دوسرے کی موجودگی سے بے خبر تھے۔

رافع سوچنے لگا، کیا یہی باور کرانے کے لیے فلک نے اسے اپنی اور سفیان کی باتیں سنوائی تھیں؟

"میں سمجھ گیا۔" سفیان کی آواز آئی۔ "ہم ابھی آتے ہیں۔ رافع صاحب بور تو نہیں ہوں گے؟"

"کس بات سے؟"

"ہمارے آنے سے۔"

"انہوں نے تو ابھی خود کہا تھا کہ میں نے اب تک تم سے رابطہ کیوں نہیں کیا۔ تمہیں میں نے دوپہر ہی کو سامنے کی سڑک سے گزرتے دیکھ لیا تھا۔"

"دوپہر سے آئی ہوئی ہو؟"

"ہاں۔"

"لعنت ہے تم پر۔" سفیان بگڑ کر بولا۔ "اب فون کر رہی ہو؟"

فلک ہنسنے لگی، پھر بولی۔ "یہ بات نہیں ہے سفیان! میں نے کوشش کی تھی لیکن رابطہ نہیں ہو سکا۔ ایک بار نہیں بلکہ دو بار کوشش کی تھی۔ دوسری مرتبہ رابطہ ہو بھی گیا تھا۔ تمہاری مدھم سی آواز آئی تھی، پھر لائن کٹ گئی تھی۔ موسم ہی آج ایسا رہا۔ نیٹ ورک صحیح کام نہیں کر رہا ہوگا۔"

"ہاں دوسری بار تمہاری کال آئی تھی تو میں نے تمہارا نام دیکھ لیا تھا۔ خود بھی اسی وقت تم سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ہو نہیں سکا۔ اس کا دوش موسم ہی کو دیا جا سکتا ہے۔ اچھا خیر، ہم ابھی آ رہے ہیں۔"

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

"دیکھا!" فلک نے ہنس کر کہا۔ "میں نے کہا تھا نا کہ وہ فوراً آئے گا۔"

"اس نے ہم کا لفظ استعمال کیا تھا۔ گویا بیوی کو بھی ساتھ لائے گا۔"

www.pkdigest.com

''وہ تو ملے ہے۔'' فلک اب بھی ہنس رہی تھی۔ ''میں کہیں آس پاس بھی ہوں اور مطربہ کو معلوم ہو جائے تو وہ سفیان کے ساتھ دم کی طرح لگ جاتی ہے۔ اس کی کوشش ہوتی ہے کہ سفیان مجھ سے اکیلے نہ ملے۔''

مشکل سے دس منٹ گزرے ہوں گے کہ وہ دونوں آگئے۔ مطربہ معمول کے مطابق سنجیدہ تھی۔ سفیان نے چہکتے ہوئے کہا۔

''اب مزہ آئے گا مری میں تفریح کرنے کا۔''

اس وقت مطربہ کا منہ بن گیا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ میرے ساتھ مزہ نہیں آتا؟''

''بیوی کی بات اور ہوتی ہے جانِ من!'' سفیان نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''دوستوں کی رفاقت کا مزہ الگ ہی ہوتا ہے۔ کیوں رافع صاحب؟''

''مجھے اس کا کوئی خاص تجربہ نہیں ہے۔'' رافع نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''دوسری بات یہ کہ آپ جو چند دن کا پروگرام بنا کر آئے ہیں، اس میں آپ کو ہماری رفاقت حاصل نہیں ہوگی۔ ہم کل صبح واپس جا رہے ہیں۔''

''کیوں، کیوں؟'' سفیان نے جلدی سے پوچھا۔

''ہم تو آپ کی دوست کے موڈ پر چلتے ہیں۔'' رافع کا اشارہ فلک کی طرف تھا۔

سفیان اور اس کے ساتھ مطربہ کی نگاہیں بھی فلک کی طرف اٹھیں۔

فلک سنجیدہ نظر آنے لگی اور بولی۔ ''آج کچھ ایسا ہی واقعہ ہوگیا ہے کہ اگر میں یہاں رکی تو گھبراہٹ کا شکار رہوں گی۔''

''کیا ہوگیا؟'' سفیان کے چہرے پر پریشانی ظاہر ہونے لگی۔

رافع اس کی طرف غور سے دیکھتا رہا۔ فلک اسے وہ سب کچھ بتا رہی تھی جو رافع کو بتا چکی تھی۔ وہ سب کچھ سنتے ہوئے سفیان کے چہرے پر تشویش و پریشانی کے تاثرات بڑھتے رہے۔ اس کے برعکس مطربہ کا چہرہ سپاٹ رہا۔

فلک کے خاموش ہونے پر، اس سے پہلے کہ سفیان کچھ کہتا، مطربہ بڑی سنجیدگی سے ایک عجیب سوال کر بیٹھی۔ ''کیا واقعی کوئی ڈاکو تھا؟''

فلک کا منہ بن گیا۔ ''نہیں، کوئی فرشتہ ہوگا۔'' اس نے کہا۔

''تم شاید برا مان گئیں۔'' مطربہ سنجیدہ ہی رہی۔ ''دراصل مجھے یہ خیال آیا تھا کہ وہ شاید کسی شناسا کی شرارت ہو۔''

رافع نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اسے ایسا لگا تھا جیسے وہ سفیان کی طرف اشارہ کرنا چاہتی ہو۔ رافع کا یہ ردعمل کسی اور کی نظر میں نہیں آیا۔ وہ بھی مطربہ کی طرف متوجہ تھے۔

''وہ کوئی شناسا نہیں تھا۔'' فلک نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''میں نے سب کچھ بتایا لیکن یہ بتانا بھول گئی کہ میں نے اس کا چہرہ دیکھ لیا تھا۔''

وہ بتانے لگی کہ اسے ڈاکو کا چہرہ دیکھنے کا موقع کیسے ملا تھا۔

سفیان نے فوراً رافع سے کہا۔ ''آپ نے پولیس میں رپورٹ نہیں کی؟''

''فلک نے نہیں کرانے دی۔'' رافع نے جواب دیا۔

فلک اس بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگی، پھر اس نے کہا۔ ''میں نے کچھ اور سوچا ہے۔ تم جانتے ہو سفیان کہ میں نامور تو نہیں لیکن بہرحال مصورہ ہوں۔ میں اس کی تصویر بناؤں گی۔ کراچی میں رافع کے ایک دوست ایسے سرکاری ادارے میں ہیں کہ میرے ساتھ یہ حرکت کرنے والا اگر بلیک لسٹڈ ہوا تو وہ اسے طلب کر کے شناخت کے لیے میرے سامنے لے آئیں گے اور تب اسے گرفتار کر لیا جائے گا۔''

''فلک!'' سفیان نے کہا۔ ''ترکیب تو تم نے اچھی سوچی ہے لیکن اس کا ذکر کہیں اور نہ کرنا۔ یہ واردات کرنے والے کو اگر اس کا علم ہوگیا تو وہ تمہاری جان کا دشمن ہو جائے گا۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں محتاط رہوں گی۔'' فلک نے کہا۔ ''خیر، یہ قصہ اب چھوڑو۔ میں اسے اپنے دماغ پر بوجھ نہیں بنانا چاہتی۔'' پھر وہ ہنسی۔ ''تم اپنے مزاج کے مطابق باتیں کرو۔ ماحول خوش گوار رہنا چاہیے تمہاری موجودگی میں۔''

''ہاں!'' مطربہ بول پڑی۔ ''تمہیں ان چیزوں کی پروا تو ہے نہیں جو ڈاکو لے گیا۔ تمہارے ڈیڈی اتنے بڑے سرمایہ دار ہیں کہ تمہیں اس سے زیادہ دلا دیں گے۔''

''تم باز نہیں آتی ہو تیکھے جملے بولنے سے۔'' فلک نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''وہ سب کچھ مجھے سفیان بھی دلا دیں گے۔ گھڑیاں تو میرے پاس کئی ہیں۔ کیا اس وقت تم میری کلائی خالی دیکھ رہی ہو؟''

فلک نے دوسری گھڑی نکال کر باندھ لی تھی۔

''دراصل۔'' سفیان ہنس کر بولا۔ ''آج کل یہ ایک ایسی فلم میں کام کر رہی ہیں جس میں ان کا کردار بی جمالو کا ہے۔ ایسے فقرے بولنے کی عادت اب بڑھتی جا رہی ہے۔''

فلک کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''یہ تم نے اچھا کہا کہ بڑھتی جا رہی ہے۔''

مطربہ کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ ''اگر میں ہمیشہ سے ایسی ہوں تو شادی کیوں کی تھی مجھ سے؟'' وہ سفیان ہی سے مخاطب ہوئی تھی۔

''ارے بھئی آپ لوگ لڑیں تو نہیں۔'' رافع بول پڑا۔

سفیان ہنسا۔ ''لڑائی نہیں ہوگی رافع صاحب! وہ تو جب ہوتی ہے جب دوسرے فریق کی پیشانی پر بھی شکنیں پڑ جائیں لیکن میری پیشانی پر شاید کھال اتنی کم ہے کہ شکن پڑتی ہی نہیں۔''

''یہ ہوئی نہ بات۔'' فلک نے سفیان کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر کہا۔ ''تمہارے ایسے ہی فقرے تو تمہاری پہچان ہیں۔''

مطربہ کے چہرے سے صاف ظاہر ہو گیا کہ فلک کا سفیان کے ہاتھ پر ہاتھ مارنا اسے گراں گزرا تھا۔ خود رافع کو بھی ان دونوں کی اتنی بے تکلفی پسند نہیں تھی۔ وہ اپنے دل کو یہ کہہ کر سمجھا لیا کرتا تھا کہ اگر فلک کے دل میں کوئی چور ہوتو وہ سب کے سامنے اتنی بے تکلفی کا مظاہرہ نہ کرے لیکن اس وقت وہ رافع کو بھی اس لیے زیادہ کھلا محسوس ہوا کہ جو واقعہ پیش آچکا تھا اس کے بارے میں وہ شکوک وشبہات کا شکار تھا۔

''میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔'' فلک اٹھتے ہوئے بولی۔

''نہیں۔'' مطربہ نے جلدی سے کہا۔ ''ہم لوگ ہوٹل میں کھانا کھانے کے لیے اپنے ریسٹ ہاؤس سے نکلنے ہی والے تھے کہ تمہارا فون آگیا لیکن سفیان کے لیے ممکن ہی نہیں کہ وہ کھانے کو تم پر ترجیح دے۔''

''ظاہر ہے۔'' سفیان نے خوش گوار لہجے میں کہا۔ ''میں فلک کو چبا چبا کر پیٹ بھر سکتا ہوں۔''

''اچھا اب اٹھ جائیے۔'' مطربہ نے چڑ کر کہا اور کھڑی ہوگئی۔

سفیان بھی ہنستا ہوا کھڑا ہو گیا۔ ''اچھا رافع صاحب، اجازت!'' پھر اس نے فلک کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''صبح تم کس وقت روانہ ہوگی؟ میں بھی تمہارے ساتھ چلا چلتا ہوں واپس۔''

مطربہ جلدی سے بولی۔ ''ہم کئی دن کا پروگرام بنا کر آئے ہیں۔''

''ارے تو میرے چلے جانے سے کیا فرق پڑے گا۔ تم یہیں رکنا۔'' وہ ہنسا۔ ''مجھے یقین ہے کہ تمہیں کوئی ڈاکو پریشان نہیں کرے گا۔''

مطربہ تختی سے بولی۔ ''تمہیں رکنا پڑے گا میرے ساتھ۔''

''اچھا خیر۔'' سفیان نے ٹالنے والے انداز میں کہا پھر فلک سے بولا۔ ''میں تم سے بعد میں موبائل پر بات کروں گا۔''

مطربہ جانے کے لیے تیزی سے مڑی۔ سفیان نے ہنس کر رافع اور فلک کی طرف دیکھا اور پھر مطربہ کے پیچھے قدم بڑھا دیے۔

پھر رافع اور فلک بھی اٹھے۔ وہ ان دونوں کو ریسٹ ہاؤس کے دروازے تک چھوڑ کر واپس لوٹے۔

''ہمیں تو چائے پینا ہی ہے۔'' فلک بولی۔ ''آپ آرام کریں، میں بنا کے لاتی ہوں۔''

وہ کچن کی طرف چلی گئی۔ رافع بستر پر نیم دراز ہوگیا۔ وہ ابھی تک خود کو شکوک وشبہات کے غبار سے نہیں نکال سکا تھا، لیکن کسی ثبوت کے بغیر وہ فلک کے کردار پر انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ فلک سے محبت اسے بھی تھی۔ ان دونوں کی شادی ہی محبت کا نتیجہ تھی۔ اسی لیے رافع کو یہ بھی سوچنا پڑتا تھا کہ فلک نے اسے سفیان پر کیوں ترجیح دی؟ اس سوچ کے باوجود ان دونوں کی بے تکلفی اسے ذہنی خلفشار میں بھی مبتلا کرتی تھی۔

اس دن کے واقعے نے تو اسے زیادہ ہی الجھا دیا تھا۔

فلک چائے بنا کر لے آئی اور بولی۔ ''دیکھا آپ نے اس عورت کو؟ شادی کے تین سال بعد بھی وہ سفیان کو نہیں سمجھ سکی ہے۔''

رافع نے دل میں کہا۔ 'میں بھی دو سال میں کچھ نہیں سمجھ سکا ہوں۔'

ان کی شادی کو دو سال ہو چکے تھے۔

''اب جھگڑا کر رہی ہوگی وہ۔'' فلک پھر بولی۔ ''لیکن میں جانتی ہوں کہ سفیان اپنا فیصلہ نہیں بدلے گا۔ وہ ہمارے ساتھ ہی واپس جائے گا۔''

''اس طرح تو ان کی ازدواجی زندگی میں رخنہ پڑ سکتا ہے۔'' رافع نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیوں نہ تم دونوں اپنے دوستانہ رویے پر نظر ثانی کر لو۔''

اب فلک نے بھی اسے غور سے دیکھا اور رافع نے محسوس کیا جیسے وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی ہو۔ وہ خاموشی سے چائے پینے لگی۔

''تم کچھ سوچنے لگیں۔'' رافع بولا۔

www.pkdigest.com

فلک مسکرائی۔ "دراصل اس وقت آپ کی سوچ کچھ اور تھی۔"

"کیا مطلب؟"

"چھوڑیے بھی یہ ذکر! میں جانتی ہوں کہ آپ کی یہ کیفیت وقتی ہوتی ہے۔ مجھے اپنی محبت پر بھی بھروسا ہے اور آپ پر بھی۔" وہ خوش گوار انداز میں بولنے لگی۔ "سفیان سے میری دوستی تو ہر صورت میں قائم رہے گی اور اس کی وجہ سے ہماری ازدواجی زندگی پر کوئی سنگین سایہ ہرگز نہیں پڑے گا۔ رہ گئی مطربہ تو اب سفیان کو اس کی پروا نہیں رہی ہے۔ وہ بس ایک جذباتی دھارا تھا جس میں بہہ کر سفیان نے اس سے شادی کرلی تھی۔ وہ جذباتی دھارا اب گزر چکا ہے۔ اب بس سفیان کی ضد ہے کہ وہ یہ شادی قائم رکھے ہوئے ہے۔"

"ضد؟" رافع حیرت سے بولا۔ "ضد کیسی؟"

فلک سنجیدہ ہوگئی۔ وہ کچھ رک کر بولی۔ "پہلے آپ میرے ایک سوال کا جواب دیں۔"

"پوچھو۔"

"اگر کوئی آپ سے وعدہ لے لے کہ اس کے بارے میں فلاں بات آپ کسی کو نہیں بتائیں گے تو کیا آپ وہ بات مجھے بتادیں گے؟"

رافع نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ نہیں۔ میں اسے انسانیت کی تذلیل سمجھتا ہوں کہ کسی کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی جائے۔"

"بس یہی بات ہے!" فلک خوش ہوکر بولی۔ "بس بے خیالی میں یا بے اختیار میری زبان پر اس کی ضد کی بات آگئی۔ ایسا ہونا نہیں چاہیے تھا۔ دراصل سفیان نے مجھ سے وعدہ لیا ہے کہ میں آپ کو اس بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔"

"تم نے تو مجھے الجھن میں ڈال دیا۔"

فلک نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے چائے ختم کرلی تھی اور رافع بھی پی چکا تھا۔ فلک کرسی سے اٹھ کر بستر پر بیٹھی اور اس کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے بولی۔ "کچھ دن کی بات ہے۔ آپ کی الجھن زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہے گی۔ میں سفیان سے بھی کہہ چکی ہوں کہ یہ ایک ایسی بات ہے جو زیادہ عرصے تک چھپی نہیں رہ سکتی۔ ایک نہ ایک دن..." وہ یکایک چپ ہوگئی۔

"ایک نہ ایک دن؟" رافع نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

فلک ہنستے ہوئے بولی۔ "میرے منہ سے پھر ایک ایسی بات نکلنے والی تھی جس سے سفیان کی ضد پر کچھ روشنی پڑ جاتی۔ بس اب اس موضوع پر ہم کوئی بات نہیں کریں گے۔"

فلک نے رافع کے جسم پر دباؤ ڈالا اور اسے بستر پر لٹاتے ہوئے خود بھی اس کے برابر میں لیٹ گئی... اس کا یہی والہانہ انداز رافع کو ذہنی طور پر ہلکا پھلکا کردیتا تھا۔

بارہ بجے کے قریب جب وہ سوچکے تھے تو موبائل کی گھنٹی نے انہیں جگادیا۔

گھنٹی فلک کے فون کی بجی تھی۔

"یہ تو سفیان ہے۔" فلک نے موبائل کی اسکرین پر نام پڑھتے ہوئے کہا اور پھر اس نے اسے آن کرتے ہوئے اسپیکر کا بٹن بھی دبادیا اور منہ بناتے ہوئے بولی۔

"یہ آدھی رات کے وقت کیوں بور کیا ہے تم نے؟"

"کیا سوگئی تھیں؟" اسپیکر سے سفیان کی آواز آئی۔

"اور نہیں تو کیا۔"

"چلو خیر، پھر سوجانا۔ تمہیں نیند تو فوراً آجاتی ہے۔ فون کرنا اس لیے ضروری تھا کہ تمہاری روانگی کا وقت معلوم کرلوں۔ دراصل مطربہ سے تصفیہ کرنے میں کچھ دیر ہوگئی۔ وہ جانتی ہے کہ میں جو کہہ دیتا ہوں، وہ اٹل ہوتا ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ تم دونوں کے ساتھ ہی، میرا مطلب ہے تمہاری ہی کار میں چلا جاؤں گا۔ جس کار میں ہم آئے تھے، وہ میں مطربہ کے لیے چھوڑ دیتا لیکن اب فیصلہ ہوا ہے کہ وہ بھی واپس چلے گی۔"

فلک ہنس پڑی۔

"کیوں؟" سفیان کی آواز آئی۔ "تم ہنسیں کیوں؟"

"وہ کچھ خیال آگیا تھا۔ تم اپنی بات مکمل کرلو۔"

"وہ تو مکمل ہوگئی۔ بس اب میں اور وہ اپنی کار میں روانہ ہوں گے۔ تمہاری کار کے آگے یا پیچھے چلتے رہیں گے۔ تم اپنی روانگی کا وقت بتاؤ۔"

"بس ناشتا کرکے روانہ ہوجائیں گے۔ یوں سمجھ لو کہ دس بجے۔"

"بس تو ہم دس بجنے میں پانچ منٹ پر تمہارے ریسٹ ہاؤس پہنچ جائیں گے۔ اب تم سوجاؤ۔" دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہوگیا۔

فلک نے اپنا موبائل رکھتے ہوئے رافع سے کہا۔ "میں اس بات پر ہنسی تھی کہ مطربہ بھی ساتھ ہی واپس جائے گی۔"

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

"دراصل مطربہ یہ برداشت ہی نہیں کرسکتی کہ میں اور سفیان تو کراچی میں ہوں اور وہ ہم سے اتنی دور مری میں

رہے۔ سفیان کی نقل و حرکت سے باخبر رہتا تو اس نے اپنا فرض اولین بنالیا ہے۔"

"ہوں۔" رافع مسکرادیا۔

"چلو اب سوجاؤ۔" فلک نے اپنا ایک ہاتھ رافع کے سینے پر رکھ دیا اور آنکھیں بند کرلیں۔

جلدی ہی وہ سو بھی گئی لیکن رافع کی نیند کچھ دیر کے لیے تو اڑ ہی گئی تھی۔ سفیان کا کہا ہوا ایک فقرہ اس کے دماغ میں چبھنے لگا تھا۔ بات اس کے لیے معنی خیز تھی۔ سفیان یہ کیسے جانتا تھا کہ فلک کو نیند فوراً آجاتی تھی۔

دماغ کی اس چبھن کے باعث رافع کو کچھ دیر سے نیند آئی۔ اسی لیے دوسری صبح اس سے پہلے فلک بیدار ہوئی۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ کھڑکی سے آتی ہوئی مدھم روشنی کے باعث اس کا خیال تھا کہ سات ساڑھے سات بجے ہوں گے لیکن گھڑی دیکھتے ہی وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں اٹھی کیونکہ نو بج چکے تھے۔ اس وقت سورج کی اچھی خاصی روشنی کمرے میں آنا چاہیے تھی لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ دماغ میں آنے والے کسی خیال کے باعث فلک جھپٹنے کے انداز میں کھڑکی کی طرف بڑھی اور اسے کھولا۔

"لعنت ہے۔" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی جس سے سڑکوں کا چکنا ہوجانا قدرتی امر تھا۔ اس صورت میں ٹیڑھے میڑھے پہاڑی راستوں پر کار چلانا مخدوش ہوجاتا ہے۔

فلک تیزی سے مڑی اور بستر کے قریب جاکر رافع کو بری طرح جھنجوڑ ڈالا۔

"کیا ہوا؟" رافع بوکھلا کر اٹھا۔

"موسم پھر خراب ہوگیا ہے۔" فلک کچھ روہانسی ہوگئی۔ "پھوار پڑ رہی ہے۔ بارش بھی ہوسکتی ہے۔ ہم آج واپس نہیں جاسکتے۔"

رافع اٹھ کر فلک کے ساتھ کھڑکی کے قریب گیا۔

"واقعی۔" اس کے منہ سے نکلا۔ "بادل تو خاصے گہرے ہیں۔ بارش کا امکان تو قوی ہے۔"

"لعنت ہے اس موسم پر!" فلک نے رافع کا بازو پکڑ کر اس طرح جھنجوڑ ڈالا جیسے موسم کی جھنجلاہٹ اس پر اتار رہی ہو۔

رافع ہنسنے لگا۔

فلک پھر بولی۔ "یہ مری ہے یا پنجاب کا کوئی شہر جہاں بارش شروع ہوئی تو بس روزانہ ہورہی ہے۔"

"ساری دنیا کا موسم بدل رہا ہے فلک! ہوسکتا ہے کہ بارش کے بعد ژالہ باری بھی شروع ہوجائے۔"

"ستمبر میں؟" فلک نے آنکھیں نکالیں۔

"کچھ بھروسا نہیں۔" رافع بولا۔ "دنیا میں بہت بڑی موسمی تبدیلیاں آرہی ہیں۔ ابھی پچھلے ہی سال تو خلیج کی کسی ریاست میں، یا اسی طرف کہیں برف باری ہوئی تھی جسے ایک تاریخی واقعہ قرار دیا گیا تھا۔"

"مائی گاڈ! بڑی خوف ناک بات کی ہے آپ نے۔" فلک نے کہا۔ "ژالہ باری یا برف باری ہوگئی تو ہم یہیں پھنس کر رہ جائیں گے۔"

"یہ تو ہے۔"

"بس تو پھر ہمیں بارش ہی میں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

"پاگل مت بنو۔ یہ خطرہ مول نہیں لیا جاسکتا۔ آخر تم اتنی بے چین کیوں ہو یہاں سے نکل جانے کے لیے؟ کل جو کچھ ہوگیا، وہ روزانہ تو نہیں ہوگا۔"

اسی وقت کال بیل کی آواز آئی۔

"کون آگیا؟" رافع چونک کر بولا۔

"وہی ہوگا، سفیان۔" فلک نے کہا۔

وہ دونوں ہی دروازے پر گئے۔ وہ سفیان اور مطربہ ہی تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں چھتریاں تھیں۔

"ہم اس لیے جلدی آگئے کہ ناشتا تم دونوں کے ساتھ ہی کرلیں گے۔" سفیان نے اندر آتے ہوئے کہا۔ پھر فلک کی طرف دیکھ کر بولا۔ "روانگی کا پروگرام تو تم نے کینسل کر ہی دیا ہوگا۔"

رافع نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "محترمہ پر بھوت سوار ہے کہ اس موسم کے باوجود یہاں سے نکل لیا جائے۔"

"یہ تو حماقت ہی ہوگی۔"

فلک دروازہ بند کررہی تھی۔

رافع نے کہا۔ "اب آپ ہی سمجھائیں اپنی دوست کو۔"

"کیوں فلک..."

لیکن سفیان کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی فلک نے فرش پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا تھا۔

سفیان ہنسا۔ "کیا سر میں درد ہورہا ہے؟" پھر اس نے فلک کے قریب جاکر دونوں ہاتھوں سے اس کا سر دبانا شروع کردیا۔

"ہٹو۔" فلک نے اس کے دونوں ہاتھ جھٹک دیے۔ "اس وقت مجھے مذاق بالکل اچھا نہیں لگے گا۔"

www.pkdigest.com

رافع نے محسوس کیا کہ اس وقت مطربہ کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ وہ اس کے چہرے پر فلک اور سفیان کی چھیڑ چھاڑ کا ردعمل دیکھنا چاہتی ہوگی لیکن اسے مایوسی ہوئی۔ رافع ایسے مواقع پر اپنے دلی جذبات کا سایہ بھی اپنے چہرے پر نہیں پڑنے دیتا تھا۔

سفیان نے بڑے "مزاحیہ سنجیدہ" لہجے میں فلک سے کہا۔ "اگر یہ مذاق کا وقت نہیں ہے تو جو اصل وقت ہے، وہ بتا دو۔ میں اسی وقت کیا کروں گا مذاق۔"

فلک ایک جھٹکے سے کھڑی ہوگئی۔

"چلو!" رافع نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے واپس لے جاتے ہوئے کہا۔ "موسم پر غصہ کرنا بھی کسی حماقت سے کم نہیں ہوتا۔"

کمرے میں چار کرسیاں تھیں۔ وہ انہی پر جا بیٹھے۔

"ناشتے کا کیا رہے گا رافع صاحب!" سفیان بولا۔ "کسی ہوٹل جانا ہے یا یہاں کچھ بندوبست ہے؟"

"یہاں سب کچھ ہے۔ بس کوئی تیار کرنے والا ہو۔"

"میں کیے لیتا ہوں۔" سفیان کھڑا ہوا۔

فلک سر جھکائے بیٹھی تھی۔

رافع نے سفیان کی بات کو مذاق سمجھا تھا لیکن سفیان نے کمرے سے جاتے جاتے کہا۔ "ابھی سب کچھ تیار کر کے لے آتا ہوں۔"

فلک نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔ سفیان اس وقت کمرے سے نکل چکا تھا۔

"کمال کرتے ہیں آپ!" فلک نے رافع کو گھورتے ہوئے کہا۔ "اسے جانے بھی دیا آپ نے؟ کچھ بھی بنانا نہیں آتا اسے، سب کچھ برباد کر دے گا۔" وہ اٹھی اور تیزی سے چلتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

مطربہ نے بے قراری سے رافع کی طرف دیکھتے ہوئے بے چینی سے پہلو بدلا۔ وہ ہرگز نہیں چاہتی ہوگی کہ فلک اور سفیان کچن میں تنہا ہوں لیکن رافع ضبط کیے بیٹھا رہا۔ اب اس کے دماغ میں فلک کا ایک فقرہ چبھ رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ سفیان کو کچھ بھی بنانا نہیں آتا تھا اور یہ کہ وہ سب کچھ برباد کر دے گا۔

"میں بھی جا کر دیکھتی ہوں۔" مطربہ سے رہا نہ گیا اور وہ کھڑی ہوگئی۔

"بیٹھیے بھی۔" رافع نے سنجیدگی سے کہا۔ "جو کچھ ہونا ہے، وہ تو ہوگا۔"

"جی!" مطربہ چونکی۔ "میں سمجھی نہیں۔"

"میرا مطلب ہے۔" رافع مسکرایا۔ "فلک چلی گئی ہے تو سب کچھ ٹھیک ہی ہوگا۔ سفیان کو کچھ برباد کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔ بیٹھیے آپ! مجھے ایک بات بھی کرنی ہے آپ سے۔"

مطربہ بیٹھ گئی اور کچھ الجھی ہوئی نظروں سے رافع کی طرف دیکھنے لگی، لیکن اس کی بے چینی بھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس کی نظریں بار بار دروازے کی طرف اٹھ رہی تھیں۔

"سفیان صاحب بہت دلچسپ آدمی ہیں۔" رافع نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میری سمجھ میں نہیں آسکا کہ ان سے آپ کی بنتی کیوں نہیں؟"

"یہ آپ نے کیسے سمجھ لیا؟" مطربہ سنجیدگی سے بولی۔

"میں تو ان سے بہت محبت کرتی ہوں اسی لیے ہماری شادی بھی ہوئی۔ مجھے تو ان کے بغیر چین ہی نہیں پڑتا۔"

رافع کے خیال میں یہ سراسر جھوٹ تھا۔ مطربہ اپنی فلمی مصروفیات کے باعث سفیان سے دور رہنے پر مجبور ہوتی ہو گی۔

"خیر!" رافع نے اس معاملے میں بحث کرنا غیر ضروری سمجھا اور کہا۔ "یہ احساس مجھے دراصل یوں ہوا کہ جب بھی ہماری ملاقات ہوئی ہے، میں نے آپ کو خوش گوار موڈ میں بھی نہیں دیکھا، بلکہ سفیان صاحب سے آپ کی نوک جھوک بھی رہتی ہے۔"

"جہاں دو برتن ہوتے ہیں، وہ کھڑکتے تو ہیں۔" مطربہ نے جواب میں ایک فلمی سی بات کہہ دی۔

"لیکن خاص مواقع پر نہیں کھڑکتے۔" رافع نے یہ بات بہ ظاہر بڑی سادگی سے کہہ دی تھی لیکن مطربہ نے اس کی چبھن ضرور محسوس کی ہوگی۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن رافع نے اسے بولنے کا موقع نہیں دیا اور ہنس کر کہا۔ "خیر چھوڑیے! غالباً مجھ سے غلطی ہوئی کہ میں آپ سے یہ بات کر بیٹھا۔ میاں بیوی کے معاملات میں کسی تیسرے کو دخل نہیں دینا چاہیے۔"

مطربہ اسے گھورنے لگی، پھر کچھ توقف سے بولی۔

"آپ نے اچانک اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ دراصل آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مجھے آپ کی بیوی سے سفیان کی بے تکلفی اچھی نہیں لگتی۔ خیر! سفیان تو مرد ہیں۔ مجھے حیرت آپ پر ہے۔ آپ اپنی بیوی کے یہ طور طریق کیسے برداشت کر لیتے ہیں؟"

رافع نے اپنے دل و دماغ کی کیفیت کے خلاف مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "میں تو سمجھتا ہوں کہ وہ دونوں بس بہت اچھے دوست ہیں۔ اگر ان کے دلوں میں چور ہوتا تو وہ دوسروں کے سامنے محتاط رہا کرتے۔"

ممکن تھا کہ مطربہ یہ بحث آگے بڑھاتی لیکن اسی وقت سفیان ہنستا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور رافع کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں تو بہت اچھا ناشتا تیار کرتا لیکن آپ کی بیگم صاحبہ نے مجھے بھگا دیا کچن سے۔"

"بڑی جلدی بھگا دیا!" مطربہ کا لہجہ معمول کے مطابق کھلا تھا۔

سفیان نے اس کی طرف دھیان دیے بغیر ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "بہرحال، میں نے اس کم وقت میں بھی اسے بہت سے لطیفے سنا ڈالے۔ اس کا موڈ ٹھیک کر دیا ہے۔ اب وہ اس موسم میں مری سے نکلنے پر اصرار نہیں کرے گی۔"

ذرا دیر بعد جب فلک ناشتے کی ٹرالی لے کر آئی تو اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

☆☆☆

اس دن بارش نہیں ہوئی لیکن پھوار پڑتی رہی اور دوپہر کو بادل چھٹنے لگے۔ سہ پہر سے پہلے مطلع بالکل صاف ہو چکا تھا اور سورج پوری آب و تاب سے چمکنے لگا تھا۔ موسم کی اس یہ تدریج تبدیلی کے ساتھ فلک کے چہرے کی چمک بڑھتی رہی تھی۔ آخر اس نے کہا۔ "اب شام سے پہلے پہلے راستے بالکل خشک ہو جائیں گے۔ اب ہم آج بھی نکل سکتے ہیں یہاں سے!"

"راستے میں رات ہو جائے گی۔" رافع نے کہا۔

"ہونے دیں۔" فلک نے کہا۔ "میں اب رات گزرنے کا انتظار نہیں کروں گی۔ کیا پتا، کل صبح بادل پھر ٹپک پڑیں۔"

رافع کو اندازہ تھا کہ کراچی واپس جانے کے لیے فلک کی بے تابی بہت بڑھ چکی ہے لہٰذا اس نے رکنے پر اصرار نہیں کیا۔

سفیان اور مطربہ ناشتا کرنے کے ایک گھنٹے بعد ان کے ریسٹ ہاؤس سے چلے گئے تھے۔ اب فلک نے موبائل پر سفیان سے رابطہ کیا اور اسے اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ رافع کی طرح سفیان نے بھی رات کے سفر سے گریز کرنا چاہا لیکن فلک کے آگے اس کی بھی نہ چل سکی۔

سفیان سے بات ختم کر کے فلک نے موبائل پر اپنے والد اورنگ زیب صاحب سے رابطہ کیا جو اس وقت لاہور میں تھے۔

"اچانک کسی کام سے آنا پڑا یہاں۔" انہوں نے بتایا۔ "شام کی فلائٹ سے واپس چلا جاؤں گا۔"

"میں نے آپ کو یہ اطلاع دینے کے لیے فون کیا ہے ڈیڈی کہ میں اور رافع آج مری سے روانہ ہو رہے ہیں۔ اگر پنڈی سے کوئی فلائٹ مل گئی تو آج ہی رات کراچی بھی پہنچ جائیں گے۔"

"یہ اچانک پروگرام کیوں بدل دیا؟ تمہیں تو وہاں چند دن رکنا تھا۔"

"کل ایک ایسا واقعہ ہو گیا ہے کہ اب مری سے وحشت ہونے لگی ہے۔"

"کیا ہو گیا؟" اورنگ زیب صاحب نے تشویش سے پوچھا۔

فلک نے واردات کی ساری کہانی دہرا دی۔

اورنگ زیب صاحب وہ سب کچھ سن کر ناخوش گوار لہجے میں بولے۔ "اور تم مجھے اس کی اطلاع کل نہیں دے سکیں؟"

"میں نے سوچا تھا کہ آپ بہت پریشان ہو جائیں گے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ سب کام چھوڑ چھاڑ کر مری پہنچنے کا پروگرام بنا لیتے۔ اب کیونکہ میں مری سے واپس آرہی ہوں اس لیے سوچا کہ آپ کو بتا دوں۔"

"پولیس میں رپورٹ کروا دی؟"

"پولیس کیا کرتی ڈیڈی؟ ہم ہی لوگوں کو پریشان کرتی رہتی۔ میں نے ایک اور قدم اٹھانے کے بارے میں سوچا ہے۔"

"اور کیا قدم اٹھا سکتی ہو؟"

فلک نے انہیں بتا دیا کہ وہ ڈاکو کی تصویر بنا کر رافع کے دوست انور مختار کو دے دے گی۔ اس نے کہا۔ "اگر وہ بلیک لسٹڈ ہوا تو فوراً پکڑا جا سکے گا۔"

"ہاں، سوچا تو تم نے ٹھیک ہے۔"

"اچھا اب میں بند کرتی ہوں۔ کراچی آجاؤں گی تو تفصیل سے بات کریں گے۔ یہ میں ایک اور آواز بھی سن رہی ہوں۔ آپ کے ساتھ کوئی ہے کیا؟"

"ہاں۔" اورنگ زیب صاحب نے جواب دیا۔ "کام کچھ ایسا تھا کہ میں فرید کو بھی ساتھ لے آیا تھا۔"

فرید، فلک کے سوتیلے بھائی کا نام تھا۔ اورنگ زیب صاحب نے دوسری شادی اس وقت کی تھی جب فلک صرف ڈھائی سال کی تھی اور اس کی ماں کا انتقال ہو گیا تھا۔

"کون تھا ڈیڈی کے ساتھ؟" رافع نے اس وقت پوچھا جب فلک اپنا موبائل ایک طرف رکھ رہی تھی۔

"فرید۔" فلک نے جواب دیا۔

"بہت ہونہار ہے یہ نوجوان۔" رافع نے کہا۔

www.pkdigest.com

"اور مجھ سے محبت بھی بہت کرتا ہے۔" فلک نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ ہم دونوں سگے بہن بھائی نہیں ہیں۔"

"یہ تو ہے۔" رافع نے کہا۔ "اگر مجھے بتا نہ دیا جاتا تو مجھے بھی بالکل محسوس نہیں ہوتا۔ اس کی زندگی کا ایک رخ بالکل تمہارا جیسا ہے۔"

"وہ کون سا؟"

"تم ہی نے بتایا تھا۔ اس کی عمر بھی ڈھائی سال تھی جب اس کی والدہ کا انتقال ہوا۔"

"ہاں' یہ ایک قدر مشترک تو ہے۔" فلک نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "لیکن میری طرح اس پر سوتیلی ماں کا سایہ نہیں پڑا۔ ڈیڈی نے تیسری شادی کے بارے میں سوچا بھی نہیں۔"

"خیر، چھوڑو اذرا چائے تو بنالو۔ موڈ ہو رہا ہے۔"

"ابھی بنا کے لائی ہوں سرکار!" فلک نے شرارتی انداز سے مؤدب ہو کر کہا۔

رافع ہنسنے لگا اور وہ کچن میں چلی گئی۔

شام کو جب دو کاروں کا قافلہ وہاں سے روانہ ہوا تو مری کی فضا خاصی خنک ہو چکی تھی۔

"اطمینان بخش بات یہ ہے کہ بادل نہیں ہیں۔" رواں کار میں رافع نے کہا۔

فلک جھک کر عقب نما آئینے میں پیچھے آنے والی کار دیکھنے لگی جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر مطربہ تھی۔

"بڑا مضحکہ خیز لگتا ہے یہ مجھے۔" فلک بولی۔

"کیا؟" رافع نے پوچھا۔

"کار میں مرد ہو لیکن عورت ڈرائیونگ کرے۔"

"بعض اوقات مجبوری بھی ہوتی ہے۔ مرد کو ڈرائیونگ نہ آتی ہو تو یہ فریضہ عورت ہی کو سرانجام دینا پڑتا ہے۔"

"میں ذرا سفیان کو چھیڑتی ہوں۔" فلک نے وینٹی بیگ سے اپنا موبائل نکالتے ہوئے کہا۔

"کیوں خوامخواہ..." رافع کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

فلک نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا اور موبائل پر سفیان سے رابطہ قائم کیا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ جھک کر عقب نما آئینے میں پیچھے آنے والی کار پر بھی نظر رکھے رہی۔ اس نے دیکھا کہ سفیان نے موبائل کان سے لگایا تھا۔

"ہاں فلک!" اس کی آواز آئی۔

فلک نے دیکھا کہ مطربہ نے چونک کر سفیان کی طرف دیکھا تھا۔

"سگنلز؟" فلک کا لہجہ سوالیہ تھا۔

"پورے آرہے ہیں۔" جواب آیا۔

رابطہ ہوتے ہی یہ الفاظ رافع کو عجیب سے لگے۔ نہ جانے کیوں اسے خیال آیا کہ شاید وہ "کوڈورڈز" تھے۔

"بالکل بے وقوف لگ رہے ہو تم۔" فلک نے ہنس کر کہا۔ "ایسا لگ رہا ہے جیسے مالکہ نے شوفر کو ڈرائیونگ سیٹ سے ہٹا دیا ہو۔"

"لگ رہا ہوگا۔ میں تو بڑے سکون سے ہوں۔"

اس وقت پچھلی کار میں بیٹھی ہوئی مطربہ نے دھیمی آواز میں کہا۔ "اسپیکر آن کر دیجیے سفیان! آپ تو خوب جانتے ہیں کہ مجھے آپ دونوں کی باتیں سننے سے بہت دلچسپی ہے۔"

"سگنلز کچھ گڑبڑ ہو رہے ہیں فلک!" سفیان کی آواز آئی۔

فلک کے ہونٹوں پر مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ اس نے آئینے میں دیکھ لیا تھا کہ سفیان نے اسے جواب دینے کے بجائے دوسرے ہاتھ سے موبائل کو کچھ کیا تھا اور پھر موبائل اپنے کان سے بھی ہٹا لیا تھا۔

"سگنلز تو ٹھیک آرہے ہیں۔" فلک نے مطربہ کی آواز سنی۔

"ہاں سفیان!" وہ جلدی سے بولی۔ "موڑ پر میرے موبائل کے سگنلز کچھ گڑبڑ پڑے تھے۔ اب تو ٹھیک ہیں نا؟"

"ہاں۔" سفیان کی آواز آئی۔ "اس وقت تم نے کیا کہا تھا؟ بات پوری نہیں سنائی دی تھی۔"

"میں یہ کہہ رہی تھی کہ مطربہ ڈرائیونگ کرتی ہوئی بہت اچھی لگ رہی ہے۔" فلک نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بھئی ان کا تو کہیں سے کہیں تک جواب نہیں ہے۔" سفیان ہنسا۔ "فلمی مناظر میں تو انہیں بہت تیز ڈرائیونگ کا مظاہرہ بھی کرنا پڑتا ہے۔"

فلک ہنسی۔ "اس خطرناک راستے پر تیز ڈرائیونگ نہ کر بیٹھیں۔"

"ایسی بے وقوف تو نہیں ہیں یہ۔"

"اچھا بس! میں نے یہی کہنے کے لیے فون کیا تھا کہ یہ بہت اچھی لگ رہی ہیں۔" فلک نے رابطہ منقطع کر دیا۔

رافع بولا۔ "یہ سگنلز والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

جواب توقع کے مطابق تھا۔ "یہ کوڈورڈز ہیں۔" فلک نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "سفیان کے جواب سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے موبائل کا اسپیکر تو آن نہیں ہے! مطربہ اکثر ایسا کرواتی ہے اور کروایا اس نے۔"

رافع نے ایک طویل سانس لی۔ "اسی لیے تم نے بعد میں بات بدل دی؟"

"ہاں۔" فلک نے جواب دیا۔ "اچانک سفیان نے کہا تھا کہ سگنلز گڑبڑ ہو رہے ہیں۔ اس وقت مطربہ نے سفیان سے اسپیکر آن کروایا ہوگا۔ اس کی ان حرکتوں سے مجھے بڑا مزہ آتا ہے۔"

"اپنا دشمن بنا لو تم اسے۔"

"وہ کیا کر سکتی ہے میرا؟"

"عورت کے جنون پر میں نے کئی کتابیں پڑھی ہیں، کئی فلمیں دیکھی ہیں۔ تم نے بھی یقیناً دیکھی ہوں گی۔"

فلک نے بے پروائی سے اپنے شانے جھٹکے اور کھڑکی سے سیکڑوں فٹ گہری کھائی کی طرف دیکھنے لگی۔

ڈرائیونگ سیٹ کی طرف اونچے اونچے پہاڑ اور چٹانیں تھیں۔

آدھے گھنٹے بعد اندھیرا پھیل گیا۔ رافع نے کار کی رفتار کچھ کم کر دی۔ رات ہوتے ہی کھائی میں بہت دور جگنو سے چمکتے نظر آنے لگے تھے۔

"اس وقت یہ منظر بہت اچھا لگ رہا ہے۔" فلک نے کہا۔ "تم نے بتایا تھا کہ میلوں نیچے مقامی لوگوں کے چھوٹے چھوٹے گھر ہیں۔ وہاں جو روشنی ہے، وہ جگنوؤں کی طرح نظر آرہی ہے۔"

"وہ گھر اگر قریب ہوں تو چراغ سے جلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔"

"تم نے بتایا تھا کہ وہ لوگ اوپر بھی آتے جاتے ہیں۔ وہ اتنی بلندی کیسے طے کرتے ہوں گے؟"

"عادی ہیں وہ اس کے۔" رافع نے جواب دیا، پھر بولا۔ "تمہیں اتنی گہرائی میں دیکھتے ہوئے ڈر نہیں لگتا؟"

"مجھے تو بہت اچھا لگتا ہے۔"

"زیادہ تر عورتیں ڈرتی ہیں۔"

"وہ تو ایک قسم کا مرض ہوتا ہے اور وہ مرض ہو تو مرد بھی ڈرتے ہیں۔ کبھی اگر دن میں آنا ہوا تو میں نیچے اتروں گی۔"

"نیچے اترنا تو شاید زیادہ مشکل نہ ہو لیکن واپس اوپر آتے آتے آدھی رہ جاؤ گی۔" رافع نے ہنس کر کہا۔

اب وہ اتنی دور نکل آئے تھے کہ مری کا رہائشی علاقہ دور رہ گیا تھا۔ سامنے سے آتی ہوئی بسوں، ویگنوں اور کاروں کی تعداد بہت کم ہو گئی تھی۔ کچھ دیر بعد کاریں نظر آنا بالکل بند ہو گئیں۔

"اندھیرے میں ان راستوں پر شاید صرف پروفیشنل ڈرائیور ہی چلتے ہوں گے۔" فلک بولی۔

رافع نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے اپنی ساری توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز کر دی کیونکہ اس وقت اسے ایک خطرناک موڑ کاٹنا تھا۔

موڑ کاٹنے کے بعد وہ بولا۔ "ہاں! کچھ کہا تھا تم نے؟"

"میں یہ کہہ رہی تھی کہ..."

ایک شور کے باعث فلک اپنی بات پوری نہیں کر سکی۔

"اوہ گاڈ!" رافع کے منہ سے نکلا۔

اس موڑ کے بعد راستہ قدرے کشادہ ہو گیا تھا اس لیے رافع نے رفتار قدرے بڑھا دی تھی اس لیے بریک لگا کر گاڑی یک لخت نہیں روکی جا سکتی تھی۔

چاندنی رات ہونے کی وجہ سے انہیں وہ بڑا سا چٹان جیسا پتھر دکھائی دے گیا تھا جو بلندی سے لڑھکتا ہوا ان کے راستے میں آنے والا تھا۔

فلک اتنی خوف زدہ ہوئی کہ رافع کی کمر سے لپٹ گئی۔

"بریک لگاؤ۔" سفیان کار کی کھڑکی سے سر نکال کر شاید پوری قوت سے چیخا تھا لیکن اس کی آواز خاصی دھیمی ہو کر رافع کے کانوں تک پہنچ سکی تھی۔

فلک تو سن ہی نہیں سکی کیونکہ وہ دہشت زدہ ہو گئی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ چٹان جیسا پتھر ان کی کار پر ہی آکر گرے گا۔

رافع نے اگر سفیان کی آواز نہ سنی ہوتی تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ پیر یک تو لگا ہی رہا تھا لیکن اسے اس میں بھی احتیاط برتنا پڑ رہی تھی۔ ہینڈ لائٹس میں اس نے سڑک پر تیل کی چمک دیکھ لی تھی جو غالباً کسی پرانی گاڑی سے گرتا چلا گیا تھا اور خاصی دور تھا۔

رافع زیادہ تیزی سے بریک لگاتا تو عین ممکن تھا کہ ٹائر سلپ ہو جاتے اور کار سیکڑوں فٹ گہری کھائی میں جا گرتی یا دوسری طرف کی چٹانوں سے ٹکرا جاتی۔

لڑھکتا ہوا چٹان جیسا پتھر کافی نیچے آچکا تھا لیکن رافع کی کار ابھی اس سے کچھ دور تھی۔

پچھلی کار سے سفیان برابر چیخے جا رہا تھا۔ فلک رافع کی کمر سے لپٹی ہوئی تھی۔ خود رافع کی حالت ایسی تھی جیسے اعصابی شاک کا شکار ہو گیا ہو۔ اسے کار اس جگہ سے پہلے روکنا

www.pkdigest.com

تھی جہاں اس کے مطابق وہ چٹان نما پتھر سڑک پر گرتا۔ ان کے پیچھے مطربہ بھی رفتار بڑی احتیاط سے کم کررہی تھی۔ سڑک پر تیل اسے بھی دکھائی دے گیا ہوگا۔

ایک موقع ایسا آیا کہ رافع کو یک لخت پورا بریک لگانا پڑا۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اب اگر گاڑی زیادہ آگے بڑھی تو وہ بھاری پتھر ان کی کار پر ہی گرے گا اور وہ فلک سمیت کچلا جائے گا۔ اس صورت میں ان دونوں کی موت بڑی حد تک یقینی تھی۔

یک لخت بریک لگانے کا جو نتیجہ نکلنا چاہیے تھا، وہ بہرحال نکلا۔ گاڑی سلپ ہوئی لیکن کھائی کی طرف جانے کے بجائے پہاڑ کی جانب گئی اور ایک چٹان سے ٹکرا کر رک گئی۔

صرف ایک گز آگے وہ بھاری پتھر ایک خوف ناک آواز کے ساتھ سڑک پر گرا لیکن اسی جگہ رک جانے کے بجائے لڑھک کر کھائی میں گرنے لگا۔ اس کے گرنے کی دور ہوتی ہوئی آواز رافع، سفیان اور مطربہ تینوں کو سنائی دے رہی تھی۔ صرف فلک وہ آواز نہیں سن سکی۔

چٹان سے کار ٹکرانے کے باعث جو جھٹکا لگا تھا، اس سے وہ بھی کچھ نہ کچھ چٹان جیسا پتھر کار پر آگرا تھا۔

اس کے علاوہ اس کے سر پر کوئی چوٹ بھی لگی تھی۔ اس چوٹ یا دہشت کے باعث وہ بے ہوش ہوئی تھی۔

جب اسے ہوش آیا تو اس نے خود کو ایک ایسے کمرے میں پایا جو کسی اسپتال کا کمرا معلوم ہوتا تھا۔

بستر کے قریب موجود سفیان نے اس کے سر پر آہستگی سے ہاتھ رکھتے ہوئے بڑی محبت سے پوچھا۔ اس نے کوشش کی تھی کہ اس کا ہاتھ اس ڈریسنگ سے مس نہ ہو جو فلک کی پیشانی سے سر کے پچھلے حصے تک تھی۔

فلک کے حواس پوری طرح بحال ہونے میں چند لمحے گزرے اور پھر وہ چیخ پڑی۔

"رافع کہاں ہیں؟"

اس وقت ایک نرس کمرے میں داخل ہورہی تھی۔

سفیان نے فلک کو جواب دیا۔ "رافع صاحب باہر ہیں۔ پولیس ان سے کچھ پوچھ گچھ کررہی ہے۔"

نرس قریب آگئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بھری ہوئی سرنج تھی۔

"امکان یہی تھا کہ اب آپ کو جلد ہی ہوش آجائے گا۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی اور فلک کے دائیں بازو پر جھکی ہوئی روئی رگڑنے لگی۔

فلک کو سب کچھ یاد آچکا تھا۔ بہت سے خیالات اس کے دماغ میں چکرانے لگے تھے۔

"شکر ہے فلک کہ تمہیں کوئی خطرناک چوٹ نہیں آئی۔" مطربہ بولی۔

فلک نے نرس سے پوچھا۔ "یہ آپ مجھے کس دوا کا انجکشن لگارہی ہیں؟"

"یہ کوئی دوا نہیں، طاقت کا انجکشن ہے۔" نرس نے جواب دیا۔ "آپ کو چوٹ تو خطرناک نہیں لگی لیکن یہاں تک آتے آتے خون خاصا بہہ گیا ہے۔"

فلک واقعی نقاہت محسوس کررہی تھی۔

سفیان اس کے سرہانے کھڑا تھا۔ مطربہ سامنے تھی۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہیں تھے۔

نرس نے انجکشن لگا کر کہا۔ "میں ابھی ڈاکٹر صاحب کو بھیجتی ہوں لیکن وہ ایک رسمی وزٹ ہوگا۔ معاملہ ایسا نہیں ہے کہ آپ کا معائنہ ضروری ہو۔"

"رافع کو بلاؤ سفیان!" فلک بولی۔

"فکرمند نہ ہو۔ ہم ہیں نا تمہارے پاس۔" سفیان نے کہا۔ "پولیس کی پوچھ گچھ ختم ہوگی تو رافع صاحب خود آجائیں گے۔"

نرس کمرے سے چلی گئی۔

"کتنا خوف ناک تھا وہ!" فلک نے جھرجھری لی۔ "میں تو سمجھی تھی کہ وہ کار پر ہی آگرا... اگر ایسا ہوتا تو میں زندہ نہ ہوتی۔" پھر اس نے پوچھا۔ "یہ کون سا اسپتال ہے؟ کیا ہم پنڈی میں ہیں؟"

"نہیں۔" سفیان نے جواب دیا۔ "وہاں پہنچنے میں تو بہت دیر لگتی۔ تمہارا بہت زیادہ خون بہہ جاتا۔ ہم واپس مری آگئے ہیں۔ شکر ہے کہ کار کھائی میں نہیں جا گری۔"

"کار کو اتنا زوردار جھٹکا اور میرے سر پر چوٹ کیسے لگی؟"

"کار پہاڑ سے ٹکرا گئی تھی اور تمہارا سر ڈیش بورڈ سے ٹکرایا تھا۔ کار کی باڈی کو تو خاصا نقصان پہنچا لیکن انجن ٹھیک رہا۔ اسے واپس لانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ تم ہمارے کار میں آئی ہو۔ مطربہ تمہارا سر اپنی گود میں لیے بیٹھی رہی تھی۔ اس کا وہ لباس تمہارے خون سے رنگ گیا تھا۔ یہاں آنے کے بعد ہی اس نے کپڑے تبدیل کیے ہیں۔"

"رافع کو تو کوئی چوٹ نہیں لگی؟"

"معجزانہ طور پر اسے خراش بھی نہیں آئی حالانکہ اس طرف سے کار کا دروازہ خاصا پچک گیا ہے۔"

اسی وقت رافع کمرے میں آگیا اور لپکتا ہوا فلک کی طرف آیا۔

''نرس نے بتایا تھا کہ تمہیں ہوش آگیا ہے۔ اب کیسا محسوس کررہی ہو؟'' اس نے قریب آکر پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ چل بھی سکتی ہوں۔'' فلک نے اٹھنا چاہا۔

''ابھی لیٹی رہو فلک!'' سفیان جلدی سے بولا۔ ''ڈاکٹر آکے تمہیں دیکھ لے۔ اس کے بعد...'' اس نے ڈاکٹر کو کمرے میں آتے دیکھ کر خود ہی اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

ڈاکٹر بہت خوش مزاج تھا۔ اس نے فلک سے دو چار باتیں کرتے ہوئے اس کا بلڈ پریشر چیک کیا، پھر بولا۔ ''اب آپ بالکل ٹھیک ہیں مسز رافع! سر کی چوٹ ٹھیک ہونے میں بھی زیادہ دن نہیں لگیں گے۔''

''کیا میں اسپتال سے جاسکتی ہوں؟'' فلک نے پوچھا۔

''ہاں ہاں، بالکل! کوئی حرج نہیں ہے۔ بس ذرا پولیس کو اپنا بیان دے دیجیے۔ میں نے ان لوگوں سے کہا تھا کہ پہلے آپ کا معائنہ کرلوں۔''

''میرا بیان بھی ضروری ہے۔'' فلک نے منہ بنایا۔

ڈاکٹر نے ہنس کے کہا۔ ''یہ لوگ رسمی کارروائیاں تو پوری کرتے ہی ہیں۔''

فلک نے رافع کی طرف دیکھا۔ ''ان لوگوں نے تم سے کیا پوچھا؟''

''حادثے کی تفصیل۔'' رافع نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''پولیس دراصل اس الجھن کا شکار ہوگئی ہے کہ سڑک پر تیل اتنی دور تک کیسے پھیلا ہوا تھا اور یہ کہ اتنا بڑا پتھر خود بہ خود کیسے لڑھک گیا۔ وہ لوگ پوچھ رہے تھے کہ ہماری کسی سے دشمنی تو نہیں؟''

فلک ہنسی۔ ''ہماری کسی سے کیا دشمنی ہوگی۔''

''تم بھول رہی ہو فلک...'' اس مرتبہ رافع کو جملہ ادھورا چھوڑنا پڑا کیونکہ ایک پولیس افسر اور ایک کانسٹیبل کمرے میں داخل ہوئے۔

فلک نے کچھ اشارہ کیا تو رافع اس پر جھک گیا۔

فلک نے پوچھا۔ ''آپ نے انہیں اس ڈاکو کے بارے میں تو کچھ نہیں بتایا؟'' اس نے اپنی آواز اتنی دھیمی رکھی تھی کہ رافع کے سوا کوئی نہ سن سکے۔

''نہیں۔'' رافع نے کہا اور سیدھا کھڑا ہوگیا۔

پولیس والے قریب آگئے۔

بیان سراسر رسمی بھی نہیں تھا۔ کسی دشمن کے بارے میں سوال فلک سے بھی کیا گیا۔ بیان لینے کے بعد پولیس افسر نے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب بتا رہے تھے کہ آپ اسپتال چھوڑنا چاہتی ہیں۔ یہاں سے آپ کہاں جائیں گی؟''

''اپنے ریسٹ ہاؤس۔'' فلک نے جواب دیا۔

رافع بولا۔ ''میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ ہمارا ریسٹ ہاؤس کہاں ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' پولیس آفیسر کھڑا ہوگیا۔ ''لیکن ابھی آپ مری سے نہ جایئے گا۔ ممکن ہے کہ ہمیں پھر کسی وقت آپ سے رابطہ کرنا پڑے۔''

فلک نے بے چینی سے پہلو بدلا اور رافع کی طرف دیکھا۔

''ٹھیک ہے آفیسر!'' رافع نے کہا۔ ''ہم ابھی نہیں جائیں گے۔''

''کیا مصیبت ہے۔'' پولیس والوں کے جانے کے بعد فلک بولی۔ ''میں تو مری سے جلد از جلد جانا چاہتی ہوں۔''

''فلک!'' رافع نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ان لوگوں کے دماغ میں یہ خیال چکرا رہا ہے کہ کسی نے ہمیں ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ لوگ مکمل چھان بین کر کے اپنا اطمینان کرنا چاہتے ہیں۔''

فلک کے چہرے سے اکتاہٹ ظاہر ہونے لگی۔ رافع اس کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ فلک کا یہ مزاج اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ بڑے سے بڑے معاملات اس پر اثر انداز تو ہوتے تھے لیکن وقتی طور پر! وہ بہت جلد خود کو معمول پر لے آتی تھی۔ اتنے بڑے حادثے سے بچ نکلنے کے بعد اب اس کے چہرے سے کسی قسم کی پریشانی ظاہر نہیں ہورہی تھی۔ اسے صرف یہ خیال ستا رہا تھا کہ وہ ابھی مری سے نہیں جاسکے گی۔

☆☆☆

وہ چاروں آدھے گھنٹے بعد ریسٹ ہاؤس میں تھے۔ رات اپنے تیسرے پہر سے گزر رہی تھی۔ فلک کو رافع نے بستر پر یہ اصرار لٹایا تھا ورنہ وہ ان کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرنا چاہتی تھی۔

''اب باتوں کا وقت بھی نہیں ہے۔'' رافع نے سفیان اور مطربہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب آپ لوگ بھی اپنے ریسٹ ہاؤس چلے جائیں۔''

''میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔'' سفیان کے چہرے پر گمبھیرتا تھی۔

سبھی اس کی طرف غور سے دیکھنے لگے۔

''پولیس کا شبہ بالکل درست ہے۔'' سفیان ذرا سا رک کر بولا۔ ''سڑک پر جو اتنا تیل پھیلا ہوا تھا، وہ کسی نے ازخود وہاں پھیلایا تھا۔ کسی گاڑی سے ٹپکتا ہوا آئل سڑک پر اس طرح پھیلا ہوا نہیں ہوتا۔ دوسری بات یہ کہ جب اس پتھر نے لڑھکنا شروع کیا تھا تو اتفاق سے میری نظر اس وقت ادھر ہی تھی۔ وہاں میں نے دو آدمیوں کے سائے دیکھے تھے۔''

''کیا؟'' مطربہ تیزی سے بولی۔

فلک اور رافع بھی چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''ہاں۔'' سفیان نے کہا۔ ''یوں کہا جاسکتا ہے کہ میں ان کی بس ایک جھک ہی دیکھ سکا تھا۔ میری توجہ لڑھکتے ہوئے پتھر کی طرف مبذول ہوگئی تھی۔ دوبارہ وہ سائے دکھائی بھی نہیں دیے۔ اگر چاندنی رات نہ ہوتی تو وہ سائے ایک بار بھی دکھائی نہیں دیتے۔ مجھے بڑی حد تک یقین ہے کہ وہ پتھر انہی دونوں نے لڑھکایا تھا اور سڑک پر تیل پھیلانے والے بھی وہی ہوں گے۔ انہیں یقین نہیں ہوگا کہ پتھر کار پر جا گرے گا لہٰذا تیل اس لیے پھیلایا گیا کہ جب اس پتھر سے بچنے کے لیے مجلت میں بریک لگایا جائے تو گاڑی سلپ ہو کر کھائی میں جا گرے۔''

یہ سب کچھ بڑے سکوت کے عالم میں سنا گیا تھا۔ سفیان کے خاموش ہوجانے کے بعد بھی کمرے میں کچھ لمحوں تک مرگ آسا سکوت طاری رہا۔

''کون ہوسکتا ہے ہمارا دشمن۔'' رافع نے سکوت توڑا۔

''آپ کا نہیں رافع صاحب!'' سفیان نے کہا۔ ''میرے خیال میں یہ کوشش فلک کو ختم کرنے کے لیے کی گئی تھی۔''

فلک کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

''مگر کیوں؟'' رافع پھر بولا۔ ''فلک کا دشمن کون ہوسکتا ہے؟''

''وہی ڈاکو۔'' سفیان نے کہا۔ ''فلک نے اس کی تصویر بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا ہوگا کہ اس طرح قانون کے ہاتھ اس تک نہیں پہنچ جائیں۔''

''سفیان!'' فلک کی آواز میں لرزش تھی۔ ''اسے میرے اس ارادے کا علم کیسے ہوسکتا ہے؟''

''کسی ذریعے ہی سے یہ بات اس تک پہنچی ہوگی۔'' سفیان نے کہا۔ ''اسے پہلے سے یہ ہرگز نہیں معلوم ہوگا کہ فلک کسی کی تصویر بنانے میں اتنی مشاق ہے۔ اگر وہ واقف ہوتا تو پھر یہیں فلک کو ختم کرنے کی کوشش کرتا۔''

''کوشش کرتا۔'' فلک کی مسکراہٹ پھیکی سی تھی۔ ''بڑی احتیاط سے لفظوں کا انتخاب کیا ہے تم نے! یہ کہو کہ وہ مجھے یہیں گولی مار کر ختم کردیتا۔''

سفیان خاموش رہ گیا۔

رافع سوچتا ہوا بڑبڑایا۔ ''اسے یہ بات کس سے معلوم ہوسکتی ہے؟''

''مجھ سے یا سفیان سے۔'' مطربہ نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ''کیوں فلک! تم نے صرف ہم ہی دونوں کو تو اپنے اس ارادے سے باخبر کیا تھا۔''

''باخبر تو میں بھی تھا۔'' رافع آہستہ سے بولا۔ اس کے چہرے پر سوچ بچار کے تاثرات تھے۔

فلک بولی۔ ''بتایا تو میں نے ڈیڈی کو بھی تھا۔''

''تمہارے ڈیڈی تو تمہاری جان کے دشمن نہیں ہوسکتے فلک۔'' مطربہ نے کہا۔

فلک سوچتے ہوئے بولی۔ ''ہوسکتا ہے ڈیڈی نے کسی سے اس کا ذکر کردیا ہو اور وہ ظاہر ہے کہ یہ نہیں جانتے ہوں گے کہ جس سے ذکر کررہے ہیں، اسے مجھ سے کوئی دشمنی ہے۔''

رافع نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''کیا تمہارا اشارہ اپنے بھائی فرید کی طرف ہے؟''

فلک نے بے بسی کے سے انداز میں بولی۔ ''میں نہیں جانتی کہ میں کس کی طرف اشارہ کررہی ہوں۔''

''فرید تمہارا سگا بھائی نہ سہی لیکن تم سے بہت محبت کرتا ہے۔ یہ تم اکثر کہہ چکی ہو۔''

''بس تو پھر۔'' مطربہ بولی۔ ''بھائی اور باپ دشمن نہیں، اور رافع صاحب! آپ یوں بھی یہ حرکت نہیں کرواسکتے کہ اس طرح خود آپ بھی ہلاک ہوتے۔ سفیان اور فلک بھی ایک دوسرے کے بہترین دوست ہیں۔'' وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔ ''اب صرف میں ہی رہ جاتی ہوں۔''

''ایسی بات زبان پر نہ لاؤ مطربہ!'' فلک نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ہمیں سنجیدگی سے سوچنا چاہیے کہ اس شخص تک یہ بات پہنچانے والا کون ہوسکتا ہے۔''

''ایک بات اور بھی طے ہے۔'' سفیان بولا۔ ''وہ شخص اکیلا بھی نہیں ہے۔ کوئی اور بھی اس کے ساتھ ہے۔ میں نے دو سائے دیکھے تھے۔''

''سفیان صاحب!'' رافع بولا۔ ''آپ نے یہ سب کچھ پولیس کو نہیں بتایا؟''

''کیسے بتاتا!'' سفیان نے جواب دیا۔ ''فلک نے

www.pkdigest.com

شروع ہی سے یہ چاہا ہے کہ پولیس کو کچھ نہ بتایا جائے۔"

فلک بولی۔ "دراصل میں پولیس کے طریقہ کار سے بہت الجھتی ہوں۔ خیر، یہ میرا ذاتی تجربہ تو نہیں لیکن مشاہدہ بہرحال ہے۔ یہ لوگ صرف اپنی کارکردگی کی نمائش کے لیے متعلقین ہی سے اتنی پوچھ گچھ کرتے ہیں کہ توبہ۔"

"بات اب بہت بڑھ چکی ہے۔" سفیان بولا۔ "بہتر ہے کہ پولیس کو بتا دیا جائے۔"

"اب تو وہ اور جان ذیق میں کر دیں گے کہ پہلے یہ بات کیوں چھپائی گئی۔" فلک نے کہا۔

سفیان بڑبڑایا۔ "یہ تو عجب صورت حال بن گئی ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ میں انور کو فون کر کے اس سے مشورہ کروں۔" رافع نے فلک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

فلک بولی۔ "ابھی میرے دماغ میں بھی یہی خیال آیا تھا۔"

رافع نے فوراً اپنا موبائل نکالا۔

رافع نے انور مختار سے رابطہ کر کے مختصر سی جملوں کے بعد اسے وہ سب کچھ بتانا شروع کیا جو ان پر گزر چکی تھی۔ اس دوران میں فلک، مطربہ اور سفیان بالکل خاموش رہے۔

تفصیل سے سب کچھ بتانے کے بعد بھی رافع نے انور سے کچھ باتیں کیں، پھر رابطہ منقطع کر کے بولا۔ "وہ کل خود یہاں پہنچ جائے گا۔ وہ میرا بہت اچھا دوست ہے سفیان صاحب! اور اسے خوش قسمتی کہا جا سکتا ہے کہ ان دنوں وہ چھٹیوں پر ہے۔"

"اب میں اسے ایک اطمینان بخش صورتِ حال کہوں گا۔" سفیان نے سر ہلایا۔ "ان خطرناک حالات میں ایسا کوئی قدم اٹھایا جانا ضروری تھا۔"

"میں بھی بہت پریشان ہو گیا تھا آپ سے یہ سب کچھ سننے کے بعد۔" رافع نے کہا۔ "اور سننے کے بعد کیا، پہلے ہی سے پریشان تھا۔ میں چاہتا تھا کہ پولیس سے رابطہ کیا جائے لیکن فلک کی سوچ کو دیکھتے ہوئے یہ قدم نہیں اٹھایا تھا لیکن اب انور سے بات ہو گئی ہے تو دماغ سے بوجھ کم ہو گیا ہے۔ کل وہ آ جائے گا تو میں سمجھوں گا کہ اب ساری ذمے داری اسی کی ہے۔"

مطربہ نے ایک جماہی لی اور کہا۔ "اب بہتر ہو گا کہ ہم لوگ یہ گفتگو ختم کریں اور فلک کو آرام کرنے دیں۔"

وہ دراصل اب اپنے ریسٹ ہاؤس جانا چاہتی تھی جس کا اظہار اس نے بڑے سلیقے سے کیا تھا۔

سفیان بولا۔ "ہاں اب ہم لوگوں کو چلنا چاہیے۔ تم اب سونے کی کوشش کرنا فلک! زیادہ سوچنا نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے تمہارے سامنے یہ سب کچھ اس لیے بتایا کہ تم اب محتاط رہ سکو۔ تمہارا مزاج تو جانتا ہوں نا میں... کسی بھی بات سے وقتی طور پر ہی پریشان ہوتی ہو، پھر سب کچھ بھلا دیتی ہو۔"

فلک پھیکے سے انداز میں مسکرا دی۔

سفیان اور مطربہ چلے گئے۔ رافع انہیں چھوڑنے کے لیے دروازے تک گیا تھا تاکہ دروازہ بند بھی کر آئے۔

"ڈیڈی کراچی پہنچ چکے ہوں گے۔" فلک بولی۔ "اور شاید انتظار کر رہے ہوں گے کہ میں فون کر کے انہیں اپنے کراچی واپس آنے کی اطلاع دوں گی۔"

"تم خود انہیں فون کر دو اور یہ بھی بتا دو کہ کیا واقعہ پیش آ چکا ہے۔"

"وہ بہت پریشان ہو جائیں گے۔"

"بتانا تو پڑے گا انہیں۔ اب ہمیں کم از کم دو تین روز تو رکنا ہی پڑے گا۔ کوئی بہانہ بنانا مناسب نہیں۔ بعد میں انہیں معلوم ہو گا تو وہ ناراض ہوں گے۔ تم نے بتایا تھا کہ ڈیتی ہی کے معاملے میں تمہاری رازداری پر وہ تھوڑا سا خفا ہوئے تھے۔ بہتر یہی ہے کہ انہیں سب کچھ بتا دو۔"

"تو پھر طے ہے کہ وہ بھی کل یہاں پہنچ ہوئے ہوں گے۔"

"کوئی حرج نہیں ہے۔"

فلک نے اپنے سرہانے رکھا ہوا موبائل اٹھا کر کہا۔ "ان کے ساتھ شاید فرید بھی آ جائے۔"

رافع کچھ نہیں بولا۔

فلک نے موبائل پر اورنگ زیب صاحب سے رابطہ کر کے انہیں تمام حالات سے آگاہ کر دیا۔ ان سے گفتگو ختم کرنے کے بعد اس نے رافع سے کہا۔ "میرا خیال ٹھیک نکلا۔ وہ کل آ رہے ہیں۔"

"فرید بھی آ رہا ہے؟"

"یہ تو انہوں نے نہیں کہا لیکن جب وہ فرید کو بتائیں گے تو وہ بھی ان کے ساتھ آنے کے لیے تیار ہو جائے گا۔"

"اچھا اب تم یہ دوا کھا لو۔"

"میں اب خود کو بالکل ٹھیک محسوس کر رہی ہوں۔"

"لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم دوا نہ کھاؤ۔ یہ دوا اسی لیے جاری رکھنے کو کہا گیا ہے کہ تمہارا زخم جلد مندمل ہو جائے۔"

فلک نے دوا کھا لی، پھر کہا۔ "کل آپ ایک کام کیجیے

گا۔ اب اس ڈاکو کی تصویر میں یہیں بنا ڈالوں گی۔ اس میں چند گھنٹوں سے زیادہ نہیں لگیں گے۔ تصویر بنانے کے لیے کچھ چیزیں درکار ہوں گی۔"

"میں اب تمہیں ایک پل کے لیے بھی اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔"

"اچھا تو پھر میں سفیان سے کہہ دوں گی۔ وہ لا دے گا۔"

رافع کے چہرے پر سوچ بچار کے تاثرات ابھر آئے۔

فلک نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ "کیا ہوا... کیا سوچنے لگے؟"

"اگر اس شخص کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ تم نے یہیں اس کی تصویر بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے تو..."

"اب کیا اسے ہر بات معلوم ہو جائے گی؟"

رافع نے اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "تم ایک بات کا خیال رکھنا۔ مطربہ کو اس کا علم نہ ہو۔"

فلک نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "کیا آپ مطربہ پر شک کر رہے ہیں؟"

اس سے پہلے کہ رافع جواب دیتا، فلک کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ موبائل ابھی اس کے ہاتھ ہی میں تھا۔

"سفیان۔" وہ موبائل کی اسکرین پر نظر ڈالتے ہوئے بڑبڑائی، پھر اس نے موبائل کان سے لگا لیا۔ "ہاں، خیریت؟"

دوسری طرف کی آواز سن کر اس کے چہرے سے فکرمندی کا اظہار ہوا اور اس نے پوچھا۔ "ان سے کیا بات کرنا چاہتے ہو؟"

رافع غور سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ فلک نے موبائل اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "وہ آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔"

"مجھ سے؟" رافع نے دھیرے سے کہتے ہوئے موبائل لے کر کان سے لگایا اور بولا۔ "کیا بات ہے سفیان صاحب؟"

"آپ کے ریسٹ ہاؤس کے پاس کچھ گڑبڑ ہے۔" سفیان کی آواز آئی۔ "میں نے وہاں سے نکلتے وقت دو تین آدمیوں کی نقل و حرکت دیکھی ہے جو مجھے مشتبہ لگی ہے۔ بہتر ہو گا کہ آپ فوری طور پر پولیس کو اس سے آگاہ کر دیں۔ پولیس اسٹیشن کا نمبر تو ظاہر ہے کہ آپ کے علم میں بھی ہو گا۔"

رافع کے چہرے سے فکرمندی ظاہر ہونے لگی تھی۔

سفیان نے اسے ایک غیر معمولی بات بتائی تھی۔ وہ بولا۔ "میں ابھی بات کرتا ہوں۔ میں نے پولیس آفیسر سے اس کا موبائل نمبر بھی لے لیا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں نے فلک کو کچھ نہیں بتایا ہے کیونکہ میں جلد از جلد آپ سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اس سے کچھ چھپانا قطعی مناسب نہیں۔ آپ اسے بتا دیجیے گا۔"

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ رافع پولیس آفیسر سے رابطہ کرنے لگا۔

"کیا ہو گیا؟" فلک نے تشویش سے پوچھا۔

"ابھی بتاتا ہوں۔"

موبائل پر دوسری طرف سے کال ریسیو کر لی گئی تھی اس لیے رافع اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے پولیس آفیسر کو وہ باتیں بتا دیں جو اسے سفیان سے معلوم ہوئی تھیں۔

جواب میں دوسری طرف سے ہنس کر کہا گیا۔ "اس کے لیے آپ فکرمند نہ ہوں، وہ سادہ لباس میں پولیس ہی کے لوگ ہیں۔ ان کی ڈیوٹی میں نے ہی لگائی ہے۔ آپ لوگ خود اسے ایک اتفاقی حادثہ سمجھتے رہے لیکن مجھے گمان ہے کہ دراصل آپ دونوں کو ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ میں آپ دونوں کے لیے خطرہ محسوس کر رہا ہوں اس لیے حفاظت کے خیال سے تین آدمی آپ کے ریسٹ ہاؤس کی نگرانی کے لیے بھیج دیے ہیں۔"

"اچھا۔" رافع نے طویل سانس لی۔ "میں تو پریشان ہو گیا تھا کہ..."

دوسری طرف سے بات کاٹ دی گئی۔ "اب آپ آرام کیجیے۔"

گفتگو ختم ہوتے ہی فلک بے چینی سے بولی۔ "کیا بتایا اس نے؟"

رافع نے اسے پولیس آفیسر کے جواب سے آگاہ کر دیا اور بولا۔ "پولیس سے رابطہ کر لیا جائے تو کوئی فائدہ ہوتا ہی ہے۔"

فلک نے سر ہلا دیا، رافع نے اس کا موبائل اسے واپس دیا۔

"آپ میرے ایک سوال کا جواب نہیں دے سکے۔" فلک بولی۔ "کیا آپ مطربہ پر شک کر رہے ہیں؟"

"حالات ایسے ہیں کہ شک تو مجھ پر بھی کیا جا سکتا ہے۔" رافع نے سنجیدگی سے کہا۔ "جو لوگ حالات سے واقف ہیں، شک تو انہی پر کیا جائے گا نا۔"

"پھر تو ڈیڈی بھی اس زمرے میں آتے ہیں اور شاید فرید بھی۔" فلک نے کہا۔

www.pkdigest.com

"کوئی اور ایسا فرد بھی ہو سکتا ہے جس سے تمہارے ڈیڈی نے اس کا ذکر کر دیا ہو۔"

فلک نے سوچتے ہوئے کہا۔ "فی الحال تو انہی لوگوں پر شک کیا جا سکتا ہے جو ہمارے سامنے ہیں۔ ایسی صورت میں آپ کو سفیان پر بھی شک ہونا چاہیے۔ آپ نے مجھے اس بات سے کیوں نہیں روکا کہ میں وہ سامان سفیان سے منگواؤں؟"

"فرض کرو، اگر سفیان ہی وہ شخص ہوا تو وہ کوئی گڑبڑ ضرور کرے گا۔ اس طرح بلی تھیلے سے باہر آ جائے گی۔"

"اور اگر کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی تو سفیان پر سے آپ کا شک ختم ہو جائے گا؟"

رافع نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلایا اور کہا۔ "غالباً۔"

"آپ کا جواب مبہم ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہو تم! میرا دماغ بہت الجھ گیا ہے فلک!"

"کم از کم میں تو سفیان پر ذرا بھی شبہ نہیں کر سکتی۔"

"تم اس کے معاملے میں جذباتی ہو نا۔"

"کیا مطلب؟" فلک نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"مطلب یہی کہ تم اسے اپنا بہت ہی اچھا دوست سمجھتی ہو۔"

فلک غور سے چند لمحے تک رافع کی طرف دیکھتی رہی، پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

"ہاں۔" رافع نے کہا۔ "بہتر یہی ہے کہ اب سونے کی کوشش کرو۔"

فلک کی آنکھیں بند رہیں۔ رافع بھی لیٹ گیا۔ فکر و تردد کے تاثرات اس کے چہرے سے ختم نہیں ہو سکے تھے۔

☆☆☆

دوسرے دن سفیان، فلک کے لیے مصوری کا سامان لینے چلا گیا۔ فلک نے اس سے یہ کام لینے کے سلسلے میں مطربہ سے رازداری اس طرح برتی تھی کہ موبائل پر ہی سفیان سے ساری بات اس وقت کر لی تھی جب وہ اپنے ریسٹ ہاؤس کے باتھ روم میں تھی۔ سامان کی تفصیل بھی اس نے موبائل پر ہی لکھوا دی تھی اور سفیان اس سے ملے بغیر روانہ ہو گیا تھا۔

دس بجے اورنگ زیب صاحب کا فون آ گیا۔ "صبح کی فلائٹ میں سیٹ نہیں مل سکی بیٹا! ایک سیٹ تو شاید مل جاتی لیکن فرید بھی میرے ساتھ ہی روانہ ہونا چاہتا ہے۔ اس کی تو حالت ہی غیر ہو گئی ہے سب کچھ سن کر! مجھے تو ڈر ہے کہ اس کی طبیعت خراب نہ ہو جائے۔"

"وہ مجھے بہت چاہتا ہے ڈیڈی۔" فلک نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بہرحال، دوپہر کی فلائٹ میں سیٹیں مل گئی ہیں۔"

"کوئی حرج نہیں ڈیڈی۔" فلک نے کہا۔ "آپ زیادہ فکرمند نہ ہوں۔ پولیس نے میری حفاظت کا خاصا بندوبست کر دیا ہے۔"

"سوچ سوچ کر میرے سر میں درد ہو گیا ہے بیٹا کہ تم نے بیٹھے بٹھائے کسی کو اپنا جانی دشمن بنا لیا ہے۔"

"اتنا مت سوچیے ڈیڈی کہ آپ کی طبیعت بھی خراب ہو جائے۔" فلک نے ہنس کر کہا۔ "یہاں کی بالکل فکر نہ کریں۔ رافع کے دوست انور صاحب کا ذکر تو آپ نے سنا ہو گا مجھ سے! وہ آج آ رہے ہیں مری۔ وہ ایک اہم ادارے میں ہیں۔ ان کے وسائل بھی زیادہ ہوں گے۔ وہ سنبھال لیں گے سب کچھ۔ وہ شخص جلد گرفتار ہو گا جو مجھے ہلاک کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اس کی تصویر بنانے کے لیے کچھ چیزیں منگوالی ہیں۔"

اس وقت قریب بیٹھے ہوئے رافع نے ایک طویل سانس لی۔

فلک نے اس کی طرف دیکھا لیکن موبائل کی طرف متوجہ رہی۔

اورنگ زیب صاحب کہہ رہے تھے۔ "تصویر کا کام تو یقیناً جلد از جلد کر ڈالو۔"

"ڈیڈی!" فلک کو اچانک خیال آیا۔ "آپ نے کسی اور کو بھی بتایا ہے کہ میرے ساتھ یہاں کیا واقعہ ہو چکا ہے؟ مطلب یہ ہے کہ میں نے اس ڈاکو کا چہرہ دیکھ لیا ہے۔"

"یہ تو میں نے صرف فرید کو بتایا ہے، ہاں البتہ ڈکیتی والی بات اور رات جو کچھ ہوا، وہ میں اپنے جنرل منیجر کو بتا چکا ہوں۔ اسے تو باخبر کرنا ضروری تھا کہ میں مری کیوں جا رہا ہوں لیکن تم نے یہ کیوں پوچھا؟"

"بس ایسے ہی۔"

"یہ ایسے ہی کیے جانے والا سوال تو نہیں تھا۔"

فلک ہنسی۔ "آپ اپنے ذہن کو زیادہ نہ الجھائیے ڈیڈی! جب آپ یہاں آ جائیں گے تو پھر تفصیلی باتیں کریں گے۔"

جب باپ بیٹی کی گفتگو ختم ہو گئی تو رافع بولا۔ "تمہیں ان کو بھی یہ نہیں بتانا چاہیے تھا کہ تم نے مصوری کا سامان منگوایا ہے۔"

"کمال کر رہے ہیں آپ؟" فلک نے کچھ خفگی سے کہا۔ "کم از کم ڈیڈی پر تو شبہ نہ کیجیے۔"

"میرا مطلب یہ تھا فلک کہ فون پر اس قسم کی باتیں کرنا مناسب نہیں ہوتا جن میں رازداری کی ضرورت ہو۔ کبھی کبھی قریب کھڑا ہوا کوئی شخص بھی موبائل پر آنے والی آواز سن لیتا ہے۔"

"اچھا! میں پوچھے لیتی ہوں ڈیڈی سے۔" فلک نے موبائل سنبھالتے ہوئے کہا۔ "معلوم ہو جائے گا کہ اس وقت ان کے قریب کوئی کھڑا ہوا تھا یا نہیں۔"

"اور الجھن میں ڈالو گی تم انہیں۔" رافع نے اس کے ہاتھ سے موبائل لیتے ہوئے کہا۔ "اس وقت مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ ان حالات سے تم کچھ چڑچڑی ہو گئی ہو۔"

اس سے پہلے کہ فلک کچھ کہتی، کال بیل بج اٹھی۔ رافع اٹھ کر دروازے کی طرف گیا۔ آنے والی مطربہ تھی۔

"سفیان صاحب نہیں آئے؟" رافع نے اس طرح پوچھا جیسے اس بارے میں کچھ نہ جانتا ہو۔

"کوئی ضروری کام یاد آ گیا تھا انہیں۔ صبح ہی نکل گئے تھے۔ جلدی آ جائیں گے۔"

بعد میں یہی سوال فلک نے بھی کیا اور مطربہ نے وہی جواب دیا۔ پھر اس نے رسماً فلک کے سر کی تکلیف کے بارے میں پوچھا۔ اس نے کچھ دیر تک کچھ ادھر ادھر کی باتیں کیں اور یہ کہہ کر چلی گئی کہ اس کا کوئی پروڈیوسر آنے والا ہے جس کے ساتھ وہ شوٹنگ کے لیے کوئی لوکیشن دیکھنے جائے گی۔

"بہانہ کیا ہے اس نے۔" رافع بولا۔ "سفیان صاحب نے بتایا تھا کہ وہ یہاں محض تفریحاً آئے ہیں۔"

فلک ہنس کر بولی۔ "جم کر وہ کیوں بیٹھتی، سفیان تو ہے نہیں یہاں۔" پھر اس نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ "آپ اتنے ہلکان کیوں نظر آ رہے ہیں؟"

"ایک شخص تمہاری جان کا دشمن ہو گیا ہے اور تم کہہ رہی ہو کہ میں ہلکان کیوں ہوں۔"

فلک ہنسی۔ "میں تو اتنی پریشان نہیں ہوں۔"

"تمہارا جیسا مزاج نہیں ہے میرا۔ تم تو نہ جانے کس مٹی کی بنی ہو۔"

"ملتانی مٹی کی۔" فلک زیادہ زور سے ہنسی تو رافع اسے گھور کر رہ گیا۔

فلک نے وہ اخبار اٹھا لیا جو مطربہ کے ہاتھ میں تھا جو وہ وہیں بھول گئی تھی یا بھولے سے چھوڑ گئی تھی۔

"آج کل کوئی خاص خبر تو آ نہیں رہی ہے۔" وہ اخبار پر نظر دوڑاتے ہوئے بولی۔

پھر فلک نے اخبار ایک طرف ڈال دیا۔

رافع کے موبائل پر انور مختار کی کال آئی۔

رافع نے موبائل کان سے لگاتے ہوئے منہ بنا کر کہا۔ "ابھی تک کراچی ہی میں ہو کیا؟"

"نہیں۔" دوسری طرف سے انور نے جواب دیا۔ "میں ابھی ابھی مری پہنچا ہوں۔ پہلے پولیس اسٹیشن آ گیا ہوں۔ یہ لوگ خاصا کام کر گزرے ہیں۔ سوچ رہا ہوں کہ میں بھی جائے واردات کا جائزہ لے آؤں۔ اس کے بعد ہی تمہارے پاس آؤں گا۔ مجھے دو تین گھنٹے لگ سکتے ہیں۔"

"پہلے آ کر ہماری خبر تو لے لیتے۔"

"پریشانی کی کوئی بات نہیں رافع!" انور نے کہا۔ "پولیس آفیسر سے میری خاصی گفتگو ہوئی ہے۔ تمہارے ریسٹ ہاؤس کی حفاظت کا نہایت معقول بندوبست کر دیا گیا ہے۔ کوئی اجنبی تو ریسٹ ہاؤس کے قریب پھٹک بھی نہیں سکے گا۔ بس اتنی احتیاط کرنا کہ فی الحال بھابی ریسٹ ہاؤس سے باہر نہ نکلیں۔"

"شام کو اسپتال تو جانا پڑے گا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ فلک کے سر کی ڈریسنگ آج بھی کی جائے گی۔"

"اس کا کچھ بندوبست ہو جائے گا۔ اسپتال سے ڈاکٹر ہی کو بلوا لیا جائے گا اور اگر کوئی نرس ڈریسنگ کر سکے گی تو وہ آ جائے گی۔ اس کی فکر مت کرو۔ بھابی سے بھی کہہ دینا کہ بالکل فکرمند نہ ہوں۔"

رافع نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ فلک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ان محترمہ نے تو پریشان ہونا شاید سیکھا ہی نہیں ہے۔"

"اچھا خدا حافظ! میں آتا ہوں دو تین گھنٹے میں۔"

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ رافع نے فلک کو وہ سب کچھ بتا دیا جو انور نے اس سے کہا تھا۔

فلک نے سر ہلانے پر اکتفا کیا لیکن پھر کچھ رک کر کہا۔ "پولیس اب تک کیا اچھا خاصا کام کر گزری ہے؟"

"انور آ جائے تب ہی کچھ معلوم ہو گا۔"

فلک کچھ سوچنے لگی۔

ساڑھے بارہ بجے کے قریب سفیان آ گیا۔ وہ سب چیزیں لے آیا تھا۔ چیزیں دے کر وہ فوراً چلا گیا۔ جاتے جاتے وہ یہ کہہ گیا تھا کہ اب کچھ دیر بعد مطربہ کے ساتھ آئے گا۔

"میں یہ سب چیزیں دوسرے کمرے میں پہنچا دیتا

www.pkdigest.com

ہوں۔'' رافع نے کہا۔ ''وہیں تصویر بنانا اور اب کسی کو بھی اس کا علم نہ ہو کہ تم نے یہیں تصویر بنانا شروع کر دی ہے۔''

ریسٹ ہاؤس کا دوسرا کمرا ابھی ان کے استعمال میں نہیں آیا تھا۔ اس کے استعمال کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔

فلک بولی۔ ''اب اور کس کو معلوم ہو گا... اوہ!'' وہ یکا یک رکی اور پھر رافع کو غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''آپ کا دھیان شاید مطربہ کی طرف گیا ہے؟''

''سفیان صاحب تو تمہارا سامان لے آئے ہیں۔ ان کی طرف سے مجھے بڑی حد تک اطمینان ہو گیا ہے۔''

''تو آپ ہاتھ دھو کر مطربہ ہی کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں؟''

''فی الحال سامنے صرف وہی ایک ہستی ایسی رہ گئی ہے جو تمام حالات سے واقف ہے۔''

''کوئی مضبوط جواز نہیں ہے آپ کے پاس اس پر شبہ کرنے کا۔''

رافع بحث میں نہیں پڑا اور مصوری کا سامان اٹھانے لگا۔ سب کچھ دوسرے کمرے میں پہنچانے کے بعد اس نے واپس آ کر کہا۔ ''کیا خیال ہے۔ کھانا کھا لیا جائے؟''

''ابھی تو بھوک نہیں لگ رہی۔ ہاں اگر آپ...''

''نہیں، میں نے تمہارے ہی خیال سے پوچھا تھا۔''

''میں تو وہ سب سامان قرینے سے لگانا چاہتی ہوں تاکہ جلد از جلد تصویر بنانا شروع کر دوں۔''

''مطربہ آ جائے تو اس کمرے میں مت جانا۔''

فلک نے منہ بنایا پھر بولی۔ ''میں سفیان کو فون کیے دیتی ہوں کہ وہ اب شام تک نہ آئے، میں اب سوؤں گی کیونکہ رات کو نیند نہیں آئی تھی۔''

اس نے واقعی سفیان کو فون کر ڈالا۔ وہ تصویر بنانے کے لیے بہت بے چین تھی۔

فون کرنے کے بعد اس نے دوسرے کمرے کا رخ کیا۔ وہاں اس نے سب سامان سیٹ کیا کہ تصویر بنانے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ اس کام میں رافع بھی اس کی مدد کر رہا تھا۔ دونوں میں باتیں بھی ہوتی رہیں۔ فلک نے اس خیال کا اظہار بھی کیا کہ اس وقت اس کے ڈیڈی اور اس کا بھائی فرید ہوائی جہاز میں ہوں گے۔

''تیسرے پہر تک انہیں یہاں پہنچ جانا چاہیے۔'' وہ بولی۔ ''اور ہاں ... ابھی ابھی مجھے ایک بات کا خیال آیا ہے۔ رات کو جب ہم پنڈی جا رہے تھے تو ہمیں راستے میں کوئی اور گاڑی نظر ہی نہیں آئی تھی۔''

''تم پہلے کبھی یہاں نہیں آئیں۔ اس لیے تمہیں علم نہیں کہ رات کے وقت پنڈی سے مری کی طرف ٹریفک نہیں چلتا۔ خطرناک راستے رات کے وقت زیادہ مخدوش ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی اِکا دُکا پرائیویٹ کار دکھائی دے جائے تو سمجھ لو کہ اس شخص کو مری میں ضرور کوئی خاص کام ہو گا۔''

''اسی لیے میرے دشمن کو وہ سارا اہتمام کرنے کا موقع مل گیا۔''

''ہاں۔''

''گویا یہ موسم بھی مجھ سے دشمنی پر تلا ہوا ہے۔'' فلک نے ہنس کر کہا۔ پھر سنجیدہ ہو کر بولی۔ ''کیں صبح تو ٹریفک چلنا شروع ہو گیا تھا۔ کیا وہاں بکھرے ہوئے تیل کی وجہ سے دن میں حادثات کا اندیشہ نہیں رہتا؟''

''تیل کو دن بارات سے کوئی مطلب نہیں ہوتا۔'' رافع نے جواب دیا۔ ''پولیس نے صبح ہونے سے پہلے سڑک صاف کروا دی ہو گی۔''

''بجری بھی ہو گی۔''

''بجری بھی ٹریفک کے لیے خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ ہاں شاید وقتی طور پر بکھیری گئی ہو اور پھر صاف کر دی گئی ہو۔ مجھے علم نہیں کہ ایسے موقع پر سڑک صاف کرنے کے لیے کیا کچھ کیا جاتا ہے۔''

موبائل فون کی گھنٹی کی آواز نے فلک کو چونکایا۔ ''اوہ!'' اس کے منہ سے نکلا۔ ''میں اپنا موبائل تو وہیں بھول آئی ہوں۔'' وہ تیزی سے بولی۔

''سنبھل کر۔'' رافع جلدی سے بولا۔ ''سر کو جھٹکا نہ لگے۔''

''اچھل تو نہیں رہی ہوں۔'' فلک نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

کمرے میں پہنچ کر اس نے موبائل اٹھایا۔

''ڈیڈی کی کال ہے۔'' اس نے رافع کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو اس کے پیچھے پیچھے آ گیا تھا۔

''ہیلو ڈیڈی!'' اس نے موبائل کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''پنڈی پہنچ گئے آپ؟''

''نہیں بیٹا! میں ابھی کراچی ہی میں ہوں۔'' دوسری طرف سے اورنگ زیب صاحب نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''یہاں موسم بہت خراب ہو گیا ہے۔ ایسی طوفانی بارش ہو رہی ہے کہ خدا کی پناہ! اس کی وجہ سے وہ فلائٹ کینسل ہو گئی جس سے مجھے آنا تھا۔ دو تین مرتبہ تم سے بات کرنا چاہی لیکن رابطہ نہیں ہوا۔ بلا کی گرج چمک تھی۔ اب اس وقت موسم کچھ ٹھیک ہے لیکن بادل اب بھی ہیں۔ میں ائرپورٹ بھی فون کر چکا ہوں۔ معلوم ہوا ہے کہ فلائٹ اب شاید پانچ بجے روانہ ہو لیکن یہ بات بھی حتمی طور پر نہیں کہی گئی۔''

فلک کو ہنسی آ گئی۔ ''حد ہو گئی ڈیڈی! ابھی کچھ ہی منٹ پہلے میں رافع سے کہہ رہی تھی کہ یہ موسم بھی میرا دشمن ہو گیا ہے۔ خیر، اگر پانچ بجے فلائٹ روانہ ہوتی ہے تو اسی سے آ جائیے گا لیکن پنڈی ہی کے کسی ہوٹل میں رک جائیے گا۔ یہاں کل صبح آئیے گا۔''

''کیوں؟ نہیں بیٹا! میں پنڈی پہنچتے ہی بذریعہ کار مری روانہ ہو جاؤں گا۔''

''نہیں ڈیڈی!'' فلک جلدی سے بولی۔ ''رات کو راستے زیادہ خطرناک ہو جاتے ہیں۔ آپ...'' وہ اچانک خاموش ہو گئی۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ لائن بے جان ہو گئی تھی۔

''کیا مصیبت ہے۔'' فلک بڑبڑائی۔ پھر اس نے خود اورنگ زیب صاحب سے رابطہ کرنا چاہا مگر کامیاب نہیں ہو سکی۔

رافع نے فلک کی باتوں سے معاملہ سمجھ لیا تھا۔ وہ بولا۔ ''شاید وہاں کا موسم پھر زیادہ خراب ہو گیا ہو گا۔ اسی لیے لائن ڈراپ ہو گئی۔''

فلک نے دو تین بار کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکی۔

''خیر!'' فلک نے جھکے ہوئے انداز میں موبائل بستر پر ڈال دیا۔ ''میں ان سے کہنا چاہتی تھی کہ وہ رات کو ہرگز نہ آئیں۔ بہرحال، اگر پھر موسم خراب ہو گیا ہے تو فلائٹ پانچ بجے بھی نہیں نکل سکے گی۔''

''میرا خیال ہے کہ اب تو کھانا کھا ہی لیا جائے۔'' رافع بولا۔

''ہاں۔'' فلک نے کہا۔ ''اب مجھے بھوک لگنے لگی ہے۔''

ان دونوں نے کھانا گرم کر کے کھایا۔ رات کو رافع نے کسی ہوٹل سے اتنا کچھ لے لیا تھا کہ انہیں اگلی صبح تک بھی کسی چیز کی پریشانی نہیں ہوتی۔

کھانے کے ذرا دیر بعد انہوں نے چائے پی۔ اس کے بعد فلک نے تصویر بنانے کے لیے دوسرے کمرے کا رخ کیا۔ رافع ساتھ رہا۔ کمرے میں ایک طرف بیٹھ کر وہ فلک کو کام کرتے دیکھتا رہا۔

کال بیل کی آواز نے ان دونوں کو چونکایا۔

رافع جلدی سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''انور ہو گا۔ سفیان کے آنے کا تو امکان نہیں ہے۔''

رافع کے ساتھ فلک بھی اس کمرے سے نکل آئی۔

آنے والا انور ہی تھا اور بہت تھکا تھکا سا نظر آ رہا تھا۔

''کیسی ہیں بھابی؟'' انور نے مصافحہ رافع سے کیا اور خیریت فلک کی پوچھی۔

''ابھی تک تو ٹھیک ہوں۔'' فلک خفیف سا مسکرائی۔

''آپ اتنی باہمت ہیں کہ ٹھیک ہی رہیں گی۔''

رافع پہلو بدل کر بولا۔ ''یہ رسمی باتیں کرتے رہو گے یا کچھ بتاؤ گے بھی۔''

انور ہنسا۔ ''کہیں بٹھاؤ گے بھی۔''

''اوہ!'' رافع نے سر جھٹکا۔ ''دماغ ہی قابو میں نہیں ہے۔ آؤ، بیٹھو۔''

وہ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

فلک انور کی طرف دیکھ کر بولی۔ ''آپ نے رافع کو بتایا تھا کہ پولیس خاصا کام کر گزری ہے۔''

''ہاں۔'' انور نے کہا۔ ''وہ سب کچھ بتانے کے لیے وہ پولیس افسر آپ لوگوں کے پاس آنے ہی والا تھا کہ میں وہاں پہنچ گیا۔ اس سے مجھے ساری معلومات حاصل ہو گئیں۔ میں نے سوچا کہ میں بھی جائے واردات پر ایک نظر ڈال لوں۔ پولیس آفیسر کو لے کر میں وہیں چلا گیا تھا۔ سیدھا وہیں سے آ رہا ہوں۔''

''اب کچھ بتاؤ گے بھی کہ آخر معلوم کیا ہوا ہے؟''

''پولیس آفیسر سیاہیوں کے ساتھ اوپر چڑھا تھا۔ سفیان صاحب اسے بتا ہی چکے تھے کہ پتھر کتنی بلندی سے لڑھکا تھا۔ خاصی کاوش کے بعد ایک جگہ دو آدمی گرڈر مل گئے۔ ان پر کچھ نشانات بھی تھے۔ پولیس آفیسر نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ وہ گرڈر اس پتھر کے نیچے دبا کر زور لگایا گیا تھا ورنہ اتنا بڑا پتھر خود تو اپنی جگہ چھوڑ کر نیچے نہیں لڑھکتا۔ پولیس آفیسر کو یہ اندازہ بھی تھا کہ یہ کام شاید دو آدمیوں نے کیا ہو گا۔ اس گرڈر کے نشانات کے فوٹو لے گئے تو انگلیوں کے نشانات بھی ملے۔ ان نشانات سے بھی ثابت ہو گیا کہ پولیس آفیسر کا خیال درست تھا۔ نشانات دو مختلف آدمیوں کے ہیں۔ تم مجھے بتا بھی چکے تھے کہ سفیان صاحب نے وہاں دو سائے دیکھے تھے۔''

''تم نے بتا دیا پولیس آفیسر کو؟'' رافع جلدی سے بولا۔

''کیا؟''

''یہی کہ سفیان نے دو سائے دیکھے تھے؟''

''میں یہ کیسے بتا دیتا؟'' تم لوگ پولیس سے ہر بات چھپاتے رہے ہو تو میں اسے بتا کر اس کا موڈ کیوں خراب

www.pkdigest.com

کرتا۔ ابھی تو وہ بڑی تندہی سے تفتیش کر رہا ہے۔‘‘

’’اچھا تو جن آدمیوں نے وہ پتھر لڑھکایا تھا، ان کی انگلیوں کے نشانات سے کچھ پتا چلا؟‘‘

’’نہیں۔‘‘ انور نے جواب دیا۔ ’’یہاں پولیس کو اپنے ریکارڈز میں تو وہ نشانات نہیں ملے۔ وہ اب اسلام آباد ہیڈ کوارٹر بھیج دیے گئے ہیں۔ وہاں سے جلد ہی رپورٹ ملے گی۔‘‘

فلک بولی۔ ’’اس شخص کی تصویر تو آج میں آپ کو دے دوں گی جس نے یہاں، ریسٹ ہاؤس میں آکر مجھے لوٹا تھا۔‘‘

’’وہ کب تک مکمل ہو جائے گی؟‘‘

’’دو تین گھنٹے سے زیادہ نہیں لگیں گے۔ مجھے اس پر زیادہ کام کرنے کی ضرورت تو ہے نہیں۔ بس اس شخص کے نقوش واضح کرنا ہیں۔‘‘

’’آپ کے اس کام کی وجہ سے معاملہ بھتا بہت آسان ہو جائے گا۔‘‘ انور نے کہا۔ ’’وہ اگر بلیک لسٹڈ نہ بھی ہوا تو تصویر کی وجہ سے اسے تلاش کرنا آسان ہو جائے گا۔‘‘

’’تو کیا میں جا کے اس پر کام کروں؟‘‘

’’ہاں آپ کیجیے۔ اچھا ہے کہ وہ تصویر جلد مکمل ہو جائے۔‘‘

فلک اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

’’انور!‘‘ رافع بڑی سنجیدگی سے بولا۔ ’’یہ سارا معاملہ مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔‘‘

’’وہ کیسے؟‘‘

’’ایک معمولی قسم کا ڈکیت کیا اتنا خطرناک بھی ہو سکتا ہے کہ وہ قتل جیسے بڑے جرائم بھی کرتا ہو؟ دوسری بات یہ کہ اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔ سفیان نے پہاڑ پر دو سائے دیکھے تھے۔ تم بھی بتا رہے ہو کہ وہاں جو آہنی گرڈرز ملے ہیں، ان پر دو مختلف آدمیوں کے نشاناتِ انگشت ملے ہیں۔‘‘

’’تمہاری الجھن کا جواز کمزور نہیں ہے۔‘‘ انور نے کہا۔ ’’میں بھی ان خطوط پر سوچ رہا ہوں۔‘‘

’’کسی نتیجے پر پہنچے؟‘‘

’’کوئی ایسا کلیو ابھی تک نہیں ملا ہے جس سے کسی نتیجے تک پہنچا جا سکے لیکن میں اپنے تجربات کی بنیاد پر محسوس کر رہا ہوں کہ معاملہ صرف اتنا نہیں ہوگا جو دکھائی دے رہا ہے۔‘‘

رافع فکرمندی کے ساتھ سوالیہ نظروں سے انور کی طرف دیکھنے لگا لیکن انور نے کچھ نہیں کہا۔

☆☆☆

فلک تصویر بنانے میں مصروف تھی کہ اس کے موبائل پر اورنگ زیب صاحب کی کال آئی۔ موبائل اس وقت فلک کے پاس ہی تھا۔ اس نے کال ریسیو کی۔

’’جی ڈیڈی! اب کیسا موسم ہے کراچی کا؟‘‘

’’میں اس وقت ائرپورٹ پر ہوں بیٹا!‘‘ دوسری طرف سے کہا گیا۔ ’’آدھے گھنٹے میں فلائٹ روانہ ہونے والی ہے۔‘‘

’’اب تو آپ کو بہت دیر ہو جائے گی ڈیڈی! فلائٹ سات بجے پنڈی پہنچے گی۔ ائرپورٹ سے نکلتے نکلتے ساڑھے سات بج جائیں گے۔ اس کے آدھے گھنٹے بعد اندھیرا پھیلنے لگے گا۔ رات کے وقت آپ کا مری آنا مناسب نہیں ہوگا۔ بہتر ہوتا کہ آپ کل صبح کی فلائٹ سے آتے۔‘‘

’’کیا معلوم، کل صبح موسم پھر خراب ہو جائے۔‘‘

فلک نے ایک طویل سانس لی۔ ’’ہاں یہ تو ہے۔ اچھا خیر، آپ پنڈی آجایئے لیکن رات وہیں کسی ہوٹل میں گزار لیجیے گا۔ مری کل صبح آجایئے گا۔‘‘

’’میں تمہیں دیکھنے کے لیے بہت بے چین ہو گیا ہوں بیٹا! میں آج ہی آؤں گا۔‘‘

’’پلیز ڈیڈی! رات کے وقت یہ سفر کرنے کا خطرہ مول نہ لیجیے۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو میرا وہ سارا وقت بڑی بے چینی اور پریشانی میں گزرے گا۔ پلیز! اب کچھ اور نہ کہیے گا۔ آپ پنڈی ہی کے کسی ہوٹل میں رک جایئے گا۔‘‘

’’اچھا بیٹا! اگر تمہارا اتنا اصرار ہے تو ٹھیک ہے۔‘‘

’’شکریہ ڈیڈی! اچھا ہاں، فرید بھی ہے نا آپ کے ساتھ؟‘‘

’’نہیں۔‘‘ اورنگ زیب صاحب نے جواب دیا۔ ’’ابھی دو گھنٹے پہلے اس کے بائیں پیر میں شدید موچ آگئی ہے۔ میں نے اسے ڈاکٹر زبیری کے کلینک میں داخل کرا دیا ہے۔‘‘

فلک پریشان ہو گئی۔ ’’یہ کیسے ہوا ڈیڈی؟‘‘

’’بس ہو گیا۔ اوپر کی منزل سے نیچے اتر رہا تھا۔ پیر پھسل کر مڑ گیا۔ یہ چھوٹی موٹی باتیں تو ہو ہی جاتی ہیں۔ تم اس کے لیے زیادہ پریشان نہ ہو۔ جلد ہی ٹھیک ہو جائے گا۔‘‘

’’اس کا دھیان تو میری طرف لگا ہوا ہوگا نا! اسی لیے پیر پھسل گیا۔‘‘

اورنگ زیب صاحب ہنسے۔ ’’ضروری نہیں کہ یہی سبب ہو۔ بس اتفاق ہے۔ اچھا اب میں فون بند کر رہا ہوں۔ اناؤنس کیا جا رہا ہے کہ مسافر جہاز میں پہنچیں۔‘‘

’’اناؤنسر کی آواز مجھے بھی سنائی دی ہے۔ اچھا ڈیڈی، خدا حافظ۔ رات آپ پنڈی ہی میں گزاریے گا۔‘‘

فلک بھی فرید سے اتنی محبت کرتی تھی کہ اس کی ٹانگ میں موچ آجانے کی اطلاع نے اسے کچھ دیر تک ذہنی طور پر منتشر رکھا۔ باپ سے گفتگو ختم کرنے کے بعد اسے اپنے کام کے معاملے میں یکسو ہونے میں کچھ وقت لگا۔

یکایک اس نے اپنا ہاتھ روک لیا اور غور سے تصویر کی طرف دیکھنے لگی۔ تصویر اب آخری مراحل میں تھی تو اسے محسوس ہوا کہ جو نقوش اس کے دماغ میں تھے، انہیں وہ صحیح طور پر واضح نہیں کر سکی تھی۔

’’دوبارہ بنانا پڑے گی۔‘‘ وہ بڑبڑائی، پھر جھنجلاہٹ میں اس نے تصویر پر کئی آڑے ترچھے ہاتھ چلا دیے جس سے تصویر بگڑ کر رہ گئی اور نقوش غیر واضح ہو گئے۔

اب ضرورت تھی کہ فریم پر دوسری شیٹ چڑھائے۔ وہ اکتائے ہوئے انداز میں اس کمرے سے نکلی اور اس کمرے میں پہنچی جہاں رافع اور انور تھے۔

’’بن گئی تصویر؟‘‘ انور نے جلدی سے پوچھا۔

’’نہیں۔ آئی ایم سوری! نقوش بالکل وہی نہیں بن سکے جو میرے دماغ میں ہیں۔ میں دوبارہ کوشش کروں گی۔ تین گھنٹے اور لگ جائیں گے۔‘‘

’’آپ وہ مجھے دکھا تو دیں۔ نقوش پوری طرح واضح نہ سہی لیکن اس کی کچھ جھلک تو آ گئی ہوگی۔ ممکن ہے کہ اسی سے میرے ذہن میں کسی شخص کا خیال آسکے، اگر وہ بلیک لسٹڈ ہے تو شاید میں اسے یا اس کی تصویر دیکھ چکا ہوں۔‘‘

’’ہاں نقوش کسی حد تک تو اس جیسے تھے لیکن مجھ سے حماقت ہو گئی ہے۔ میں نے جھنجلاہٹ میں اس پر لکیریں پھیر دی ہیں۔‘‘

’’اوہ!‘‘ انور کے لہجے میں مایوسی تھی۔

’’دراصل میرا ذہن تھوڑا سا الجھا ہوا تھا۔‘‘ فلک نے رافع کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’ڈیڈی کا فون آیا تھا۔ ان سے معلوم ہوا کہ فرید کے پیر میں موچ آگئی ہے۔‘‘

’’صرف اتنی سی بات پر اتنا الجھ گئیں۔‘‘ رافع کے منہ سے نکلا۔

فلک نے اسے گھور کر دیکھا۔

انور جلدی سے بولا۔ ’’ایسا ہوتا ہے رافع! بھائی بہن اگر ایک دوسرے سے بہت زیادہ محبت کرتے ہوں تو چھوٹی چھوٹی سی باتیں بھی بہت بڑی لگتی ہیں۔‘‘

اس کے بول پڑنے کی وجہ سے فلک چپ رہ گئی۔

رافع نے بھی محسوس کر لیا کہ اس کی بات فلک کو گراں گزری ہوگی۔ وہ آہستہ سے بولا۔ ’’آئی ایم سوری فلک!‘‘

فلک مسکرا دی۔ ’’میں آپ لوگوں کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔ مجھے بھی خواہش ہو رہی ہے۔‘‘

’’تھکن تو ظاہر ہے کہ ہوئی ہوگی۔‘‘ رافع بولا۔ ’’بہتر ہوگا کہ تم چائے پی کر فوراً تصویر بنانے نہ کھڑی ہو جانا۔ کچھ دیر آرام کر لو۔‘‘

فلک کچن کی طرف چلی گئی۔

’’کیا بات ہے؟‘‘ رافع نے غور سے انور کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ’’تم اچانک کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔‘‘

’’ہاں۔‘‘ انور کچھ عجیب سے انداز میں دھیرے سے ہنس کر بولا۔ ’’جب کسی کام میں غیر متوقع طور پر کوئی رکاوٹ آتی ہے تو میں تھوڑا سا پریشان ہو جاتا ہوں۔‘‘

’’وہ تو قدرتی بات ہے۔‘‘

’’تم سمجھے نہیں میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔ دراصل جب بھی ایسا ہوتا ہے تو پھر اس کے دو ہی نتیجے نکلتے ہیں یا تو اس کی وجہ سے بہتری کی کوئی صورت نکل آتی ہے، یا پھر کوئی اور پریشانی بھی کھڑی ہو جاتی ہے۔‘‘

’’یہاں کس پریشانی کا خدشہ ہو گیا تمہیں؟‘‘

’’کسی کا بھی نہیں۔‘‘ انور نے کہا۔ ’’میں بس یہی سوچنے لگا تھا کہ اس قسم کی رکاوٹ کا کچھ نہ کچھ نتیجہ ضرور نکلتا ہے۔‘‘

ان دونوں میں اسی موضوع پر بات ہو رہی تھی کہ فلک چائے بنا کر لے آئی۔

’’میں نے اسپتال بھی فون کر دیا ہے بھائی اور اس پولیس آفیسر کو بھی۔‘‘ انور بولا۔ ’’ڈریسنگ کے لیے آپ کو اسپتال نہیں جانا پڑے گا۔ ایک نرس آکے ڈریسنگ کر دے گی۔‘‘

فلک نے چائے کا ایک گھونٹ لیا۔

رافع نے اس سے پوچھا۔ ’’ڈیڈی نے صرف یہی اطلاع دینے کے لیے فون کیا تھا کہ فرید کے پیر میں موچ آگئی ہے؟‘‘

’’نہیں۔‘‘ فلک نے جواب دیا۔ ’’کراچی سے اب فلائٹ روانہ ہونے والی ہے بلکہ اب تو روانہ ہو چکی ہوگی۔ ڈیڈی اس فلائٹ سے آ رہے ہیں۔ وہ پنڈی پہنچ کر یہاں کے لیے روانہ ہو جاتے لیکن میں نے اصرار کر کے انہیں رات کے وقت آنے سے روک دیا ہے۔ اب وہ کل صبح آئیں گے۔ رات کسی ہوٹل میں گزاریں گے۔‘‘

’’یہ آپ نے اچھا کیا۔‘‘ انور بولا۔ ’’رات کو ان

www.pkdigest.com

پہاڑی راستوں پر سفر کرنا مناسب نہیں ہوتا۔"

"چائے پی کر تم کچھ دیر آرام ضرور کر لینا۔ تصویر بعد میں شروع کرنا۔" رافع نے فلک سے کہا۔

لیکن فلک کو آرام کرنے کے بعد بھی تصویر بنانے کا موقع نہیں مل سکا۔ سفیان اور مطربہ آ گئے تھے۔

"مجھے یقین تھا کہ اب تم سو کر اٹھ چکی ہو گی۔" سفیان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اسی لیے میں نے یہاں آنے سے پہلے تمہیں فون کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔"

"ان سے ملیے سفیان صاحب!" رافع نے انور کی طرف اشارہ کیا۔

وہ مزید کچھ کہتا لیکن سفیان نے مصافحے کے لیے انور کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ آپ انور صاحب ہوں گے۔"

اس کے بعد سفیان کی بیوی کی حیثیت سے مطربہ کا تعارف بھی کرایا گیا۔

فلک کے چہرے پر سوچ بچار کے تاثرات نمایاں ہو گئے تھے۔ رافع سمجھ گیا کہ وہ مطربہ کی وجہ سے پریشان ہو گئی تھی۔ یہ اس سے رافع نے ہی کہا تھا کہ تصویر کشی کے سلسلے میں مطربہ سے بھی رازداری برتی جائے لیکن جب تک سفیان تھا، وہ بھی موجودہی رہتی اور رافع سفیان کو ٹالنے کے لیے کچھ کہنا نہیں چاہتا تھا۔ نہ جانے فلک کو اس کی بات گراں گزر جاتی۔ سفیان اس کا دوست تھا...

دوست؟

یہ سوال ان حالات میں بھی رافع کے دماغ سے محو نہیں ہو سکا تھا۔ ان کی وہ حد درجہ بے تکلفی اس کے لیے اب بھی ناقابلِ فہم تھی... اس بے تکلفی کا "بہ بانگِ دہل" ہونا اس بات کا اشارہ تھا کہ ان دونوں کے دلوں میں کوئی چور نہیں تھا لیکن رافع کے ذہن میں کبھی کبھی یہ بات بھی ابھرتی رہی تھی کہ اس طرح شاید یہی باور کرانا مقصود ہو کہ ان کے دلوں میں کوئی چور نہیں تھا۔

رافع کبھی یہ بھی سوچتا تھا کہ اگر کبھی اس کا شبہ درست ثابت ہو گیا تو وہ اذیت اس کی جان لے لے گی۔ فلک سے وہ اتنی ہی محبت کرتا تھا۔

سات بجے اسپتال سے نرس آ کر فلک کی ڈریسنگ کر گئی۔

مطربہ کے چہرے سے اب شدید اکتاہٹ ظاہر ہونے لگی تھی۔ آخر اس نے سفیان کو وہاں سے اٹھنے پر مجبور کر ہی دیا۔

ان کے جانے کے بعد انور نے رافع کی طرف دیکھتے ہوئے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "تاخیر پر تاخیر ہوئی جا رہی ہے۔"

"بس اب ایک کپ چائے پی کر میں کام شروع کرتی ہوں۔" فلک بولی اور اٹھ کر چائے بنانے چلی گئی۔

سات بجے اس نے تصویر بنانا شروع کی۔ اس مرتبہ وہ بہت رک رک کر، بہت غور کر کے برش کو حرکت دے رہی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس مرتبہ بھی اسے صحیح تصویر بنانے میں ناکامی ہو۔ اسے یہ خیال تو آیا کہ اس طرح تصویر بننے میں زیادہ وقت لگ جائے گا لیکن اس نے تاخیر کو زیادہ بہتر سمجھا۔

تصویر بنانے میں وہ اس درجہ منہمک رہی کہ اسے اپنے والد کا خیال ہی نہیں آیا۔ ساڑھے نو بج رہے تھے جب اس کے خیال کی رو اس طرف گئی۔ اس نے جلدی سے موبائل اٹھا کر اپنے والد سے رابطہ کرنا چاہا لیکن اسے مایوسی ہوئی۔ اسے "پاور ڈاؤن" کی ریکارڈنگ سننا پڑی تھی۔

"سو گئے غالباً۔" وہ بڑبڑائی۔

اورنگ زیب صاحب کی عادت تھی کہ وہ نو بجے کھانا کھانے کے بعد سونے کے لیے لیٹ جاتے تھے اور اپنا موبائل بند کر دیتے تھے۔

دوسری کوشش میں ناکام ہونے کے بعد فلک پھر تصویر کی طرف متوجہ ہو گئی مگر اس کا ذہن تھوڑا سا الجھا ضرور رہا کہ اورنگ زیب صاحب نے پنڈی پہنچنے کے بعد اسے اطلاع کیوں نہیں دی۔

دس بج رہے تھے جب رافع اور انور کمرے میں داخل ہوتے نظر آئے۔

"کیا ابھی مکمل نہیں ہوئی؟" انور نے داخل ہوتے ہی پوچھا۔

"بس دس پندرہ منٹ اور لگیں گے۔" فلک نے جواب دیا۔ "مجھے تو خیال تھا کہ زیادہ دیر لگ جائے گی لیکن ایسا ہوا نہیں۔ بس ذرا اس کی بھویں مجھے الجھن میں ڈال رہی ہیں۔"

رافع اور انور اس کے قریب آ کھڑے ہوئے تھے۔ انور غور سے تصویر کی طرف دیکھنے لگا۔

فلک نے اپنا کام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال تھا کہ اس کی بھویں پتلی تھیں لیکن اب بنا چکی ہوں تو محسوس ہو رہا ہے کہ اس کی بھویں ایسی نہیں تھیں۔ اب ان کو تھوڑا سا چوڑا کر کے دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"کیا بات ہے۔ کیا تم اسے پہچان رہے ہو؟"

رافع کی آواز سن کر فلک نے انور کی طرف دیکھا جس کی پیشانی پر ایک شکن پڑ گئی تھی اور نظریں تصویر پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ تصویر دیکھ کر اسے کچھ یاد آ رہا ہے۔

"وہی ہے۔" یکایک وہ ہیجانی انداز میں بڑبڑایا۔ "یقیناً وہی ہے۔"

"کون؟" رافع کے منہ سے نکلا۔

فلک بھی استفہامیہ نظروں سے انور کی طرف دیکھنے لگی۔

انور انہیں کوئی جواب دیے بغیر اپنے موبائل پر کسی سے رابطہ کرنے لگا۔ اس کی وہ کیفیت ایسی تھی کہ رافع اور فلک بھی بے چین ہو گئے۔

"ہاں۔" انور موبائل پر کسی سے کہنے لگا۔ "آپ ایسا کیجیے کہ فوراً کراچی پولیس ہیڈ کوارٹر کو فون کیجیے۔ وہاں سے معلوم کرنا ہو گا کہ بلراج اس وقت کراچی میں ہے یا نہیں۔" پھر اس نے کچھ رک کر کہا۔ "دراصل میں نے کسی طرح یہ جان لیا ہے کہ مسز رافع کو لوٹنے والا تو بلراج ہی ہے۔"

انور کی وہ گفتگو یقینی طور پر اسی پولیس آفیسر سے تھی جو فلک کے معاملے میں تفتیش کر رہا تھا۔ یہ بات رافع اور فلک، دونوں ہی نے سمجھ لی۔

انور نے مزید ایک آدھ بات کرنے کے بعد موبائل بند کیا ہی تھا کہ رافع بے چینی سے بول پڑا۔ "یہ بلراج کون ہے؟"

انور نے فلک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب آپ کو اس تصویر پر مزید کام کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے پہچان لیا ہے اسے۔ ہاں اس کی بھویں ذرا چوڑی ہیں۔ آیئے اب کمرے میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ جلد ہی معلوم ہو جائے گا کہ بلراج اس وقت کہاں ہے؟"

وہ تینوں نشست کے کمرے میں آ گئے۔

"میں بہت حیران ہوں۔" انور نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "بلراج کا ڈیتی جیسے معاملات میں ملوث ہونا بہت عجیب بات ہے۔ وہ تو ایک پروفیشنل قاتل ہے اور نہایت بارسوخ بھی ہے۔ کئی بڑے آدمی اس کے پشت پناہ ہیں۔"

"قاتل کے؟" فلک حیرت سے بولی۔

"جی!" انور تلخی سے بولا۔ "سیاسی قتل عموماً بڑے لوگ ہی کرواتے ہیں۔ دو قتل تو ایسے ہو چکے ہیں جن کے بارے میں قانون کو یقین ہے کہ ان میں بلراج کا ہاتھ تھا کیونکہ اسے چند بڑے لوگوں کی سرپرستی حاصل ہے اس لیے کسی مضبوط ثبوت کے بغیر اسے تختۂ دار تک نہیں پہنچایا جا سکتا۔ ایک معاملے میں وہ کچھ پھنس بھی گیا تھا لیکن اس کے خلاف عدالت میں جو کچھ ثابت کیا جا سکا، وہ اتنا کافی نہیں تھا کہ عدالت اسے عمر قید یا موت کی سزا سنا سکتی۔ اسے صرف چھ سال کی سزا دی گئی تھی۔ دو سال پہلے وہ جیل سے رہا ہوا ہے۔ اسی بنیاد پر قانون اسے اس حد تک پابند کر سکا ہے کہ وہ جس شہر میں بھی رہے، وہاں کے پولیس ہیڈ کوارٹر کو اپنی موجودگی اور پتے سے باخبر رکھے۔ اگر کراچی سے کسی دوسرے شہر جائے تو اس شہر کے پولیس ہیڈ کوارٹر کو اپنے بارے میں رپورٹ دے دے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو پولیس حرکت میں آ جائے گی اور اسے گرفتار کر لے گی۔ عدالت سے کسی طرح ان سب باتوں کی اجازت لے لی گئی تھی۔"

فلک کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ اس کے تصور میں وہ منظر ابھر آیا ہو گا جب وہ خطرناک شخص اس پر پستول تانے ہوئے تھا۔

اب رافع کے ذہن سے یہ شبہ قطعی رفع ہو چکا تھا کہ اس کی عدم موجودگی میں ریسٹ ہاؤس آنے والا شخص سفیان.... تھا اور اس معاملے میں فلک نے ذرا بھی دروغ گوئی نہیں کی تھی۔

بیس منٹ بعد انور کے موبائل پر کال آئی۔

"وہ پنڈی میں ہے۔" دوسری طرف سے آواز آئی۔ "کراچی پولیس ہیڈ کوارٹر کو اس نے رپورٹ کر دی تھی کہ وہ اپنے کسی کام سے پنڈی جا رہا ہے۔ پنڈی کے ہیڈ کوارٹر کو بھی اس نے رپورٹ کر دی تھی کہ وہ یہاں آ گیا ہے۔ کراچی پولیس کو اطلاع دے دی گئی تھی کہ وہ یہاں آ گیا ہے۔"

انور نے جلدی سے پوچھا۔ "اس نے اپنی قیام گاہ کے بارے میں بھی تو بتایا ہو گا؟"

"جی ہاں۔ وہ پنڈی کے ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔"

"اس کی فوری گرفتاری ضروری ہے لیکن آپ کو تو پنڈی پہنچنے میں ڈھائی گھنٹے لگ سکتے ہیں۔" انور نے بے چینی سے کہا۔ اس کے چہرے سے فکر و تردد بھی ظاہر ہونے لگا تھا۔

"اچھا خیر۔" وہ بولا۔ "میں کچھ کرتا ہوں۔"

انور نے رابطہ منقطع کیا اور ٹہلنے لگا۔ فلک اور رافع ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

"مشکل یہ ہے کہ میں ان دنوں چھٹیوں پر ہوں۔" انور نے ٹہلتے ہوئے کہا۔ "یہاں تو وہ پولیس آفیسر مجھ سے نہ صرف مرعوب ہے بلکہ مجھے پہلے سے جانتا بھی ہے۔ وہ تو خوش ہے کہ میں اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں لیکن پنڈی پولیس

www.pkdigest.com

میری بات آسانی سے نہیں مان سکتی کیونکہ معاملہ بلراج جیسے بارسوخ مجرم کا ہے۔"

"گویا..."

رافع کی بات پوری نہیں ہو سکی۔ انور نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا تھا۔ اس نے موبائل پر کوئی نمبر ملاتے ہوئے بتایا کہ وہ اپنے محکمے کے ڈائریکٹر جنرل سے بات کرے گا۔

جلد ہی رافع اور فلک نے انور کو کہتے سنا۔ "سر! اتنی رات کو آپ کو تکلیف دے رہا ہوں۔ اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ دراصل معاملہ بہت اہم ہے۔ میں اس وقت مری میں ہوں۔ ایک معاملہ ایسا سامنے آگیا ہے کہ بلراج کو گرفتار کیا جا سکتا ہے۔"

انور نے سارے حالات بتائے، پھر کہا۔ "آپ ہنگامی طور پر میری چھٹیاں منسوخ کروا دیجیے اور پنڈی پولیس کو احکامات بھجوا دیجیے کہ وہ میری ہدایات پر عمل کرے۔ ان سب کاموں میں کچھ وقت لگے گا اس لیے بلراج کی فوری گرفتاری کے لیے تو آپ ابھی خود ہی پنڈی پولیس کے ڈی آئی جی سے کہہ دیجیے۔ بعد کے معاملات میں خود ہینڈل کر لوں گا۔"

انور نے چند باتیں اور کیں، پھر قدرے مطمئن ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"اب معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے کہا۔ "ڈکیتی کے معاملے میں اسے زیادہ لمبی سزا تو نہیں مل سکے گی لیکن کچھ دن کے لیے تو وہ جیل چلا ہی جائے گا۔ ممکن ہے کہ یہ ثبوت بھی مل جائے۔" اس نے فلک کی طرف دیکھا۔ "کہ آپ کو ہلاک کرنے کی کوشش بھی اسی نے کی تھی۔ اس صورت میں اسے زیادہ سزا بھی مل سکتی ہے۔"

رافع بولا۔ "کیا اس کا امکان نہیں کہ وہ پنڈی کے بجائے مری میں ہو۔"

"اس نے مری پولیس کو اس کی اطلاع نہیں دی ہے۔ اگر وہ یہاں ہوا تو اس کی گرفتاری کے لیے ایک مزید جواز مل جائے گا۔"

فلک الجھے ہوئے انداز میں بولی۔ "اس جیسے شخص کو ڈکیتی کرنے کی آخر کیا ضرورت تھی؟"

"یہ بات ابھی میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہی ہے۔" انور نے ٹھنڈی سانس لی۔

اسی وقت اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے کال ریسیو کی۔

"کیا؟" دوسری طرف کی بات سنتے ہی اس کے منہ سے نکلا۔ وہ خاصا چونک گیا تھا۔ رافع اور فلک اس کا منہ تکنے لگے۔

"ٹھیک ہے، آپ نکلیں۔" انور کھڑا ہو گیا۔ "میں بھی آتا ہوں آپ کے پیچھے۔"

اس نے موبائل بند کیا ہی تھا کہ رافع بول پڑا۔ "کیا کوئی اہم اطلاع..."

"صرف اہم نہیں، خوف ناک۔" انور نے اس کی بات کاٹی۔ "میں چلتا ہوں۔"

"آخر..."

"واپس آ کر بتاؤں گا۔" انور نے پھر اس کی بات کاٹی اور تیزی سے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔

"میں دروازہ بند کر کے آتا ہوں۔" رافع نے فلک سے کہا اور اٹھ کر انور کے پیچھے لپکا۔

فلک دم بہ خود سی بیٹھی رہی۔ انور کے انداز نے اسے خاصا پریشان کر دیا تھا۔ جلد ہی رافع واپس آ گیا۔

"کچھ بتایا آپ کو؟" فلک نے بے چینی سے پوچھا۔

"نہیں۔" رافع نے مایوسی سے سر ہلایا اور بیٹھ گیا۔ "الجھن میں ڈال گئے وہ۔"

رافع کچھ کہتا لیکن فلک کے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔

"ہاں سفیان!" فلک نے کال ریسیو کی۔

"تم لوگوں نے کھانا کھا لیا؟"

"نہیں، ابھی نہیں کھایا۔ کیوں؟"

"مطربہ کو کچھ شاپنگ کرنا تھی۔ ہم اس وقت بازار میں ہیں۔ شاپنگ کر لی ہے۔ اب کھانے کے لیے کسی ہوٹل کا رخ کرنا تھا تو مجھے تم لوگوں کا خیال آیا۔ کھانا لے کر وہیں آ جاتا ہوں۔ سب ساتھ ہی کھائیں گے۔"

"آ جاؤ۔" فلک نے کہا۔ "لیکن ہمارے لیے مت لانا۔ فریج میں ہے ابھی۔"

"اب کہاں گرم کرتی پھرو گی۔ میں سب کے لیے لے کر آتا ہوں۔ انور صاحب بھی ہیں نا؟"

"نہیں، انہیں کچھ کام تھا۔ ابھی گئے ہیں۔"

"اچھا خیر، تو ہم آتے ہیں ابھی۔"

تھوڑی دیر میں سفیان اور مطربہ آ گئے۔ سفیان کھانے کا اتنا سامان لے آیا تھا کہ وہ اگلے دن بھی کام آ جاتا۔

"کچھ بات آگے بڑھی؟" سفیان نے پوچھا۔

"کچھ ہوا تو ہے۔" فلک نے جواب دیا۔ "کوئی کال آئی تھی۔ انور صاحب بڑی عجلت میں گئے ہیں۔"

"بہت بھوک لگ رہی ہے۔" مطربہ بولی۔ "کھانا تو نکالا جائے۔"

"ہاں۔" فلک کھڑی ہوئی۔

"میں بھی ہاتھ بٹاتی ہوں آپ کا۔" مطربہ بھی جلدی سے اٹھی۔ اسے اندیشہ ہوا کہ اس کام کے لیے سفیان نہ اٹھ کھڑا ہو۔

وہ دونوں سب پیکٹ لے کر کچن میں چلی گئیں اور پلیٹوں میں نکال لائیں۔

کھانے کے دوران میں اور اس کے بعد بھی باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ موضوعات بدلتے رہے۔ جب یہ محسوس ہوا کہ مطربہ بور ہونے لگی ہے، تو سفیان کھڑا ہوا۔

"اچھا اب چلتے ہیں۔" اس نے کہا۔ "کل حلوہ پوری کا ناشتا کریں گے۔ میں ساڑھے سات بجے تک لے کر آ جاؤں گا۔"

وہ دونوں چلے گئے۔ اس وقت ایک بجا تھا۔

رافع اور فلک، دونوں اتنے پریشان تھے کہ انہیں انور کے جلدی آنے کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔ ان میں بلراج کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ یہ تو بالکل واضح تھا کہ بلراج کا کوئی چھوٹا موٹا گروہ بھی ہو گا کیونکہ سفیان نے پہاڑ پر دو آدمیوں کے سائے دیکھے تھے۔ ایسی صورت میں یہ بات اور زیادہ تعجب خیز ہو جاتی تھی کہ ڈکیتی کی واردات بلراج نے خود کی تھی۔

وہ دونوں تین بجے تک انور کے منتظر رہے، پھر انہیں نیند آ گئی۔

سفیان اپنے وعدے کے مطابق صبح ساڑھے سات بجے ناشتے کا سامان لے کر آ گیا۔ اسی کی وجہ سے فلک سات بجے کا الارم لگا کر سوئی تھی۔ ساڑھے سات بجے وہ دونوں تیار تھے۔

ناشتے کے دوران میں سفیان نے پوچھا۔ "انور صاحب کی کیا خبر ہے؟ رات کو آئے تھے؟"

ظاہر ہے کہ جواب نفی میں ہی دیا جا سکتا تھا۔

انور اس وقت آیا جب وہ لوگ چائے پی رہے تھے۔ اس کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ مسلسل مصروف رہا تھا۔ آنکھوں کی سرخی شب بے داری کی علامت تھی۔

"خیریت تو رہی؟" رافع نے تشویش سے پوچھا۔

انور نے جواب دینے کے بجائے کہا۔ "چائے تو پلاؤ۔"

فلک فوراً اٹھ کر ایک کپ لے آئی اور اسی نے چائے بنا کر انور کو دی۔ انور چائے پینے کے دوران میں بھی کھویا کھویا سا رہا۔ رافع اور فلک کے سوالوں پر اس نے بڑے مبہم جواب دیے۔ چائے پی لینے کے بعد اس نے کہا۔

"آپ کو میرے ساتھ چلنا ہے بھابی۔"

"کہاں؟" فلک چونکی۔

انور نے اسے جواب دینے کے بجائے سفیان سے کہا۔ "اگر آپ لوگ بھی چلیں تو کوئی حرج نہیں ہو گا۔"

"آپ نے بہت تجسس کر دیا ہے۔ ہم ضرور چلیں گے۔"

"میں بالکل متجسس نہیں ہوں۔" مطربہ نے منہ بنا کر کہا۔

"تو تم مت جاؤ۔" سفیان کا لہجہ خشک ہو گیا۔ "میں تو جاؤں گا۔"

لیکن یہ ممکن نہیں تھا کہ مطربہ اسے تنہا چلا جانے دیتی جبکہ فلک بھی ساتھ تھی۔

وہ لوگ دو کاروں میں وہاں سے روانہ ہوئے۔ سفیان اور مطربہ اپنی کار میں تھے۔ انور نے اپنی کار وہیں چھوڑ دی تھی۔ وہ رافع اور فلک کے ساتھ انہی کی کار میں بیٹھ گیا تھا۔

"واپس تو مجھے آنا ہی ہے۔" اس نے کہا.... ڈرائیونگ بھی اسی نے سنبھال لی تھی۔ فلک کو پچھلی سیٹ پر بیٹھنا پڑا تھا۔

"کچھ تو بتائیں انور صاحب!" وہ بولی۔ "آپ نے مجھے شدید خلفشار میں مبتلا کر دیا ہے۔"

"کوئی وجہ ہے جو میں آپ کو ابھی نہیں بتا رہا ہوں۔"

اس جواب نے فلک اور رافع کو مزید الجھا دیا۔

آخر دونوں کاریں آگے پیچھے ایک عمارت کے سامنے جا رکیں۔ وہاں پولیس آفیسر موجود تھا، جیسے انہی کا منتظر ہو۔

وہ سب اس عمارت میں داخل ہوئے۔ انور ان کے ساتھ ایک کمرے کے سامنے رکا۔

"اب میں صرف بھابی کو اندر لے جاؤں گا۔" انور نے کہا۔ "آیئے بھابی!"

وہ صرف فلک کو اندر لے گیا۔ فلک نے دیکھا کہ وہاں ایک اسٹریچر پر کوئی لیٹا ہوا تھا۔ اس پر چادر پڑی ہوئی تھی۔

"یہ لاش ہے۔" انور کی آواز نے فلک پر دھماکا سا کیا۔ "بہت مسخ حالت میں ہے۔ لیکن آپ شاید پہچان لیں۔"

انور نے لاش سے چادر ہٹا دی۔

باہر کھڑے ہوئے افراد نے فلک کی چیخ سنی۔ رافع اور سفیان فوراً دروازے کی طرف لپکے لیکن پولیس آفیسر نے انہیں روک دیا۔

"آپ لوگ رکیں۔ وہ دونوں ابھی باہر آ جائیں گے۔" پولیس آفیسر بولا۔ "انور صاحب نے آپ کو بتا تو دیا ہو گا کہ انہیں مسخ لاش کی شناخت کے لیے یہاں لایا گیا ہے۔ دراصل حتمی شناخت ضروری ہے ورنہ ہمیں کچھ چیزوں سے

www.pkdigest.com

اندازہ تو ہو گیا ہے کہ وہ اورنگ زیب صاحب کی لاش ہے۔''

''کیا؟'' سفیان بڑے زور سے چیخ پڑا۔

اسی وقت ہذیانی انداز میں چیختی ہوئی فلک باہر آئی اور بے تحاشا سفیان سے لپٹ کر رونے لگی۔

وہ بڑی المناک صورتِ حال تھی لیکن رافع کو اس وقت بھی یہ بات اچھی نہیں لگی کہ فلک، سفیان سے اس طرح لپٹ گئی تھی جیسے دنیا میں وہی اس کی عزیز ترین ہستی ہو۔

''ڈیڈی!'' فلک روتے ہوئے چیخی۔ ''اندر ڈیڈی کی لاش ہے بھیا!''

یہ رافع کے لیے بہت بڑا ذہنی جھٹکا تھا کہ فلک نے سفیان کو اس وقت ''بھیا'' کہا تھا۔

سفیان کا چہرہ دھواں دھواں سا ہو گیا تھا۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ آنکھوں میں ایسی نمی آ گئی تھی جیسے وہ اپنے آنسوؤں پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہو۔

''فلک کو سنبھالیے!'' سفیان نے لرزتی ہوئی آواز میں رافع سے کہا اور فلک کو اس کی طرف دھکیل کر تیزی سے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔

پولیس آفیسر نے اسے روکنے کی کوشش کی تو وہ چیخ پڑا۔

''کیا مجھے حق نہیں کہ اپنے ڈیڈی کی لاش دیکھ سکوں۔''

انور نے کچھ اشارہ کیا تو پولیس آفیسر سفیان کے ساتھ کمرے میں چلا گیا۔

انور نے متحیر لہجے میں رافع سے پوچھا۔ ''سفیان صاحب تمہاری بیوی کے بھائی ہیں؟''

رافع کے سینے سے لگ کر روتی ہوئی فلک پر غشی طاری ہو گئی تھی۔ اسے دونوں ہاتھوں سے سنبھالنے کے باعث رافع، انور کو جواب نہیں دے سکا۔

مطربہ اس وقت ساکت مجسمہ بنی ہوئی تھی۔

اس وقت دو پولیس کانسٹیبل بھی وہاں آ گئے تھے۔ انور نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ان کے ہتھکڑیاں لگا دو۔'' اس کا اشارہ مطربہ کی طرف تھا۔

''کیا؟'' مطربہ تیزی سے بولی۔

کانسٹیبلوں نے اسے ہتھکڑیاں لگانے میں بڑی پھرتی دکھائی تھی۔

''کیا ہے یہ؟'' مطربہ ہذیانی انداز میں چیخی۔

رافع، فلک کو فرش پر ہی ایک جانب لٹا چکا تھا لیکن اس وقت اس کی ساری توجہ فلک پر مرکوز نہیں رہ سکی تھی۔ مطربہ کے ہتھکڑیاں لگنے کے منظر نے اس کا دماغ جیسے بھک سے اڑا دیا تھا۔

''بلراج سے یہ کام تم ہی نے کروایا ہے اداکارہ صاحبہ!'' انور نے نہایت تیز لہجے میں کہا اور پھر مطربہ کے ہاتھ سے اس کا پرس چھین لیا۔ ''امکان ہے کہ تمہارا موبائل بھی تمہارے خلاف ایک اہم ثبوت بنے گا۔''

مطربہ کا موبائل اس کے پرس ہی میں تھا۔

''فلک! فلک!'' رافع دونوں ہاتھوں سے فلک کے گال تھپتھپانے لگا۔

روتا ہوا سفیان کمرے سے نکلا تو ایک جھٹکے سے رک گیا۔ وہ منظر اس کے لیے بھی غیر متوقع ہی تھا کہ مطربہ کے ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں۔

☆☆☆

انور کی ہدایت پر پولیس ہی نے فلک کو قریب ترین اسپتال پہنچایا تھا جہاں فلک کو ہوش آیا لیکن دماغ میں باپ کی لاش کا تصور آتے ہی وہ چیخ مار کر پھر بے ہوش ہو گئی۔ ایک ڈاکٹر اور دو نرسیں بڑی مجلت میں اس کے قریب پہنچیں۔

دھیرے دھیرے ہی فلک کو سنبھالنے میں کامیابی ہو سکی لیکن صرف اس حد تک کہ اس پر غشی کے دورے پڑنا بند ہو گئے۔ اس کے حواس پوری طرح بحال ہونے میں دو دن لگ گئے۔ ان دنوں میں اسے قطعی نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ سب کچھ کیا ہوا تھا اور کیوں ہوا تھا۔

انور کی خواہش تھی کہ اورنگ زیب صاحب کی لاش سردخانے میں رکھوا دی جائے اور ان کی تدفین اس وقت ہو جب فلک کے حواس پوری طرح بحال ہو جائیں لیکن فرید نے اس کی سختی سے مخالفت کی۔ وہ پاؤں کی موچ کے باوجود کراچی سے آ گیا تھا۔ اس کے لیے ایک وہیل چیئر مہیا کر دی گئی تھی۔

فرید کی اس بات سے سفیان نے بھی اتفاق کیا تھا کہ اورنگ زیب صاحب کی لاش ایک بند تابوت میں رکھ دی جائے تاکہ وہ خراب نہ ہو اور تدفین کے لیے تابوت اسی وقت کراچی لے جایا جائے جب فلک کے حواس پوری طرح بحال ہو جائیں۔

جو کچھ ہوا تھا، اس کی تفصیلات رافع کے علم میں آ چکی تھیں۔ رات کو جب انور موبائل پر پولیس آفیسر کی کال سننے کے بعد مجلت میں ریسٹ ہاؤس سے روانہ ہوا تھا، اس وقت اسے یہی اطلاع ملی تھی کہ مری اور پنڈی کے درمیانی راستے پر ایک اور حادثہ ہو گیا تھا۔ حادثے کی نوعیت وہی تھی جو رافع اور فلک کو پیش آ چکی تھی۔ یعنی کسی نے ایک موڑ پر اتنا تیل پھیلایا تھا کہ اورنگ زیب کی کار سلپ ہو کر کھائی میں جا گری تھی لیکن لڑھکتی ہوئی بالکل نیچے نہیں چلی گئی تھی۔ ایک چٹان جیسے بڑے پتھر نے کار کو زیادہ نیچے جانے سے روک لیا تھا۔

حادثے کی اس نوعیت ہی کے باعث انور کے ذہن میں کچھ شبہات چکرائے تھے اور وہ پولیس آفیسر کے ساتھ جائے واردات پر پہنچا تھا۔

کار کیونکہ زیادہ نیچے نہیں گئی تھی اس لیے پولیس کو اس مقام تک پہنچنے میں کچھ زیادہ دشواری نہیں ہوئی تھی۔ کار کا حلیہ بگڑ چکا تھا اس لیے اس میں سے اورنگ زیب صاحب کی لاش بہ مشکل نکالی جا سکی تھی۔

کار چلانے والا شوفر بھی ہلاک ہو گیا تھا اس لیے اس کی لاش بھی نکالی گئی تھی۔

اورنگ زیب صاحب کی جیب سے ان کا پرس مل گیا تھا۔ اس میں رکھے ہوئے کچھ کاغذات اور شناختی کارڈ کی وجہ سے سمجھ لیا گیا تھا کہ وہ انہی کی لاش تھی جسے حتمی شناخت کے لیے فلک کو دکھانا ضروری تھا۔

فلک کے لیے وہ شناخت اس لیے زیادہ ممکن ہوئی تھی کہ اورنگ زیب صاحب کی گردن پر کان کی لو کے نیچے ایک بڑا سا مسا تھا۔ شناختی کارڈ میں اس مسّے کا اندراج اس لیے نہیں تھا کہ وہ شناختی کارڈ بننے کے برسوں بعد ابھرا تھا۔

انور کے خیال کے مطابق اورنگ زیب صاحب نے صرف فلک کی تشفی اور اس سے زیادہ بحث نہ کرنے کے خیال سے کہہ دیا تھا کہ وہ پنڈی کے ہوٹل میں رک جائیں گے مگر انہوں نے فیصلہ یہی کیا تھا کہ وہ رات ہی کو مری، اپنی لاڈلی بیٹی کے پاس پہنچ جائیں گے۔

ان کی قتل و حرکت پر بلراج نے خود یا اپنے آدمیوں کے ذریعے کڑی نظر رکھی تھی چنانچہ پنڈی سے ان کی روانگی کے ساتھ ہی انہیں ختم کرنے کا سیٹ اپ بنا دیا گیا تھا۔

وہ سارا کھیل ہی اورنگ زیب صاحب کو ختم کرنے کے لیے کھیلا گیا تھا۔

بلراج اور مطربہ کے خفیہ ناجائز تعلقات تھے۔ اسی نے بلراج سے یہ کام کرنے کے لیے کہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ سفیان کس کا بیٹا تھا۔ وہ سفیان کی بہت بڑی جذباتی غلطی تھی کہ اس نے باپ کی ناراضی کو خاطر میں لائے بغیر مطربہ سے شادی کر لی تھی۔

اورنگ زیب صاحب نے اس شادی ہی کی وجہ سے سفیان سے قطع تعلق کر لیا تھا اور اپنی اولادوں ہی کو نہیں، دیگر عزیزوں یا جاننے والوں کو بھی تنبیہہ کر دی تھی کہ اگر اب کسی کی زبان پر سفیان کا نام بھی آیا تو وہ اس سے بھی قطع تعلق کر لیں گے۔

فلک اور سفیان ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے۔ وہ جڑواں بھائی بہن تھے۔ وہ خفیہ طور پر ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ رافع سے شادی کے باعث فلک کو بھائی سے ملنے میں مشکل ہو سکتی تھی اور رافع کو حقیقت بتاتے ہوئے بھی اسے ڈر لگتا تھا۔ اورنگ زیب صاحب نہایت محبت کرنے والے شفیق باپ ہونے کے باوجود نہایت دبنگ، غصیلے اور حد درجہ ضدی تھے۔ خاندان کا ہر فرد ان سے ڈرتا تھا۔

مطربہ حقیقت سے واقف تھی۔ سفیان سے شادی کرتے وقت ہی اس کا ارادہ تھا کہ اورنگ زیب صاحب کو ختم کروا دے گی۔ اس طرح سفیان اپنے باپ کی لگ بھگ نصف دولت کا مالک بن جاتا جس سے مطربہ بھی اپنی زندگی میں بہت زیادہ رنگینیاں لا سکتی تھی۔ بلراج نے اسے مشورہ دیا تھا کہ یہ کام دو ایک سال بعد کیا جائے۔ مطربہ نے اس کی بات مان لی تھی اور خود پر جبر کر کے کلریکل جاب کرنے والے سفیان کے ساتھ ایک طویل عرصہ گزارا تھا۔

جس روز رافع نے مری کے لیے ایک فلائٹ میں ریزرویشن کرائی تھی، اس سے پہلے کی ایک فلائٹ سے مطربہ سفیان کے ساتھ پنڈی پہنچی تھی۔ وہاں اس نے رافع اور فلک کو دیکھ لیا تھا۔ لیکن وہ دونوں اسے نہیں دیکھ سکے تھے۔ اس وقت ہوٹل کی لابی میں رافع موبائل پر اپنے کسی دوست سے مری جانے کے لیے کار مانگ رہا تھا۔

مطربہ نے اپنے موبائل سے اس کی اطلاع بلراج کو دی تھی۔ اس وقت اس کے ذہن میں کوئی خاص خیال نہیں تھا۔ وہ بلراج کو بس یوں ہی بتا بیٹھی تھی کہ سفیان کی بہن اور اس کے شوہر نے بھی مری کا پروگرام بنایا ہے۔

خود بلراج کے ذہن میں شروع سے یہ تھا کہ اورنگ زیب صاحب کے قتل کو کسی حادثے کا رنگ دے دے گا۔ یہ اطلاع ملتے ہی اس کے عیار دماغ نے فوراً ایک منصوبہ بنا لیا اور اس نے بھی پنڈی اور پھر مری پہنچنے میں دیر نہیں لگائی۔

مری پہنچنے کے بعد ہی اس نے فون کر کے پنڈی اپنے دو آدمیوں کو بھی اس خیال سے بلوا لیا کہ شاید کسی موقع پر ضرورت پڑ جائے۔ اس نے ان دونوں کی آمد سے پہلے یہ ڈکیتی کا ڈراما خود رچا ڈالا۔ اسے باتوں باتوں میں بہت پہلے ہی مطربہ سے معلوم ہو چکا تھا کہ اورنگ زیب صاحب سخت گیر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ایسے باپ بھی ہیں جو اپنی اولاد کی کسی پریشانی پر اپنی اولاد سے زیادہ پریشان ہو جاتے ہیں۔

ڈکیتی کا مقصد یہ تھا کہ فلک پولیس کو رپورٹ دے گی اور اس کے ساتھ ہی اپنے باپ کو بھی اطلاع دے گی تو عین ممکن ہے کہ وہ مری دوڑے چلے آئیں۔

لیکن اورنگ زیب صاحب کی آمد سے پہلے اسے مطربہ

www.pkdigest.com

سے جب یہ معلوم ہوا کہ فلک نے اس کی جو ایک جھلک دیکھی ہے تو اب اس کی تصویر بنانے پر آمادہ ہے، یہ بلراج کے لیے خطرے کی گھنٹی تھی چنانچہ اس نے باپ سے پہلے بیٹی ہی کو ختم کرنے کی منصوبہ بندی کر لی۔ وہی منصوبہ اس نے اورنگ زیب صاحب کے لیے بھی بنایا تھا۔ اسے مطربہ سے اطلاع مل گئی کہ فلک شام ہی کو مری سے روانہ ہو رہی ہے چنانچہ اس کی ہدایت پر اس کے آدمیوں نے سڑک پر تیل پھیلایا اور اوپر سے ایک پتھر بھی لڑھکا دیا۔ فلک اور رافع اس حادثے سے بال بال بچے۔ وہ بلراج کے لیے تشویش کی بات تھی لیکن اسے اطمینان رہا کہ فلک کراچی پہنچنے کے بعد ہی اس کی تصویر بنا سکے گی۔ اسے یہ نہیں معلوم ہو سکا تھا کہ فلک نے سفیان سے مصوری کا سامان منگوالیا تھا اور مری ہی کے ریسٹ ہاؤس میں اس کی تصویر بنا بیٹھی تھی۔

کراچی میں موجود بلراج کے آدمی اس کی ہدایت پر اورنگ زیب صاحب کی نقل و حرکت پر نظر رکھے رہے تھے۔ ان سے بلراج کو اطلاع مل گئی کہ اورنگ زیب صاحب پانچ بجے کراچی سے پنڈی کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔

بلراج کو یقین نہیں تھا کہ اورنگ زیب صاحب رات ہی کو مری روانہ ہو جائیں گے لیکن اس نے اپنے دونوں آدمیوں کو الرٹ رکھا۔ جب اورنگ زیب رات ہی کو مری روانہ ہوئے تو بلراج کے دونوں آدمی وہ کام کر گزرے جو بلراج چاہتا تھا۔

دوسری طرف پنڈی کی پولیس کو حکم مل چکا تھا کہ بلراج کو گرفتار کر لیا جائے۔ بلراج نے پنڈی پولیس کو یہ رپورٹ تو کر دی کہ وہ پنڈی آ گیا ہے لیکن اپنے مری جانے کی بات چھپا گیا تھا۔ اس نے پنڈی پولیس کو اپنا پنڈی کا جو پتا دیا تھا، وہاں وہ موجود نہیں تھا۔ وہاں اس کی گرفتاری عمل میں نہیں آ سکی تو انور کو یقین ہو گیا کہ وہ اس رات بھی مری ہی میں ہو گا۔ امکان تھا کہ وہ کسی فرضی نام سے کسی ہوٹل میں مقیم ہو گا اور کسی معمولی ہوٹل میں ہرگز نہیں ٹھہرا ہو گا۔ چنانچہ جو چند نمایاں ہوٹل تھے، وہاں پولیس نے ریڈ کیا۔ ایک ہوٹل سے بلراج کو گرفتار کر لیا گیا جس پر اس نے شدید احتجاج کیا...... اسے بتایا گیا کہ اس نے جس عورت کو لوٹا تھا، اس نے اس کی تصویر بنا کر پولیس کو دے دی ہے۔ بلراج اس کے بعد بھی اکڑا رہا۔ انور کو اس کی توقع بھی تھی لیکن اس نے جو کچھ سوچا تھا، اس کی وجہ سے مطمئن بھی رہا۔ اسی کی ہدایت پر پولیس نے بلراج کا موبائل اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ انور نے اس موبائل کمپنی سے رابطہ کیا جس کی ''سم'' بلراج کے موبائل میں تھی۔ کمپنی سے معلوم ہو گیا کہ گزشتہ دو روز میں بلراج نے کن کن نمبروں کے موبائل سے رابطہ کیا تھا۔ ان نمبروں کے حامل مالکان کے نام بھی کمپنی نے بتا دیے۔ اس طرح انور کو معلوم ہو سکا کہ ان میں سے ایک نمبر مطربہ کے نام پر تھا۔ یہ اس کے لیے نہایت تعجب خیز انکشاف تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ مطربہ کو بلراج سے رابطہ رکھنے کے سلسلے میں پولیس اسٹیشن طلب کر کے اس سے پوچھ گچھ کی جائے لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ مردہ خانے میں جب اس پر یہ منکشف ہوا کہ سفیان اورنگ زیب صاحب کا بیٹا ہے تو اس نے دو اور دو چار کی طرح ساری بات سمجھ لی۔ اس نے اسی وقت مطربہ کو گرفتار کرا دیا۔

''بلراج نے ابھی تک زبان نہیں کھولی ہے۔'' انور نے رافع سے کہا...... ''لیکن مطربہ سب کچھ اگل چکی ہے۔ بہرحال اب ان دونوں کے موبائلز کی سم انہیں عدالت کے کٹہرے میں لانے کے لیے بہت کافی ہے۔''

ان سب باتوں سے فلک اس وقت بھی بے خبر رہی جب اس کے حواس بحال ہو چکے تھے۔ اس پر یہ غم مسلط تھا کہ وہ یتیم ہو چکی تھی، کسی اور بات کی اسے پروا ہی نہیں تھی۔ اس نے سفیان کے ساتھ مطربہ کی عدم موجودگی پر بھی اس بارے میں کوئی استفسار نہیں کیا۔ وہ بس فریدہ کو گلے لگا کر کچھ دیر تک روتی رہی تھی۔

اسی دن انہیں مری سے پنڈی اور پنڈی سے کراچی روانہ ہونا تھا۔ مری سے وہ روانہ ہو بھی گئے لیکن جب پنڈی پہنچے تو فلائٹ کی روانگی سے ایک گھنٹے قبل بارش شروع ہو گئی اور موسم طیارے کی پرواز کے لیے حد درجہ ناساز ہو گیا۔ فلائٹ بروقت جانے کا امکان مفقود ہو گیا اور اس وقت رافع کو فلک کی ایک بات یاد آ گئی۔ اس نے اس موسم کو اپنا دشمن قرار دیا تھا اور اس کی وہ بات اب تک درست ہوتی چلی آ رہی تھی۔

اہم اعلان

جملہ اشتہارات (جن کے مندرجات سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں ہوتا) نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ مشتہرین کے لیے ادارے کی معرفت آنے والی ڈاک ضائع کر دی جاتی ہے۔ قارئین رابطے یا معلومات کے لیے براہ راست مشتہرین سے رجوع کریں۔ اس ضمن میں کسی نقصان یا شکایت کی صورت میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی کوئی اخلاقی یا قانونی ذمے داری نہیں ہوگی۔

www.pkdigest.com